16.99

16

خُطباتِ بہاولپور

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

اِدارۂ تحقیقاتِ اِسلامی
الجامعة الاسلامية العالمية
(اِسلام آباد — پاکستان)

خطباتِ بہاولپور

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

اِدارۂ تحقیقاتِ اِسلامی
الجامعة الاسلامية العالمية
(اِسلام آباد — پاکستان)

سلسلہ مطبوعات ادارہ تحقیقات اسلامی ، الجامعۃ الاسلامیۃ العالمیۃ

نمبر ۶۰(۸)

اشاعت اول ادارہ تحقیقات اسلامی (مؤلف کا نظر ثانی اور تصحیح شدہ ایڈیشن) ۱۹۸۵ء

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری، ادارہ تحقیقات اسلامی
کوائف فہرست سازی دوران طباعت
حمید اللہ محمد، ۱۹۰۸ء

خطبات بہاولپور

(ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، سلسلہ مطبوعات نمبر ۶۰ (۷)

کتابیات۔ ص اشاریہ۔ ص "نسخہ مصحح مؤلف"

۱۔ سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ خطبات
۲۔ اسلام۔ خطبات۔ (الف) عنوان، (ب) سلسلہ

ISBN 969 408 065 - 7 اشاعت دہم ۲۰۰۵ء ۶۳- ۲۹۷

طابع و ناشر : ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

فہرست

باسمہ تعالیٰ

تعارف طبع رابع

حامداً و مصلیاً

شب قدر کا مبارک زمانہ تھا کہ اچانک ایک خوشخبری ملی- وہ یہ کہ میری حقیر و ناچیز تالیف کی پھر ایک بار طباعت شروع ہو چکی ہے- وقت تو نہیں ہے کہ ساری کتاب پر خود اطمینان سے ایک نظر ڈال سکوں- لیکن بعض فاضل کرم فرماؤں- خاص کر ڈاکٹر محمد خالد مسعود' اور حکیم نعیم الدین زبیری صاحبان کی نظر میں آئی ہوئی سو پچاس طباعتی یا اسلوبی فروگزاشتوں کو درست کرنے پر اکتفا کرتا ہوں-

خدا ان کو جزائے خیر دے اور مجھے صراط مستقیم کی ہدایت فرمائے- نعم المولیٰ و نعم النصیر-

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

پاریس ۲۶ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ

مکرر

معلوم ہوا کہ لاہور کے ایک ناشر نے اسے کتابی صورت میں چھاپا ہے- معلوم نہیں کس کی اجازت سے' افسوس خاص کر اس پر ہے کہ غیر مصحح چیزیں دوبارہ پھیل کر علم دشمنی کا باعث بن رہی ہیں-

واللہ بصیر بالعباد

باسمہ تعالٰی

پیش لفظ مولف برائے اشاعت سوم

حامداً و مصلیاً

اللہ کی عنائتیں بے پایاں ہیں۔ ان کا شکر کسی طرح ادا ہو نہیں سکتا۔ بہاولپور کی جامعہ اسلامیہ نے مجھے نوازا اور مجھ گمنام بلکہ بدنام کو ربیع الاول ۱۴۰۰ھ میں بارہ خطبات اہل علم و فضل کے سامنے دینے کی دعوت دی۔ یہ میرے لیے "فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا" بنے وللہ الحمد۔

وہاں ارباب جامعہ، اساتذہ اور طلبہ نے بھی میری حد سے زیادہ عزت افزائی کی، اہل شہر نے، بلدیہ نے، اور مقامی علمی اداروں نے بھی، اور خود محترم نواب صاحب بہاولپور نے بھی مجھے باریاب فرمایا۔ الفاظ نہیں پاتا کہ ان کا کما حقہم شکریہ ادا کرسکوں۔

یہ خطبات برجستہ تھے جلد یہ نفیس طباعت کے ساتھ ۱۴۰۱ھ میں چھاپے گئے۔ انتظامی دشواریوں سے میں ان مدونہ اوراق کی جانچ نہ کرسکا۔ پھر یہ ۱۴۰۲ھ میں مکرر من و عن چھاپے گئے۔ اب تیسری اشاعت کے وقت مجھے پہلی بار موقع ملا ہے کہ زبانی تقریروں کو جس طرح تحریری صورت دی گئی تھی اس پر نظر ڈال سکوں، اور جہاں میری مراد کو سمجھنے میں مدون صاحب سے غلطی ہوئی تھی اسے درست کرسکوں۔ اپنی غلطیاں اور کوتاہیاں تو میں دور نہیں کرسکوں گا، لیکن میرے الفاظ اور میرے مفہوم کے تعین میں سہو ہوا تھا تو اب اس کی اصلاح کر دی گئی ہے۔ وللہ الحمد۔ یہ اب گویا پہلا مستند ایڈیشن ہے۔ حوالے تو یہاں نہیں دیے جاسکے، لیکن بیانات کا اب میں ذمہ دار ہوں۔

پہلے بہاولپور نے میری عزت افزائی کی۔ اب اس نئی اشاعت کے لیے میں دارالسلطنت اسلام آباد کا رہین منت ہوں۔ خدا ارباب متعلقہ کو جزائے خیر دے۔ "وما اوتيتم من العلم الا قليلا" کا مصداق ہوں، اور "رب زدني علما" کا دعاگو۔

محمد حمید اللہ

رجب ۱۴۰۵ھ، پاریس

حرف تقدیم : طبع دوم

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کو رب کریم نے علم و فضل اور اخلاق و اوصاف حمیدہ سے جو حصہ وافر عطا فرمایا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ مارچ ۱۹۸۰ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے زیر انصرام آپ نے متعدد اسلامی موضوعات پر جو خطبات ارشاد فرمائے وہ فی البدیہ ہونے کے باوجود تحقیق و تعمق کی روشن مثال ہیں۔ یہ مجموعہ اپریل ۱۹۸۱ء میں پہلی بار جناب پروفیسر عبدالقیوم قریشی' جو ان دنوں جامعہ کے سربراہ تھے' کی ذاتی توجہ سے صفحہ قرطاس پر منتقل ہوکر زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ آئندہ برس طلباء کے لیے اس کا سستا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ امسال پروفیسر موصوف کا تقرر انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی' اسلام آباد میں ہوا تو انھیں خیال ہوا کہ خطبات کا ایک جدید ایڈیشن اسلام آباد سے شائع کیا جائے۔چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے مراسلت کے بعد ایک مطبوعہ نسخہ اس غرض سے ان کی خدمت میں ارسال کیا کہ وہ ضروری تصحیح و ترمیم کے بعد اسے طباعت کے لیے واپس بھیج دیں۔ یہ نظر ثانی شدہ نسخہ چند ماہ پیشتر موصول ہوا' اور فیصلہ کیا گیا کہ ادارۂ تحقیقات اسلامی جو اب انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی سے منسلک ہے' اس مستند اور ترمیم شدہ ایڈیشن کو شائع کرنے کی سعادت حاصل کرے۔

مجھے مسرت بھی ہے اور فخر بھی کہ ادارۂ تحقیقات اسلامی کو دور حاضر کے ایک نامور عالم اور محقق کی ایک مایہ ناز تالیف کا مستند نسخہ شائع کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مشورہ سے اس ایڈیشن میں توضیحی نقشوں اور اشاریہ کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے انتہائی ممنون ہیں کہ انہوں نے از راہ کرم پوری کتاب کو پیراگرافوں میں تقسیم فرما کر اس کا اشاریہ خود ترتیب دینے کی زحمت فرمائی۔ رب رؤف و رحیم انھیں جزائے جزیل عطا فرمائے۔

۴ دسمبر ۱۹۸۵ء

(ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ زمان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف: طبع اول

"خطبات بہاولپور" کے نام سے شائع ہونے والی یہ کتاب عام کتابوں سے یوں مختلف ہے کہ اسے کسی مصنف نے کتاب کے طور پر نہیں لکھا بلکہ اس میں ان خطبات کو یکجا کیا گیا ہے جو ایک عالم تبحر نے، نہایت شگفتہ مگر فاضلانہ گفتگو کے انداز میں، کسی تحریری یاد داشت کے بغیر، متعدد اسلامی موضوعات پر، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں مسلسل بارہ روز دیے۔ ان خطبات کو دوران گفتگو ٹیپ پر ریکارڈ کرلیا گیا تھا اور پھر تحریر میں لاکر کم و بیش من و عن شائع کر دیا گیا۔

فاضل مقرر کا اسم گرامی ڈاکٹر محمد حمید اللہ ہے جو سالہا سال سے پیرس میں مقیم ہیں اور فرانس کے نیشنل سینٹر آف سائنٹیفک ریسرچ سے بیس سال تک منسلک رہنے کے بعد اب نجی طور پر اسلامی تحقیق و تبلیغ تالیف کا کام پیرس ہی میں جاری رکھے ہوئے ہیں اور اپنے تحقیقی و تبلیغی کارناموں کی بدولت مشرق و مغرب کے علمی حلقوں میں یکساں طور پر معروف و ممتاز ہیں۔

قدیم جامعہ عباسیہ، بہاولپور کی بنیاد امیر بہاولپور، نواب محمد صادق خان خامس عباسی مرحوم نے ۱۹۲۵ء میں رکھی تھی۔ بعد میں وحدت مغربی پاکستان کے وجود میں آنے پر یہ دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ کہلانے لگی اور پھر ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی ۱۹۷۵ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بن گئی۔ یونیورسٹی کے وسیع تر مقاصد کے پیش نظر اس میں کلیئہ معارف اسلامیہ کے علاوہ کلیئہ علوم عمرانی اور کلیئہ علوم طبیعی بھی قائم کیے گئے ہیں۔ تاہم مرکزی حیثیت علوم اسلامیہ ہی کو حاصل ہے۔

نومبر ۱۹۷۸ء میں جب مجھے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی سربراہی تفویض ہوئی تو میرا پہلا کام ایسے ارباب علم و فضل کی تلاش تھا جو علوم اسلامی میں بالخصوص اور دیگر علوم میں بالعموم گہری نظر رکھتے ہوں اور ہماری نوزائیدہ دانش گاہ کو اعلیٰ ترین علمی بنیادوں پر استوار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ اسی تجسس کے دوران میری ملاقات اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب سے ہوئی، جنہوں نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب سے مجھے غائبانہ طور پر متعارف کرایا۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے سلسلہ مراسلت کا آغاز کرتے ہوئے ایک ایسی دانش گاہ کے اجمالی خاکے کی بابت مشاورت کی جو صحیح معنوں میں اسلامی یونیورسٹی کہلانے کی مستحق ہو۔ میں ممنون ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے اس ضمن میں ہمیشہ انتہائی شفقت اور خلوص کے ساتھ میری رہنمائی فرمائی۔ خط و کتابت کا سلسلہ جب آگے بڑھا تو میں نے فروری ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر صاحب کو

یونیورسٹی میں "سیرت چیئر" کی پیش کش کرتے ہوئے لکھا کہ اگر آپ ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے معارف اسلامیہ کے متعدد شعبہ جات کو اپنی سرپرستی میں چند سالوں کے اندر منظم کر جائیں اور اپنے جذب و شوق سے ہمارے نوجوانوں کو متاثر کرتے ہوئے ان کے دلوں میں مطالعہ و تحقیق کی ایسی لگن پیدا کر دیں کہ وہ آپ کے علمی کام کو آگے بڑھانے کے قابل ہو جائیں تو یہ آپ کا ہم پر اور ہماری آئندہ نسلوں پر بہت بڑا احسان ہوگا' کیونکہ اس طرح چراغ سے چراغ روشن ہونے کا ایک سلسلہ چل نکلے گا جو بہت دور رس اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔ اس خط کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا کہ ملک فرانس کے قوانین' جہاں وہ پناہ گزین کی حیثیت سے مقیم ہیں' پانچ ماہ سے زیادہ ملک سے باہر رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لیے پاکستان میں طویل قیام ممکن نہیں' البتہ سیرت پاک پر مہینے پندرہ دن کا سلسلہ تقاریر یا سلسلہ درس خوشگوار موسم میں ممکن ہے۔ میں نے اگلے خط میں درسی تقاریر کی پیش کش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر اصرار کیا کہ ہمارے درمیان چند سال کے لیے سکونت پذیر ہونے کی کوئی صورت نکالیئے تاکہ ہمارے نوجوان آپ جیسے فاضل اجل کی صحبت سے بہرہ ور ہوکر علم و دانش کی صحیح قدر و منزلت پہچان سکیں اور ان کے ذہنوں سے علمی کم مائیگی کا وہ احساس جو دور غلامی کے ورثے کی صورت ہم سے چمٹا ہوا ہے' جاتا رہے۔ میرے اس اصرار پر ڈاکٹر صاحب نے ایک طویل خط لکھا جس میں انہوں نے اپنے اس عظیم اسلامی مشن کی طرف اشارہ کیا جس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ اس خط سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ تحقیق و تبلیغ اسلام کے سلسلے میں موصوف جو عظیم خدمات مغربی زبانوں میں مقالے اور کتابیں لکھ کر اور اپنے خطبات کے ذریعے انجام دے رہے ہیں' ان کے پیش نظر انھیں اپنی زندگی کا مشن چھوڑنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے آپ کی درسی تقاریر کی پیش کش کو غنیمت جانتے ہوئے آپ کے ساتھ دو ہفتوں کی لیکچر سیریز کا پروگرام طے کیا جو بعض محکمانہ رکاوٹوں کو سر کرنے کے بعد' مارچ ۱۹۸۰ء میں ممکن ہوا۔ اس پروگرام کا خاکہ 'جو ڈاکٹر صاحب نے خود ہی تجویز فرمایا' یوں تھا: ۸ مارچ سے ۲۰ مارچ تک' سوائے ایک جمعہ کے جو درمیان میں آیا' ہر روز یونیورسٹی کے غلام محمد گھوٹوی ہال میں عصر اور مغرب کے درمیان اردو زبان میں ایک لیکچر ہوتا اور نماز مغرب سے فارغ ہونے کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ قریباً عشاء تک جاری رہتا۔ جن موضوعات پر لیکچر دیے گئے اور جن حضرات کو صدارت کے لیے مدعو کیا گیا وہ بالترتیب حسب ذیل تھے:

۱۔ تاریخ قرآن مجید

زیر صدارت
جناب ڈاکٹر زیڈ۔ اے ہاشمی،
مشیر تعلیم، سائنس و ثقافت،
حکومت پنجاب، لاہور

۲۔ تاریخ حدیث شریف

زیر صدارت
جناب جسٹس گل محمد،
جج ہائی کورٹ، لاہور

۳۔ تاریخ فقہ

زیر صدارت
جناب ڈاکٹر محمد الطاف علی قریشی،
وائس چانسلر، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی،
ملتان

۴۔ تاریخ اصول فقہ و اجتہاد

زیر صدارت
جناب ڈاکٹر صغیر الحسن معصومی،
ڈین، کلیہ معارف اسلامیہ،
اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

۵۔ قانون بین الممالک

زیر صدارت
جناب ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی،
صدر، شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی،
لاہور

۶۔ دین (عقائد، عبادات، تصوف)

زیر صدارت
جناب قاضی عظیم الدین

خطیب، بہاولپور

۷۔ مملکت اور نظم و نسق

زیر صدارت
جناب سید نذیر علی شاہ
بہاولپور

۸۔ نظام دفاع اور غزوات

زیر صدارت
جناب میجر جنرل محمد اقبال،
جنرل آفیسر کمانڈنگ، ۳۵ ڈویژن،
پاکستان آرمی، بہاولپور

۹۔ نظام تعلیم اور سرپرستی علوم

زیر صدارت
جناب جسٹس عبدالغفور خان لودھی،
سابق جج ہائی کورٹ، لاہور

۱۰۔ نظام تشریع و عدلیہ

زیر صدارت
جناب مولانا تقی عثمانی،
مہتمم، دارالعلوم، کراچی

۱۱۔ نظام مالیہ و تقویم

زیر صدارت
جناب پیر محمد محسن شاہ،
خانپور

۱۲۔ تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ

زیر صدارت

جناب اے۔ کے۔ بروہی،

چیئرمین، قومی ہجرہ کمیٹی،

اسلام آباد

ان خطبات کو سننے کے لیے یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء و طالبات کے علاوہ شہر کے علمائے کرام اور اہل ذوق و طلب خواتین و حضرات کی ایک کثیر تعداد تشریف لاتی جن میں ملک کے دوسرے شہروں سے آنے والے مہمانان گرامی بھی شامل ہوتے۔ چنانچہ سامعین کی کثیر تعداد کے پیش نظر ہمیں یونیورسٹی کے ہال کے باہر بھی نشستوں اور لاؤڈ اسپیکروں کا انتظام کرنا پڑا مارچ کے معتدل اور خوشگوار موسم کی لطافت اور دینی جذبے سے سرشار خواتین و حضرات کے ذوق و شوق نے مجالس خطبات میں ایک علمی جشن بہاراں کا سماں پیدا کر دیا جس کی یاد ہمارے دلوں میں مدتوں باقی رہے گی۔ بہر حال ان مجالس کی رونق اس عالم با عمل کی رہین منت تھی جو ابر نیسان بن کر بارہ دن تک علم کے موتی لٹاتا رہا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی شخصیت علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں لیکن چونکہ یہ خطبات استفادہ عام و خاص کی غرض سے شائع کیے جا رہے ہیں اس لیے موصوف کے علمی شغف کا قدرے تفصیلی ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ۱۶ محرم الحرام ۱۳۲۶ھ (۱۹ فروری ۱۹۰۸ء) کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے اور آپ نے تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل بھی اسی سرزمین میں طے کیے جو اس وقت اہل علم کا مرکز اور علوم اسلامیہ کا گہوارہ تھی۔ خدا جن لوگوں سے کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے ان کے طور طریقے ابتداء ہی سے نرالے ہوتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی طالب علمی کے زمانے میں آپ کے علمی شغف کا یہ عالم تھا کہ نہ تو کبھی غیر حاضر ہوئے اور نہ جماعت میں دیر سے پہنچے۔ آپ نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں لیکن حصول علم کی تشنگی اور تحقیق و جستجو کا ذوق بڑھتا گیا۔ چنانچہ آپ اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے یورپ پہنچے۔ بون یونیورسٹی (جرمنی) سے اسلام کے بین الاقوامی قانون پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی اور سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف لیٹرز کی سند پائی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ عرصے تک جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پروفیسر رہے۔ یورپ جانے کے بعد جرمنی اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں

فرانس کے نیشنل سنٹر آف سائنٹیفک ریسرچ سے تقریباً بیس سال تک وابستہ رہے۔ علاوہ ازیں یورپ اور ایشیا کی کئی یونیورسٹیوں میں آپ کے توسیعی خطبات کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

ڈاکٹر صاحب السنہ شرقیہ یعنی اردو فارسی عربی اور ترکی کے علاوہ انگریزی فرانسیسی جرمن اطالوی وغیرہ زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ چنانچہ مختلف اقوام و ادیان کے تاریخی اور تقابلی مطالعے کی بدولت آپ کے مقالات اور تصانیف کا علمی و تحقیقی مرتبہ نہایت بلند ہے۔ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں بھی آپ کو اس لسانی مہارت سے بڑی مدد ملی۔ آپ نے اہل مغرب کو اسلام کی حقیقی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی سیرت طیبہ سے متعارف کرانے کے لیے مختلف یورپی زبانوں میں سینکڑوں مقالات اور متعدد کتابیں لکھیں۔ فرانسیسی زبان میں آپ کے ترجمہ قرآن مجید اور اسی زبان میں دو جلدوں پر مشتمل سیرت پاک کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں آپ کی کتاب Muhammad Rasul Allah بہت مقبول ہوئی۔ آپ اپنی تقریروں اور تحریروں میں عام مبلغوں کا مناظراتی اور جارحانہ انداز کبھی اختیار نہیں کرتے بلکہ قدیم و جدید ماخذ کے تحقیقی و تقابلی مطالعے کے بعد اپنے نتائج فکر نہایت محتاط اور مثبت طریقے سے پیش کر دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی تحریر و تقریر کا یہ سائنٹیفک انداز اور استدلال و استنباط کا مجتہدانہ اسلوب جدید دور کے سنجیدہ علمی مذاق کو بہت متاثر کرتا ہے۔

یوں تو آپ کی کثیر التعداد تصانیف کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن قرآن و حدیث اور سیرت طیبہ پر آپ کے تحقیقی مقالے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ نے سیرت النبی کے اجتماعی اور سیاسی پہلوؤں پر مختلف زبانوں میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں عہد نبوی کے نظام حکومت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی اور مسلمانوں کے ابتدائی سیاسی نظام پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے مثال کے طور پر:

The Battlefields of the Prophet Muhammad ;

The Muslim Conduct of State ;

The First Written __ Constitution.

الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی عہد نبوی میں نظام حکمرانی وغیرہا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں آپ نے اپنی فاضلانہ تصنیف "قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں" میں

مسلمانوں کے قدیم علم سیر کو قانون بین الممالک (انٹرنیشنل لاء) کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ علم حدیث کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا اہم ترین کارنامہ صحیفہ ہمام بن منبہ کی تحقیق و اشاعت ہے۔ یہ قدیم ترین مجموعہ احادیث ہے جو عہد صحابہ میں مرتب ہوا تھا۔ آپ نے اس نادر و نایاب ذخیرہ حدیث کا ایک مخطوطہ برلن میں دریافت کیا اور اسے جدید اسلوب تدوین کے مطابق مرتب کر کے شائع کرایا۔

خدمت قرآن کے سلسلے میں اپنے پچیس برس قبل تراجم قرآن حکیم کی ببلیو گرافی "القرآن فی کل لسان" مرتب کی تھی جس میں دنیا بھر کی ایک سو بیس زبانوں میں قرآن کے تراجم کا تذکرہ اور بطور نمونہ سورہ فاتحہ کے تراجم درج ہیں۔ پچھلے دنوں آپ نے گور مکھی میں ترجمہ قران کی تلاش کے سلسلے میں لکھا تھا کہ "اگر خریدنا ممکن نہ ہو تو اس کے فوٹو یا مائیکرو فلم بھی کافی ہوں گے اور سارے مصارف پیشگی ادا کرنے کو حاضر ہوں" اس سے آپ کے ذوق و شوق کا پتہ چلتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ تراجم قرآن کے مکمل نسخے جمع کرنے کی مہم ہنوز جاری ہے درحقیقت آپ کی ذات گرامی ان علمائے سلف کی یاد دلاتی ہے جن کی عمر کا ہر لمحہ علمی تحقیق میں گزرتا تھا۔ اب بھی جب کہ آپ کی عمر ستر برس سے تجاوز کر چکی ہے آپ جوانا عزم و ہمت سے تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ ان دنوں آپ امام بخاری کے مشہور مجموعہ احادیث الجامع الصحیح کا مکمل اشاریہ مرتب کر رہے ہیں یہ کام بعض وجوہ کی بنا پر نہایت پیچیدہ اور دشوار ہے لیکن اس کا کافی حصہ مکمل کر چکے ہیں۔

جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے موجودہ مجموعہ خطبات کا تعلق ہے اگرچہ علمی اعتبار سے اس کا مرتبہ آپ کی مستقل تصانیف کے برابر نہیں گردانا جا سکتا تاہم عام افادیت کے لحاظ سے اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ فاضل مقرر نے اپنے تحقیقی مطالعے کی بدولت ہر موضوع پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ دین اسلام اور اس کے اجتماعی نظام کا ایک واضح تصور ذہن پر چھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں تقابل ادیان کا پہلو بھی نمایاں اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے دیگر مذاہب و ملل کے تاریخی پس منظر میں اسلام اور اسلامی ثقافت کی عظمت پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔

فاضل مقرر کے ہر خطبے میں ایسی بہت سی باتیں ملتی ہیں جو بیشتر لوگوں کے لیے انکشاف کی حیثیت رکھتی ہیں اور جابجا ایسے نکات موجود ہیں جن سے غور و فکر کی نئی راہیں کھلتی ہیں مثلاً پہلے

خطبے میں آپ نے مستند حوالوں کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کو صحیح صورت میں جمع کرنے کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں مکمل ہو چکا تھا۔ بعد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے انتہائی احتیاط و اہتمام سے ایک کتاب کی صورت میں مدون کیا۔ یہ جو مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن کو جمع کیا تھا' جس کے باعث وہ جامعہ القرآن کہلائے تو اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام مسلمانوں کو ایک ہی نسخہ قرآن پر جمع اور متفق کیا۔ قرآنی تعلیمات پر اظہار خیال کرتے ہوئے آپ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید کی تبلیغ آیات سے نہ صرف مختلف ادیان اور فلسفوں پر روشنی پڑتی ہے بلکہ انسان کی توجہ بہت سے ایسے علوم کی طرف بھی مبذول ہو جاتی ہے جو جدید تحقیق کے موضوع بنے ہوئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب غیر مسلم فلسفی اور سائنس دان قرآن مجید کا دقت نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی حقانیت پر ایمان لے آتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ حدیث کے ضمن میں آپ نے محکم دلائل سے یہ واضح کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کے متعلق جو احادیث جمع کی گئی ہیں' وہ بھی اس قدر مستند ہیں کہ کسی اور مذہبی پیشوا کے احوال کا تو ذکر ہی کیا' کسی اور مذہبی کتاب یا صحیفہ آسمانی کو بھی استناد کا یہ مقام حاصل نہیں۔ آپ کی تحقیق سے یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں احادیث جمع کرنے کا کام شروع ہو چکا تھا۔ لہٰذا مستشرقین کی یہ رائے غلط اور گمراہ کن ہے کہ تدوین حدیث کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تین سو سال بعد شروع ہوا۔ تاریخ اصول فقہ میں اجتہاد پر ڈاکٹر صاحب کا خطبہ بہت اہم ہے جس میں تفصیل سے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلامی قانون کی تدوین کس طرح عمل میں آئی اور نئے مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں حل کرنے کے لیے کن اصولوں سے کام لیا جاتا رہا۔ اس ضمن میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اجتہادی مسائل میں اجماع کی صورت پیدا کرنے کے لیے آپ کی یہ تجویز قابل غور ہے کہ کسی اسلامی ملک میں فقہاء کا ایک مرکزی ادارہ قائم کیا جائے۔ جس کی شاخیں ہر ملک میں موجود ہوں اور اس طرح مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کے بعد ایک متفق علیہ حل پیش کیا جائے۔ قانون بین الممالک پر ڈاکٹر صاحب کے خطبے سے غیر اقوام کے مقابلے میں مسلمانوں کے قانون اور کردار کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ نے یہ واضح کیا ہے کہ اگرچہ رومن لا سے دنیا کے بہت سے قوانین متاثر ہوئے' لیکن اسلام کے خدائی قانون پر نہ اس کا کوئی اثر ہوا نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ

قانون، رومن لا یا کسی بھی انسانی قانون کے مقابلے میں زیادہ جامع اور فطری ہے۔ قانون بین الممالک کی طرح، اسلامی مملکت اور اس کا نظم و نسق، نظام دفاع اور غزوات النبی صلی اللہ علیہ وسلم، نظام تعلیم اور علوم کی سرپرستی، تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ، غرض سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ تمام پہلو، ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ و تحقیق کے خاص موضوعات ہیں اور ان سب موضوعات پر آپ کے فاضلانہ خطبات ہمارے لیے معلومات افزا اور بصیرت افروز ہیں۔

مذکورہ خطبات میں روایتی فن خطابت کی لفاظی کا کہیں شائبہ تک نہیں کیونکہ جذباتی لب و لہجہ یا مبالغہ آرائی ڈاکٹر صاحب جیسے سنجیدہ عالم اور کہنہ مشق محقق کے شایاں نہیں۔ آپ نے واقعات و حقائق کو نہایت محتاط الفاظ اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کیا ہے۔ سوال و جواب کے سلسلے میں بھی افہام و تفہیم کا وہی دل نشین، شگفتہ اور سلجھا ہوا اسلوب ملتا ہے۔ عموماً آپ جواب دیتے وقت طالب علمانہ انکسار سے یوں فرماتے ہیں "جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے، اس کی روشنی میں یہ عرض کروں گا" یا "اس بارے میں میری ناقص رائے یہ ہے...." کسی اختلافی مسئلے پر سوال پوچھا جاتا تو اپنی بات منوانے کے بجائے فرماتے "یہ میری ذاتی رائے ہے، ضروری نہیں کہ صحیح ہو، آپ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں" ایک جید عالم کا یہ منکسرانہ انداز بیان اور شگفتہ اسلوب سامعین کے لیے روشن مثال ہے۔ چنانچہ ہر لیکچر کے اختتام پر نفس مضمون سے متعلق سوالات و جوابات کو بھی شامل کر دیا گیا ہے جن سے متعدد نکات کی وضاحت میں مدد ملتی ہے۔

ہمارا تجربہ ہے کہ ان خطبات کے سامعین سراپا گوش بن کر ڈاکٹر صاحب کی سلیس اور دلنشین تقریروں کو گھنٹوں سنتے مگر کبھی بار محسوس نہ کرتے بلکہ یوں تصور کرتے جیسے "فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم" آپ کے خطبات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر خلوص و صداقت سے کوئی چیز پیش کی جائے تو سادگی بیان کے باوجود حقائق کے نور سے دل و دماغ منور و مجلا ہوتے جاتے ہیں۔ بقول شاعر۔

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچ آتے ہیں اے واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

(جگر)

ہمیں امید ہے کہ خطبات کے مطالعے کے بعد قارئین کے تاثرات بھی سامعین کے تاثرات سے

کچھ مختلف نہ ہوں گے۔

علمی مجالس میں عموماً خاص اہتمام سے لکھے ہوئے خطبات پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن مذکورہ خطبات قطعی برجستہ و بے ساختہ تھے، حتیٰ کہ فاضل مقرر نے کبھی کوئی کاغذ کا پرزہ تک بھی تحریری اشارے یا حوالے کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ البتہ ہم نے ان خطبات کو دوران ارشاد ٹیپ پر ریکارڈ کر لیا اور جب ارباب ذوق و طلب نے ان کی طباعت و اشاعت پر اصرار کیا، تو یہ صدا بند خطبات ٹیپ سے بڑی جانفشانی کے ساتھ تحریر میں منتقل کیے گئے۔ بعد ازاں صدر شعبہ اردو کی نگرانی میں اردو اور اسلامیات کے اساتذہ نے مل کر خطبات کی تدوین و ترتیب کی خدمت انجام دی۔ طباعت کے مختلف مراحل کی نگرانی صدر شعبہ عربی نے کی۔ یہ سب اصحاب شکریے کے مستحق ہیں۔ خطبات کے متن میں کسی بنیادی تبدیلی کے بغیر بعض جزئی اور لفظی ترمیمیں کی گئیں جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ جہاں کہیں الفاظ و فقرات کی نشست و ترتیب، تقریری اور تحریری اسلوب میں فرق کی وجہ سے، اصل مقام سے ہٹ گئی ہو، وہاں صحیح ترتیب قائم کر دی جائے، بہرحال اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ خطبات کے متن میں کسی قسم کی معنوی تحریف راہ نہ پائے نیز یہ کہ تقریر کا لہجہ اور زبان و بیان کی شستگی اور سادگی بھی برقرار رہے۔

مغرب کی دانش گاہوں اور تحقیقی اداروں میں نامور علماء و فضلاء کے توسیعی لیکچروں کی روایت بہت عام ہے کیونکہ وہاں ایسے ماہرین اور محققین کی کوئی کمی نہیں جن کے خطبات تحقیقی مطالعے اور ذاتی مشاہدے پر مبنی ہوں۔ موجودہ صدی میں برصغیر پاک و ہند کی یونیورسٹیوں میں بھی توسیعی اور یادگاری خطبات کی روایت شروع تو ہوئی ہے لیکن علمی تخصص اور تحقیق کے میدان میں ہم ابھی بہت پیچھے ہیں۔ اس لیے ہمارے یہاں مقبول عام علمی خطبات کی روشن مثالیں بہت کم ملتی ہیں جن خطبات کو علمی حلقوں میں اولاً شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، ان کا تعلق بھی تعلیمی اداروں سے نہیں بلکہ ایک غیر معروف رفاہی انجمن "ساؤتھ انڈین مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی، مدراس" سے تھا۔ تقریباً نصف صدی قبل اس انجمن کے زیر اہتمام علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر اور علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ سے متعلق اپنے گرانقدر خطبات پیش کیے تھے۔ خطبات کا یہ سلسلہ "خطبات مدراس" کے نام سے مشہور ہوا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ علمی و تحقیقی معیار کو برقرار رکھنے کے لیے صف اول کے علماء و محققین میسر نہ آسکے، یا ممکن ہے کوئی اور مجبوری ہو، چنانچہ یہ

سلسلہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ خطبات مدراس کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہم نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے خطبات کو "خطبات بہاولپور" کے نام سے موسوم کیا ہے آج اسلامی علوم کے محقق اور مبلغ کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کو جو بلند مقام حاصل ہے، تحقیقاتی کام کرنے والے حضرات اس سے بخوبی واقف ہیں۔ بلحاظ موضوع و مواد اور بہ اعتبار افادہ عام، ان خطبات کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، اس کے پیش نظر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطبات فکر اسلامی کو موثر طور پر منظر عام پر لائے ہیں۔

ہمارے لیے فخر و انبساط کا مقام ہے کہ پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے مبارک موقعے پر پاکستان کی پہلی اسلامی یونیورسٹی قوم و ملت کے حضور یہ ارمغان علمی پیش کر رہی ہے۔

عبدالقیوم قریشی

۲۰ مارچ ۱۹۸۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ نمبرا

تاریخ قرآن مجید

محترم صدر، محترم وائس چانسلر، برادران و خواہران محترم!

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ!

ا۔ قرآن مجید ایک ایسا موضوع ہے جس کے بہت سے پہلو ہیں اور ایک گھنٹے کے مختصر وقت میں یہ ممکن نہیں کہ ان سارے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا سکے۔ اس لیے صرف اس کے ایک پہلو یعنی تدوین قرآن مجید کی تاریخ کو چند الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

۲۔ مسند احمد بن حنبلؒ میں ایک حدیث ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: "اللہ نے حضرت آدم سے لے کر مجھ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے، جن میں سے تین سو پندرہ صاحب کتاب تھے"۔ تین سو پندرہ صاحب کتاب نبیوں کے نام نہ تو قرآن مجید میں ہیں اور نہ احادیث میں ان کا ذکر ہے، لہٰذا ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ان کی تفصیل معلوم کر سکیں۔ صرف چند اشارے ملتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل ہوئے تھے۔ لیکن یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس زبان میں تھے۔ چہ جائیکہ ان کے مندرجات کا علم ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام بھی پیغمبر تھے ان کے متعلق بعض روایات میں ذکر ملتا ہے کہ ان پر بھی چند کتابیں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن ان کا بھی دنیا میں اب کوئی وجود نہیں۔ قدیم ترین نبی، جن کی طرف منسوب کتاب کا کچھ حصہ ابھی حال ہی میں ہم تک پہنچا ہے، حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ غالباً" آپ نے سنا ہو گا کہ فلسطین میں بحر مردار کے پاس بعض غاروں میں کچھ مخطوطے ملے ہیں۔ ان مخطوطوں میں سے ایک کتاب حضرت اخنوخ یا انوخ یعنی حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ حال ہی میں اس کتاب کے کچھ ترجمے انگریزی زبان میں شائع ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس بات کا کوئی حتمی و قطعی ثبوت موجود نہیں، لیکن اب تک کی تحقیق کے مطابق ہم اسے قدیم ترین نبی کی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں آخری نبی کی بشارت بھی ہے، جس کو بعد میں عہد جدید (انجیل) کے باب "مکتوب یہودا" نے بھی نقل کیا ہے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق بھی ہمیں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ عراق میں "صابیہ" کے نام

سے ایک چھوٹا سا گروہ پایا جاتا ہے، جس کا ایک مستقل دین ہے۔ ان کا یہ دعوی ہے کہ "ہم حضرت نوح علیہ السلام کی کتاب اور ان کے دین پر عمل پیرا ہیں" ان کا کہنا ہے کہ "ایک زمانے میں حضرت نوح علیہ السلام کی پوری کتاب ہمارے پاس موجود تھی لیکن امتداد زمانہ کے سبب سے اب وہ ناپید ہے۔ اس کے مندرجات صرف چار پانچ سطروں میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ جن میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے" اس کے بعد ایک اور نبی آئے ہیں جن کی کتاب کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ "صحف ابراہیم و موسیٰ"۔ دو مرتبہ قرآن مجید (۵۳: ۳۷ تا ۴۱ اور ۸۷: ۱۹) میں اس کا ذکر آیا ہے۔ ان کی کتاب کے مندرجات یہودی اور عیسائی ادبیات میں تو نہیں، قرآن میں چند سطروں کی حد تک محفوظ ملتے ہیں۔ اسی طرح بعض ایسے انسان بھی ہیں جن کو صراحت کے ساتھ نبی تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان کی نبوت کے امکان کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک شخصیت "زردشت" کی ہے۔ پارسی انھیں اپنا نبی مانتے ہیں۔ ان کی نبوت کا امکان اس بناء پر بھی ہے کہ قرآن مجید میں مجوس قوم کا ذکر آیا ہے۔ مجوسیوں کا مذہب زردشت کی لائی ہوئی کتاب "آوستا" پر مبنی ہے۔ آوستا کے متعلق ہم تک کچھ معلومات پہنچی ہیں۔ جب ہم اس کا قرآن مجید سے موازنہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کس کو کیا برتری حاصل ہے؟ زردشت کی کتاب اس وقت کی "زند" زبان میں تھی۔ کچھ عرصے بعد ایران پر دوسری قوموں کا غلبہ ہوا۔ اور نئے فاتحین کی زبان وہاں رائج ہوئی۔ پرانی زبان متروک ہوتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھر میں مٹھی بھر عالم اور متخصصین کے سوا زند زبان جاننے والا کوئی نہ رہا۔ اس لیے زردشتی مذہب کے علماء نے نئی زبان پا زند میں اس کتاب کا خلاصہ اور شرح لکھی۔ آج کل ہمارے پاس اس نسخے کا صرف دسواں حصہ موجود ہے۔ باقی غائب ہو چکا ہے۔ اس دسویں حصے میں کچھ چیزیں عبادات کے متعلق ہیں، اور کچھ دیگر احکام ہیں۔ بہرحال دنیا کی ایک قدیم دینی کتاب کو ہم آوستا کے نام سے جانتے ہیں لیکن وہ مکمل حالت میں ہم تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ یہاں ایک چیز کا میں اشارۃً ذکر کروں گا۔ آوستا میں دوسری باتوں کے علاوہ زردشت کا یہ بیان ملتا ہے: "میں نے دین کو مکمل نہیں کیا۔ میرے بعد ایک اور نبی آئے گا جو اس کی تکمیل کرے گا۔ اور اس کا نام رحمتہ للعالمین ہو گا" یعنی ساری کائنات کے لیے باعث رحمت۔

۳۔ ہندوستان میں بھی کچھ دینی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے الہام شدہ کتابیں ہیں۔ ان مقدس کتابوں میں وید، پران، اپنشد اور دوسری کتابیں شامل ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب کتابیں ایک ہی نبی پر نازل ہوئی ہیں۔ ممکن ہے متعدد نبیوں پر نازل ہوئی ہوں، بشرطیکہ وہ نبی ہوں، ان میں بھی خصوصاً "پران" نامی کتابوں میں کچھ دلچسپ اشارے ملتے ہیں "پران" وہی لفظ ہے جو

اردو میں پرانا یعنی قدیم ہے۔ اس کی طرف ہمیں قرآن مجید میں ایک عجیب و غریب اشارہ ملتا ہے: وانہ لفی زبر الاولین (۲۶:۱۹۶) (اس چیز کا پرانے لوگوں کی کتابوں میں ذکر ہے)۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا پران سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ بہرحال دس پران ہیں' ان میں سے ایک میں یہ ذکر آیا ہے کہ "آخری زمانے میں ایک شخص ریگستان کے علاقے میں پیدا ہو گا۔ اس کی ماں کا نام 'قابل اعتماد' اور باپ کا نام 'اللہ کا غلام' ہو گا۔ وہ اپنے وطن سے شمال کی طرف جا کر بسنے پر مجبور ہو گا۔ اور پھر وہ اپنے وطن کو متعدد بار دس ہزار (۱) آدمیوں کی مدد سے فتح کرے گا۔ جنگ میں اس کی رتھ کو اونٹ کھینچیں گے۔ اور وہ اونٹ اس قدر تیز رفتار ہوں گے کہ آسمان تک پہنچ جائیں گے" (۲)۔ اس کتاب میں جو مذکورہ الفاظ ہمیں ملتے ہیں ان سے ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ مستنبط کیا جا سکے۔

۴۔ ان پرانی کتابوں کے علاوہ' وہ کتابیں ہیں جو مسلمانوں میں بالخصوص معروف ہیں' یعنی توریت' زبور اور انجیل۔ قبل اس کے کہ قرآن مجید کا آپ سے ذکر کروں بطور تمہید ان کا بھی چند الفاظ میں ذکر کروں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو کتاب نازل ہوئی وہ "توریت" کہی جاتی ہے۔ لیکن دراصل توریت اس کتاب کا ایک جزء ہے۔ توریت کے معنی ہیں "قانون"۔ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف پانچ کتابیں منسوب کرتے ہیں۔ پہلی کتاب "کتاب پیدائش" کہلاتی ہے۔ دوسری کتاب "کتاب خروج" جو مصر سے نکلنے کے حالات پر مشتمل ہے۔ تیسری کتاب "قانون" ہے۔ چوتھی کتاب کا نام "اعداد و شمار" ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا تھا کہ یہودیوں کی قبیلے وار مردم شماری کی جائے۔ پانچویں کتاب "تثنیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ پرانی چیزوں کو دوبارہ دہرایا جائے۔ ان کو Up to date کیا جائے یا ان کی تشریح کی جائے۔ شروع شروع میں یہودیوں کے ہاں یہ پانچویں کتاب (تثنیہ) نہیں پائی جاتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوئی چھ سو سال بعد ایک جنگ کے زمانے میں ایک شخص ملک کے اس وقت کے یہودی بادشاہ کے پاس ایک کتاب لایا اور کہا کہ مجھے یہ ایک کتاب ایک غار سے ملی ہے۔ معلوم نہیں کس کی ہے۔ مگر اس میں دینی احکام نظر آتے ہیں۔ بادشاہ نے اپنے زمانے کی ایک نبیہ عورت کے پاس اس نسخے کو بھیجا' یہودیوں کے ہاں عورتیں بھی نبی رہی ہیں (یا کم از کم وہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں) اس نبیہ نے جس کا نام ہلدا HULDA بیان کیا جاتا ہے' یہ کہلا بھیجا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی کتاب ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چھ سو سال بعد اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

(۱) یہ ایک عدد ہے جس کا اردو میں مترادف نہیں۔ بہرحال "متعدد بار دس ہزار" کا اشارہ شاید حجۃ الوداع کی طرف ہو' نہ کہ فتح مکہ کی طرف۔ (۲) یہ شاید معراج مبارک کی طرف اشارہ ہے۔

طرف منسوب کیا جانے لگا۔ اس کتاب کو "شنیہ" کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس میں پہلی چار کتابوں کے احکام میں سے کچھ احکام خلاصے کے طور پر اور کچھ اضافے کے ساتھ دہرائے گئے ہیں۔ بہرحال ان پانچ کتابوں کی سرگزشت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد آنے والے انبیاء کے زمانے میں یہودیوں نے فلسطین کا کچھ حصہ فتح کیا۔ اور وہاں حکومت شروع کی تو کچھ عرصے بعد عراق کے حکمران بخت نصر (نبوکد نوصور) نے فلسطین پر حملہ کیا۔ چونکہ اس کا دین یہودیوں کے دین سے مختلف تھا اس لیے اس نے صرف ملک فتح کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ ان دشمنوں کے دین کو بھی دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لیے توریت کے تمام قلمی نسخوں کو جمع کر کے آگ لگا دی۔ حتیٰ کہ توریت کا ایک نسخہ بھی باقی نہ رہا۔ یہودی مورخوں کے مطابق اس کے ایک سو سال بعد ان کے ایک نبی "حضرت عزرا" ESDRA نے (جو شاید حضرت عزیر (Uzair) علیہ السلام ہوں) یہ کہا کہ مجھے توریت زبانی یاد ہے۔ انھوں نے توریت املا کروائی۔ توریت کے اس اعادے کے کچھ عرصے بعد روما کے ایک حکمران نے فلسطین پر حملہ کیا۔ سپہ سالار کا نام انٹیوکس Antiochus تھا اس نے بھی وہی کام کیا جو بخت نصر نے کیا تھا۔ یعنی یہودیوں کی کتابیں جمع کر کے جلا دیں۔ اس طرح دوسری مرتبہ وہ نابود کر دی گئیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایک اور رومی حکمران نے ٹیطس (Titus) نامی کمانڈر کی ماتحتی میں ایک فوج بھیجی اور اس نے تیسری مرتبہ، فلسطین میں دستیاب شدہ یہودیوں کی تمام کتابوں کو جلا دیا۔ اب ہمیں توریت کے نام سے جو کتاب ملتی ہے وہ بائبل کے حصہ عہد نامہ عتیق (Old Testament) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب پانچ کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں تین چار مرتبہ کی آتش زدگی کے بعد اعادہ شدہ شکلیں ہیں۔ ان کا اعادہ کس طرح ہوا اور کس نے ان کا اعادہ کیا، اس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔ البتہ جو شخص ان کتابوں کو پڑھتا ہے تو اسے دو چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بعض اوقات اسے ایسی چیزیں نظر آتی ہیں، جو کھٹکتی ہیں اور اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ اصل میں نہ ہوں گی بلکہ بعد کا اضافہ ہیں۔ بعض مقامات پر کمی محسوس ہوتی ہے اور تشنگی باقی رہتی ہے۔ چنانچہ بعض چیزیں جو زیادہ ہو گئی ہیں وہ اس طرح کی ہیں کہ جو کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اس میں وہ باتیں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد پیش آئیں۔ اگر آپ کتاب "شنیہ" پڑھیں تو اس کے آخری باب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیماری، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تدفین اور اس کے بعد کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حصہ بعد کا اضافہ ہے۔ مگر یہ تو ایسی باتیں ہیں جنھیں ہر پڑھنے والا فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں دیگر کتنی چیزوں کا اضافہ ہوا ہے جو غیر محسوس ہوں۔ اسی طرح جن چیزوں کی کمی نظر آتی ہے یا جن کا وہاں

ہونا ضروری تھا مگر نہیں ہیں وہ ایسی ہیں کہ کم از کم بیس مرتبہ اس طرح کے الفاظ ملتے ہیں کہ اس حکم کی تفصیلیں فلاں باب میں ملیں گی۔ جن ابواب کے حوالے دیے گئے ہیں ان میں سے ایک باب کا نام "خدا کی جنگیں" اور ایک اور باب کا نام "مخلص اور نیک لوگوں کی کتاب" ہے۔ اور وہ باب سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ یہ کچھ باتیں توریت کے متعلق تھیں جو میں نے آپ سے بیان کیں۔ توریت ضخیم صورت میں ہمارے پاس موجود ہے اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

۵۔ توریت کے بعد مسلمانوں میں عام طور پر زبور کا نام لیا جاتا ہے اور ہمارا تصور یہ رہا ہے کہ یہ بھی توریت اور انجیل ہی کی طرح ایک مستقل کتاب ہے۔ لیکن عہد نامہ عتیق (Old Testament) میں جو چیز حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اور جس کو وہ سام Psalm یعنی زبور کے نام سے موسوم کرتے ہیں' اس میں صرف خدا کی حمد و ثناء کی نظمیں ہیں' کوئی نیا حکم نہیں ہے۔ ہمارا یہ تصور ہے کہ ہر رسول یا نبی ایک نئی شریعت لاتا ہے لیکن اس کتاب میں ایسی کوئی نئی شریعت نہیں ملتی۔ تاہم جس طرح پرانی کتابوں میں (کتاب ادریس سے لے کر ایران کے آوستا تک) ایک آخری نبی علیہ السلام کی بشارت ملتی ہے اس طرح زبور میں بھی ایسی چیزیں ملتی ہیں۔ نیز جو سرگزشت توریت کی رہی' وہی زبور کی بھی رہی ہے۔ اس لیے میں اس کو چھوڑ کر اب انجیل کا ذکر کرتا ہوں۔

۶۔ انجیل کے متعلق مسلمانوں کا تصور عام طور پر یہ ہے کہ وہ ایک مستقل کتاب تھی جو خدا کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ لیکن ہمارے پاس عیسائیوں کے توسط سے جو انجیل پہنچی ہے' وہ ایک نہیں بلکہ چار انجیلیں ہیں' جو یہ ہیں: (۱) متی (MATTHEW)' (۲) مرقس (MARK)' (۳) لوقا (LUKE) (۴) یوحنا (John) ۔ ہر انجیل ایک الگ آدمی کی طرف منسوب ہے۔ یہ چار کتابیں بھی ساری انجیلیں نہیں ہیں' بلکہ خود عیسائی مورخوں کے مطابق ستر سے زیادہ انجیلیں پائی جاتی تھیں' جن میں سے ان چار کو قابل اعتماد اور باقی کو مشتبہ قرار دیا گیا ہے۔ ان کو پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے الہام یا وحی پر مشتمل نہیں بلکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ چار شخصوں نے یکے بعد دیگرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری لکھی اور ہر ایک نے اس کو انجیل کا نام دیا۔ لفظ انجیل کے معنی ہیں "خوشخبری" اور اس کی وجہ تسمیہ غالباً" یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو حالات زندگی انجیل میں ملتے ہیں' ان کے مطابق عام طور پر وہ کسی گاؤں میں جایا کرتے تھے اور وہاں کے لوگوں سے کہتے تھے کہ میں بشارت دیتا ہوں کہ خدا کی حکمرانی اب جلد آنے والی ہے۔ شاید اس اساس پر کتاب کا نام بھی یہی ہو گیا۔ لیکن اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کوئی کتاب نازل ہوئی تھی تو حضرت عیسیٰ

علیہ السلام نے اسے لکھوایا نہیں اس لیے آج دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ اب جو انجیلیں موجود ہیں‘ ان کی حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے مختلف زمانوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں لکھیں اور ان سوانح عمریوں کو ہر مؤلف نے انجیل کا نام دیا۔ ان میں سے چار کو کلیسا نے قابل اعتماد قرار دیا ہے اور باقی کو رد کیا ہے۔ ان چار انجیلوں کے انتخاب کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں کہ ان کو کس نے انتخاب کیا‘ کب انتخاب کیا‘ اور کن معیارات کو سامنے رکھ کر انتخاب کیا؟ فرانس کا ایک مشہور مورخ "والٹیر" VOLTAIRE کے نام سے گزرا ہے۔ اس نے اپنی ایک کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کلیسا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ جو ستر سے زائد انجیلیں ہیں اور ان کے مندرجات میں اختلافات بھی ہیں‘ ان میں سے صرف ان انجیلوں کا انتخاب کیا جائے جو قابل اعتماد ہوں۔ انتخاب کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ کلیسا میں ساری انجیلوں کو عبادت گاہ کے مقام کے پاس ایک میز پر جمع کیا گیا۔ پھر اس میز کو ہلایا گیا۔ جو کتابیں نیچے گر گئیں ان کو ناقابل اعتماد‘ اور ہلانے کے باوجود جو کتابیں میز پر باقی رہیں‘ ان کو قابل اعتماد قرار دیا گیا۔ یہ والٹیر کا بیان ہے۔ اس نے کس بنیاد پر یہ بات کہی ہے‘ یہ بتانا میرے لیے دشوار ہے۔ ظاہر ہے عیسائی لوگ اس کی تردید کرتے ہیں اور ایسی بات کہنے والا ان کے نزدیک جھوٹا اور بدمعاش تھا۔ بہرحال اس بات پر سب متفق ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لکھوائی ہوئی کتاب دنیا میں موجود نہیں ہے۔ جو چیز اس وقت ہمارے پاس انجیل کے نام سے ملتی ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ انھیں ہم "سیرت حضرت عیسیٰ علیہ السلام" کہہ سکتے ہیں‘ بعینہٖ جس طرح مسلمانوں کے ہاں سیرت نبوی کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔

۷۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ پر نازل شدہ احکام کو لکھوایا کیوں نہیں تھا؟ میرے ذہن میں جو جواب آتا ہے (ممکن ہے غلط ہو) وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ان سے پہلے کے نبی‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو توریت نازل ہوئی تھی‘ اس کی کیا درگت بنی۔ دشمن حملہ کرتے ہیں‘ اس کی توہین کرتے ہیں‘ اسے جلا دیتے ہیں اور نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ غالباً انھوں نے یہ سوچا کہ کہیں میری کتاب کا بھی وہی حشر نہ ہو۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اسے لکھوایا ہی نہ جائے۔ اس طرح یہ کتاب لوگوں کے ذہنوں میں رہے گی۔ عبادت گزار نیک لوگ اسے ادب سے یاد رکھیں گے اور اپنے بعد کی نسلوں تک پہنچائیں گے۔ شاید یہی تصور ہو جس کی بناء پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی انجیل کو نہ لکھوایا۔

۸۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خدا چونکہ ازلی اور ابدی علم کا مالک ہے اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ حضرت آدم کو ایک حکم دے اور بعد کے نبی کو کوئی دوسرا اس کے بالکل برعکس حکم دے۔ البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے

کہ ایک نبی کو کچھ احکام اور بعد کے نبی کو کچھ اور احکام اضافے کے ساتھ دیے جائیں۔ فرض کیجیے کہ حضرت آدم علیہ السلام پر نازل شدہ کتابیں آج دنیا میں صحیح حالت میں موجود ہوتیں تو (میرا تصور یہ ہے کہ) خدا کو کوئی نئی کتاب بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ وہی کتاب آج بھی کار آمد ہوتی۔ لیکن جس طرح ابھی ہم نے اس مختصر مطالعے میں دیکھا کہ پرانے انبیاء کی کوئی کتاب بھی' بلا استثناء ہم تک 'من و عن' کامل صورت میں نہیں پہنچی ہے اس لیے خدا نے چاہا کہ ایک مرتبہ انسان کو ایسی مکمل کتاب دی جائے جس میں تمام احکام ہوں اور اس کی مشیت یہ بھی ہوئی کہ یہ کتاب محفوظ رہے۔ وہ کتاب قرآن مجید ہے۔

۹۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ قرآن مجید کس طرح محفوظ حالت میں ہم تک پہنچا ہے۔ اولاً میں اس کی زبان کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ یہ عربی زبان میں ہے۔ اس آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیوں ہوا؟ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زبانیں رفتہ رفتہ بدل جاتی ہیں۔ خود اردو زبان کو لیجیے۔ اب سے پانچ سو سال پہلے کی کتاب مشکل سے ہمیں سمجھ میں آتی ہے۔ دنیا کی ساری زبانوں کا یہی حال ہے انگریزی میں پانچ سو سال پہلے کے مؤلف "چاسیر" (Chaucer) کی کتاب کو آج کل لندن کا کوئی شخص' یونیورسٹی کے فاضل پروفیسروں کے سوا' سمجھ نہیں سکتا۔ یہی حال دوسری قدیم و جدید زبانوں کا ہے۔ یعنی وہ بدل جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ اگر خدا کا آخری پیغام بھی کسی ایسی ہی تبدیل ہونے والی زبان میں آتا تو خدا کی رحمت کا اقتضاء یہ ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے لوگوں کو پھر ایک نئی کتاب دے تاکہ ہم اسے سمجھ سکیں کیونکہ گزشتہ صدیوں کی کتاب اب تک ناقابل فہم ہو چکی ہوتی۔ دنیا کی زبانوں میں سے اگر کسی زبان کو یہ استثنا ہے کہ وہ نہیں بدلتی تو وہ عربی زبان ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم عصر عربی' یعنی قرآن مجید اور حدیث شریف میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اور جو عربی آج ریڈیو پر آپ سنتے ہیں یا جو آج عربی اخباروں میں پڑھتے ہیں' ان دونوں میں بہ لحاظ مفہوم الفاظ' گرامر (صرف نحو)' ہجے اور تلفظ' کوئی فرق نہیں ہے۔ آج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور میں ایک عرب کی حیثیت سے اپنی موجودہ عربی میں آپ سے گفتگو کروں تو آپ اس کا ہر لفظ سمجھیں گے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے جواب مرحمت فرمائیں تو آپ کا ہر لفظ میں سمجھ سکوں گا۔ کیونکہ ان دونوں زبانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں اس سے یہ استنباط کرتا ہوں کہ آخری نبی پر بھیجی ہوئی آخری کتاب ایسی زبان میں ہونی چاہیے جو غیر تبدل پذیر ہو' لہٰذا عربی کا انتخاب کیا گیا'۔ عرض کرنا یہ ہے کہ اس عربی زبان میں دیگر خصوصیات مثلاً فصاحت' بلاغت' ترنم وغیرہ کے علاوہ ایک خصوصیت ایسی ہے جس کا ہم سب مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ عربی زبان غیر تبدل پذیر ہے اور اس کے لیے ہمیں عربوں کا

بھی شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے مختلف علاقوں کی بولیوں کو اپنی زبان نہیں بنایا۔ بلکہ اپنی علمی اور تحریری زبان وہی رکھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔

۱۰۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے آپ سب واقف ہیں کہ وہ بیک وقت نازل نہیں ہوا۔ جیسا کہ توریت کے متعلق یہودیوں کا بیان کہ اسے خدا نے تختیوں پر لکھ کر ایک ہی مرتبہ دے دیا۔ اس کے برخلاف قرآن مجید تیئس سال تک جستہ جستہ ' (نجماً" نجماً") نازل ہوتا رہا اور یہ ان مختلف زمانوں میں نازل شدہ اجزاء کا مجموعہ ہے جو قرآن مجید کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ اس کا آغاز دسمبر سنہ ۶۰۹ء میں ہوا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں معتکف تھے۔ وہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام آتے ہیں۔ اور آپ تک خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ وہ پیغام بہت ہی اثر انگیز ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک امی ہیں۔ انھیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ اس امی شخص کو جو پہلا حکم دیا گیا وہ ہے "اقراء" یعنی پڑھ اور پھر قلم کی تعریف کی گئی ہے۔ پڑھنے کا حکم دے کر پھر قلم کی تعریف کیوں کی جاتی ہے؟ اس لیے کہ قلم ہی کے ذریعے سے خدا انسان کو وہ چیز بتاتا ہے جو وہ نہیں جانتا یا دوسرے الفاظ میں قلم ہی وہ چیز ہے جو انسانی تمدن اور انسانی تہذیب کی حفاظت گاہ (Depository) ہے۔ اس کا وجود اس لیے ہے کہ پرانی چیزوں کو محفوظ رکھا جاسکے۔ آنے والے اس میں نئی چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا راز یہی ہے اور اسی وجہ سے انسان کو دیگر حیوانات پر تفوق حاصل ہے ورنہ آپ غور کریں گے کہ کوا آج سے بیس لاکھ سال پہلے جس طرح گھونسلا بناتا تھا آج بھی اسی طرح بناتا ہے۔ اس نے کوئی ترقی نہیں کی۔ لیکن انسان وہ جانور ہے جو چاند تک پہنچ چکا ہے۔ اس نے اتنی ترقی کی کہ آج وہ ساری کائنات پر حکومت کر رہا ہے۔ یہ ساری ترقیاں انسان نے اس لیے کی ہیں کہ اس کو اپنے سے پہلے کے لوگوں کے تجربات کا جو علم حاصل ہوا اس کو محفوظ رکھا اور اس میں اس نے اپنے ذاتی تجربوں سے روز افزوں اضافہ کیا اور اس سے استفادہ کرتا رہا۔ اور یہ سب قلم کی بدولت ممکن ہوا۔ آیت 'علم بالقلم' علم الانسان مالم یعلم' (۹۶:۵) میں اسی حقیقت کی طرف قرآن مجید نے بہت ہی بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے۔ جب "سورہ اقراء" (یعنی سورۃ العلق) کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار کو چھوڑ کر گھر واپس آئے اور اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتایا کہ مجھے آج یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ وہ شاید کسی دن مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تسلی دی اور کہا کہ خدا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ضائع نہیں کرے گا۔ ورقہ بن نوفل میرا چچازاد بھائی ہے جو ان معاملات (یعنی فرشتے' وحی وغیرہ) سے واقف ہے۔ کل صبح جا کر ہم اس سے گفتگو کریں گے' وہ آپ کو بتائے گا۔ میں ان چیزوں سے واقف نہیں ہوں

لیکن مجھے یقین ہے کہ شیطان کبھی آپ کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔ ایک روایت کے مطابق صبح کو وہ آپ کو اپنے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے ان کے عزیز دوست ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو یہ قصہ سنایا اور کہا کہ انھیں اپنے ساتھ لے جا کر ورقہ سے ملاؤ۔ ورقہ بن نوفل بہت بوڑھے تھے۔ ان کی بصارت زائل ہو چکی تھی، مذہباً نصرانی تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے اور یہ قصہ سنایا تو ورقہ نے بے ساختہ یہ الفاظ کہے: "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو چیزیں تم نے ابھی بیان کی ہیں۔ اگر وہ صحیح ہیں تو یہ ناموس موسیٰ علیہ السلام سے مشابہ ہیں"۔ "ناموس" کا لفظ اردو میں عام طور پر عزت کے لیے مستعمل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ مفہوم نہیں ہو سکتا۔ بعض مفسرین ناموس کے معنی "قابل اعتماد" لکھتے ہیں۔ وہ بھی یہاں موزوں نہیں ہے۔ بعض لکھتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ناموس کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلامی ادبیات میں وہ "روح الامین" ہیں مگر یہ معنی بھی یہاں کام نہیں دیتے۔ میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ "ناموس" اصل میں ایک اجنبی لفظ ہے، جو معرب ہو کر عربی زبان میں مستعمل ہوا۔ یہ یونانی زبان کا لفظ "نوموس" (Nomos) ہے۔ یونانی زبان میں لفظ توریت کو نوموس یعنی قانون کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ورقہ بن نوفل کا بیان ہے کہ یہ چیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے مشابہ ہے۔ اور یہی معنی زیادہ قرین قیاس نظر آتے ہیں۔

۱۱۔ قرآن مجید کی تبلیغ و اشاعت کے متعلق قدیم ترین ذکر ابن اسحٰق کی کتاب المغازی میں ملتا ہے۔ یہ کتاب ضائع ہو گئی تھی لیکن اس کے بعض ٹکڑے حال ہی میں ملے ہیں اور حکومت مراکش نے ان کو شائع بھی کیا ہے۔ اس میں ڈیڑھ سطر کی ایک بہت دلچسپ روایت ہے، جسے ابن ہشام نے اپنی سیرۃ النبی میں معلوم نہیں کس بنا پر یا سہواً چھوڑ دیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: "جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کی کوئی عبارت نازل ہوتی، تو آپ سب سے پہلے اسے مردوں کی جماعت میں تلاوت فرماتے پھر اس کے بعد اسی عبارت کو عورتوں کی خصوصی محفل میں بھی سناتے"۔ اسلامی تاریخ میں یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کی تعلیم سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی۔ جتنی مردوں کی تعلیم سے۔ یہ قدیم ترین اشارہ ہے جو قرآن مجید کی تبلیغ کے متعلق ملتا ہے۔ اس کے بعد کیا پیش آیا، یہ کہنا مشکل ہے لیکن بالکل ابتدائی زمانے ہی سے ہمیں ایک نئی چیز کا پتہ چلتا ہے، وہ یہ کہ قرآن مجید کو لکھوایا جائے اور غالباً حفظ کرانا بھی اسی ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے، جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پہلی وحی کے موقع پر قرآن مجید کی سورہ اقرا کی پہلی پانچ آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائیں تو ایک

حدیث کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دو کام اور کیے۔ ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو استنجاء اور وضو کرنا سکھایا کہ نماز کے لیے کس طرح اپنے آپ کو جسمانی طور پر پاک کریں۔ دوسرے یہ کہ نماز پڑھنے کا طریقہ بھی بتایا۔ خود جبرئیل علیہ السلام امام بنے اور پیغمبر مقتدی کی حیثیت سے پیچھے کھڑے دیکھتے رہے کہ پہلے کھڑے ہوں، پھر رکوع میں جائیں، پھر سجدہ کریں وغیرہ اور ساتھ ساتھ خود بھی وہی کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ نماز میں قرآن مجید کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔ لہٰذا ابتدائی زمانے ہی سے جب لوگ مسلمان ہونے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم دیا ہو گا کہ قرآن مجید کو حفظ بھی کرو اور روزانہ جتنی نمازیں پڑھنی ہیں، ان نمازوں میں ان کا اعادہ بھی کرتے رہو۔ گویا اس وقت ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید حفظ کرنا اور اس کو لکھنا۔ آدمی کو کسی نئی چیز کے ازبر کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی تحریری عبارت ہو تو اس کو بار بار پڑھتا ہے، بالآخر وہ حفظ ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن کو حفظ کرنا اور لکھنا دونوں ایک ہی زمانے کی چیزیں ہیں۔ ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ اپنے صحابہ میں سے کسی ایسے شخص کو، جسے لکھنا پڑھنا آتا ہوتا، یاد فرماتے اور اس کو املا کراتے تھے۔ اہم بات یہ بیان ہوئی ہے کہ لکھنے کے بعد اس سے کہتے کہ "جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر سناؤ" تا کہ اگر کاتب نے کوئی غلطی کی ہو تو اس کی اصلاح کرا سکیں۔ یہ قرآن مجید کی تدوین کا آغاز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ لکھوانے کے بعد اپنے صحابہ کو حکم دیتے کہ اسے ازبر کر لو اور روزانہ دو وقت نمازوں میں پڑھو۔ اس وقت دو نمازیں تھیں۔ معراج کے بعد پانچ نمازیں ہوئیں تو دو کے بجائے پانچ مرتبہ اس کو لوگ نماز میں دہرانے لگے۔ اس کا ایک عملی فائدہ یہ ہے کہ اگر آدمی کا حافظہ اچھا نہ ہو اور سال بھر میں مثلاً صرف عیدالاضحیٰ اور عید الفطر کے دن قرآن مجید کو حافظے کی مدد سے پڑھے تو ممکن ہے کہ اس کو بھول جائے لیکن اگر کوئی آدمی روزانہ پانچ مرتبہ دہراتا رہے تو ظاہر ہے قرآن مجید اس کے حافظے میں رہے گا اور وہ اسے نہیں بھولے گا۔

۱۲۔ الغرض قرآن مجید کو لکھنے اور اسے حفظ کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اس سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال ہمیں نظر نہیں آتی۔ اس سے بڑھ کر ایک اور کام بھی ہوا۔ وہ یہ کہ، فرض کیجیے میرے پاس ایک تحریری نسخہ موجود ہے جس میں کسی نہ کسی وجہ سے کتابت کی کچھ غلطیاں موجود ہیں۔ اس غلط نسخے کو میں حفظ کر لیتا ہوں۔ اس طرح میرا حفظ بھی غلط ہو گا۔ اس کی اصلاح کس طرح کی جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف بھی توجہ فرمائی اور حکم دیا کہ ہر مسلمان کو کسی مستند استاد ہی سے قرآن مجید پڑھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذات سے بڑھ کر قرآن مجید سے کون واقف ہو سکتا ہے؟ اس لیے ہر مسلمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ اگر اس کے پاس تحریری نسخہ موجود ہے تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تلاوت کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر فرمائیں کہ ہاں یہ نسخہ ٹھیک ہے تب اسے حفظ کیا جائے۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو ظاہر ہے کہ ایک آدمی سارے لوگوں کو تعلیم و تربیت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ایسے صحابہ کو، جن کی قرآن دانی کے متعلق آپ کو پورا اعتماد تھا، یہ حکم دیا کہ اب تم بھی پڑھایا کرو۔ یہ وہ مستند استاد تھے جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سند دیتے تھے کہ تم پڑھانے کے قابل ہو۔ اور اس کا سلسلہ آج بھی دنیا میں قائم ہے۔ اگر کوئی شخص کسی استاد سے قرآن مجید پڑھتا ہے تو قرأت کی تکمیل کے بعد استاد کی طرف سے اسے جو سند ملتی ہے، اس میں وہ استاد لکھتا ہے کہ "میں نے اپنے شاگرد فلاں کو قرآن مجید کے الفاظ، قرآن مجید کے قرأت کے اصولوں کو ملحوظ رکھ کر یہ تعلیم دی ہے۔ یہ بالکل وہی ہے جو میرے استاد نے مجھ تک پہنچائی تھی اور اس نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ اس کو اس کے اپنے استاد نے اسی طرح پڑھایا تھا۔ اس کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

۱۳۔ اسلامی روایات (Tradition) کے سوا دنیا کی کسی قوم نے اپنی مذہبی کتاب کو محفوظ کرنے کے لیے یہ اصول کبھی اختیار نہیں کیے تھے۔ یہ چیزیں قرآن مجید کی تدوین کے سلسلے میں عہد نبوی میں ہی پیش آئیں مگر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ ایک اور چیز کی بھی شروع ہی سے ضرورت تھی۔ قبل اس کے کہ میں اس کا ذکر کروں، قرآن مجید کے تحریری نسخوں کے متعلق بھی کچھ آپ کو بتاتا چلوں کہ ان کا کب سے پتہ چلتا ہے۔ غالباً" نبوت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ ان کے واقعہ سے آپ واقف ہوں گے۔ وہ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت جانی دشمن تھے۔ ایک دن یہ طے کر کے گھر سے نکلے کہ رسول اللہؐ کو (نعوذ باللہ) قتل کر ڈالوں۔ راستے میں انھیں ان کا ایک رشتہ دار ملا جس نے اسلام تو قبول کر لیا تھا لیکن اسے چھپا رکھا تھا۔ اس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ ہتھیار سے لیس ہو کر کہاں جا رہے ہو؟ چونکہ وہ رشتہ دار تھا اس لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے بتا دیا کہ میں محمد کو (نعوذ باللہ) قتل کرنے جا رہا ہوں کہ اس نے ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس رشتے دار نے کہا اے عمر، اپنے قبیلے کو بنی ہاشم کے قبیلے سے جنگ میں الجھانے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمھاری بہن فاطمہ بھی مسلمان ہو چکی ہے، اس کا شوہر بھی مسلمان ہو چکا ہے۔ پہلے اپنے گھر کی خبر لو بعد میں دنیا کی اصلاح کرنا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حیران ہوئے اور سیدھے بہن کے گھر پہنچے۔ دروازے کے پاس

انھوں نے اندر سے کچھ آواز سنی، جیسے کوئی شخص گا رہا ہے یا خوش الحانی سے کچھ پڑھ رہا ہے۔ انھوں نے بہت زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر سے ایک شخص نکلا اور یہ اندر پہنچے۔ وہاں بہن اور بہنوئی سے جو سخت کلامی ہوئی اس سے آپ لوگ واقف ہیں۔ میں مختصراً ذکر کر رہا ہوں کہ بالآخر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بہن کو اس پر آمادہ کر لیا کہ جو چیز وہ پڑھ رہی تھیں وہ ان کو دکھائیں۔ انھوں نے غسل کرانے کے بعد آپ کو وہ چیز پیش کی۔ یہ قرآن مجید کی چند سورتیں تھیں۔ ان کو پڑھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔ اس واقعے سے میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید کی کم از کم چند سورتوں کے تحریری صورت میں پائے جانے کا ذکر سنہ ۵ نبوی ہی سے یعنی قبل ہجرت سے ملتا ہے۔ اس کے بعد جس تحریری نسخے کا پتہ چلتا ہے، اس کا ذکر بھی دلچسپ ہے۔ یہ غالباً بیعت عقبہ ثانیہ کا واقعہ ہے۔ مدینے سے کچھ لوگ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، ان میں سے بنی زریق کے ایک شخص کے بارے میں مؤرخین نے صراحت سے لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی اس وقت تک نازل شدہ سورتوں کا مکمل مجموعہ ان کے سپرد کیا۔ یہ صحابی مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے قبیلے میں اپنے محلے کی مسجد میں اسے روزانہ باواز بلند پڑھا کرتے تھے۔ گویا قرآن مجید مدون ہونے یا تحریری صورت میں پائے جانے کا یہ دوسرا واقعہ ہے جس کا مؤرخوں نے صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

۱۴۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قرآن کو کسی مستند استاد سے پڑھنا پہلی خصوصیت تھی۔ دوسری خصوصیت تحریری صورت میں محفوظ رکھنا، تا کہ اگر کہیں بھول جائے تو تحریر دیکھ کر اپنے حافظے کو تازہ کر لیا جائے اور تیسری خصوصیت اسے حفظ کرنا تھا۔ ان تین باتوں کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن اس میں ایک پیچیدگی اس طرح پیدا ہو گئی تھی کہ قرآن مجید کامل حالت میں بہ یک وقت نازل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ جستہ جستہ ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو میکانیکی طور پر مدون نہیں کیا کہ پہلی آیت شروع میں ہو اور بعد میں نازل شدہ دوسرے نمبر پر رہے بلکہ اس کی تدوین الہام اور حکمت نبوی کے تحت ایک اور طرح سے کی گئی۔ قرآن مجید کی اولین نازل شدہ آیتیں، جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا، سورہ اقراء کی ابتدائی پانچ آیتیں ہیں۔ یہ آیتیں سورہ نمبر ۹۶ میں ہیں جب کہ قرآن مجید کی کل سورتیں ۱۱۴ ہیں۔ ان میں ۹۶ نمبر پر ابتدائی سورۃ ہے۔ قرآن مجید میں اب جو بالکل ابتدائی سورتیں ملتی ہیں، مثلاً سورۃ بقرہ وغیرہ وہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ دوسرے الفاظ میں قرآن مجید زمانی ترتیب کے لحاظ سے مدون نہیں ہوا بلکہ ایک دوسری صورت میں مرتب ہوا۔ اس کی

وجہ سے لوگوں کو دشواریاں پیش آسکتی تھیں' یعنی آج ایک سورۃ نازل ہوئی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت دیتے ہیں کہ اس کو فلاں مقام پر لکھو۔ پھر کل ایک آیت نازل ہوئی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ اس کو فلاں آیت سے قبل لکھو یا فلاں آیت کے بعد لکھو یا فلاں سورہ میں لکھو۔ اس لیے ضرورت تھی کہ وقتاً" فوقتاً" نظرثانی ہوتی رہے۔ لوگوں کے ذاتی نسخوں کی اصلاح اور نظرثانی کا ذکر بھی ہجرت کے بعد سے ملتا ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف کے مہینے میں دن کے وقت قرآن مجید کو' جتنا اس سال تک نازل ہوا تھا' باآواز بلند دہرایا کرتے تھے اور ایسے صحابہ جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا' وہ اپنا ذاتی نسخہ ساتھ لاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت پر اس کا مقابلہ کرتے جاتے' تاکہ اگر ان سے کسی لفظ کے لکھنے میں یا سورتوں کو صحیح مقام پر درج کرنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے' تو وہ اس کی اصلاح کرلیں۔ یہ چیز "عرضہ" یا پیشکش کہلاتی تھی۔ مؤرخین مثلاً امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ آخری سال' وفات سے چند ماہ پہلے' جب رمضان کا مہینہ آیا تو آپ نے پورے کا پورا قرآن مجید لوگوں کو دو مرتبہ سنایا اور یہ بھی کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ میری وفات قریب آگئی ہے کیونکہ قرآن حکیم کے متعلق جبرئیل علیہ السلام نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں دو مرتبہ پڑھ کر سناؤں تاکہ اگر کسی سے غلطیاں ہوئی ہوں تو وہ باقی نہ رہیں۔ یہ تھی تدبیر' جو آخری نبی نے آخری پیغام ربانی کی حفاظت کے لیے اختیار فرمائی۔ اس طرح قرآن مجید کے ہم تک قابل اعتماد حالت میں پہنچنے کا اہتمام ہوا۔

۱۵۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو شروع میں قرآن مجید کی طرف کسی کی توجہ مبذول نہ ہوئی۔ لوگوں کے پاس جو کچھ موجود تھا۔ اس کو نماز میں پڑھا کرتے تھے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ لیکن پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ تمام مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ قرآن مجید کی طرف فوری توجہ دیں۔ اس زمانے میں قرآن مجید کا کوئی سرکاری نسخہ موجود نہیں تھا اور غالباً کسی ایک شخص کے پاس بھی کامل قرآن مجید لکھا ہوا موجود نہیں تھا۔ یہ واقعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ملک میں چند لوگ مرتد ہوگئے اور مسیلمہ کذاب نے نہ صرف ارتداد کیا بلکہ نئے نبی ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ وہ چونکہ ایک طاقتور قبیلے کا سردار تھا' اس لیے بہت سے لوگ اس کے حامی بھی ہوگئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے جنگ کی۔ یہ جنگ بہت شدید تھی' اور اس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی جب کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور جنگ بھی دشمن کے علاقے میں' یمامہ کے مقام پر ہوئی۔ میں جب وہاں گیا تھا تو وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ یہ جنگ موجودہ شہر ریاض کے مضافات میں ہوئی تھی۔ اس جنگ میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ ان شہید

ہونے والوں میں چند لوگ ایسے بھی تھے۔ جو قرآن مجید کے بہترین حافظ سمجھے جاتے تھے۔ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ مدینے کے مسلمانوں کو فتح پر خوشی ہوئی لیکن یہ اطلاع پاکر کہ بہت سے برگزیدہ اور بہترین حافظ قرآن مسلمان اس جنگ میں شہید ہو گئے ہیں' رنج بھی ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر قرآن مجید کے تحفظ پر حکومت نے توجہ نہ کی اور حافظ قرآن رفتہ رفتہ آئندہ جنگوں میں شہید ہوتے رہے یا طبعی موت سے اس دنیا سے رخصت ہوتے رہے تو پھر قرآن مجید کے لیے بھی وہی دشواری پیش آئے گی جو پرانے انبیاء علیہ السلام کی کتابوں کے سلسلے میں پیش آئی تھی۔ اس لیے وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے امیرالمؤمنین قرآن کے تحفظ پر توجہ فرمایئے۔ یمامہ کی جنگ میں چھ ہزار مسلمان شہید ہو چکے ہیں جن میں بہت سے حافظ قرآن بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس تجویز پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب' ان کی سیرت کے ایک خاص پہلو کا مظہر ہے۔ وہ فدائے رسول تھے اور فدائے رسول کا جواب ایسا ہی ہونا چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں کیسے کروں؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحث کرتے ہیں۔ بالآخر دونوں اس بات پر رضامند ہوئے کہ کسی تیسرے شخص' کو حکم بنائیں' اور وہ جو فیصلہ کردے اس پر عمل کریں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا حکم بنایا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب وحی تھے' حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فوری جواب بھی وہی تھا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟ دوبارہ بحث ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے کہا اے زید! اگر لکھیں تو اس میں حرج کیا ہے؟ روایت میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ واقعی حرج تو مجھے بھی نظر نہیں آتا۔ یہ ایک جذباتی رویہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تو ہم کیسے کریں؟ لیکن اگر کریں تو اس سے کوئی امر مانع نظر نہیں آتا۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے حکم دیا کہ یہ کام میں سرانجام دوں تو مجھے یہ اتنا مشکل معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تدوین کے مقابلے میں اگر مجھے جبل احد کے سر پر اٹھانے کا حکم دیا جاتا تو وہ میرے لیے آسان ہوتا۔

۱۶۔ قرآن مجید کی تدوین کے سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے احکام قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے شہر مدینہ میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جس شخص کے پاس قرآن مجید کا کوئی حصہ تحریری صورت میں موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس "عرضہ" کے موقع پر جو تلاوت ہوتی تھی' اس سے مقابلہ کر کے تصحیح شدہ ہے' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا ہوا نسخہ موجود ہے تو وہ لاکر اس کمیشن کے

سامنے پیش کرے۔ کمیشن کے صدر حضرت زید بن ثابت تھے لیکن کئی اور مددگار بھی تھے جن میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔ اس کمیشن کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ قرآن مجید کے جو نسخے پیش کیے جائیں' قابل اعتماد ہوں' عرضہ میں پیش کیے ہوئے نسخے ہوں۔ اگر کوئی آیت کم سے کم دو تحریری نسخوں میں موجود ہو تو اسے لکھا جائے ورنہ رد کر دی جائے۔

۱۷۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں اس طرح قرآن مجید کی تدوین ہوئی اور اس کو ایک کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگرانی میں انجام دیا گیا۔ یہ بات بھی نہ بھلایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کم از کم بیس پچیس حافظ موجود تھے' جن میں سے کچھ انصار تھے اور کچھ مہاجرین' جنھیں سارا قرآن مجید زبانی یاد تھا۔ ان میں ایک خاتون حافظہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تھیں۔ خود اس کمیشن کے صدر' زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حافظ تھے' اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا' اس یقین کے ساتھ لکھا کہ یہ ان کے ذہن میں بھی اسی طرح موجود ہے' یہاں ایک اور چھوٹی سی بات کا ذکر کرتا ہوں کہ جب لوگ نسخہ لا کر پیش کرتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انھیں حکم دیتے تھے کہ قسم کھا کر بتاؤ کہ یہ نسخہ جو تم پیش کر رہے ہو' وہی ہے جس کی تصحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوئی ہے۔ وہ قسم کھا کر یقین دلاتے تو پھر اس سے استفادہ کیا جاتا۔ جب پورا قرآن مجید لکھا جا چکا تو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا' اس میں مجھے ایک آیت کم نظر آئی' یہ آیت میرے حافظے میں تو موجود تھی مگر کسی تحریری نسخے میں موجود نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے شہر کے چکر لگائے۔ ہر گھر میں داخل ہوا۔ اولاً" مہاجرین کے گھروں میں' کسی کے پاس یہ آیت تحریری صورت میں موجود نہیں تھی۔ پھر انصار کے گھروں کو گیا۔ بالآخر ایک شخص کے پاس ایک تحریری نسخہ ملا۔ وہ نسخہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا ہوا تھا لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہدایت تھی کہ جب تک دو تحریری نسخے نہ ملیں اس وقت تک اس کو قرآن کے طور پر قبول نہ کیا جائے۔ جبکہ یہ آیت صرف ایک تحریری نسخے میں ملی تھی۔ لیکن یہاں مشیت خداوندی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اتفاق سے یہ وہ شخص تھا جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اس کے کسی کام سے خوش ہو کر کہا تھا کہ آج سے تمھاری شہادت دو شہادتوں کے مساوی سمجھی جائے گی۔ غرض یہ قدرت کی طرف سے پیشگی انتظام تھا۔ اس طرح اس آیت کو انھوں نے صرف ایک شخص سے لے کر نقل کیا۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں نے قرآن کو دوبارہ پڑھا تو ایک اور آیت کی بھی کمی نظر آئی۔ ممکن ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ ہو اور آیت کے متعلق راویوں میں اختلاف ہو' بہر حال وہاں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس نام

والے ایک شخص نے وہ چیز بیان کی۔ یہ آیتیں، جن کا ہمارے پاس صراحت سے ذکر موجود ہے کہ کون سی آیتیں تھیں، فرض کیجئے کہ اگر آج ہم ان کو قرآن مجید سے خارج بھی کر دیں تو کوئی اہم چیز خارج نہیں ہوتی۔ قرآن مجید کی جن آیتوں کی طرف یہ اشارہ ہے ان کا مفہوم قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی موجود ہے۔ لیکن بہرحال جس احتیاط سے قرآن مجید کی تدوین عمل میں آئی اس کا مقابلہ تاریخ عالم کی دینی کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی نہیں کر سکتی۔

۱۸۔ ایک اور نکتہ بیان کرنا خالی از فائدہ نہ ہو گا اور اسی پر یہ تقریر ختم کرتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے کا ذکر ہے، جرمنی کے عیسائی پادریوں نے یہ سوچا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں آرامی زبان میں جو انجیل تھی وہ تو اب دنیا میں موجود نہیں۔ اس وقت قدیم ترین انجیل یونانی زبان میں ہے اور یونانی سے ہی ساری زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یونانی مخطوطوں کو جمع کیا جائے اور ان کا آپس میں مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ یونانی زبان میں انجیل کے نسخے جتنے دنیا میں پائے جاتے تھے کامل ہوں کہ جزئی ان سب کو جمع کیا گیا اور ان کے ایک ایک لفظ کا باہم مقابلہ (Collation) کیا گیا۔ اس کی جو رپورٹ شائع ہوئی اس کے لفظ یہ ہیں: "کوئی دو لاکھ اختلافی روایات ملتی ہیں" اس کے بعد یہ جملہ ملتا ہے "ان میں سے ۱/۸ اہم ہیں" یہ ہے انجیل کا قصہ۔ غالباً اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد کچھ لوگوں کو قرآن کے متعلق حسد پیدا ہوا۔ جرمنی ہی میں میونک یونیورسٹی میں ایک ادارہ قائم کیا گیا "قرآن مجید کی تحقیقات کا ادارہ" اس کا مقصد یہ تھا کہ ساری دنیا سے قرآن مجید کے قدیم ترین دستیاب نسخے خرید کر، فوٹو لے کر، جس طرح بھی ممکن ہو جمع کیے جائیں۔ جمع کرنے کا یہ سلسلہ تین نسلوں تک جاری رہا۔ جب میں ۱۹۳۳ء میں پیرس یونیورسٹی میں تھا تو اس کا تیسرا ڈائریکٹر پرتسل Pretzl پیرس آیا تھا تاکہ پیرس کی پبلک لائبریری میں قرآن مجید کے جو قدیم نسخے پائے جاتے ہیں ان کے فوٹو حاصل کرے۔ اس پروفیسر نے مجھ سے شخصاً بیان کیا کہ اس وقت (یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے) ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں قرآن مجید کے بیالیس ہزار (۴۲۰۰۰) نسخوں کے فوٹو موجود ہیں، اور مقابلے (Collation) کا کام جاری ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اس ادارے کی عمارت پر ایک امریکی بم گرا اور عمارت، اس کا کتب خانہ اور عملہ سب کچھ برباد ہو گیا۔ لیکن جنگ کے شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے ایک عارضی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اس رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں کہ قرآن مجید کے نسخوں میں مقابلے کا جو کام ہم نے شروع کیا تھا، وہ ابھی مکمل تو نہیں ہوا لیکن اب تک جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ ان نسخوں میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں تو ملتی ہیں لیکن اختلافات روایت ایک بھی نہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ کتابت کی جو غلطی ایک نسخے میں ہو گی وہ کسی دوسرے نسخوں میں نہیں ہو گی۔ مثلاً فرض

کیجئے۔ "بسم اللہ الرحیم" میں "الرحمٰن" کا لفظ نہیں لیکن یہ صرف ایک نسخے میں ہے۔ باقی کسی نسخے میں ایسا نہیں ہے' سب میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ہے۔ اس کو ہم کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ یا کہیں کوئی لفظ بڑھ گیا ہے' مثلاً ایک نسخے میں بسم اللہ اللہ الرحمٰن الرحیم ہے باقی نسخوں میں نہیں ہے' تو اسے کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی چیزیں کہیں کہیں سہو قلم یعنی کاتب کی غلطی سے ملتی ہیں۔ لیکن اختلاف روایت' یعنی ایک ہی فرق کئی نسخوں میں ملے' ایسا کہیں نہیں ہے' یہ ہے قرآن مجید کی تاریخ کا خلاصہ' جس سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں خدا کا جو فرمان ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون (ہم ہی اسے نازل کرتے ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے) یہ تمام واقعات جو میں نے آپ سے بیان کیے' اس آیت کی حرف بحرف تصدیق کرتے ہیں۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

سوالات و جوابات

برادران کرام : خواہران محترم السلام علیکم :

۱۹۔ سوالات کی ایک خاصی تعداد جمع ہوئی ہے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ میری تقریر کو توجہ کے ساتھ سنا گیا ہے۔ اسی وجہ سے کئی سوالات ذہنوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی بساط کے مطابق' ذہن میں جو جواب آئے' وہ آپ سے عرض کروں۔ ظاہر ہے کہ ایک گھنٹے کی مختصر تقریر میں ساری باتوں کو بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا' کسی تحریری چیز کو میں نے نہیں پڑھا بلکہ آپ سے اپنے معلومات برجستہ بیان کرتا چلا گیا۔ چنانچہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر کچھ باتیں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کی تدوین قرآن کے بارے میں' آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ دو سوال اس بارے میں بھی آئے ہیں۔ *

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب قرآن مجید کی تحریراً تدوین ہوئی تو مورخین نے لکھا ہے کہ یہ نسخہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور ان کی وفات تک ان کے پاس رہا۔ جب ان کی وفات ہوئی تو وہ نسخہ ان کے جانشین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چلا گیا۔ اور پھر مورخین لکھتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت واقع ہوئی تو وہ نسخہ ان کی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس چلا گیا۔ امہات المومنین' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجات مطہرات' میں سب پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ بعض کو صرف پڑھنا آتا اور بعض کو پڑھنا لکھنا دونوں آتے تھے۔ جب کہ بعض اُمی تھیں۔

* فاضل مقرر نے یہ دونوں سوال نہیں سنائے۔ لیکن جواب کی نوعیت سے ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ تدوین قرآن کے سلسلے میں ان کی خدمات کیا ہیں اور انہیں جامع القرآن کیوں کہا جاتا ہے۔

اس میں کوئی اعتراض کا پہلو نہیں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی 'ان معدودے چند عورتوں میں تھیں' جن کو پڑھنا لکھنا دونوں آتے تھے۔ بہر حال حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے تیار شدہ نسخہ' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد' حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس چلا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جانشین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غالباً ان کی شخصیت اور وجاہت کی بنا پر' یہ مناسب نہیں سمجھا کہ وہ نسخہ ان سے لے لیں۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود حافظ قرآن تھے۔ ان کے پاس ان کا اپنا نسخہ موجود تھا۔ انھیں ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اس نسخے کو حاصل کریں۔ لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کی بنا پر ضرورت پیش آئی کہ وہ نسخہ دوبارہ خلیفہ وقت کے پاس لایا جائے اور اس سے استفادہ کیا جائے۔

۲۰۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں غیر معمولی تیز رفتاری سے چاردانگ عالم میں فتوحات ہوئیں تو بہت سے ایسے لوگ جو دنیا طلب تھے' انھیں موقع پرستی کے تحت خیال آیا کہ وہ بھی اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کریں۔ لیکن حقیقت میں وہ مسلمان نہیں تھے بلکہ منافق تھے اور ان کی کوشش تھی کہ اسلام کو اندر سے ٹھیس پہنچائی جائے۔ اس سلسلے میں وہ قرآن مجید پر بھی حملے کرتے رہے۔ ممکن ہے اس کی کوئی اہمیت نہ رہی ہو لیکن ایک واقعے سے سنگین صورت حال پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں آرمینیا سے جنگ کرنے کے لیے ایک فوج بھیجی گئی۔ آرمینیا کا تصور غالباً آپ کے ذہنوں میں نہیں ہوگا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ شمالی ترکی' جہاں آج کل ارض روم شہر ہے اور ایرانی سرحد کا علاقہ ہے' اس علاقے میں ارمنی رہتے تھے۔ یہ علاقہ آرمینیا کہلاتا تھا۔ قسطلانی جو بخاری کے شارح ہیں' وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک فوج جب ارزن روم کے قریب موجود تھی (یہ ارزن روم اب ارض روم بن گیا ہے) تو اس وقت فوج میں ایک حادثہ پیش آیا۔ وہ یہ تھا کہ امام اور مقتدیوں میں بعض آیتوں کی قرات کے بارے میں جھگڑا ہو گیا۔ امام نے ایک طرح سے عبارت پڑھی اور حاضرین نے کہا یوں نہیں' یوں ہے۔ ایک نے کہا ہمیں فلاں استاد' فلاں صحابی نے عراق میں یوں پڑھایا ہے۔ دوسرے نے کہا مجھے میرے استاد' فلاں صحابی نے شام میں یوں پڑھایا ہے۔ دونوں اپنی اپنی باتوں پر اڑے رہے۔ قریب تھا کہ تلواریں چلیں اور خوں ریزی ہو کہ فوج کے کمانڈر انچیف نے حسن تدبیر سے اس فتنے کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ جب وہ فوج مدینہ منورہ واپس آئی تو کمانڈر انچیف حذیفہ بن یمان اپنے گھر میں بچوں کی خیریت پوچھنے سے پہلے' سیدھے خلیفہ کے پاس پہنچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا امیر المؤمنین امت محمد کی خبر لیجئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا

کیا واقعہ پیش آیا؟ تو انہوں نے یہ قصہ سنایا۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوراً فیصلہ کیا۔ ان میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ کوئی کام ان کے ذہن میں آتا اور فیصلہ کر لیتے تو فوراً اس کی تعمیل بھی کراتے۔ جیسے ہی یہ صورت حال سامنے لائی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے تیار شدہ جو نسخہ آپ کے پاس ہے' وہ مجھے مستعار دیجئے۔ استفادہ کرنے کے بعد میں آپ کو واپس کر دوں گا۔ وہ نسخہ ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے دوبارہ پرانے کاتب وحی زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے سپرد کیا کہ اس کی نقلیں تیار کرو' اور ان نقلوں کا مقابلہ کر کے' اگر ان میں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہوں تو ان کی اصلاح کرو۔ قرآن مجید چونکہ عربی زبان کی پہلی کتاب ہے' اس لیے ابتدائی زمانے میں عربی خط میں کچھ خامیاں ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بھی ہدایت کی کہ اگر تلفظ کی ضرورت کے لحاظ سے املا میں کچھ ترمیم کی ضرورت محسوس ہو تو ضرور کرو۔ یہ نکتہ بھی سمجھایا کہ عربی زبان مختلف علاقوں میں کچھ فرق بھی رکھتی ہے۔ قبیلہ نجد کے لوگ ایک لفظ کو ایک طریقے سے ادا کرتے ہیں مدینے کے لوگ دوسرے طریقے سے' فلاں جگہ کے لوگ تیسرے طریقے سے۔ اس لیے اگر کسی لفظ کے تلفظ میں اختلاف پایا جاتا ہے تو قرآن مجید کو مکہ معظمہ کے تلفظ کے مطابق لکھو۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ' اپنے چند مددگاروں کے تعاون سے' دوبارہ اس پرانے نسخے کو سامنے رکھ کر نقل کرنا شروع کرتے ہیں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر کسی مسئلے میں اختلاف ہو' تو مسئلہ میرے پاس بھیجو' میں خود اس کا فیصلہ کر دوں گا۔ بدقسمتی سے یہ واقعہ جو ارغ روم میں پیش آیا تھا کہ فلاں آیت کے متعلق یا فلاں لفظ کے متعلق فوج میں جھگڑا ہوا' اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی' شاید اس جھگڑے کی بنیاد قبائلی بولیوں اور لہجوں کا اختلاف ہو۔ اس قسم کی ایک مثال مجھے یاد آتی ہے۔ قرآن مجید میں "تابوت" کا لفظ آیا ہے' جس کے معنی صندوق کے ہوتے ہیں۔ اس کا تلفظ مدینہ منورہ کی بولی (Dialect) میں "تابوہ" ہوتا تھا۔ آخر میں "ۃ" کے ساتھ جب کہ مکے کے لوگ "تابوت" کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس پر کمیشن کے ارکان متفق نہیں ہو سکے۔ یہ اختلافی مسئلہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے پیش ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تابوت بڑی ت کے ساتھ لکھو' یہ کوئی بڑی اہمیت کی بات نہیں' لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں قرآن مجید کی تدوین ہوئی' اس کی حقیقت کیا ہے؟ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں قرآن مجید کی نقلیں تیار کی گئیں۔ املا میں کہیں کہیں ترمیم کی گئی۔

لفظ کی آواز کو نہیں بدلا گیا' لیکن اس آواز کی املا میں کچھ فرق کیا گیا۔ اس کے بعد اس کے چار نسخے' یا ایک روایت کے مطابق سات نسخے تیار کیے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں علمی دیانت داری کا جو معیار تھا اس کے تحت انہوں نے حکم دیا کہ ان ساتوں نسخوں کو ایک ایک کر کے' مسجد نبوی میں ایک شخص با آواز بلند شروع سے لے کر آخر تک پڑھے تا کہ کسی شخص کو بھی یہ شبہ نہ رہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن میں کہیں تبدیلی کی ہے۔ جب یہ سارے نسخے اس طرح پڑھے گئے اور سب کو اطمینان ہو گیا کہ یہ نسخے صحیح ہیں تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی وسیع سلطنت کے مختلف صوبوں کے صدر مقاموں پر وہ نسخے بھیجے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے کی اسلامی سلطنت کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ۲۷ ہجری میں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف پندرہ سال بعد' اسلامی فوج ایک طرف اسپین میں اور دوسری طرف دریائے جیحوں کو عبور کر کے ماوراء النہر (چین) میں داخل ہو گئی تھی۔ یورپ' ایشیا اور افریقہ' اسلامی سلطنت ان سب براعظموں میں پھیل گئی تھی اس کے بڑے بڑے صوبوں میں قرآن مجید کے یہ نسخے بھیجے گئے اور یہ حکم دیا گیا کہ آئندہ صرف انہی سرکاری مستند نسخوں سے مزید نقلیں لی جایا کریں۔ اس بات کی تاکید بھی کی گئی کہ اگر کسی کے پاس کوئی نسخہ اس کے خلاف پایا جائے تو اسے تلف کر دیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کس حد تک ہوئی' اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔ عملاً یہ ناممکن بھی تھا کہ تین براعظموں کے ہر ہر مسلمان کے گھر میں پولیس جائے اور قرآن مجید کا شروع سے لے کر آخر تک سرکاری نسخے سے مقابلہ کرے۔ اور پھر اس میں کوئی اختلاف نظر آئے تو اسے تلف کر دے۔ تاریخی طور پر ایسے کسی واقعے کا ذکر بھی نہیں ملتا لیکن بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے سے آج تک قرآن مجید کے جو نسخے ہمارے پاس نسلاً بعد نسل چلے آ رہے ہیں' وہ پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک وہی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو چار یا سات قلمی نسخے مختلف مقامات پر بھیجے ان میں سے کچھ اب تک محفوظ سمجھے جاتے ہیں۔ ثبوت کوئی نہیں' لیکن یہ روایت ہے کہ یہ انہی نسخوں میں سے ہیں' ایک نسخہ آج کل روس کے شہر تاشقند میں ہے وہاں کیسے پہنچا' اس کا قصہ یہ ہے کہ یہ نسخہ پہلے دمشق میں پایا جاتا تھا جو بنی امیہ کا صدر مقام تھا۔ جب دمشق کو تیمور لنگ نے فتح کیا تو وہاں کے مال غنیمت میں سب سے زیادہ قیمتی چیز کے طور پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن مجید کا نسخہ پایا۔ اسے لیا اور اپنے ساتھ پایہ تخت سمرقند لایا اور وہاں اسے محفوظ رکھا۔ یہ نسخہ سمرقند میں رہا تا آنکہ گزشتہ صدی میں روسیوں نے سمرقند کو فتح کر لیا۔ فتح کرنے کے بعد اس نسخے کو' جس کی بڑی شہرت تھی' روسی کمانڈر انچیف نے وہاں سے لے کر سینٹ پیٹرس برگ منتقل کر دیا جو آج کل لینن گراڈ کہلاتا ہے۔ روسی مؤرخ

بیان کرتے ہیں کہ اس نسخے کو سمر قند کے حاکم نے روسی کمانڈر کے ہاتھ ۲۵ یا ۵۰ روپے میں فروخت کر دیا تھا۔ ہم نے اسے چرایا نہیں بلکہ خرید کر لائے ہیں۔ بہر حال پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک وہ نسخہ لینن گراڈ میں رہا اس کے بعد' جیسا کہ آپ کو معلوم ہے' زار کی حکومت ختم ہو گئی اور کمیونسٹوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت بہت سے روسی باشندے جو کمیونسٹ حکومت کے ماتحت رہنا نہیں چاہتے تھے' روس چھوڑ کر دنیا میں تتر بتر ہو گئے۔ ان میں سے ایک صاحب پیرس بھی آئے جو جنرل علی اکبر توپچی باشی کے نام سے مشہور تھے۔ میں خود ان سے مل چکا ہوں' انہوں نے اس کا قصہ مجھے سنایا۔ کہنے لگے کہ جب زار کو قتل کیا گیا اس وقت میں فوج میں ایک بڑے افسر کی حیثیت سے سینٹ پیٹرس برگ ہی میں موجود تھا۔ میں نے ایک کمانڈو (فوجی دستہ) بھیجا کہ جا کر شاہی محل پر قبضہ کرو اور شاہی کتب خانے میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کا جو قرآن مجید کا نسخہ ہے' تلاش کر کے اسے لے آؤ۔ کمانڈو گیا اور وہ قرآن مجید لے آیا۔ انہوں نے ایک فوجی جنرل کی حیثیت سے ریلوے اسٹیشن پر جا کر وہاں کے اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ مجھے ایک ریل کا انجن درکار ہے۔ اس انجن میں اس قرآن کو رکھا اور اپنے آدمیوں کی نگرانی میں انجن ڈرائیور کو حکم دیا کہ جس قدر تیزی سے جا سکتے ہو اس انجن کو ترکستان لے جاؤ۔ اس کی اطلاع کمیونسٹ فوجی کمانڈروں کو چند گھنٹے بعد ملی۔ چنانچہ اس کے تعاقب میں دوسرا انجن اور کچھ افسر روانہ کیے گئے لیکن وہ انجن ان کے ہاتھ سے باہر نکل چکا تھا اور اس طرح یہ نسخہ تاشقند پہنچ گیا۔ جب کمیونسٹ دور میں تاشقند پر روسیوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا تو اس نسخے کو وہاں سے لینن گراڈ منتقل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ چنانچہ وہ نسخہ اب تک تاشقند میں محفوظ ہے۔ زار کے زمانے میں اس قرآن مجید کا فوٹو لے کر ایک گز لمبی تقطیع پر کل پچاس نسخے چھاپے گئے تھے۔ ان میں سے چند نسخے میرے علم میں ہیں اور وہ دنیا میں محفوظ ہیں۔ ایک امریکہ میں ہے' ایک انگلستان میں ہے۔ ایک نسخہ میں نے کابل میں دیکھا تھا۔ ایک مصر کے کتب خانے میں پایا جاتا ہے۔ میرے پاس اس کا مائیکرو فلم بھی ہے۔ یہ ایک نسخہ ہے۔ دوسرا نسخہ استنبول میں توپ قاپی سرائے میوزیم میں موجود ہے جس کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ اس میں سورہ بقرہ کی آیت فسیکفیکھم اللہ پر سرخ دھبے پائے جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کا خون ہے۔ کیونکہ وہ جس وقت تلاوت کر رہے تھے اس وقت انھیں شہید کر دیا گیا تھا۔ تیسرا نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے۔ اس کا فوٹو میرے پاس ہے۔۔۔ اس پر سرکاری مہریں ہیں اور لکھا ہے کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کا نسخہ قرآن ہے۔ ان نسخوں کے خط اور تقطیع میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخے ایک دوسرے کے

ہم عصر ہیں۔ یہ نسخے جھلی پر لکھے گئے ہیں کاغذ پر نہیں ہیں۔ ممکن ہے حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کے نسخے ہوں یا اس زمانے میں یا اس کے کچھ ہی عرصہ بعد کے لکھوائے ہوئے نسخے ہوں۔ بہر حال یہ بات ہمارے لیے قابل فخر اور باعث اطمینان ہے کہ ان نسخوں میں اور موجودہ مستعملہ نسخوں میں، باہم کہیں بھی، کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

۲۱۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کو جامع القرآن کہا جاتا ہے، اس کے معنی یہ نہیں کہ انہوں نے قرآن کو جمع کیا۔ اس کی تاویل ہمارے مورخوں نے یہ کی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو ایک ہی قرآن پر جمع کیا۔ جو اختلاف لوگوں میں پایا جاتا تھا اس سے ان کو بچانے کے لیے مکہ معظمہ کے تلفظ والے قرآن کو انہوں نے نافذ کیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر یہ اجازت دی تھی کہ مختلف قبائل کے لوگ، مختلف الفاظ کو، مختلف انداز میں پڑھ سکتے ہیں تو اب اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ مکہ معظمہ کی عربی اب ساری دنیائے اسلام میں نافذ اور رائج ہو چکی ہے۔ اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ نے مسلمانوں کو ایک قرآن مجید پر جمع کیا۔ خدا ان کی روح پر اپنی برکات نازل فرمائے۔

۲۲۔ سوال ۲ مع جواب۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اس کے بعد میں دوسرے سوالوں پر توجہ کر سکتا ہوں۔ ایک سوال حروف مقطعات کے متعلق ہے۔ یعنی قرآن مجید میں بعض جگہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ حروف ہیں مثلاً الم، حم، عسق، وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان الفاظ کی کبھی تشریح نہیں فرمائی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تشریح فرما دی ہوتی تو بعد میں کسی کو جرات نہ ہوتی کہ اس کے خلاف کوئی رائے دے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کم از کم ساٹھ ستر آراء پائی جاتی ہیں۔ الف صاحب یہ بیان کرتے ہیں۔ ب صاحب وہ بیان کرتے ہیں اور یہ چودہ سو سال سے چلا آرہا ہے۔ اس کا قصہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ آج بھی لوگ نئی نئی رائیں دے رہے ہیں۔ لطیفے کے طور پر میں عرض کرتا ہوں۔ ۱۹۳۳ء کی بات ہے، میں پیرس یونیورسٹی میں تھا، تو ایک عیسائی ہم جماعت نے ایک دن مجھ سے کہا کہ مسلمان ابھی تک حروف مقطعات کو نہیں سمجھ سکے۔ میں بتاتا ہوں کہ یہ کیا چیز ہے؟ وہ موسیقی کا ماہر تھا، کہنے لگا کہ یہ گانے کی جو لے اور دھن وغیرہ ہوتی ہے ان کی طرف اشارہ ہے۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ لوگ حروف مقطعات کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اپنی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔ سوائے ایک چیز کے اور وہ یہ ہے کہ ایک حدیث میں کچھ اشارہ ملتا ہے کہ ایک دن کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور پوچھا کہ تمہارا دین کب تک رہے گا؟ کم و بیش اسی مفہوم کے الفاظ انہوں نے ادا کئے تو رسول اللہ صلی اللہ

قال الحوريون نحن انصر الله فا
منت طايفه من بنى اسريل و
كفرت طايفه فايدنا الذ
ين امنوا على عدوهم فاصبحوا
ظهرين

بسم الله الرحمن الرحيم يسبح لله
ما في السموت وما في الا
رض الملك القدوس العزيز
الحكيم هو الذي بعث في
الاميين رسولا منهم يتلوا عليهم ايته
ويزكيهم ويعلمهم الكتب
والحكمه وان كانوا من قبل
لفى ضلل مبين واخرين منهم لما
يلحقوا بهم وهو العزيز الحكيم
ذلك فضل الله يوتيه من يشا و
الله ذو الفضل العظيم
مثل الذين حملوا التورىة ثم

ورقة ٢٦٧ ب من مصحف [illegible] [illegible] المنسوب الى عثمان بن عفان رقم 194

علیہ وسلم نے فرمایا؟ "الم" تو انہوں نے کہا اچھا تمہارا دین الف (۱) ل (۳۰) اور م (۴۰) یعنی اکہتر سال رہے گا الحمد للہ اکہتر سال بعد تمہارا دین ختم ہو جائے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر "الر" اور "المر" بھی نازل ہوا ہے۔ انہوں نے کہا الر ۲۳۱ سال المر ۲۷۱ سال۔ پھر آپ نے فرمایا کہ مجھ پر فلاں لفظ بھی نازل ہوا ہے مثلاً حم عسق وغیرہ۔ یہاں تک کہ یہودیوں نے کہا کہ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آتا اور چلے گئے۔ ہو سکتا ہے انھیں پریشان کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا جواب دیا ہو۔ لیکن اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ حروف کی گویا عددی قیمت ہے۔ جس طرح آپ لوگ واقف ہیں کہ الف کے ایک 'ب کے دو' ج کے تین اور د کے چار عدد مقرر ہیں۔ اس طرح عربی زبان میں اٹھائیس حروف ہیں۔ ان سے بہت ہی مکمل طریقے سے ہم ایک ہزار تک لکھ سکتے ہیں۔ تاکہ ہندسہ لکھنے میں اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہو تو حروف کے ذریعے اسے دور کیا جا سکے۔۔۔ یا دو قسم کے ہندسوں کی ضرورت ہو۔ میں نے سنا ہے کہ سنسکرت میں بھی یہ طریقہ موجود ہے لیکن سنسکرت میں حروف تہجی ۲۸ سے کہیں زیادہ ہیں اور اس میں ایک سے مہاسنکھ تک لکھ سکتے ہیں۔ بہر حال ایک ہزار ہماری ضرورتوں کے لئے کافی ہے۔ یہ تھا حروف مقطعات کے متعلق میری معلومات کا خلاصہ۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ اس سے زیادہ میں آپ کو کوئی معلومات فراہم نہیں کر سکتا۔

۲۳ سوال ۳۔ ایک اور سوال ہے۔ اچھا ہوتا اگر وہ نہ کیا جاتا۔ سوال یہ ہے کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو یہ بات مان لینی چاہیے کہ قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے اس میں مسلمانوں کے لیے زیادہ فخر کی بات ہے' اور یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک پڑھے لکھے انسان تھے۔

جواب۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر یہ سوال نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر پڑھے لکھے ہوتے تو کیا آپ کی عزت بڑھ جاتی؟ یا اُمی تھے تو کیا آپ کی عزت گھٹ گئی؟ باقی خود قرآن کریم کہتا ہے کہ میں کسی انسان کی تصنیف نہیں ہوں' میں خدا کا کلام ہوں۔ فرشتے اس کے شاہد ہیں۔ خدا شہادت دیتا ہے کہ خدا کا کلام ہے۔ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ (۴۱: ۴۲) خود رسول بھی اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا' اور نہ ہی ترمیم کر سکتا ہے۔ قرآن نے ایک چیلنج بھی دیا ہے جو میری دانست میں اس کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ وہ چیلنج یہ ہے کہ قرآن جیسی ایک سورت یعنی کم از کم تین آیتیں لکھنے کی کوشش کرو۔ دنیا کے سارے انسانوں' سارے جنات کی مدد سے بھی تم نہیں لکھ سکو گے۔ یہ قرآن کا چیلنج تھا۔ اس قرآن کے چیلنج کا آج چودہ سو سال کے بعد بھی کسی نے کوئی ایسا جواب نہیں دیا' جسے لوگ قبول کر سکیں۔ میں

سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں یہ کہنا کہ اگر قرآن مجید کسی انسان کی تصنیف ہو' تو اس کی عزت بڑھ جائے گی' میرے نزدیک کوئی یقینی بات نہیں۔ شخصی طور پر مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔

۴۴ سوال ۴۔ ایک اور سوال ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی آیت قرآن مجید سے نکال لی جائے تو کوئی حرج واقع نہیں ہو گا کہ اس قسم کی دوسری آیات موجود ہیں۔ جس سے اس کا مفہوم ادا ہو سکتا ہے اس کی پیشی کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟

جواب۔ اپنے مفہوم کو میں نے شاید ٹھیک طرح سے ادا نہیں کیا یا شاید آپ نے اس کو پوری طرح سمجھا نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قرآن مجید کی کچھ آیتیں نکال لی جائیں۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ قرآن مجید کی جن دو آیتوں کے متعلق یہ روایت آتی ہے کہ وہ دونوں تحریری صورتوں میں نہیں ملیں' ان میں حقیقتاً کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے کہ اگر وہ اتفاقاً نکل بھی جائیں تو اس سے قرآن مجید کی تعلیم متاثر ہو۔ مثلاً صرف ایک آیت میں یہ ذکر ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ فرض کیجیے یہ آیت نہ رہے۔ تو اس کا امکان تھا کہ اسلام صحیح صورت میں باقی نہ رہ سکے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جن آیتوں کی طرف مذکورہ روایت میں اشارہ ہوا ہے ان میں ایسی کوئی چیز نہیں ۔ مثلاً یہ عبارت کہ لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمومنین روف رحیم' فان تولوا فقل حسبی الله لا اله الا هو علیه تو کلت وهو رب العرش العظیم (۹: ۱۲۸ تا ۱۲۹) اس میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے نبی ہیں جن کو اپنی امت کے ساتھ بڑی شفقت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی چیز تو ہے لیکن اس میں کوئی ایسی بات نہیں کہ یہ عبارت نہ ہوتی تو اسلام باقی نہ رہ سکے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ قرآن مجید کی آیتوں کے حذف کرنے کا امکان پایا جاتا ہے۔ ویسے میں آپ سے عرض کروں گا کہ قرآن کی بعض آیتیں مکرر ہیں۔ ایک ہی آیت بار بار آتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ان میں سے ایک حذف کر دی جائے تو ظاہر ہے کہ قرآن کی تعلیمات میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔ مثلاً سورہ رحمان (۵۵ : ۱۳) میں فبای الاء ربکما تکذبان کوئی پندرہ بیس مرتبہ آیا ہے۔ ان میں سے اگر ایک جگہ حذف کر کے دو آیتوں کو ایک آیت بنا دیا جائے تو قرآن مجید میں جو چیزیں انسان کی تعلیم کے لیے آئی ہیں ان میں عملاً کوئی کمی نہیں آئے گی۔ یہ نہیں کہ اس کا امکان ہے یا یہ کہ یہ مناسب ہے۔ میں یہ بالکل نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ قرآن مجید کی جس آیت کے متعلق حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ کو تلاش کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اسلام کی تعلیم پر موثر ہو۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں اور

آیتیں بھی موجود ہیں یہ تھا میرا منشا۔

۲۵سوال ۵۔ ایک اور سوال ہے کہ قرآن مجید کے جمع کرنے میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ نے جو کردار ادا کیا اور جس کی وجہ سے آپ کو 'ائمہ حضرات اپنے خطبوں میں جامع القرآن کے خطاب سے مخاطب کرتے ہیں' آپ نے اپنی تقریر میں' جو قران کی تاریخ ہی کے بارے میں ہے' ان کا کوئی تذکرہ نہیں فرمایا۔ مہربانی فرما کر اس کی وضاحت کریں۔

جواب۔ میں اپنی بات دہراتا ہوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ نے مسلمانوں کو ایک قرآن پر جمع کیا۔ یہ نہیں کہ انہوں نے قرآن مجید کو جمع کیا۔ قرآن مجید کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانے میں جمع کیا گیا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانے میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے جمع کردہ قرآن کو تحریری صورت دی گئی۔ کوئی نیا کام نہیں ہوا۔

۲۶سوال ۶۔ خواتین کے مبعوث ہونے کے متعلق اپنی تحقیق سے مطلع فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔

جواب۔ قرآن مجید میں ایک آیت ہے کہ خدا نے مردوں کو نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اور عورت کو نبی بنا کر بھیجنے کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے لیکن جیسا کہ میں نے اپنی تقریر میں ابھی ذکر کیا تھا کہ یہودیوں کے ہاں عورت کے نبی ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ خدا کا بیان تو یہ ہے کہ ہم نے کسی عورت کو نبی بنا کر نہیں بھیجا لیکن یہودی کہتے ہیں کہ 'نہیں' ہمارے ہاں نبیہ عورت ہوئی تھی تو اس کا فیصلہ خدا ہی کریگا۔ میرے لیے یہ مشکل ہے کہ میں اس کا فیصلہ کروں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میری بہنیں' جو یہاں موجود ہیں' الحمد للہ سب دیندار مسلمان ہیں اور کوئی بھی نبوت کے منصب کی امیدوار نہیں ہے۔

۲۷ سوال ۷۔ قرآن مجید کی وہ کون سی آیت تھی جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ کے ذہن میں تھی اور اس صحابی کا نام کیا تھا جنہوں نے اس کو فراہم کیا۔

جواب آیت ابھی میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے اور اس صحابی کا نام حضرت ہزیمہ رضی اللہ تعالی عنہ بیان کیا جاتا ہے۔

۲۸سوال ۸۔ انجیل برناباس کی صحت کے متعلق آپ کی کیا تحقیق ہے؟

جواب۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید کی تاریخ میں انجیل برناباس پر بحث کی کم ضرورت ہے۔ قصہ یہ ہے کہ برناباس حضرت عیسی علیہ السلام کے ہاتھوں دین قبول کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ اور ایک زمانے میں ان کی بڑی اہمیت تھی۔ سینٹ پال کا نام آپ نے سنا ہو گا۔ وہ حضرت عیسی علیہ السلام کے زمانے میں ان کا دشمن رہا' عیسائیوں کو تکلیف دیتا رہا' حضرت عیسی علیہ السلام کے

نموذج من مصحف طشقند المنسوب الى عثمان ، نقلا عن المنجد ، الكتاب العربي المخطوط

اس دنیا سے سفر کر جانے کے بعد ایک دن اس نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دین سچا تھا۔ اور اس دن سے وہ عیسائی بنا۔ مگر لوگوں کو اس پر اعتبار نہیں تھا۔ اکثر لوگ کہتے تھے کہ یہ منافق ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں جب یہ ہم کو تکلیفیں دیتا رہا تو اب ہم کیسے یقین کر لیں کہ وہ حقیقتاً کایا پلٹ ہو کر دین دار ہو گیا ہے۔

۲۹۔ برناباس، جن کو میں رضی اللہ عنہ کہہ سکتا ہوں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے تھے۔ انہوں نے کہا، نہیں، مجھے اطمینان ہے کہ یہ پال پکا اور سچا دین دار ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد شہر بیت المقدس میں، ایک اجتماع ہوا۔ جہاں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو قول ہے کہ میں "توریت کے ایک شوشے کو بھی تبدیل کرنے نہیں آیا ہوں آیا اس کی من و عن تعمیل کی جانی چاہئے، اس قانون کو ہم برقرار رکھیں یا لوگوں کو اپنے دین کی طرف مائل کرنے کے لیے اس میں کچھ نرمی کریں"۔ یہ یروشلم کونسل کہلاتی ہے۔ وہاں سینٹ پال کا اصرار تھا کہ اس کو باقی نہ رکھا جائے بلکہ توریت کے سخت احکامات کو نرم کر دیا جائے۔ برناباس نے اس کی مخالفت کی تھی اور اس وقت شدت سے کہا تھا کہ یہ شخص منافق معلوم ہوتا ہے لیکن عیسائیوں نے برناباس کی تازہ ترین شہادت کو قبول نہیں کیا۔ برناباس کو کونسل سے نکال دیا اور سینٹ پال کی بات کو قبول کیا۔ عہد نامہ جدید کے ایک باب میں صراحت سے لکھا ہے کہ ہم لوگوں کو روح القدس کی طرف سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اب تم پر پرانے احکام باقی نہیں رہے، سوائے چار چیزوں کے، ایک تو یہ کہ خدا کو ایک مانیں، دوسرے یہ کہ اگر کسی بت پر جانور کو ذبح کیا گیا ہو تو اسے نہ کھائیں۔ تیسرے یہ کہ فحش کاری نہ کریں۔ اسی طرح کی ایک اور چیز کا بہ صراحت ذکر ہے۔ اس کے علاوہ باقی جتنی پابندیاں اور ممانعتیں تھیں۔ اب وہ تم پر باقی نہیں رہیں۔ چنانچہ اب لوگ، عیسائی دنیا میں، سینٹ پال کی اس رائے پر عمل کرتے ہیں اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ کہ "میں توریت کا ایک شوشہ بھی تبدیل کرنے نہیں آیا ہوں اس کی من و عن تعمیل ہونی چاہیے" اس پر عمل نہیں کرتے۔

۳۰۔ انجیل برناباس، جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے، زمانہ حال کی دستیاب شدہ ایک چیز ہے۔ اس کا کوئی پرانا نسخہ نہیں ملا۔ اور وہ برناباس کی مادری زبان آرامی زبان میں بھی نہیں ہے۔ بلکہ اطالوی زبان میں ہے اور اس کے قلمی نسخے کے حاشیے پر جا بجا عربی الفاظ بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں عیسائی محققین کا خیال ہے بلکہ اصرار ہے کہ یہ مسلمانوں کی تالیف کردہ جعلی انجیل ہے اور یہ حضرت برناباس کی انجیل نہیں ہے۔ مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں ہے البتہ اس حد تک جانتا ہوں کہ انجیل برناباس کے دو نسخے ایک زمانے میں ملتے تھے۔ ایک وہ جو آسٹریا میں تھا اور

جو غالباً اب بھی محفوظ ہے۔ غالباً میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے ٹھیک علم نہیں ہے۔ دوسرا وہ نسخہ جو اسپین میں تھا۔ جب آسٹریا کا نسخہ انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا گیا تو اسپین کا نسخہ یکایک غائب ہو گیا۔ غالباً اسے ضائع کر دیا گیا بہر حال یہ مختصر سے حالات ہیں' مجھے شخصی طور پر انجیل برناباس کے متعلق معلومات نہیں ہیں۔ سوائے اس کے کہ اس میں جابجا ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو اسلامی عقائد سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں اور عیسائیوں کے جو عام عقائد ہیں' اس سے بہت کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں جانتا۔ اس کو میں شخصی طور پر کوئی زیادہ اہمیت بھی نہیں دیتا کیونکہ میرے مطالعے کا جو موضوع ہے' وہ اس سے ذرا ہٹا ہوا ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کوئی واقفیت بھی نہیں ہے۔ ادب سے معافی چاہتا ہوں۔

۳۱ سوال ۹۔ سید مودودی نے سورہ الصف کی تشریح میں برناباس کی انجیل پر بحث کی ہے کیا آپ اس کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے۔

جواب۔ یہی کہ مجھے معلومات نہیں ہیں۔

۳۲ سوال ۱۰۔ لفظ "فار قلیطس" کے متعلق وضاحت فرمائیں۔

جواب۔ فار قلیطس سے غالباً آپ واقف ہوں گے کہ یہ ایک یونانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی یونانی زبان میں Director یا رہنما کے ہیں' مسلمانوں میں یہ خیال عام ہے کہ یہ وہ لفظ ہے جس کے معنی احمد کے ہیں یعنی جس کی بہت تعریف کی جائے۔ یہ خیال مسلمانوں میں غالباً اس وجہ سے عام ہوا کہ مسلمانوں کے قدیم ترین سیرت نگار ابن اسحٰق نے ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر قدیم دینی کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فار قلیطس کا لفظ انجیل میں آیا ہے' جس کے معنی احمد کے ہیں۔ یہ تھا خلاصہ اس قصے کا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ممکن ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیشن گوئی فرمائی ہو جیسا کہ قرآن (۶۱ : ۶) نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد' پیر قلیطس اور پارا قلیطس دو یونانی لفظ ہیں ان میں تھوڑا سا فرق ہے۔ پیر قلیطس کے معنی ہیں جو حمد و ثناء کا مجسم نمونہ ہے "احمد" اور پارا قلیطس کے معنی ہیں Director یا رہنما۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ پیشن گوئی فرمائی کہ آخری نبی آئے گا جو ہادی ہو گا' یا یہ فرمایا کہ آخری نبی آئے گا جو حمد و ثناء کا مجسم نمونہ ہو گا تو نتیجہ ایک ہی ہے۔ وہ ایک پیشن گوئی کر رہے تھے کہ میں نے دین کی تکمیل نہیں کی۔ میرے بعد ایک اور نبی آئے گا' وہ اس کی تکمیل کرے گا۔ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس کی تائید انجیل کے بعض دوسرے قصوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں مجھے جلد ہی دنیا سے جانا پڑے گا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ یہ ضروری ہے کہ میں یہاں سے جاؤں تاکہ آسمانی باپ تمہیں وہ شخص

روانہ کرے جو تمہیں وہ چیزیں بیان کرے گا جو میں اب تک بیان نہیں کر سکا ہوں۔ ایسی بہت سی باتیں تھیں، جو مجھے تمہیں بیان کرنا تھیں لیکن تم میں اس کا تحمل نہیں ہے۔ وہ شخص آئے گا جو میری بھی چیزیں تمہیں دوبارہ بیان کرے گا اور وہ قیامت تک تمہارے ساتھ رہے گا۔ انجیل کی دوسری عبارتوں میں بھی کچھ اس طرح کی باتیں ہیں جن سے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے۔ اور یہ گویا خلاصہ ہے میری معلومات کا۔

۴۳ سوال ۱۱۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے کون سے سال میں قرآن کا پہلا نسخہ مدوّن ہوا۔ یہ کون سا ہجری سال تھا؟

جواب۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ بننے کے چند مہینے بعد ہی کا واقعہ ہے۔ یہ ۱۱ھ کے اواخر کا زمانہ ہو گا۔ یعنی مسیلمہ کذاب سے جو جنگ ہوئی تھی اس جنگ کے فوراً بعد کا ذکر ہے۔

۴۴ سوال ۱۴۔ احادیث مبارکہ میں مختلف آیات کی شان نزول کے متعلق جو بعض اوقات متعارض روایات ملتی ہیں، ان کو کس طرح حل کیا جائے؟

جواب۔ غالباً صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ شان نزول کے متعلق ہی نہیں اور چیزوں کے متعلق بھی اگر احادیث میں اختلاف پایا جاتا ہے، تو جس طرح ہم ان کو حل کرتے ہیں اسی طرح اس کو بھی حل کیا جا سکے گا۔ اولاً ہم دیکھیں گے کہ یہ روایت صحیح ہے یا وہ روایت صحیح ہے۔ اس کے راوی زیادہ قابل اعتماد ہیں یا اس کے راوی زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ احادیث کے تمام اختلافات رفع کرنے کا یہ طریقہ اس کے متعلق بھی استعمال کیا جائے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ شان نزول کے متعلق جو اختلاف ہیں انہیں کوئی بڑی اہمیت بھی حاصل نہیں ہے۔ ان معنوں میں فرض کیجئے ایک راوی یہ کہتا ہے کہ اقرا باسم ربك الذی خلق کے بعد سب سے پہلے سورہ "الم" نازل ہوئی۔ دوسرے راوی یہ کہتے ہیں کہ نہیں فلاں سورت نازل ہوئی تو اس اختلاف کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس سے صحابہ کی واقفیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ انہیں جیسا یاد رہا انہوں نے ویسا ہی بیان کر دیا۔ اس کے متعلق میں نے حقیقتاً غور نہیں کیا، کبھی مطالعہ نہیں کیا۔ اس لیے اس وقت اس پر اکتفا کرتا ہوں۔

۴۵ سوال ۱۳۔ ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کون تھیں؟ کیا صرف وہی حافظہ تھیں یا جناب ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی حافظ قرآن تھیں۔

جواب۔ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک انصاری عورت تھیں جو بہت پہلے ایمان لائی تھیں۔ چنانچہ ان کے متعلق لکھا ہے کہ جنگ بدر (۲ھ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے

سے روانہ ہوئے تو انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں، میں اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنا چاہتی ہوں۔ ان کے متعلق ایک اور روایت ہے جو اس سے بھی زیادہ عملی یا علمی دشواریاں پیدا کرے گی وہ یہ کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو رسول اللہ نے ان کے محلے "اہل دارہا" نہ کہ "اہل بیتھا" کی مسجد کا امام مامور فرمایا تھا جیسا کہ سنن ابی داؤد اور مسند احمد بن حنبل میں ہے اور یہ بھی کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے اور یہ کہ ان کا مؤذن ایک مرد تھا۔ ظاہر ہے کہ مؤذن بھی بطور مقتدی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہوگا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو امام بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس حدیث کے متعلق یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ شاید ابتدائے اسلام کی بات ہو اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منسوخ کر دیا ہو لیکن اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک زندہ رہیں اور اپنے فرائض سر انجام دیتی رہیں۔ اس لیے ہمیں سوچنا پڑے گا۔ ایک چیز جو میرے ذہن میں آئی ہے وہ عرض کرتا ہوں کہ بعض اوقات عام قاعدے میں استثناء کی ضرورت پیش آتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استثنائی ضرورتوں کے لیے یہ استثنائی تقرر فرمایا ہوگا۔ چنانچہ میں اپنے ذاتی تجربے کی ایک چیز بیان کرتا ہوں۔ پیرس میں چند سال پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک افغان لڑکی طالب علم کے طور پر آئی تھی۔ ہالینڈ کا ایک طالب علم جو اس کا ہم جماعت تھا، اس پر عاشق ہو گیا۔ عشق اتنا شدید تھا کہ اس نے اپنا دین بدل کر اسلام قبول کر لیا۔ ان دونوں کا نکاح ہوا۔ اگلے دن وہ لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ بھائی صاحب میرا شوہر مسلمان ہو گیا ہے اور وہ اسلام پر عمل بھی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے نماز نہیں آتی اور اسے اصرار ہے کہ میں خود امام بن کر نماز پڑھاؤں۔ کیا وہ میرے اقتدا میں نماز پڑھ سکتا ہے؟ میں نے اسے جواب دیا کہ اگر آپ کسی عام مولوی صاحب سے پوچھیں گی تو وہ کہے گا کہ یہ جائز نہیں، لیکن میرے ذہن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا ایک واقعہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہے۔ اس لیے استثنائی طور پر تم امام بن کر نماز پڑھاؤ۔ تمہارے شوہر کو چاہیے کہ مقتدی بن کر تمہارے پیچھے نماز پڑھے اور جلد از جلد قرآن کی ان سورتوں کو یاد کرے جو نماز میں کام آتی ہیں۔ کم از کم تین سورتیں یاد کرے اور تشہد وغیرہ یاد کرے۔ پھر اس کے بعد وہ تمہارا امام بنے اور تم اس کے پیچھے نماز پڑھا کرو۔ دوسرے الفاظ میں ایسی استثنائی صورتیں جو کبھی کبھار امت کو پیش آسکتی تھیں۔ ان کی پیش بندی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتخاب فرمایا تھا۔ ہمارے دوست سوال کرتے ہیں کہ کیا اور عورتیں بھی حافظ تھیں؟ مجھے اس کا علم نہیں، ان معنوں میں کہ حافظ ہونے کا صراحت کے ساتھ اگر کسی کے بارے میں ذکر ملتا ہے تو

صرف انہی کے متعلق۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وغیرہ کے متعلق میں نے کبھی کوئی روایت نہیں پڑھی کہ وہ حافظ تھیں۔ انھیں کچھ سورتیں یقیناً یاد ہوں گی اور ممکن ہے کہ بہت سی سورتیں یاد ہوں لیکن ان کے حافظ قرآن ہونے کی صراحت مجھے کہیں نہیں ملی' اس کے سواء اور میں کچھ عرض نہیں کروں گا۔

۳۶ سوال ۱۴۔ وہ صحابی جن کے پاس ایک آیت کا کچھ حصہ ملا تھا اور ان کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی شہادت دو شہادتوں کے برابر ہے۔ ان کا نام کیا ہے؟

جواب۔ حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۳۷ سوال ۱۵۔ پہلے دو نمازیں فرض تھیں تو بتائیے وہ کون سی تھیں' یعنی ان کا وقت کیا تھا؟

جواب۔ جہاں تک مجھے علم ہے صبح اور شام دو وقت کی نمازیں تھیں۔ بکرۃ عشیا نیز بکرۃ واصیلا کے جو لفظ قرآن مجید میں آتے ہیں ان سے ہم یہ قرار دے سکتے ہیں اور اس کا ذکر بھی آتا ہے کہ چاشت کے وقت' یعنی سورج طلوع ہونے کے تھوڑی دیر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے اور ایک راوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اس وقت اسلام قبول کیا جب میں تیسرا مسلمان تھا۔ ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان تھے' ایک عورت مسلمان تھی اور تیسرا مسلمان میں تھا۔ تو وہ وقت بھی بیان کرتے ہیں کہ وہ چاشت کا وقت تھا۔ ابتداء صبح و شام دو وقت کی نمازیں فرض تھیں۔ معراج کے بعد پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں۔

۳۸ سوال ۱۶۔ قرآن کریم کے نسخے کے متعلق ان احادیث اور آیات کی روشنی میں درست موقف کیا ہے جو بخاری میں "بیر معونہ" کے واقعے کے ضمن میں فقرانا القرآن اور مسلم میں ابو موسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ ہم فلاں آیت پڑھتے تھے جو بعد میں منسوخ ہو گئی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ الشیخ والشیخ انازنیا

جواب۔ سوال لمبا ہے۔ اس کا جواب خاصا وقت چاہتا ہے۔ آیا قرآن مجید میں کچھ آیتیں تھیں جو منسوخ ہو گئیں اور اب موجود نہیں ہیں؟ اور یہ بھی کہ قرآن مجید کے موجودہ نسخوں میں کچھ آیتیں ہیں جو منسوخ شدہ ہیں۔ ان کے احکام باقی نہیں ہیں۔ اس بارے میں کافی بحثیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو آسانی سے کتابوں میں مل جائیں گی جو چھپ چکی ہیں۔ آپ ان میں دیکھ لیں۔ اس بارے میں صرف ایک اہم چیز کا ذکر کرونگا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف جو روایت منسوب کی جاتی ہے' اس کا بخاری

میں بھی ذکر آیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ بعد والے مجھے کہیں گے کہ میں نے کتاب اللہ میں کسی چیز کا اضافہ کیا ہے تو میں اس عبارت کا اضافہ کرتا' (جس کا ترجمہ یہ ہے) کہ "مرد اور عورت جو بالغ ہیں اور شادی شدہ ہیں وہ زنا کریں تو انھیں رجم کیا جائے۔" کیونکہ اس پر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عمل کرتے رہے اور بعد کے زمانے میں اب تک عمل کرتے رہے ہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی شخص کہے کہ یہ قرآن میں نہیں ہے لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ لوگ میری طرف یہ بات منسوب کریں کہ میں نے قرآن مجید میں کسی چیز کا اضافہ کیا۔ بخاری کے الفاظ میں قرآن کا لفظ نہیں بلکہ وہاں کتاب اللہ کا لفظ ہے کہ کتاب اللہ میں یہ چیزیں پائی جاتی تھیں۔ اس کی بعض لوگوں نے تفسیر کی ہے اور مجھے بھی وہ چیز بھائی ہے کہ کتاب اللہ سے مراد خدا کے احکام (Prescriptions of God) ہیں۔ چنانچہ توریت اور انجیل بھی کتاب اللہ ہیں اور ان میں یہ ذکر آج تک صراحت سے موجود ہے کہ شادی شدہ لوگ (مرد اور ایک اجنبی عورت) زنا کریں تو انھیں رجم کی سزا دی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "اللہ کے احکام میں یہ چیز پائی جاتی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کرایا لہٰذا اس کو میں قرآن مجید میں داخل کر دیتا۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ نہیں کہ قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت پائی جاتی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ "اللہ کے احکام میں یہ چیز پائی جاتی تھی" ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

۳۹ سوال ۱۷۔ کیا قرآن کریم کے دور میں 'صحابہ کے عہد میں 'اجتہاد یا ذاتی رائے کا وجود ملتا ہے؟

جواب۔ یہ سوال واضح نہیں ہے کیونکہ قرآن الگ چیز ہے اور صحابہ کا دور بعد کی چیز ہے۔ آپ چاہیں تو مجھ سے شخصی طور پر بعد میں گفتگو کر سکتے ہیں۔

۴۰ سوال ۱۸۔ اہل کتاب کی کتابوں سے تفسیر قرآن کا کام کس حد تک لیا گیا ہے؟

جواب۔ قرآن میں جہاں اجمالی بیان آیا ہے' تفصیل نہیں ہے' تو ہماری تفسیروں میں کہیں کہیں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے مثلاً کسی نبی کا قرآن میں صرف نام آیا ہے اور اگر توریت و انجیل میں تفصیلی قصہ موجود ہے تو اس کو ہمارے مفسروں نے بیان کیا ہے اور ان میں غالباً سب سے اہم نام البقاعی ہے۔ انھوں نے ایک ضخیم تفسیر لکھی ہے جو اب چھپ بھی رہی ہے۔ غالباً آٹھ یا دس جلدیں چھپ چکی ہیں اور ابھی آدھے سے زیادہ چھپنا باقی ہیں۔ وہ اس طرح کے بہت طویل اقتباسات دیتے ہیں۔ قدیم زمانے میں توریت اور انجیل کا عربی ترجمہ ہو گیا تھا' جو اس کتاب میں ملتا ہے۔ اگر آپ اس کا مقابلہ' بیروت کے حالیہ شائع شدہ توریت اور انجیل کے عربی ترجمے سے کریں تو وہ اتنا بھونڈا ہے اور اس کی عربی اتنی خراب ہے کہ اسے پڑھنے کو جی نہیں

چاہتا۔ تفسیر البقاعی میں جو آیتیں توریت اور انجیل کی نقل ہوئی ہیں' انھیں اگر کوئی صاحب جمع کریں تو کم از کم ۱۰۰' ۲۰۰ صفحے کی ضخیم جلد بن سکتی ہے۔ ان سے ہمارے مفسروں نے اس کی صحت پر اصرار کیے بغیر استفادہ کیا ہے۔ خود بخاری میں صراحت کے ساتھ ایک حدیث آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اہل کتاب کی باتوں کو تم روایت کر سکتے ہو"۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "تم نہ تو اسے قبول کرو' اور نہ اسے رد کرو۔ اور کہو کہ ہم اللہ کی بات پر یقین کرتے ہیں"۔ اگر اس سے استفادہ کیا جائے تو شرعی نقطہ نگاہ سے کوئی امر مانع نہیں۔

۴۱ سوال ۱۹ ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرئیل امین علیہ السلام نے نماز کا طریقہ بتلایا۔ نماز کے طریقے پر تحقیق کیا ہے؟ کون سا طریقہ نماز درست ہے؟ مختلف فرقوں مثلاً شیعہ یا سنی طریقوں میں فرق کیوں ہے؟

جواب۔ میں نے یہ ذکر بلاذری کی "انساب الاشراف" میں پڑھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرنا بھی سکھایا تھا' طہارت اور استنجے کا طریقہ بھی بتایا تھا اور نماز پڑھنا بھی سکھایا تھا۔ شیعہ اور سنی نمازوں میں جو فرق ہے میری دانست میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ مالکی مذہب کے لوگ' جو سنی ہی ہیں۔ وہ بھی ہاتھ چھوڑ کر اسی طرح نماز پڑھتے ہیں جس طرح شیعہ پڑھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس طرح پڑھا اور کبھی دوسری طرح پڑھا۔ کوئی ۶۵ سال پہلے کا واقعہ ہے یا اس سے بھی زیادہ ۶۷ سال پہلے کا۔ میں پرائمری اسکول میں تھا۔ ایک دن ہمارے ہیڈ ماسٹر کلاس میں آئے اور معلوم نہیں کس بنا پر ہر ایک سے پوچھنے لگے' تمھارا نام کیا ہے؟ طلباء میں ہندو بھی تھے اور کچھ مسلمان بھی تھے۔ مسلمانوں سے پوچھا تم کس فرقے سے ہو؟ ان میں شیعہ بھی تھے اور سنی بھی تھے۔ اس وقت انہوں نے ایک جملہ کہا جو آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ میں اسے بھول نہیں سکا۔ انہوں نے کہا' بچو اس پر کبھی نہ جھگڑنا۔ شیعہ اور سنی بھائی بھائی ہیں۔ دونوں مسلمان ہیں۔ اصل میں ان میں جو فرق ہے وہ ایک مصلحت سے ہے۔ اللہ میاں کو اپنے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اس قدر محبت تھی کہ اس نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر سنت کو قیامت تک محفوظ رکھے۔ رسول اللہ نے کبھی یوں نماز پڑھی اور کبھی دوسری طرح پڑھی۔ اگر سارے لوگ ایک ہی طریقے سے پڑھیں تو دوسرے طریقے سے پڑھی ہوئی رسول اللہ کی نماز غائب ہو جائے گی۔ لہٰذا ان کی ایک سنت پر یہ لوگ عمل کر رہے ہیں اور دوسری سنت پر وہ لوگ' لیکن دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت پر عمل کر رہے ہیں۔ خدا حافظ

خطبہ ۲

تاریخ حدیث شریف

محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ کرام! برادران و ہمشیرگان!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

۴۲۔ جیسا کہ ابھی اعلان کیا گیا' آج کی تقریر کا موضوع تاریخ حدیث ہے۔ قرآن مجید کے بعد حدیث کا ذکر ناگزیر ہے' اس لیے کہ یہی دو چیزیں ہیں جو اسلام کا محور ہیں۔ شاید یہ نامناسب نہ ہو گا اگر میں شروع ہی میں تاریخ کے اس پہلو پر نظر ڈالوں کہ حدیث کی اہمیت کیا ہے اور یہ کہ حدیث اور قرآن کا ایک دوسرے کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے؟ ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں اور کچھ نہیں تو دس پندرہ جگہ صراحت کے ساتھ' مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانو مثلاً ما اتا کم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا (جو تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے دیں اسے لے لو اور جس سے وہ تمھیں منع کریں اس سے رک جاؤ) (۵۹:۷) اس سے بھی زیادہ زوردار صراحت کے ساتھ ایک اور آیت ہے: من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے وہ گویا خدا ہی کی اطاعت کرتا ہے (۴:۸۰) تو یہ آیت نیز اس طرح کی دوسری آیتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ قرآنی تصور میں حدیث کوئی کم درجے کی چیز نہیں بلکہ ایک لحاظ سے اس کا درجہ قرآن کے برابر ہی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک سفیر کسی بادشاہ کی طرف سے دوسرے بادشاہ کے پاس ایک خط لے کر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خط میں زیادہ تفصیلیں نہیں ہوں گی لیکن جس مسئلے کے لیے سفیر بھیجا جاتا ہے اس مسئلے پر جب گفتگو ہو گی۔ تو سفیر کا بیان کیا ہوا ہر ہر لفظ بھیجنے والے بادشاہ ہی کا پیغام سمجھا جائے گا۔ اس مثال کے بیان کرنے سے میرا منشاء یہ ہے کہ حقیقت میں حدیث اور قرآن ایک ہی چیز ہیں دونوں کا درجہ بالکل مساوی ہے۔ ایک مثال سے میرا مفہوم آپ پر زیادہ واضح ہو گا۔ فرض کیجئے کہ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور ہم میں سے کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کرے اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر یہ جاہل شخص اگر کہے کہ یہ تو قرآن ہے خدا کا کلام' میں اسے مانتا ہوں مگر یہ آپ کا کلام ہے اور حدیث ہے یہ میرے لیے واجب التعمیل نہیں ہے' تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا فوراً ہی اس شخص کو امت سے خارج قرار دے دیا جائے گا اور غالباً" اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

وہاں پر موجود ہوں تو اپنی تلوار کھینچ کر کہیں گے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت دیجئے کہ میں اس کافر و مرتد کا سر قلم کردوں۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ کہنا کہ یہ آپ کی نجی بات ہے اور مجھ پر واجب العمل نہیں ہے گویا ایک ایسا جملہ ہے جو اسلام سے منحرف ہونے کا مترادف سمجھا جائے گا۔ اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی ہمیں حکم دیں اس کی حیثیت بالکل وہی ہے جو اللہ کے حکم کی ہے۔ فرق دونوں میں جو کچھ ہے وہ اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ قرآن مجید کی تدوین اور قرآن مجید کا تحفظ ایک طرح سے عمل میں آیا ہے اور حدیث کی تدوین اور حدیث کا تحفظ دوسری طرح سے۔ اس لیے تحقیق اور ثبوت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تو ثبوت کا کوئی سوال نہیں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو بھی ارشاد ہوا وہ یقینی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔ لیکن بعد کے زمانے میں یہ بات نہیں رہتی۔ میں ایک حدیث سن کر آپ سے بیان کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بالکل سچے ہیں لیکن میں جھوٹا ہو سکتا ہوں۔ مجھ میں انسانی کمزوری کی وجہ سے خامیاں ہوں گی۔ ممکن ہے میرا حافظہ مجھے دھوکہ دے رہا ہو۔ ممکن ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔ ممکن ہے میں نے غلط سنا ہو۔ کسی وجہ سے مثلاً دھیان کم ہو جانے کی وجہ سے یا کوئی چیز حرکت میں تھی اس کے شور کی وجہ سے میں نے کوئی لفظ نہیں سنا تو غلط مبحث پیدا ہو گیا۔ غرض مختلف وجوہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حدیث یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا دوسروں تک ابلاغ اتنا یقینی نہیں رہتا جتنا قرآن کا یقینی ہے۔ قرآن مجید کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں مدون کرایا اور اس کے تحفظ کے لیے وہ تدبیریں اختیار کیں جو اس سے پہلے کسی پیغمبر نے نہیں کی تھیں یا کم از کم تاریخ میں ہمیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مگر حدیث کے متعلق یہ صورت پیش نہیں آئی اور اس کی وجہ ممکن ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل مبارکہ کا یہ پہلو بھی ہو کہ آپ میں تواضع بہت تھی۔ اپنے آپ کو محض انسان سمجھتے تھے۔ انما انا بشر مثلکم یہ خیال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ غالب رہتا تھا' بہ نسبت اس خیال کے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ شاید یہ تصور رہا ہو یا کوئی اور' بہرحال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی تدوین پر وہ توجہ نہ فرمائی جو قرآن مجید کے متعلق رہی۔ اس کی وجہ ایک اور بھی ہے جو بہت اہم ہے وہ یہ کہ قرآن کریم میں وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی (۵۳: ۳، ۴) کے ذریعے سے یہ واضح کیا گیا کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے بیان کرتے ہیں وہ اپنی خواہش سے نہیں کرتے بلکہ وہ اللہ کی وحی کردہ چیز ہوتی ہے۔ اس طرح ہمیں یقین دلایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی بیان کرتے ہیں وہ خدا کی وحی پر مبنی ہوتا ہے۔ جب

وحی آتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں غلطی نہیں کرتے اسے من و عن پہنچاتے ہیں لیکن اگر وحی نہ آئے تو انتظار کرتے ہیں۔ کیونکہ وحی پیغمبر کے اختیار میں نہیں۔ جب خدا چاہتا ہے وحی کرتا ہے اور جب وہ نہیں چاہتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سوائے انتظار کے کوئی چارہ نہیں ہوتا اور وہ اپنی طرف سے کچھ کہہ کر من گھڑت طور سے اپنی بات کو وحی قرار نہیں دے سکتے۔ ہمیں حدیث میں ایسی کافی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض دنیوی معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ بھی فرماتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احکام دیے۔ صحابہ نے کہا کہ کیا یہ وحی پر مشتمل ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اگر وحی پر مشتمل ہوتے تو میں تم سے مشورہ نہ کرتا۔ ایک دوسری حدیث بہت دلچسپ ہے جو کھجور کے درختوں کے متعلق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور وہاں دیکھا کہ نر درختوں کے پھول مادہ پھول کے اندر ڈالے جاتے ہیں گویا اس عمل کی وجہ سے کھجور پیدا ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں جو حیا تھی اس کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ عمل پسند نہیں آیا اور کہا کہ نر اور مادہ کا تعلق پیدا کرنا درختوں میں مناسب نہیں ہے، بہتر ہے کہ تم یہ نہ کرو۔ لوگوں نے جب اس حکم پر عمل کیا تو کھجور کی پیداوار اس سال بہت خراب ہو گئی۔ سب لوگ آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے اس سال بیج ڈالنے (Pollination) کا عمل نہیں کیا جس کی وجہ سے کھجور پیدا نہیں ہوئی اس پر (ترمذی شریف وغیرہ کی حدیثوں کے مطابق) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ تھا انتم اعلم بامور دنیا کم (تم اپنے دنیاوی معاملات کو میرے مقابلے میں بہتر جانتے ہو) اس مثال سے یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی چیز وحی کے تحت بیان کریں تو اس کی حیثیت قرآن کے مطابق ہو گی۔ لیکن کوئی بات اپنی طرف سے بیان کریں تو وہ ایک ذہین 'ایک فہیم انسان کا بیان ہو گا' لیکن خدائی وحی نہیں ہو گی۔ انسانی چیز ہو گی اور انسانی چیز میں انسانی خامیاں ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ حدیثوں میں اس کا ذکر آتا ہے کہ کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے چار رکعت کے تین ہی رکعت کے بعد سلام پھیر لیا' یا یہ کہ بجائے دو کے تین رکعتیں پڑھ لیں' سہو ہو گیا' تو یہ انسانی بھول چوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ممکن ہے اور ایسا مصلحت الٰہی کے تحت واقع ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اسوہ حسنہ قرار دیا ہے۔ کوئی رسول اسوہ حسنہ اور کامل نمونہ اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ انسانی دائرے میں رہے۔ یعنی وہ ایسا ہی کام کرے جسے اور انسان بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر رسول "فوق البشر" بن جائے تو ہمارے لیے اسوہ حسنہ نہیں رہے گا۔ اس لیے ایسی مثالیں پیش آتی ہیں کہ فجر کی نماز کا وقت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو

رہے ہیں، بیدار نہیں ہوتے جب سورج طلوع ہوتا ہے تو سورج کی کرنوں کی گرمی اور جلن سے بیدار ہوتے ہیں یا جیسا کہ میں نے بیان کیا، کبھی نماز پڑھنے میں رکعتوں کی تعداد میں سہو فرماتے ہیں، یا اسی طرح کی چیزیں پیش آتی ہیں جن کا حکمت الٰہی کے تحت منشاء اور غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ ہمیں یقین دلایا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی انسان ہی ہیں۔ وہ جو کام کرتے رہے اس کے متعلق کبھی یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ہم نہیں کر سکتے بلکہ ہم بھی چاہیں تو ویسا ہی کام کر سکتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یاد رہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ طرز عمل یہ رہا کہ ایسے کام نہ کریں جو امت کی طاقت سے بالاتر اور ان کی استطاعت سے باہر ہوں۔ مثال کے طور پر "وصال" نامی روزے کا میں آپ سے ذکر کروں گا---- "وصال" کے معنی یہ ہیں کہ چوبیس گھنٹے کی جگہ اڑتالیس گھنٹے کا روزہ رکھا جائے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدت کے ساتھ منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ چوبیس گھنٹے کا بھی روزہ نہ رکھو بلکہ سحری کرو، اور اس پر بہت زور دیتے تھے، ایک مرتبہ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو ہمیں حکم دیتے ہیں یوں کرو مگر خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل اس کے برخلاف ہے۔ ہم بھی ویسا ہی کرنا چاہتے ہیں، تو حدیث میں ایک دلچسپ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اچھا کوشش کر کے دیکھو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوبیس گھنٹے روزہ رکھا، افطار نہیں کیا، اسے اور بڑھایا اڑتالیس گھنٹے گزرے۔ اب لوگوں کو شدید پریشانی ہوئی۔ حسن اتفاق سے شوال کا چاند ۲۹ تاریخ کو نظر آگیا اس کی وجہ سے یہ سلسلہ رک گیا ورنہ راوی اس حدیث میں یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر اس دن چاند نظر نہ آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاید ۷۲ گھنٹے کا روزہ رکھتے پھر ان لوگوں کو پتہ چلتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کرنے کی جو تم خواہش رکھتے ہو وہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔ امت کے لیے مصلحت یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کریں، یہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید میں وہ کام کرنا چاہیں جو ان کے بس کی چیز نہیں۔ ممکن ہے کوئی ایک شخص ایسا کر سکے لیکن عوام الناس ضعیف اور کمزور لوگ ہوتے ہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ غرض حدیث کی اہمیت قرآن کی اہمیت سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر ان دونوں میں فرق ہے تو اس قدر کہ حدیث کا ثبوت ہمیں اس طرح کا نہیں ملتا جس طرح قرآن کے متعلق ملتا ہے کہ متواتر چودہ سو سال سے اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک نقطے اور ایک ایک شوشے کے متعلق ہمیں کامل یقین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا جو قرآن تھا وہی اب بھی باقی ہے۔ حدیث کے متعلق ایسا نہیں ہوا۔

۴۳۔ اس تمہید کے بعد میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ قرآن کی مماثل چیزیں اور قوموں میں بھی

ملتی ہیں' مثلاً یہودیوں کے ہاں توریت اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے یا مثلاً اور قوموں کے ہاں بھی دعویٰ ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی کتابیں ہیں' تو قرآن کے مماثل الہامی کتابوں کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں' لیکن حدیث کی مماثل چیزیں دیگر قوموں میں مجھے نظر نہیں آتیں۔ بدھ مت میں ایسی چیز موجود ہے مگر اس کی اہمیت وہ نہیں ہے جو ہمارے ہاں حدیث کی ہے۔ بدھ مت کی اساسی اور بنیادی کتاب اسی قسم کی ہے جیسے ہمارے ہاں ملفوظات کے نام سے مشہور مجموعے ہیں جن میں کسی ولی' کسی بزرگ یا کسی مرشد کے اقوال کو ان کے مریدوں میں سے کسی نے قلم بند کیا ہے۔ گوتم بدھ کے ملفوظات بھی صرف ایک شخص کے جمع کردہ ہیں لیکن حدیث کے مماثل کوئی ایسی چیز نہیں ملتی کہ بہت سے اہل ایمان اپنے مشاہدات اور اپنے مسموعات کو جمع کر کے بعد والوں تک پہنچانے کی کوشش کریں' جیساکہ حدیث کے مجموعوں میں کوشش کی گئی ہے۔ یہ بات دوسروں کے ہاں مفقود ہے۔ گویا حدیث ایک ایسا علم ہے اور حدیث کے مندرجات ایسی چیزیں ہیں جن کے مماثل کوئی اور چیز دوسرے مذاہب میں ہمیں نظر نہیں آتی۔ ان حالات میں تقابلی مطالعے کا امکان باقی نہیں رہتا لہٰذا براہ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تاریخ ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

۴۴۔ حدیث کے سلسلے میں اولاً چند اصطلاحوں کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک لفظ حدیث ہے اور ایک لفظ سنت' اب یہ دونوں تقریباً مترادف الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ حدیث سے مراد وہی ہے جو سنت کا مفہوم ہے۔ یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ چیزیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کردہ امور جن کا تذکرہ کسی مشاہدہ کرنے والے کی طرف سے ہو کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا یا یوں کیا اور تیسرے وہ امور جنھیں ہمارے مؤلفین "تقریر" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی وہ امور جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا اور اس سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کسی صحابی کو کوئی کام کرتے ہوئے دیکھا اور اسے اس سے منع نہ کیا یا خاموش رہے' تو گویا اپنی خاموشی سے آپ نے اس عمل کو برقرار رکھا۔ یعنی آپ کے سکوت سے بھی اسلامی قانون بن جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فریضہ ہے کہ وہ کسی برائی کو دیکھیں تو نہی عن المنکر کریں یعنی اپنے صحابی کے کسی ایسے فعل کو جو اسلام کے مطابق نہیں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم معاف تو کر دیں گے کہ اس صحابی نے غفلت سے یا ناواقفیت سے کیا ہے لیکن اسے روکیں گے ضرور کہ آئندہ ایسا نہ کرے۔ مختصر یہ کہ حدیث سے متعلق تین چیزیں پائی جاتی ہیں' ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول' دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل' تیسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی دوسرے کے قول و فعل کو برقرار رکھنا یعنی اصطلاحی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "تقریر"۔ پہلی دو

اصطلاحوں یعنی حدیث اور سنت میں اب تو کوئی فرق نہیں لیکن ابتداء میں فرق تھا۔ حدیث کے معنی "بولنا" یعنی "قول" اور سنت کے معنی ہیں "طرز عمل" اب گویا قول اور فعل دونوں ایک ہی طرح کی چیزیں ہو گئی ہیں کیونکہ بارہا صحابہ کی نقل کردہ روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بھی ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی، مگر اس کے لیے حدیث کو حدیث اور سنت میں تقسیم کر کے ان کو الگ الگ کر کے جمع کرنا ناممکن بات تھی۔ اس لیے کثرت استعمال سے حدیث سے مراد قول بھی ہے اور عمل بھی۔ اسی طرح سنت سے مراد قول بھی ہے اور عمل بھی ہو گیا۔ اب عملاً ان میں کوئی فرق باقی نہیں ہے، جہاں تک میرے علم میں ہے۔

۴۵۔ حدیث اور قرآن کے مابین ایک تیسری چیز بھی آتی ہے اس سے بھی واقفیت ہو جانی چاہیے۔ اگرچہ اس میں اور حدیث میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے، لیکن ایک حد تک فرق ضرور ہے وہ چیز ہے حدیث قدسی۔ حدیث قدسی کے معنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ وہ حدیث جس کے شروع میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ "اللہ کہتا ہے کہ...... فلاں فلاں" یوں ہم کہہ سکتے ہیں۔ حدیث ساری ہی اللہ کے الہام پر مبنی ہے کیونکہ یہ وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحی (۵۳: ۳-۴) کی آیت کے مطابق ہے۔ لیکن اگر حدیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صراحت فرمائیں کہ "اللہ کہتا ہے کہ فلاں چیز" تو اس کو ہمارے مؤلف ایک مستقل درجے میں رکھتے ہیں اور اسے "حدیث قدسی" کا نام دیتے ہیں البتہ اس کی روایت اس کا ایک دور سے دوسرے دور تک منتقل ہونا بالکل اسی طرح ہوا جس طرح عام حدیثوں کا ہے۔ ہم ان میں کوئی فرق نہیں پاتے ہیں۔ ایسی حدیث کی ابتداء عموماً اس طرح ہوتی ہے کہ "اللہ" ضمیر متکلم کے ذریعے سے ایک امر ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایسا کروں گا تو خدا خود کلام کرتا ہے اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اس موضوع پر قدیم زمانے ہی سے متعدد مؤلفوں نے کتابیں لکھی ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں۔ بعض چھپ بھی گئی ہیں اور بعض ممکن ہے ابھی تک قلمی حالت میں موجود ہوں۔ اس موقع پر آپ کی دلچسپی کے لیے ایک واقعہ سناتا ہوں۔ پیرس میں ایک نو مسلم لڑکی آج کل اس موضوع پر اپنے ڈاکٹریٹ کا مقالہ تیار کر رہی ہے اس لڑکی کا نام عائشہ ہے۔ یہ بہت ذہین لڑکی ہے دو سال ہوئے اس نے عربی شروع کی اور اب اس درجہ کی اسے عربی آگئی ہے کہ ریاض الصالحین نامی سات آٹھ سو صفحوں کی ضخیم کتاب کا ترجمہ عربی سے اس نے فرنچ میں کر ڈالا ہے اور اب ایک مقالہ لکھ رہی ہے اس موضوع پر کہ "حدیث قدسی کیا ہے" اور ایسی حدیثوں کے اندر کیا کیا چیزیں ملتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس میں ہر چیز حدیث قدسی کے موضوع کی تشریح کے ساتھ ساتھ آئے گی۔ حدیث قدسی کے

دو چار رسالے جو دستیاب ہیں ان میں سے بھی بعض کا وہ ترجمہ کر رہی ہے تاکہ مقالہ میں شامل کر سکے۔

۴۶۔ حدیث کی دو بڑی قسمیں بیان کی جا سکتی ہیں ایک سرکاری مراسلے اور دوسرے صحابہ کا اپنے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل کا جمع کرنا۔ میں اولاً" پہلی چیز کا ذکر کروں گا یعنی سرکاری مراسلے یا سرکاری تحریریں۔ ہجرت سے پہلے ہی ہمیں چند چیزوں کا پتہ چلتا ہے مثلاً آپ واقف ہیں کہ تقریباً سنہ (۵) پانچ نبوت میں' ہجرت سے سات آٹھ سال پہلے کے میں جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کیا تو کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے حبشہ کو ہجرت کر گئے اس سلسلے میں ایک دستاویز ہمیں ملتی ہے۔ ممکن ہے آپ میں سے بعض اس سے واقف بھی ہوں کہ اس کا ذکر سیرت کی کتابوں میں آتا ہے یہ ایک خط ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا زاد بھائی جعفر طیارؓ کو دیا کہ یہ خط نجاشی کو جو حبشہ کا حکمران تھا پہنچا دیں۔ اس کے آخر میں الفاظ یہ ہیں:

"میں اپنے چچا زاد بھائی جعفر کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں اس کے ساتھ کچھ اور بھی مسلمان ہیں جب یہ تیرے پاس پہنچیں تو ان کی مہمانداری کرنا۔"

ظاہر ہے کہ خط پر تاریخ نہ ہونے کے باوجود یہ خط ہجرت حبشہ کے زمانے ہی کا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہمیں اس زمانے کی ایک اور چیز ملتی ہے جو کافی دلچسپ کہی جا سکتی ہے۔ بعض لوگوں کو اس پر حیرت بھی ہوتی ہے۔ یہ تمیم داری کا واقعہ ہے۔ تمیم داری شام کے رہنے والے ایک عیسائی تھے۔ وہ مکہ آتے ہیں' اسلام قبول کرتے ہیں اور پھر اپنے قصے بھی بیان کرتے ہیں' وہ ایک جہاز ران تھے بہت سے بحری سفر کر چکے تھے' جن کا تفصیل کے ساتھ "صحیح مسلم" میں ذکر آیا ہے۔ تمیم داری نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فوج بہت جلد میرے وطن یعنی شام کو فتح کرے گی جب یہ ہو تو مجھے فلاں فلاں گاؤں بطور جاگیر مرحمت فرمائیں۔ تاریخی کتابوں کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پروانہ لکھوایا اور اس کو دیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر مرطوم' جبرون اور (چند گاؤں کے نام ہیں) وغیرہ فتح ہو جائیں تو تمیم داری کو دیے جائیں۔ غرض یہ بھی ہجرت مدینہ سے پہلے کی تحریری چیزوں میں ایک چیز کہی جاتی ہے۔ اسی طرح کچھ اور چیزیں ہمیں ملتی ہیں۔ دوسرا مختصر دور ہجرت کا وقت ہے۔ یعنی مکہ سے مدینہ کے سفر کا دس بارہ دن کا زمانہ۔ اس زمانے میں بھی ہمیں بعض تحریری چیزوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر سراقہ بن مالک کا واقعہ ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کیا۔ چاہا کہ آپ کو گرفتار کرلے اور قریش کے ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیچ دے' کیونکہ قریش نے اعلان کیا تھا جو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرے گا اسے اتنا انعام دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس اثناء میں کئی معجزات بھی پیش آئے۔ کہتے ہیں کہ آخر میں سراقہ نے معافی چاہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف کیا تو اس پر اس نے درخواست کی کہ مجھے پروانہ امن دیا جائے۔ ہمارے راوی بیان کرتے ہیں کہ اس ہجرت کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوات قلم اور کاغذ بھی موجود تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہیوں میں لکھنا پڑھنا جاننے والا ایک غلام بھی موجود تھا جس کا نام عامر بن فہیرہ تھا۔ چنانچہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے املا کروایا' جس میں سراقہ بن مالک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امن اور پناہ دینے کا ذکر تھا۔ بعد میں سراقہ مسلمان ہو گیا اور جس وقت وہ مسلمان ہونے کے لیے آیا اس نے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ پروانہ میرے پاس ہے۔ چنانچہ اس تحریر کی اساس پر صحابہ نے انہے قریب ہونے کا موقعہ دیا۔ باوجود ہجوم کے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا اور گفتگو کی۔ اسے ہجرت کے زمانے کی تحریروں میں شامل کیا جائے گا۔ ایسی چیزیں زیادہ تو نہیں ہیں۔ غالباً" ہجرت کے دوران کی یہ واحد مثال ہے۔ مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے تو اب سرکاری تحریروں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ان میں کچھ سرکاری کاغذات ہیں اور کچھ تحریریں خالص پرائیویٹ قسم کی ہیں۔ بعض تحریریں ایسی ہیں جن کی کوئی توقع بھی نہیں ہو سکتی کہ ایسی چیزیں بھی اس زمانے میں پائی جاتی ہوں گی۔ مثلاً "صحیح بخاری" میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جتنے لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان کے نام لکھو۔ چنانچہ مردم شماری کی گئی۔ صحیح بخاری کے مطابق اس فہرست میں پندرہ سو نام لکھے گئے۔ مردوں' عورتوں' بچوں' بوڑھوں سب کی تعداد پندرہ سو تھی۔ اگرچہ بخاری کی روایت میں صراحت نہیں ہے کہ کس سال کا واقعہ ہے لیکن پندرہ سو کی تعداد ایسی ہے کہ میرے خیال میں ہجرت سے عین بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین دو سو خاندان ہوں گے تو پانچ سو کے لگ بھگ افراد ہونے چاہئیں۔ اسی طرح اس میں مدینہ منورہ کے مسلمان بھی ہوں گے تو اس طرح پندرہ سو مسلمانوں کا ہونا ہجرت کے ابتدائی سالوں کا واقعہ معلوم ہوتا ہے' بہت بعد کا نہیں' کیونکہ بعد میں مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً حجتہ الوداع میں ایک لاکھ چالیس ہزار حضرات فریضہ حج ادا کرنے کو آئے تھے تو پندرہ سو اور ایک لاکھ چالیس ہزار میں ظاہر ہے' کوئی نسبت نہیں پائی جاتی۔ مردم شماری کے علاوہ ایک اور چیز بھی ملتی ہے جس کا تعلق غالباً" سنہ اھ سے ہے اس کی بھی ہمیں کوئی توقع نہیں تھی۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ پہلے میں بتا دوں کہ یہ ایک دستور مملکت ہے۔ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ جیسا کہ معلوم ہے کہ ہجرت کے موقع پر قریش کی

اذیت کے باعث مکے کے مسلمان اور آخر میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینے چلے آئے تھے۔ اب اگر قریش چپ رہتے تو شاید مسلمان جلدی ہی اپنی مصیبت اپنی جائیداد کی تباہی' اپنے وطن سے بے وطنی وغیرہ کو بھی بھول جاتے اور نئے ملک اور نئے وطن میں نئی زندگی کا آغاز کر لیتے لیکن قریش مکہ نے ان کو چین لینے نہ دیا۔ قریشیوں کو یہ دیکھ کر کہ ان کے دشمن' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھ سے بچ کر چلے گئے ہیں' اتنی جلن ہوئی اور اتنا غصہ آیا کہ مدینہ والوں کو ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا دشمن تمھارے ملک میں آیا ہے یا تو اس کو مار ڈالو یا اس کو اپنے ملک سے نکال دو' ورنہ ہم مناسب تدبیریں اختیار کریں گے۔ ظاہر ہے کہ مدینے کے مسلمان ان میں سے کسی بات کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ آخری دھمکی یا الٹی میٹم کہ ہم مناسب تدبیریں اختیار کریں گے' اگر کوئی حکمران جاہل یا غافل ہوتا تو اس کو غیر اہم چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیتا لیکن جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوہ حسنہ بننا تھا ان کے لیے ضروری تھا کہ اپنے بعد آنے والے حکمرانوں کو بتائیں کہ ان حالتوں میں کیا کرنا چاہیے۔ یعنی دشمن خاص کر قوی دشمن سے اپنے اور اپنی قوم کے مفادات کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئیں؟ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تین احتیاطی تدابیر اختیار فرمائیں۔ پہلی تدبیر یہ تھی کہ جو لوگ ہجرت کر کے بے وطن ہو کر ایک نئے ملک میں آئے تھے اور جن کے پاس' ان کے بدن کے کپڑوں کے سوا' کوئی چیز نہ تھی' ان کی گزر بسر کا انتظام کیا۔ آپ لوگوں کو پاکستان میں مہاجرین کے مسائل کے پیش نظر اچھی طرح واقفیت ہے کہ یہ کتنا دشوار کام ہے۔ برسوں گزر جانے کے بعد بھی مہاجرین کی ساری گتھیاں' ساری دشواریاں حل نہیں ہو پائیں' اور پھر باوجود ان وافر وسائل کے جو موجودہ زمانے میں ہمارے پاس ہیں اور باوجود اس حقیقت کے کہ ہماری حکومت کی آمدنی کروڑوں روپے کی ہے' ہم مہاجرین کے مسائل آسانی سے حل نہیں کر سکے۔ پاکستان ہی میں نہیں' جرمنی وغیرہ جیسے بہت سے ممالک میں یہ واقعات پیش آئے ہیں اور ہر جگہ یہ ایک نہایت ہی دشوار اور پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ جو لوگ مدینہ آئے تھے ان کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں تھی۔ شاید چند سو آدمی ہوں گے لیکن اس زمانے میں وسائل بہت کم تھے۔ ان چند سو آدمیوں کو ایک چھوٹی سے بستی میں مستقل گزر بسر کے وسائل فراہم کر دینا آسان کام نہیں تھا۔ تقریباً اتنا ہی مشکل کام تھا جتنا کسی بڑے ملک میں آج کل مثلاً ایک ہزار کی جگہ ایک لاکھ یا دس لاکھ افراد کا آنا۔ تو ایسی ہی دشواری اس وقت پیدا ہوئی ہو گی۔ مگر اس مشکل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیاسی فراست سے ایک لمحے میں حل کر لیا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مدینہ کے ان لوگوں کو بلایا جو نسبتاً" خوشحال تھے اور ساتھ ہی مکی مہاجرین کے ان نمائندوں کو بھی بلایا جو اپنے اپنے خاندان کے سربراہ تھے۔ جب دونوں

جمع ہو گئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی سفارش کرتے ہوئے انصار سے خطاب فرمایا کہ یہ تمہارے بھائی ہیں' تمہارے ہی دین والے ہیں اور اس دین ہی کی خاطر اپنے وطن' اپنے ملک اور اپنی ہر چیز کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ اس لیے تمہارا فریضہ ہے کہ ان کی مدد کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کی کہ انصار میں سے ہر خاندان مکہ والوں کے ایک خاندان کو اپنے خاندان میں شامل کر لے۔ مواخاۃ یا بھائی چارہ کا مفہوم یہ نہیں کہ یہ کوئی طفیلی Parasite کے طور پر مفت خوری کرنے والے مہمانوں کی طرح رہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب بجائے چھوٹے خاندان کے بڑا خاندان ہو گا۔ بجائے دو آدمیوں کے چار آدمیوں کا خاندان ہو گا اور دونوں خاندان کام کریں گے۔ جب کام زیادہ کیا جائے گا تو آمدنی زیادہ ہو گی۔ آمدنی زیادہ ہو گی تو دونوں کی گزر بسر کا انتظام باسانی ہو سکے گا۔ کوئی شخص کسی خاندان پر بار نہیں بنے گا۔ اس لیے سب ہی نے یہ تجویز بخوشی قبول کرلی۔ مواخات کے اس اصول کا یہ نتیجہ نکلا کہ کئی سو خاندان ایک لمحے میں گزر بسر کے انتظامات حاصل کرنے کے قابل ہو گئے اور پھر اس کے بعد کبھی یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوا کہ کون خوش حال ہے کون بے روزگار ہے' کون پناہ دہندہ ہے اور کون باہر سے آیا ہوا مہاجر ہے۔ اس اہم کام سے فارغ ہونے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور امر کی طرف توجہ فرمائی وہ یہ کہ اس زمانے سے پہلے یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ میں کوئی ریاست یا مملکت نہیں پائی جاتی تھی۔ وہاں آبادی کا ایک گروہ تھا جو قبیلوں میں بٹا ہوا تھا۔ تقریباً پچیس تیس قبیلے تھے اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے سے اتنا ہی آزاد اور اتنا ہی خود مختار تھا جتنا آج کل کی دنیا کی بڑی سلطنتیں ہوتی ہیں اور اس خود مختاری کا نتیجہ بھی وہی تھا جو آزاد مملکتوں میں ہوتا ہے یعنی آپس میں جنگ بھی ہوتی ہے۔ ہمارے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ مدینے کے انصار درحقیقت دو بڑے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے (بلکہ دو بڑے گروہوں میں' اور ہر گروہ میں کئی قبیلے تھے) یعنی اوس اور خزرج۔ ان دونوں میں ایک سو بیس سال سے خانہ جنگیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ظاہر ہے کہ جب دو قبیلوں میں جنگ ہو رہی ہو تو دونوں کی مشترکہ حکومت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مدینہ میں ان عربوں کے علاوہ اور بھی لوگ آباد تھے۔ مثلاً یہودیوں کے قبائل وہاں تھے۔ ان کی کئی ہزار کی آبادی تھی تخمیناً" نصف آبادی یہودیوں پر مشتمل تھی اور نصف آبادی عربوں پر۔ یہودیوں کے علاوہ کچھ عیسائی بھی تھے جن کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ ایک روایت میں پندرہ' ایک روایت میں پچاس کا ذکر ملتا ہے اور یہ قبیلہ اوس کے اندر تھے۔

۴۷۔ بہر حال اس آبادی میں جس میں یکجہتی نہیں پائی جاتی تھی' ایسا انتظام کرنا کہ سب کی مشترکہ حکومت قائم ہو یہ بظاہر خیال و خواب کی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی ضرورت تھی' اس لیے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی مواخات کے ذریعے سے گزر بسر کا انتظام کرنے کے بعد جو کام کیا وہ یہ تھا کہ ان سارے گروہوں کے نمائندوں کو اپنے پاس بلایا' مسلمان بھی یہودی بھی' صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میرے والد کے مکان پر یہ اجتماع ہوا۔ اس میں یہودیوں کے نمائندے بھی تھے' عربوں کے بھی۔ عربوں میں اوس کے نمائندے بھی تھے۔ خزرج کے بھی۔ اسلام قبول کرنے والے اوس اور خزرج کے نمائندے بھی اور وہ بھی جو تاحال مسلمان نہیں ہوئے تھے' اور مہاجرین کے نمائندے بھی تھے۔ ان سب کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر غالباً" یہ فرمایا (کیونکہ صراحت نہیں ملتی کہ اجتماع میں کیا چیز شروع میں پیش آئی) کہ آپ اس وقت مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں اور بالکل ایک دوسرے سے آزاد ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک قبیلہ پر اس کا دشمن باہر سے حملہ آور ہوتا ہے تو باقی سب لوگ غیر جانبدار رہتے ہیں اور اس قبیلہ کو دشمن کی مجموعی قوت سے تنہا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اسے شکست ہو۔ پھر کچھ دنوں کے بعد دوسرے قبیلے پر کوئی بیرونی دشمن حملہ آور ہو اور اسی طرح تیسرے اور چوتھے پر تو نتیجہ یہی ہو گا کہ رفتہ رفتہ دشمنوں کے ہاتھوں سب ختم ہو جاؤ گے۔ اس لیے' کیا یہ مناسب نہیں کہ تم سب قبیلے اپنی ایک مشترکہ حکومت قائم کرو تاکہ تمھاری مشترکہ حکومت کے باعث دشمن کو بھی یہ خوف ہو کہ ہمارا ایک دشمن نہیں' بلکہ بہت سے قبیلے وہاں موجود ہیں وہ سب ہمارا مقابلہ کریں گے اور ہم اپنی تنہا قوت پر اس سارے شہر مدینہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک مشترکہ معاہدہ ہے جو دشمنوں سے تمھارے تحفظ' تمھارے معاشی اور مالی فوائد کا ضامن ہو گا۔ تجویز معقول تھی اس لیے سبھوں نے یا کم از کم اکثر قبیلوں نے قبول کر لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکثر کا لفظ صحیح ہے کیونکہ اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے کہ اوس کے چار قبیلے شروع میں اس میں شریک نہیں تھے۔

۴۸۔ بہرحال اہل مدینہ کے اجتماع کا مقصد صرف یہی نہ تھا جو میں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو گا کہ تمھاری مشترکہ قوت تم سب کی حفاظت کا باعث ہو گی۔ بلکہ ایک اور چیز بھی تھی جس کو ہم اس دستور کے اندر دیکھتے ہیں اور جس پر سب نے اتفاق کیا' وہ یہ کہ ہر قبیلے کو بہت سے امور میں حسب سابق کامل آزادی رہے گی صرف چند چیزوں کے متعلق یہ وضاحت کی گئی کہ وہ بجائے انفرادی کے مشترکہ ہوں گی اور مرکزی حکومت سے متعلق رہیں گی۔ ان مرکزی امور میں سے ایک عسکری مسئلہ بھی تھا یعنی جنگ۔ اجنبیوں سے جنگ کرنا اور صلح کرنا ناقابل تقسیم قرار دیا گیا یعنی یہ نہ ہو گا کہ جنگ صرف ایک قبیلہ سے ہو اور صلح صرف ایک قبیلہ سے ہو اور باقی لوگ اس میں شریک نہ ہوں بلکہ آئندہ سے صلح اور جنگ ناقابل تقسیم' ایک مشترکہ مسئلہ سمجھی جائے گی۔ اسی طرح انشورنس (یعنی بیمہ زندگی) کا ایک انتظام

کیا گیا جس کی تفصیل میں آگے بیان کروں گا۔ یہ سب گویا مشترکہ امور قرار پائے۔

۴۹۔ عدالت کے متعلق ایک حد تک قبائلی نظام برقرار رکھا گیا لیکن اگر فریقین مقدمہ دو مختلف قبیلوں کے ہوں تو مرکز سے رجوع کرنا ہو گا' اپیل کورٹ کو (اگر ہم اسے ایسا کہہ سکیں) مشترکہ قرار دیا گیا' یعنی جھگڑوں کے آخری فیصلے کے لیے شہر کے حکمران سے رجوع کیا جائے گا۔ اسی طرح اس میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ مذہبی آزادی ہو گی۔ یہود کے لیے یہود کا دین رہے گا' مسلمانوں کے لیے مسلمانوں کا دین' دین میں مذہب' قانون اور عدل گستری سب داخل سمجھے گئے' وغیرہ وغیرہ۔ ایک دستاویز مرتب کی گئی جو ہم تک لفظ بہ لفظ پہنچی ہے اور اس کی ۵۲ دفعات ہیں ان میں تفصیل بتائی گئی ہے کہ کیا کام انجام دینا چاہیے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ اس وقت کی اسلامی مملکت کا تحریری دستور ہے۔

۵۰۔ ابھی میں نے اشارتاً کہا کہ اس میں کچھ انشورنس کا بھی ذکر ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب شے ہے۔ قدیم زمانے میں وہ ضرورتیں جو آج پائی جاتی ہیں' نہیں پائی جاتی تھیں۔ اس زمانے کی جو ضرورتیں تھی وہ آج کل ہمارے لیے بے سود نظر آتی ہیں۔ قدیم زمانے میں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں' مدینہ منورہ میں دو مسئلے بہت اہم تھے۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص غلطی سے (یعنی عمداً" نہیں) کسی شخص کے قتل کا مرتکب ہوتا تو اسے خون بہا دینا پڑتا تھا۔ خون بہا کی رقم رواج و قانون کے مطابق اتنی زیادہ تھی کہ عملاً" ساری آبادی میں سے ایک آدھ شخص ہی اس کو ادا کر سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں کے لیے وہ ناممکن سی بات تھی' یعنی ایک سو اونٹ دینا۔ ایک سو اونٹ کی قیمت کا اندازہ یوں کیجیے کہ ایک اونٹ سو آدمیوں کے لیے دن بھر کی پوری غذا کا کام دیتا ہے۔ اس حساب سے سو اونٹ کے معنی ہوئے دس ہزار دن تک ایک شخص کو غذا مہیا کرنا۔ یہ ہوتا تھا خون بہا۔ اتنی رقم دینا یا اتنا بڑا خون بہا ادا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ سوائے مال دار سردار قبیلے کے کسی اور شخص کے لیے یہ ناممکن تھا۔ لیکن یہ واقعات روزمرہ پیش آتے تھے اس کے لیے اجتماعی انشورنس کا انتظام کیا گیا یعنی ایک قاتل ہی اس کا ذمہ دار نہ ہو گا بلکہ پوری انشورنس کمپنی اس کی ذمہ داری قبول کرے گی اور اس کی طرف سے خون بہا ادا کرے گی۔ دوسری چیز جس کی اس زمانے میں ضرورت تھی اور آج ہمارے عہد میں اس کی ضرورت عملاً" نظر نہیں آتی وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دشمن گرفتار کر کے قید کرلے تو وہ فدیہ دے کر اپنی آزادی حاصل کرتا تھا۔ یہ فدیہ بھی بہت گراں تھا یعنی سو اونٹ فدیہ دینا ہوتا تھا۔ کوئی غریب شخص گرفتار کر لیا جاتا تو اس کی رہائی کی کوئی صورت نہ ہوتی تھی۔ وہ عملاً" اپنے دشمن کا غلام بن جاتا۔ ایسے وقت میں انشورنس کمپنی کام دیتی۔ اس کی طرف سے ذمہ داری قبول کرتی اور فدیہ ادا کرتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام کیا کہ

مدینہ منورہ میں ہر ہر قبیلے میں ایک انشورنس یونٹ قائم ہو اور یہ کہا کہ تمھارے قبیلے کے کسی آدمی کو قتل یا گرفتاری کے سلسلے میں رقم ادا کرنی ہو اور وہ شخص ادا نہ کر سکے تو یہ انشورنس یونٹ ادا کرے گی اور اگر کسی یونٹ کے پاس اتنی گنجائش نہ ہو تو حکم تھا کہ اس کی قریبی محلے کی انشورنس یونٹ جو ہے وہ اس کے ساتھ تعاون کر کے رقم ادا کرے اور اگر اس کے پاس بھی نہ ہو تو دوسری یونٹ سے انتظام کیا جائے۔ جب ساری آبادی کی انشورنس یونٹیں بھی بار نہ اٹھا سکیں تو ایسی صورت میں مرکزی حکومت بھی مدد کرے گی۔ یہ ایک خاص نظام تھا جو مدینہ منورہ میں قائم کیا گیا اور اس دستور کے اندر ضبط تحریر میں لے لیا گیا۔ غرض سرکاری طور پر حدیث کے لکھوانے کی ایک مثال یہ دستور مملکت مدینہ کی دستاویز بھی ہے۔ ان ابتدائی کاموں میں ایک اور چیز یہ ہے کہ جب مہاجرین کی بسر و بود کا انتظام مواخات کے ذریعے کر دیا گیا اور اس کے بعد شہری مملکت وجود میں آ گئی یعنی ایسی مملکت جس کا رقبہ صرف ایک شہر تھا اور اس کے اندر عدالت اور قانون غرض ساری چیزوں کا انتظام کر دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی پر اکتفا نہیں فرماتے ہیں' آپ مکہ کے الٹی میٹم کے جواب میں ایک اقدام فرماتے ہیں وہ اقدام یہ تھا' کہ مدینہ منورہ کے اطراف کا آپ دورہ شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً شمال کی طرف جاتے ہیں وہاں کے قبیلوں سے کہتے ہیں تم اس وقت ایک آزاد قبیلہ ہو اور خود مختار ہو' لیکن دشمن سے مقابلہ ہو تو تنہا ہو گے۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم دونوں میں ایک حلیفی معاہدہ ہو جائے۔ تم پر کوئی دشمن حملہ کرے تو ہم تمھاری مدد کو دوڑیں گے' اگر ہم پر کوئی دشمن حملہ کرے اور ہم تمھیں بلائیں تو تم بھی ہماری مدد کو آنا۔ یہ بات ان کے دل کو لگی اور ان کے ساتھ معاہدہ ہو گیا یہ معاہدہ تحریری طور پر عمل میں آیا اور وہ ہم تک پہنچا ہے۔ پھر آپ مشرق کی طرف جاتے ہیں' پھر جنوب کی طرف' غرض مختلف علاقوں میں' مدینہ کے اطراف میں وقتاً فوقتاً دورہ کر کے ہجرت کے پہلے اور ہجرت کے دوسرے سال مختلف غیر مسلم قبائل سے حلیفی کے معاہدے کیے گئے اور یہ معاہدے تحریری صورت میں لائے گئے اس کے بعد اس کا سلسلہ اور چلتا رہا۔ غرض یہ ابتدائی نظام تھا کہ ایک طرف مدینے کے اندر امن و امان کا اور یکجہتی کا انتظام کیا جائے اور مدینے کے اطراف میں دوست قبائل کا جال پھیلا دیا جائے تاکہ دشمن اگر حملہ کرے تو اولاً اسے ہمارے آس پاس کے قبیلوں سے جنگ کرنا پڑے اور ہم محفوظ رہیں۔ یہ وہ سیاسی تدبیر تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور جس کے سلسلے میں تحریر کا بار بار ذکر آیا ہے۔

۵۱۔ اس کے بعد اور بے شمار چیزیں ایسی ملتی ہیں جو تحریراً عمل میں آئیں ان میں سے بعض چیزیں پرائیویٹ ہیں۔ مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلام خریدتے ہیں اس کا پروانہ موجود ہے کہ میں

نے یہ غلام فلاں شخص سے خریدا' اتنی رقم دی گئی۔ یا ایک غلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آزاد فرماتے ہیں' اسے آزادی کا تحریری پروانہ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو آزاد کیا جاتا ہے۔ اسے سب تسلیم کر لیں کہ یہ شخص آزاد ہے' اب آئندہ اسے غلام نہ قرار دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور چیز ذرا بعد کی ہے غالباً" ۸ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کو خط لکھتے ہیں کہ "جیسے ہی یہ پیغام رساں پہنچے زمزم کا پانی صبح ہو کہ شام فوراً اس کے ہاتھ مجھے بھیجو۔" اسی طرح مثلاً جب اسلامی مملکت توسیع پاتی ہے تو مختلف اضلاع اور صوبوں کے گورنروں کے نام پروانے بھیجے جاتے ہیں کہ فلاں کام انجام دو۔ یا گورنر خود دریافت کرتا ہے کہ اس خاص صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ تو اس کا جواب مدینہ سے بھیجا جاتا ہے۔ غرض سرکاری تحریروں کی کثیر تعداد ہے اور اس وقت ان کی تعداد جو ہم تک پہنچی ہے' کم سے کم چار سو مکتوبات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پائے جاچکے ہیں جن میں کچھ تبلیغی بھی ہیں۔ مثلاً قیصرو کسریٰ کو دین اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ کچھ حلیفی کے معاہدے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

۵۲۔ اب تحریری حدیث کا دوسرا پہلو لیجیے یعنی وہ حدیثیں جو سرکاری تحریریں نہیں ہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسے نجی طور پر مرتب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عام طور پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم امی تھے۔ لکھنا پڑھنا انھیں نہیں آتا تھا لیکن اچھے مخلص مسلمان ضرور تھے۔ جب مدینہ میں ہوتے تو اکثر مسجد نبوی میں حاضر ہوتے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو سنتے' اس پر عمل کرتے۔ لیکن ایک واقعہ پیش آیا جو غالباً" آغاز ہے حدیث کے مدون کرنے کا۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک دن ایک صحابی آئے' ان کا نام بیان نہیں ہوا ہے۔ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ روزانہ جو چیزیں' ہمیں بیان کرتے ہیں وہ بے حد دلچسپ' بے حد اہم اور ضروری ہوتی ہیں لیکن میرا حافظہ کمزور ہے' میں انھیں بھول جاتا ہوں' کیا کروں؟" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہ الفاظ فرمائے۔ استعن بیمینک (اپنے سیدھے ہاتھ سے مدد لو) یعنی لکھ لیا کرو۔ غالباً" انھوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھایا ہو گا اور لکھا ہو گا۔ ہمیں' بعد میں کیا ہوا' اس کے متعلق تفصیل نہیں ملتی۔ بعد میں ایک دوسرا واقعہ جو غالباً" اسی حکم اور "استعن بیمینک" کے الفاظ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے وہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کا واقعہ ہے۔ یہ نوجوان تھے۔ غالباً" سولہ سترہ سال کی عمر ہو گی۔ بے حد ذہین' بے حد دیندار اور علمی ذوق رکھنے والے تھے۔ ان کے علمی ذوق کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بعد میں انھوں نے سریانی زبان بھی سیکھی اور وہ عیسائیوں کی دینی کتاب انجیل کو سریانی زبان میں پڑھ بھی سکتے تھے۔ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت بھی دی تھی کہ اپنے علمی مشاغل جاری رکھیں۔ یعنی قرآن کے ساتھ بائیبل بھی پڑھ سکتے ہیں۔ غرض عبداللہ بن عمرو بن العاص جب یہ سنتے ہیں کہ

فلاں شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "استعن بیمینک" تو انھوں نے خود لکھنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی سنتے اسے فوراً نوٹ کر لیتے تھے۔ دو چار دن غالباً" اسی طرح کا واقعہ گزرا ہو گا' پھر ان کے دوستوں نے ان سے کہا "اے عبداللہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں' کبھی خوش ہوتے ہیں' کبھی خفا ہوتے ہیں' تم ان کی ہر چیز نوٹ کرتے جا رہے ہو' یہ مناسب نہیں۔" کوئی اور شخص ہوتا تو وہ ان کے کہنے پر عمل کرتا اور اسے چھوڑ دیتا' مگر وہ ذہین تھے۔ انھوں نے سوچا کہ بجائے ان سے مشورہ لینے یا ان کی بات ماننے کے کیوں نہ براہ راست اصل سے رجوع کیا جائے۔ ان کے استفسار پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' ضرور لکھو۔ اطمینان کے لیے وہ پوچھتے ہیں کہ کیا اس وقت بھی جب آپ خفا ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ ہے "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یہاں سے جو چیز نکلتی ہے (اپنے منہ کی طرف اشارہ فرمایا) وہ حق ہی ہوتی ہے۔" اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص پورے اطمینان کے ساتھ حدیثوں کو لکھتے رہے۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے مجموعہ احادیث میں کوئی دس ہزار حدیثیں تھیں اور اس کے بعد ان کے بیٹے اور ان کے پوتے اس قلمی نسخے کی مدد سے دوسرے لوگوں کو حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عمرو بن شعیب بن عبداللہ بن عمرو بن العاص مشہور محدث گزرے ہیں۔

۵۳۔ ایسی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ابو رافع ایک آزاد شدہ غلام تھے وہ بھی ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کے کہتے ہیں کہ کیا میں آپ کی حدیثوں کو لکھ سکتا ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بھی اجازت دے دی۔ انھوں نے بھی مجموعہ تیار کیا ہو گا۔ ان میں سب سے اہم حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کا قصہ یہ ہے کہ ہجرت کے وقت ان کی عمر دس سال کی تھی۔ بہت کم سن بچے تھے لیکن ایک ایسے بچے جس کے والدین نہایت مخلص مسلمان تھے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود فرماتے ہیں کہ جب مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میری والدہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا اور بہت ہی فخر کے ساتھ کہنے لگیں "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا بچہ لکھنا پڑھنا بھی جانتا ہے۔" ٹھیک اسی طرح جیسے آج ہم آپ کہیں کہ میرا بیٹا ڈاکٹریٹ یعنی پی ایچ ڈی کی ڈگری لے چکا ہے۔ غرض بڑے فخر سے بیان کرتی ہیں اور پھر کہتی ہیں۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری عزت افزائی کا باعث ہو گا اگر اسے آپ خادم کے طور پر قبول کر لیں۔" حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میری والدہ کی درخواست کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا چنانچہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کی وفات تک رہا۔ اس دس سال کے عرصہ میں میں ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان ہی میں رہا۔ صبح شام وہیں رہتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری و باطنی زندگی کو دیکھتا۔ مسجد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے ہیں وہ بھی دیکھتا' مکان کے اندر اپنی ازواج مطہرات سے کس طرح برتاؤ کرتے ہیں' کیا کھاتے ہیں' کس طرح سوتے ہیں' غرض ہر چیز کا میں مشاہدہ کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت' جو ان کو حاصل تھی' بڑے سے بڑے صحابہ مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی میسر نہیں آ سکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اس قدر قریب سے دیکھیں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کے زمانے میں مسلمانوں کی جماعت کی تعداد بڑھی اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا تو میرے پاس بہت سے شاگرد آیا کرتے تھے۔ اس بارے میں ان کی روایت کے دو الفاظ ہیں "اذا کثروا" (جب ان کی تعداد زیادہ ہوتی اور "اذا اکثروا" (جب وہ زیادہ اصرار کرتے)۔ بہرحال جو بھی صحیح ہو۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایسے موقع پر میں ایک صندوق میں سے ایک پرانا رجسٹر یا پرانی کتاب نکالتا اور اپنے شاگردوں کو بتاتا اور کہتا کہ یہ وہ چیز ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نوٹ کی ہے اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں وقتاً فوقتاً پیش بھی کیا ہے۔ میری تحریر میں اگر کوئی خامی یا غلطی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اصلاح فرما دیتے۔ یہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مجموعہ ہے جو یقیناً کئی ہزار حدیثوں پر مشتمل ہو گا۔ یہ ایک ایسی حدیث کی کتاب کہی جا سکتی ہے جو صحیح ترین حدیث کی کتاب ہے' کیونکہ لکھنے کے بعد خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر نظر ثانی فرماتے' یعنی سن کر اس کی اصلاح فرماتے ایسی اور مثالیں بھی ملتی ہیں۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حدیث کی تدوین ہو رہی تھی۔ بخاری شریف میں دو ہزار سے زیادہ حدیثیں نہیں ہیں اور بعض روایات کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے مجموعہ احادیث میں دس ہزار حدیثیں تھیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنی کثیر حدیثیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تحریری طور پر مدون ہو چکی تھیں۔ بدقسمتی سے وہ سب کی سب ہمارے پاس کتابی صورت میں نہیں پہنچیں بعد کے مولفوں نے ان کو تتر بتر کر دیا ہے۔ یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں میں سے ایک حدیث کو ایک باب میں دوسری حدیث کو دوسرے باب میں تحریر کیا ہے۔ اس طرح ان کا جو اصل مجموعہ تھا وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ بہرحال یہ بالکل واضح ہے کہ عہد نبوی میں حدیثوں کی جمع و تدوین کا آغاز ہو چکا

تھا اور اس میں اضافہ بھی ہو تا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم کو ایسے صحابہ کی تعداد روز افزوں نظر آتی ہے جو اپنی یادداشتوں کو مدون کرنا ضروری سمجھتے تھے۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انھیں خیال نہیں آیا' اب انھیں احساس ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باقی نہ رہے' میں بھی آج نہیں کل مرنے والا ہوں' اگر میں اپنی یادداشتوں کو محفوظ نہ کر سکتا تو یہ سب ضائع ہو جائیں گی۔ کم از کم میں خود اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تحریر کر لوں۔ چنانچہ ایسی متعدد کتابوں کا ذکر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے۔ حضرت سمرہ بن جندب' حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے بہت سے صحابہ تھے جنھوں نے کتابیں اور رسالے لکھ ڈالے۔ ان مجموعہ ہائے حدیث میں سے ایک کے متعلق ابن حجر نے لکھا ہے۔ "فیہ علم کثیر" (اس میں بہت علم ہے)۔ ایک اور رسالے کے متعلق لکھا ہے کہ بہت ضخیم تھا۔ یہ جمع حدیث کی ایک صورت ہوئی۔ ایک دوسری صورت تدوین حدیث کی یہ ہے کہ لوگ صحابہ سے لکھ کر پوچھتے تھے۔ مثلاً ایک شخص کو کسی مسئلے کے متعلق کچھ دریافت کرنا ہے تو وہ کسی بزرگ صحابی کو' اس خیال سے کہ ممکن ہے وہ جانتے ہوں' ایک خط لکھتا ہے۔ وہ صحابی جواب میں حدیث لکھ بھیجتے ہیں کہ ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کرتے دیکھا ہے۔ غرض خط و کتابت کے ذریعے سے حدیث کی تدوین اور حدیث کی تعلیم کا یہ سلسلہ ہمیں نظر آتا ہے اور اس میں ایسی بڑی شخصیتیں بھی ہیں جیسے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ ان کے ہاں اکثر خطوط آیا کرتے تھے اور وہ جواب لکھوا بھجتیں۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسرے صحابی ہیں اور ان کے متعلق صحیح بخاری میں یہ مذکور ہے کہ ان کے پاس ایک خط آیا جس کا انھوں نے جواب لکھ بھیجا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی حال تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ وقت ان سے لکھ کر دریافت کرتے کہ اس بارے میں آپ کی کیا معلومات ہیں۔

۵۴۔ اب میں ایک اور خاص پہلو کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے جب حدیثوں کو اس طرح لکھ کر مدون کرنا شروع کیا اور ان کی تعلیم اپنے زمانے کے نوجوان مسلمانوں کو دینے لگے تو ابتداءً صحابہ کے ناموں کے تحت حدیثیں مدون ہوئیں۔ مثلاً میں اپنے شہر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی کے پاس جا کر سبق لیتا ہوں اور ان سے سنی ہوئی حدیثوں کو جمع کرتا ہوں۔ دوسرے شہر میں رہنے والے صحابہ سے مجھے استفادہ کا موقع نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداءً صحابہ وار حدیثیں جمع ہوتی رہیں۔ صحابہ کے بعد کے دور میں ایک ہی شخص کئی استادوں سے درس لیتا ہے۔ مثلاً وہ ابو ہریرہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے شاگرد سے درس لینے اور اس کی روایت کردہ ساری حدیثوں کو قلم بند کرنے کے بعد ایک دوسرے صحابی کے شاگرد کے پاس جاتا ہے اور اس سے اس کی حدیثیں سنتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ دو تین نسلوں کے بعد ساری حدیثیں علماء کے علم میں آ گئیں۔ ایک اور چیز کا ذکر کرتا چلوں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ہے اور ان کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے صحابی ہیں جو دیر سے مسلمان ہوئے یعنی سنہ ۷ ہجری میں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تین چار سال پہلے اسلام لائے۔ اس کے باوجود اُن سے بے شمار حدیثیں مروی ہیں۔ اس کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ "دیگر صحابہ مثلاً ابوبکر' عمر' عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور فلاں فلاں صحابی سارا دن اپنے کاروبار میں لگے رہتے' اپنی تجارت اور اپنی دکان میں مصروف رہتے۔ میں پیٹ بھر ابن کر مسجد نبوی کے اندر پڑا رہتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو سننے کا جتنا موقع مجھے ملتا' اتنا بڑے بڑے صحابہ کو بھی نہ ملتا' ان کا حافظہ بھی بڑا اچھا تھا' علمی ذوق بھی تھا' لکھنا بھی آتا تھا۔ انھوں نے بہت سی حدیثیں لکھیں۔ چنانچہ ان کے ایک شاگرد حسن بن عمرو بن امیہ ضمری نے ایک دن غالباً" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیرانہ سالی کے زمانے میں' اپنے استاد سے کہا کہ "استاد محترم آپ نے فلاں چیز بیان کی تھی"؟ انھیں یاد نہیں تھا مکر گئے۔ نہیں صاحب میں نے کبھی یہ نہیں کہا ایسی کوئی حدیث مجھے بالکل یاد نہیں۔ نہیں استاد' آپ نے ہی ہم سے یہ چیز بیان کی ہے۔ اس پر ان کا بیان ہے کہ استاد نے میرا ہاتھ پکڑا' اپنے گھر کی طرف چل دیے اور راستے میں یہ کہتے چلے اگر واقعی میں نے وہ حدیث تم سے بیان کی ہے تو وہ میرے پاس تحریری صورت میں موجود ہونی چاہیے۔ چنانچہ گھر لائے' اپنی الماری سے ایک جلد نکالی ورق گردانی کی پر نہیں ملی پھر دوسری جلد اور پھر تیسری جلد میں نظر دوڑائی۔ پھر اس کے بعد یک بہ یک خوشی کی حالت میں پکار اٹھے کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اگر میں نے بیان کیا ہے تو وہ میرے ہاں تحریری صورت میں موجود ہونا چاہیے۔ دیکھو یہ موجود ہے۔ واقعی ٹھیک ہے۔ ابن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مزید برآں الفاظ یہ ہیں: "ارانا کتبا کثیرۃ من الحدیث" (ہمیں ابو ہریرہ نے حدیث کی بہت سی کتابیں دکھائیں) یعنی میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہت سی کتابیں ان کے گھر کے کتب خانے میں دیکھیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرز عمل عالمانہ اور بہت دلچسپ تھا۔ ان کے پاس جو شاگرد آتے' سارے شاگردوں کو وہ ایک ہی چیز نہیں پڑھاتے تھے۔ ہر شاگرد کو الگ الگ حدیثیں پڑھاتے تھے۔ چنانچہ جب ہمام بن منبہ ان کے پاس آتے ہیں تو ان کو ایک خصوصی رسالہ سو ڈیڑھ سو حدیثوں کا مرتب کر کے دیتے ہیں۔ جو "صحیفہ ہمام بن منبہ" کہلاتا ہے۔ ایک دوسرا شاگرد آتا ہے' اس کے لیے ایک نیا مجموعہ تیار کرتے ہیں جو اس شاگرد کے نام سے

منسوب ہوا۔ غرض حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ ہزاروں حدیثیں انھیں حفظ تھیں اور اپنے متعدد شاگردوں کو انھوں نے جو رسالے لکھ دیے تھے وہ آج تک محفوظ چلے آ رہے ہیں۔

۵۵۔ بعض حدیثوں میں ذکر ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ حدیث کو مت لکھو اور بعض حدیثوں میں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا' صراحت کے ساتھ حکم ہے کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو یعنی انھیں ضرور لکھو کیونکہ اس منہ سے کوئی چیز جھوٹی نہیں نکل سکتی۔ ان باتوں کے تضاد کو کیسے دور کریں گے؟ اس بارے میں اب ہمارے لیے کوئی دشواری باقی نہیں رہی۔ مختصر قصہ یہ ہے کہ ایسے متعدد صحابہ ملتے ہیں جن کا بیان ہے کہ حدیث کو نہیں لکھنا چاہیے۔ لیکن وہ اس امر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ حدیث کو مت لکھو۔ جو صحابی اپنی رائے بیان کرتے ہیں اس پر ہمیں بحث کرنے کی ضررت نہیں لیکن جو صحابہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ حکم دیا کہ نہ لکھیں' اس پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں تین صحابی ملتے ہیں۔ ایک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ خود انھوں نے حدیث کی کثیر کتابیں لکھ رکھی تھیں' دوسرے حضرب زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور تیسرے ابو سعید الخدری' جہاں تک زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کا تعلق ہے ہمارے ماہرین حدیث اس کو رد کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ درمیان کے راوی ثقہ نہیں ہیں۔ انھوں نے غلطی کی ہے۔ علم حدیث کے اصول کی رو سے یہ حدیثیں قابل قبول نہیں ہیں۔ صرف ابو سعید الخدری کی حدیث اصول کی رو سے بہت اہم ہے۔ کیونکہ "صحیح مسلم" جیسی حدیث کی صحیح کتاب میں یہ موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہا کہ مجھ سے کوئی حدیث نہ لکھو اور اگر لکھ چکے ہو تو اسے مٹا ڈالو۔ اس حدیث کی موجودگی میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کسی سیاق و سباق Context میں خاص حکم سے متعلق تھا یا کوئی عام حکم تھا؟ ہمارے دوست' مصطفیٰ الاعظمی حدیث کے ایک ماہر استاد' جو آج کل ریاض یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں' انھوں نے ایک دلچسپ تحقیق کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "صحیح مسلم" میں جو حدیث آئی ہے امام بخاری اسے رد کر دیتے ہیں۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ یہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت میں یہ ابو سعید االخدری کی ذاتی رائے تھی جو کسی درمیانی راوی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔ ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم کہ حدیثیں نہ لکھو' اس کا اصول حدیث کی رو سے کوئی ثبوت نہیں۔ اگر فرض بھی کرلیں کہ کسی وقت حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی تھی تو اس کا حل آسان ہے۔ غالباً" کسی خاص سیاق و سباق Context میں یہ حکم صادر ہوا تھا کیونکہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال موجود ہے۔ وہ نہایت ہی دین دار اور حدیث پر عامل شخص تھے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی ممانعت کی ہوتی تو وہ کبھی جسارت نہ کرتے کہ حدیث کی بہت سی کتابیں خود لکھ ڈالیں۔ ممکن ہے کسی خاص موقع پر یا کسی خاص وجہ سے منع کیا گیا ہو اور اس واقعہ کے مطابق اسے نہ لکھا گیا ہو۔ مثلاً ایک معین دن کی حدیثوں کو نہ لکھا اور بعد میں عام اجازت کے تحت لکھ ڈالا۔ غرض کوئی خاص سیاق و سباق Context ہو گا۔ مثلاً کسی دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا کہ حدیث میں اس کا ذکر آتا ہے' قیامت تک پیش آنے والے واقعات کو مسلمانوں سے بیان فرمایا کہ تم فلاں ملک فتح کرو گے' ایسے علاقوں میں جاؤ گے' ایسے ایسے امور پیش آئیں گے۔ غرض کبھی قیامت تک پیش آنے والی باتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔ اس سلسلے میں یہ بیان بھی موجود ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب یہ مقدر ہیں تو پھر ہمیں کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوشش کرنا بھی مقدر ہے' ایسا کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ ان باتوں کو مت لکھو کیونکہ بعض صحابہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ کہہ دیتے تھے کہ جب مقدر ہو چکا ہے تو کوشش کرنے کی کیا ضرورت؟ یا کوئی اور وجہ ہوئی ہو گی۔ حضرت زید بن ثابت کی طرف بھی بعض کتابیں منسوب ہیں۔

۵۶۔ ایک آخری نکتہ ہے جس پر میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں' وہ یہ کہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے مقرب ترین صحابہ نے حدیث کے متعلق کیا کام کیا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ روایت ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد' انھوں نے اپنی بقیہ مختصر زندگی کے دو ڈھائی سال کے عرصے میں حدیث کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ جس میں پانچ سو حدیثیں تھیں۔ لکھنے کے بعد ان کو وہ اپنی بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سپرد کرتے ہیں۔ میرا گمان یہ ہے کہ شاید بیٹی ہی نے فرمائش کی ہو کہ "ابا جان مجھے کچھ حدیثیں کتابی صورت میں لکھ دیجئے" کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو علم کا بے پناہ ذوق شوق تھا۔ بیٹی کی تمنا پر حدیثیں مرتب کیں اور انھیں دے دیں۔ مگر اس رات کو وہ حضرت عائشہ ہی کے مکان میں لیٹے اور سو نہ سکے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ میرے ابا جان ساری رات کروٹیں بدلتے رہے' مجھے خوف ہوا کہ وہ بیمار ہیں۔ بالآخر صبح کو بھی میں نے جسارت نہیں کی کہ خود پوچھوں کہ کیا آپ بیمار ہیں۔ خود ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ "بیٹی! میں نے تمھیں جو کتاب دی ہے

وہ لے آنا۔ میں لائی تو اسے فوراً پانی سے دھو کر مٹا دیا اور کہا۔ "اس میں بعض حدیثیں وہ ہیں جو میں نے خود سنی ہیں۔ ان کے متعلق مجھے یقین ہے۔ بعض کو میں نے کسی اور صحابی سے سنا تھا۔ مجھے جھجک اور خوف ہے کہ شاید وہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی ایسا لفظ منسوب کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ ہو اور کسی بالمعنی روایت کے تحت آیا ہو۔ مگر اس حدیث کا یہ پہلو بہت اہم ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے کی ممانعت کی ہوتی تو یقیناً حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس سے واقف ہوتے اور وہ لکھنے کی جسارت نہ کرتے۔ لکھنے کے بعد آپ کا مٹانا اس بناء پر نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت کی تھی بلکہ اس بنا پر تھا کہ انھیں خوف تھا کہ کہیں صحیح حدیث میں کمی بیشی نہ ہو جائے۔

۵۷۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بھی ایسی ایک روایت ملتی ہے۔ ایک زمانے انھوں نے حدیث کو مدون کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔ انھوں نے لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ سب کا مشورہ یہی تھا کہ "لکھنا چاہیے۔" مگر کافی عرصہ بحث مباحثہ اور مشورہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ نہیں لکھنا چاہیے۔ اور کہا ہم سے پہلے کی امتوں نے انبیاء اقوال پر عمل کیا' ان کو محفوظ رکھا لیکن خدا کی نازل کردہ کتاب کو بھول گئے۔ اس کی تحریفیں ہونے لگیں۔ میں نہیں چاہتا کہ قرآن کے متعلق بھی یہ سانحہ پیش آئے۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث کی تدوین کا جو ارادہ فرمایا تھا' اس سے یہ یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی ممانعت نہیں ہوئی ورنہ وہ لکھنے کا ارادہ نہ کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نہ لکھنے کی وجہ ایک دوسری ہی تھی کہ لوگ قرآن سے غافل نہ ہو جائیں۔

۵۸۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک دن فرمایا: "جسے ایک درہم خرچ کرنے کی توفیق ہے وہ کاغذ خرید لائے' میں حدیثیں لکھواتا ہوں' لکھ لے' ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب بازار جا کر ایک درہم میں کاغذ کی ایک گڈی خرید لائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت سی چیزیں لکھوائیں اور وہ ان کے پاس محفوظ رہیں۔ اس قصے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے کی ممانعت نہیں کی ورنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے اصحاب کبار حدیث لکھنے یا لکھوانے کی جسارت نہیں کر سکتے تھے۔

سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

۵۹۔ کچھ سوالات جو آپ کی طرف سے آئے ہیں ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال ا۔ مسلمانوں کی حدیث کی کتابوں میں اختلاف کیوں ہے۔ مثلاً اہل سنت کے نزدیک "صحاح ستہ" اور دوسری کتب ہیں' لیکن اہل تشیع ان سب کے منکر ہیں اور ان کی اپنی حدیث کی کتب ہیں۔ ان اختلاف کی وجہ نیز "حق" کی وضاحت فرمائیں؟

جواب۔ آپ نے بڑا مشکل سوال کیا ہے۔ اگر ایک ہی فرقے کی چیزیں ہوں تو آدمی آسانی سے جواب دے سکتا ہے۔ جب فرقہ داری مسئلہ بن جائے تو میں ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں ایک فرقے سے تعلق رکھوں اور دوسرے فرقے پر اعتراض کروں خاص کر اس کی غیر موجودگی میں کہ اسے جواب کا موقع نہ ہو' تو ذرا یہ علمی نقطہ نظر سے ٹھیک نہیں ہوتا۔ بہر حال جس حد تک ممکن ہے۔ مختصر الفاظ میں آپ کو اس کا جواب دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے اشارۃ" ذکر کیا' حدیثوں کو مدون کرنے اور ان کو محفوظ کر کے ایک نسل کے بعد دوسری نسل تک پہنچانے کا عمل سرکاری نگرانی میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوا' نہ خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں بلکہ اسے پرائیویٹ طور پر مختلف افراد اپنی ذاتی ذمہ داری پر یہ کام کرتے رہے۔ پھر ایک استاد کے درس میں آنے والے۔ بالفرض دس پندرہ شاگرد تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی صلاحیتیں یکساں نہیں ہو سکتیں۔ ایک ہی استاد کی بیان کردہ حدیث کو اس کے سامعین میں سے دو شخص روایت کرتے ہیں اور اس انفرادی فرق کی وجہ سے اس میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے جس کو روکا نہیں جا سکتا۔ خصوصا" اس وجہ سے کہ بعض وقت لفظ بہ لفظ حدیث کی روایت کرنے کی جگہ اس کا خلاصہ یا اس کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ ایسے نازک مقامات بھی آتے ہیں کہ لفظ کے بدلنے سے مفہوم میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کا حافظہ اچھا ہوتا ہے' دوسرے کا حافظہ کمزور ہوتا ہے یا کسی ایک شخص کا ایک زمانے میں حافظہ ٹھیک ہے' اس کے بعد مثلاً بڑھاپے کی وجہ سے اس کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے اور اس کے باوجود اپنے تدریسی کام کو جاری رکھتا ہے۔ انھی وجوہ سے حدیثوں میں باہم تضاد بھی نظر آ سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے کہ راوی سے غلطی ہوئی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا" ء ایک حکم دیا اور بعد میں اسے کسی نہ کسی وجہ سے منسوخ کر دیا اور نیا حکم دیا۔ ان حالات میں "الف" صحابی کے پاس پہلے دن کی بات تو موجود ہے اور دوسرے دن کی بات یا دوسری مرتبہ بیان کی ہوئی بات موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ

اس کی بیان کردہ حدیث اور دوسرے شخص یعنی بعد والے صحابی کی بیان کردہ حدیث میں اختلاف ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض وقت امت کی صلاحیتوں کے پیش نظر یا کسی خاص سیاق و سباق میں ایک حکم دیا جاتا ہے اور بعد میں اسے بدلنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال میں عرض کرچکا ہوں یعنی کھجور کے نر اور مادہ پھولوں کو ملانے کا مسئلہ۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا" ء صراحت کے ساتھ اس کا حکم دیا' بعد میں صراحتا" اسے منسوخ بھی فرمادیا۔

۶۰۔ ایک اور مثال اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ قبر پرستی انسانی سوسائٹی میں ایک عام مرض رہا ہے۔ عرب میں بھی اسلام سے پہلے اس کا رواج تھا' آج بھی ہم میں پایا جاتا ہے۔ غالبا" اس کو روکنے کی غرض سے (تاکہ آدمی قبر میں سونے والوں سے مانگنے کی بجائے خدا سے مانگے) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت ہی کی ممانعت فرما دی۔ کچھ عرصہ بعد ان الفاظ کے ساتھ اس کی مکرر اجازت دے دی۔ کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور الافزوروھا (میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا سنو' اب تم زیارت کرسکتے ہو) اس دوسرے حکم کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بدل گئی بلکہ یہ کہ سیاق و سباق بدل گیا۔ قبر پرستی سے بے شک روکنا چاہتے تھے لیکن قبرستان میں جانے سے جو عبرت ہوتی ہے یعنی ہم سوچتے ہیں کہ ہمیں بھی ایک روز مرنا ہے تو کیا ہمیں اس کے لیے تیار نہیں ہونا چاہیے؟ کیا ہمیں جھوٹ' دغابازی اور فریب وغیرہ پر ہی قائم رہنا چاہیے؟ تو عبرت حاصل کرنے کی خاطر اس کی اجازت مناسب سمجھی گئی اور اس امکان کو کہ لوگ قبر پرستی کرتے ہیں' تربیت اور تعلیم کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دور فرمادیا۔ غرض حدیث میں اختلاف ایک طرف فرقہ ورانہ ہے اور دوسری طرف ایک فرقے کے اندر بھی ہے۔ ان دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ماہرین علم حدیث نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اس کو انھوں نے مختلف تدبیروں کے ذریعہ حل کیا مثلاً ایک خصوصیت جو مسلمانوں ہی میں پائی جاتی ہے دوسری قوموں میں عملاً غیر موجود ہے وہ یہ کہ حوالہ نامکمل نہ ہو۔ مثلاً میں آج سے چودہ سو برس پہلے کی ایک حدیث بیان کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یوں کرو یہ نامکمل حوالہ ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر میں بیان کروں کہ میرے استاد "الف" نے کہا کہ اسے اس کے استاد "ب" نے "ج" نے اس طرح تمام استادوں کا نسلا" بعد نسل ذکر کرتے ہوئے کہوں کہ آخری استاد فلاں صحابی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے تو وہ حوالہ مکمل ہوگا۔ چنانچہ حدیث کی کتابوں میں ہر آدھی سطر یا ایک سطر کی جو حدیث ہوتی ہے' اس کے شروع میں ایک لمبی فہرست ہوتی ہے کہ عن فلاں' عن فلاں عن فلاں۔ مثلاً بخاری جو قدیم ترین مؤلفوں میں سے ایک ہیں' ان کی حدیثیں

بعض دفعہ تین درمیانی راویوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ نو (۹) تک۔ گویا ڈھائی تین سو سال کے عرصے میں نو پشتیں راویوں کی آ چکی تھیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے حوالہ مکمل ہے یا نہیں' یہ ضروری ہے کہ ہمارے سامنے ایسی کتب ہوں جن میں ہر راوی کی سوانح موجود ہو۔ مثلاً یہ بیان کیا جائے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد "الف" "ب" "ج" تھے اور پھر میرے سامنے ایک روایت آتی ہے جس میں عن فلاں' عن فلاں کرتے ہوئے مثلاً "ب" یا "ج" نامی شخص بیان کرتا ہے کہ "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا" تو اس کتاب کی مدد سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ چونکہ یہ سب راوی ثقہ ہیں اور استاد شاگرد رہے ہیں' اس لیے یہ روایت قابل قبول ہے' یہ بھی کہ ہر ایک کا ذاتی کردار کیسا تھا۔ یا اس کا حافظہ اچھا تھا یا نہیں' یہ بھی کہ اس کے استاد کون کون تھے۔ اور شاگرد کون کون تھے' تاکہ اس قسم کی سوانح عمریوں کی مدد سے ہم استاد کو جانچ سکیں اور یہ معلوم کر سکیں کہ راویوں کی تاریخ کا جو حوالہ دیا گیا ہے وہ واقعی صحیح ہے یا فرضی ہے۔ اس کے بعد علم اصول حدیث وجود میں آیا' جس میں یہ بیان کیا جانے لگا کہ اگر حدیثوں میں ایسی باتیں نظر آئیں جو خلاف عقل ہوں یا حدیثوں میں فلاں فلاں عیب یا کمی ہو' تو ایسی صورتوں میں ہم کیا کریں؟ کس طرح ان گتھیوں کو سلجھائیں! چنانچہ روایت اور درایت کے دو اصول مسلمانوں نے اختیار کیے۔ روایت کے اصول کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ حدیث کو بیان کرتے ہیں آیا وہ بیان کرنے والے فرضی ہیں یا حقیقی' قابل اعتماد ہیں یا جھوٹ بولنے والے ہیں۔ استاد شاگرد ہیں یا نہیں؟ یہ روایتاً" حدیث کو کنٹرول کرنے یا جانچنے کا طریقہ ہے۔ درایت کے اصول کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ حدیث میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ عقلاً" درست ہے یا نہیں۔ فرض کیجئے ایک حدیث میں یہ ذکر آتا ہے کہ مثلاً شہر بہاولپور میں فلاں چیز ہو گی۔ لیکن درایتاً" اس زمانے میں شہر بہاولپور موجود تھا ہی نہیں' یہ ذکر کیسے آیا' لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ غالباً" یہ سہو کتابت ہے' یا یہ کہ حدیث جعلی ہے اس شہر کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہاولپور بیان نہ کیا ہو گا' بلکہ اور لفظ ہو گا جو بگڑ کر بہاولپور بن گیا۔ یہ اور اس طرح کی چیزیں ہم درایت سے معلوم کر سکتے ہیں اور ان اصولوں کے مطابق ہم ان دشواریوں کو حل کر سکتے ہیں جو حدیث کے اندر نظر آتی ہیں۔

۶۱۔ اسی طرح دو حدیثوں میں اختلاف کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ایک میں کہا گیا ہے کہ یہ کام کرو' دوسری میں ہے کہ نہ کرو۔ تو ان دشواریوں کو جن طریقوں سے دور کیا جا سکتا ہے وہ "علم اصول حدیث" کی کتابوں میں ملتا ہے۔ مثلاً یہ بات ممکن ہے ایک حکم قدیم ہو' دوسرا حکم جدید ہو تو جدید ترین حکم قدیم ترین حکم کو منسوخ کر دے گا۔ یا یہ کہ ایک حکم خاص ہے' دوسرا حکم عام ہے۔ ایک شخص کو یہ کہا گیا کہ یوں کرو یا یوں

نہ کرو اور دوسرے لوگوں کو حکم دیا گیا کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ ایک مثال ذہن میں آتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ چند لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ایک شکایت کی کہ مدینہ کی آب و ہوا ہمیں موافق نہیں آ رہی ہے' ہم فلاں فلاں بیماریوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا' سرکاری جانوروں کے ریوڑوں میں جاکر رہو اور سرکاری اونٹوں اور اونٹنیوں کے دودھ اور ان کے پیشاب پیو۔ بظاہر یہ بات ہمیں حیران کن معلوم ہوتی ہے کہ پیشاب پینے کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے' جب کہ وہ نجس چیز ہے' اس مشکل کا حل ہمیں اصول روایت یا درایت کے ذریعے ملتا ہے اور یہ ٹیکنیکل چیز بھی ہے جو میری آپ کی رائے پر مبنی نہیں' بلکہ طبیبوں اور ڈاکٹروں کی رائے پر مبنی ہو گی۔ مثلاً زہر ہمارے لیے سم قاتل ہے لیکن ایک ڈاکٹر کسی خاص بیماری میں مریض کے لیے زہر ہی تجویز کرتا ہے۔ زہر کے بغیر اس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ کوئی خاص بیماری اونٹوں کے پیشاب کے بغیر دور نہ ہو سکتی ہو۔ جب کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو ممنوع اور مکروہ چیزیں جائز ہو جاتی ہیں۔ اونٹنیوں کے پیشاب کے متعلق بعض ہمعصر سیاح بیان کرتے ہیں کہ وہ آج بھی بعض بدوی قبائل میں مستعمل ہے۔ غرض مختلف طریقے ہیں جن کے ذریعے ہم حدیثوں کی اندرونی دشواریوں کو دور کر سکتے ہیں اور اس سے ہمارے علماء غافل نہیں رہے۔ گزشتہ چودہ سو سال سے وہ اس پر توجہ کرتے رہے ہیں اور ہم آج یہ کہہ سکتے ہیں کہ حدیثوں کی صحت کو جانچنے کا جو وسیلہ یا جو طریقہ ہمارے پاس ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی اور قوم میں نہیں پایا جاتا۔ میں اپنے عیسائی بھائیوں کو ناراض کیے بغیر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی انجیل پر اتنا اعتماد نہیں کیا جا سکتا' جتنا ہماری بخاری' مسلم اور ترمذی پر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انجیل کی تدوین' انجیل کا تحفظ' انجیل کا نسل بعد نسل منتقل ہونا' اس طریقے سے عمل میں نہیں آیا' جس طریقے سے حدیث کی کتابوں میں عمل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تین سو سال بعد تک انجیلوں کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں کہ کس نے اس کو لکھا' کس نے اس کا ترجمہ کیا اور کس نے اسے نقل کیا۔ اصل زبان سے یونانی زبان میں کس کے حکم سے منتقل کیا گیا۔ آیا کاتبوں نے صحت کا التزام رکھا یا نہیں۔ تین سو سال بعد چار انجیلوں کا ذکر ہمیں پہلی مرتبہ ملتا ہے۔ کیا ہم ایسی بلاسند کتاب پر اعتماد کریں یا بخاری پر جو ہر دو سطری بیان کو بھی تین سے لے کر نو حوالوں تک بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان کیا اور ہر نسل میں اس کی روایت کرنے والے موجود ہیں۔ ایک سوال پیدا ہو گا کہ بخاری نے بیان تو کیا ہے لیکن اس کا ثبوت کیا ہے کہ بخاری نے سچ بیان کیا ہو۔ ممکن ہے انھوں نے گھڑ لیا ہو اور راویوں سے منسوب کر دیا ہو کہ مجھے "الف" نے اور "الف" نے "ب" سے اور "ب" نے "د" سے' اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

تک پہنچایا ہو۔ اعتراض عقلاً" بالکل صحیح ہے لیکن حقیقتاً یہ بے بنیاد اعتراض ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بخاری سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جن محدثین نے حدیث کی روایت کی ہے ان کی کتابیں بھی ہمیں موجود ملتی ہیں۔ لہٰذا بخاری پر ہمیں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر بخاری کہتے ہیں مجھے یہ حدیث امام احمد بن حنبل نے بیان کی اور کہا کہ مجھے عبدالرزاق بن ہمام نے بیان کی جنھوں نے کہا کہ میرے استاد معمر نے بیان کیا تھا۔ معمر نے کہا کہ مجھے میرے استاد ہمام بن منبہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سن کر بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا ہے۔" بخاری کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔ درمیانی روایتوں کا ہمارے پاس کوئی وجود نہ ہو تو ہم علمی نقطہ نظر سے فرض کرسکتے ہیں کہ شاید امام بخاری نے جھوٹ کہا ہو۔ لیکن اگر ہمیں احمد بن حنبل کی کتاب مل جائے جو امام بخاری کے استاد ہیں اور اس میں من و عن وہی حدیث انھی الفاظ میں ایک شوشے کے فرق کے بغیر ملے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ امام بخاری جھوٹے نہیں' کیونکہ احمد بن حنبل کے پاس واقعی وہی حدیث انھی الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ امام احمد بن حنبل پر ہم شبہ کرسکتے ہیں۔ اس وقت جب کہ ان کا بیان ہے کہ مجھے عبدالرزاق بن ہمام نے بیان کیا تھا۔ اور عبدالرزاق بن ہمام کی کتاب موجود نہ ہو۔ الحمد للہ! احمد بن حنبل کی "مسند" کی طرح عبدالرزاق بن ہمام کی "مصنف" بھی دنیا میں موجود ہے۔ اب چھپ کر شائع بھی ہو چکی ہے۔ بعض حدیثوں کے متعلق تلاش کیا گیا کہ یہ کہاں ہیں۔ وہ بھی بالکل انھی الفاظ میں بیان کرتے ہیں جن الفاظ میں امام بخاری کے ہاں ہیں۔ اسی طرح ان کے استاد معمر بن راشد کی کتاب "الجامع" ہمیں مل گئی ہے۔ اس کے اندر بھی وہی حدیث جو بخاری نے بیان کی تھی انھیں الفاظ میں موجود ہے۔ اسی طرح ان کے استاد ہمام بن منبہ کا "صحیفہ" بھی دستیاب ہو چکا ہے' اور چھپ چکا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام بخاری نے جو چیزیں بیان کیں' وہ بالکل صحیح ہیں' کیونکہ ان کی کتابیں جو بخاری کا ماخذ ہیں دستیاب ہو چکی ہیں اور ان کے اندر وہی الفاظ موجود ہیں۔ ان حالات میں عقل کہتی ہے کہ بے وجہ شبہ کرنا نامناسب بات ہے۔ عقل کا تقاضا ہے کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ امام بخاری کی بیان کردہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ پھر کچھ چیزیں ایسی ملتی ہیں جن سے ایک دوسرے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً ایک دوسرے سلسلہ اسناد سے امام ترمذی نے وہی حدیث بیان کی ہے تو یہ ناممکن ہے کہ پچاس آدمی جو مختلف ادوار سے متعلق ہیں' جھوٹ پر پیشگی متفق ہو گئے ہوں۔ غرض یہ ٹکنیکی اصول ہیں جن کا استعمال حدیث کے متعلق کیا گیا ہے اور دنیا کی کوئی کتاب حتیٰ کہ مقدس ترین کتب' توریت' انجیل وغیرہ میں بھی التزام صحت کا اتنا خیال نہیں رکھا گیا جتنا حدیث کے متعلق ہمیں ملتا ہے۔ اصولاً" یہ بیان صحیح ہے کہ حدیث کی کتابوں میں جو سنیوں کی حدیثیں ہیں اور جو شیعوں کی حدیثیں

ہیں' ان میں اختلاف ہو۔ لیکن عملاً ایسا نظر آتا ہے کہ یہ مفروضہ ہی ہے۔ راویوں کا بے شک فرق ہے۔ مثلاً میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت پر ایک چیز بیان کرتا ہوں' وہی بات میرا شیعہ بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت پر بیان کرتا ہے' تو یہ مفروضہ کہ شیعہ سنی کی ساری حدیثوں میں فرق ہے' غلط ہے۔ فرق صرف روایت کرنے والوں میں ہے' حدیث کے مندرجات میں فرق نہیں ہے۔ تضاد شاذ و نادر ہو گا۔ اب تک ایسی کوئی خاص چیز ملی بھی نہیں' جس سے یہ کہا جائے کہ شیعہ کتابوں میں الف' چیز کا حکم ہے اور سنی کتابوں میں اس کے بالکل برعکس الف' کی ممانعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اختلافی باتیں جو ہمیں نظر آ سکتی ہیں ان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ سنی خاص کر حنفی' شافعی اور حنبلی نمازوں میں ہاتھوں کو سینے پر باندھتے ہیں اور ہمارے شیعہ بھائی ہاتھوں کو چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ حدیثوں میں اختلاف ہے بلکہ اس لیے کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی۔ بعض اوقات ہاتھ چھوڑ کر پڑھی۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے مثلاً فرض کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنگ میں زخمی ہو گئے اور ہاتھ کو باندھ نہیں سکتے تھے۔ کیا کریں' ہاتھ چھوڑ کر ہی پڑھیں گے۔ ایک شخص نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔ پھر اسے موقع نہیں ملا کہ کچھ عرصہ بعد دیکھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ رہے ہیں' تو وہ اسی سنت پر عمل کرے گا جس کو وہ دیکھ چکا ہے۔ یہ چیز ایک پہلو سے ہمارے لیے اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ میرے استاد نے آج سے کوئی ساٹھ پینسٹھ سال پہلے پرائمری سکول میں یہ نکتہ بیان کیا تھا' جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا کہ اللہ کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی' اس کی خاطر اللہ نے چاہا کہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر حرکت کو قیامت تک محفوظ رکھے' لہٰذا چند لوگوں کے ذریعے سے مثلاً شیعہ فرقے کے ذریعے سے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حرکت محفوظ کر لی گئی۔ کہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری حرکت ایک دوسرے گروہ کے ذریعے سے' اللہ نے قیامت تک کے لیے محفوظ رکھی۔ اس طرح جو اختلاف عمل میں نظر میں آتا ہے وہ حدیث کی غلطی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مختلف زمانوں کے عملوں اور حرکتوں پر مبنی ہے۔ اس لیے ہمیں باہم ایک دوسرے کا متحمل ہونا چاہیے۔ حدیث کے اختلاف پر جھگڑے کی جگہ یہ فرض کرنا چاہیے کہ اس خاص صورتحال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا۔ دوسری صورت حال (Context) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا حکم دیا۔ ایک دوسری مثال لیجئے' جس کا آج کل اخباروں میں بھی ذکر آتا ہے یعنی "چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنا" سینوں کے ہاں پہنچے سے ہاتھ

کاٹنے کا ذکر ملتا ہے اور شیعوں کے ہاں ہاتھ کی صرف انگلیاں کاٹنے کا ذکر ملتا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کیجیے کہ حدیثوں میں اختلاف ہے' بلکہ سینوں کے ہاں کی حدیثوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انگلیوں کو کٹوایا تھا۔ تو ان حالات میں بجائے اس کے کہ اسے فرقہ واری اختلاف قرار دیں ہم ایک دوسرے کا تحمل کریں اور حدیث پر اپنے فرقے کے بیان کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں' جو ہماری نجات کے لیے کافی ہے۔ یہ نہیں کہ ان اختلافات کو دور کرنے کی لاحاصل کوشش کریں جو کبھی دور نہیں ہو سکتے۔

۶۲ سوال ۲۔ یہ سوال مکرر ہے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ چھوڑ کر نماز نہیں پڑھی' حدیث سے ثابت کریں؟

جواب۔ امام مالک کی کتابیں آپ پڑھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا ذکر کرتے ہیں اور وہ حدیث کی بنا پر کرتے ہیں۔ جب کہ امام مالک خود سینوں ہی کے ایک امام ہیں اور مالکی مذہب کے بانی ہیں۔ یہ لوگ بھی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں۔

۶۳ سوال ۳۔ جو حدیثوں کا رجسٹر حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیار کیا تھا وہ کب تک موجود رہا اور کب ضائع ہوا؟

جواب۔ مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ صرف یہ حدیث بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور اسے اپنے شاگردوں تک پہنچایا تھا اور وہ کب ضائع ہوا' اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔

۶۴ سوال ۴۔ کیا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے جب کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ میں حدیثیں کافی بیان کرتا ہوں مگر عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھ سے زیادہ جانتے تھے کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا؟

جواب۔ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ صرف عربی لکھنا جانتے تھے بلکہ وہ حبشی زبان بھی جانتے تھے' فارسی زبان بھی جانتے تھے۔ کئی زبانیں جانتے تھے۔ گویا بہت عالم شخص تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے لکھنا شروع کیا' ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بعد میں خیال آیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حدیثوں کا زیادہ ذخیرہ تحریری صورت میں جمع ہو گیا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان حدیثوں کو جانتے تھے لیکن تحریری صورت میں نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکی مسلمان ہیں۔ شروع ہی سے مسلمان رہے' جب کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہ ۷ ہجری میں مسلمان ہوئے ہیں۔ لازمی بات ہے کہ وہ شخص جو شروع سے لکھتا رہا ہو اس کے پاس حدیثیں زیادہ ہوں گی اور وہ شخص جسے لکھنے سے تو خوب واقفیت ہے لیکن دیر سے حدیثیں لکھنے کا موقع ملا' اس کے پاس حدیثیں کم ہوں گی۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں۔

۶۵ سوال ۵۔ موضوع اگرچہ حدیث کا ہے لیکن معذرت کے ساتھ یہ سوال پیش خدمت ہے کہ فرانسیسی لڑکی عائشہ نے کس چیز سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ کیا وہ آپ کی نگرانی میں کام کر رہی تھیں؟

جواب: میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس نو مسلم فرانسیسی لڑکی کے قبول اسلام کے اسباب بیان کروں کیونکہ وہ خود چاہتی ہے کہ اسے ظاہر نہ کیا جائے۔ اس کی کچھ سیاسی دشواریاں ہیں۔ میری نگرانی میں وہ کام نہیں کر رہی ہے' وہ اپنے استادوں یعنی یونیورسٹی کے پروفیسروں کی نگرانی میں مقالہ تیار کر رہی ہے۔ اس سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ سوالات کرتی رہتی ہے۔ میں بھی اسے مدد دیتا ہوں۔ یقیناً آپ بھی اس کی مدد کریں گے' اگر وہ آپ سے کوئی سوال کرے۔

۶۶ سوال ۶۔ آپ نے ابھی اپنے خطبے میں فرمایا کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے سوال کے جواب میں فرمایا' خدا کی قسم! جو کچھ میری زبان سے نکلتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں بولتے جب کہ بعض علماء کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف ہو سکتا ہے ۔یعنی ان کی ہر بات درست نہیں' وضاحت فرمائیں؟

جواب: میں واضح کر چکا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی و الہام سے کوئی چیز معلوم ہو چکی ہو اور وہ چیز بیان کریں گے تو وہ وحی پر مبنی ہوگی۔ لیکن وحی ابھی آئی نہیں ہے' وحی کے انتظار میں ہیں' فوری معاملہ درپیش ہے تو اجتہاد کریں گے۔ یعنی اپنی رائے سے کوئی حکم دیں گے اور اسی کے متعلق وہ حدیث ملتی ہے کہ اگر مجھے وحی آ چکی ہوتی تو میں تم لوگوں سے مشورہ نہ کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض وقت وحی کا انتظار رہتا تھا اور فوری ضرورتوں سے وہ خود اجتہاد کر کے اپنے فہم و فراست سے احکام دیا کرتے تھے اور ان احکام میں بعض وقت وحی کے ذریعہ سے تنسیخ بھی ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ مثال ملاحظہ ہو کہ جنگ کے قیدیوں سے کیا برتاؤ کیا جائے؟ جنگ بدر کے موقع پر یہ معاملہ پیش آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وحی کی غیر موجودگی میں اور انتظار میں صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان سب کا سر قلم کر دیا جائے' یہ کبھی مسلمان نہیں ہوں گے۔ اسلام کے ازلی و

ابدی دشمن ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا نہیں' آج وہ مسلمان نہ ہوں لیکن ممکن ہے ان کے بچوں میں سے کوئی مسلمان ہو جائے۔ میری رائے میں ان کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری دوسری ضرورتیں ہیں' انھیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورے کو قبول کیا اور وہی حکم دیا کہ انھیں قتل نہ کیا جائے' بلکہ فدیہ لیا جائے۔ اللہ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ فرمایا: لولا کتب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم (۸: ۶۸) (اگر پہلے ہی سے اللہ اس کا فیصلہ نہ کر چکا ہوتا' (کہ اس پرانے قانون کو بدلا جائے) تو تم جو فدیہ لے رہے ہو اس پر تم لوگوں کو سخت سزا دی جاتی) آپ دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور وحی کی غیر موجودگی میں بعض اوقات انسانی ضرورتوں سے اور انسانی طریقہ سے' مشورے کے ساتھ یا بغیر مشورے کے' اپنی صوابدید کی بنا پر احکام دیا کرتے تھے اور بعض وقت وہ اللہ کو پسند نہیں آتا تھا۔ اس وقت فوراً تنسیخ کی وحی آ جاتی تھی تاکہ امت غلط چیزوں پر عمل نہ کرے۔ اس واقعے کی تھوڑی سی توجیہ میں اور کروں گا۔ قرآن مجید میں ایسی آیتیں ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ پرانے انبیاء کی شریعت پر عمل کرو اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ (۶: ۹۰) وا تحتہ توریت میں حکم دیا گیا ہے کہ دشمن سے لیے ہوئے مال غنیمت کو جلا ڈالو۔ وہ خدا کا مال ہے' خدا تک پہنچانے کے لیے تم اس کو جلا ڈالو۔ تم اس سے استفادہ نہ کرو۔ جب کوئی نئی وحی نہیں آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ تھا کہ اس پرانے خدائی قانون یعنی توریت پر عمل کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت سے اس پر عمل نہیں فرمایا۔ اس سے خدا نے وہ آیت نازل کی لولا کتب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم (۸: ۶۸) بہرحال ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس حدیث کو کہ میری زبان سے' میرے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ برحق ہوتی ہے' اس معنی میں لیں کہ اولاً" یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعے معلوم کردہ چیزوں کو بیان کرتے ہیں۔ یا بشری حیثیت سے بھی بیان کرتے ہیں۔ عمداً" کسی کو بھٹکانے یا گمراہ کرنے کے لیے نہیں' بلکہ جو چیز مناسب ترین ہے اور جس کی خدا نے ممانعت نہیں کی ہے اس کا حکم دیتے ہیں۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ ضمنی طور پر ایک سوال ہے کہ ہم حدیث کے صحیح ہونے کا اندازہ کس طرح لگائیں؟ اس کا جواب میں دے چکا ہوں کہ علمائے حدیث نے مختلف علوم اختراع کیے ہیں جن سے حدیث کی روایتہ" اور درایتہ" دونوں طرح سے جانچ ہو سکتی ہے اور ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کس حدیث پر اعتماد کیا جائے اور کس حدیث پر اعتماد نہ کیا جائے۔

۶۷ سوال ۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس صحابی کو "لستعن بیمینک" کے الفاظ فرمائے تھے

ان صحابی کا اسم گرامی کیا ہے؟

جواب: میں بیان کر چکا ہوں کہ صحابی کا نام حدیث میں مذکور نہیں۔ ایک صحابی آئے، انھوں نے کہا میں بھول جایا کرتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا "استعن بیمینک" چونکہ ماخذ میں نام درج نہیں، اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں آپ کو نام بتا سکوں البتہ ابو رافع کے متعلق بھی ذکر آیا ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ ایک آزاد شدہ غلام تھے۔ انھیں بھی یہ دقت پیش آئی تھی کہ وہ بھول جاتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، کیا میں آپ کی بیان کردہ چیزوں کو لکھ سکتا ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو۔ یعنی لکھ لیا کرو۔

۶۸ سوال ۸۔ جو حضرات غلط قسم کا پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ احادیث کو تین سو سال بعد مدون کیا گیا وہ کیا دلیل پیش کرتے ہیں؟

جواب: وہ دلیل یہ ہے کہ ان کے نزدیک اولاً "صحیح بخاری جو تیسری صدی کی تالیف ہے وہ حدیث کی قدیم ترین کتاب ہے لیکن بخاری سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جو دور گزرے ہیں اور امام بخاری کے استاد اور استاد کے استاد، انھوں نے حدیث کو تحریری صورت کبھی نہ دی۔ لیکن اب ان سب کی کتابیں بڑی حد تک دستیاب ہو چکی ہیں۔ اس لیے وہ پرانا اعتراض جو گولڈ سیہر GOLDZIER نے کہا تھا باقی نہیں رہتا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا لطیفہ میں آپ سے بیان کرتا ہوں۔ کوئی چار پانچ سال کا عرصہ ہوا، میں نے جرمن زبان میں ایک مضمون لکھا تھا جو جرمنی کے ایک رسالے میں شائع ہوا۔ اس میں یہی بات بیان کی گئی تھی کہ حدیث کے متعلق یہ تصور کہ وہ تین سو سال بعد مدون ہونا شروع ہوئی، فلاں فلاں اسباب سے صحیح نہیں۔ مضمون چھپنے کے کوئی چھ آٹھ مہینے کے بعد ایک جرمن پروفیسر نے اس موضوع پر ایک نیا مضمون لکھا، اور وہی پرانی دلیلیں اس میں دہرائیں کہ حدیث ناقابل اعتماد ہے، وہ تین سو سال بعد جمع ہونی شروع ہوئی۔ میرا اصول رہا ہے کہ کسی پر اعتراض نہ کروں۔ واقعات کو اس طرح پیش کروں کہ لوگ اپنے ممکنہ اعتراض کا جواب خود ہی پالیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ دوسرا مضمون چھپنے کے لیے آیا، اسے بھی شائع کر دیا گیا۔ ایڈیٹر نے فٹ نوٹ دیا کہ صاحب مضمون کو چاہیے کہ فلاں نمبر میں شائع شدہ، حمید اللہ کے مضمون کو پڑھ لے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کون سا اصول بہتر ہے۔

۶۹ سوال ۹۔ امام مہدی کے بارے میں متعارض احادیث کا کیا حل ہے؟

جواب: مجھے کوئی علم نہیں کہ کیا متعارض حدیثیں ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں ذکر آیا ہے کہ آخری زمانے میں میری امت سے ایک شخص پیدا ہوگا، جس کا نام میرے ہی نام کے مطابق ہوگا، یعنی "محمد" اس

کے باپ کا نام میرے باپ ہی کے نام کے مطابق ہو گا یعنی "عبداللہ" اس کی ماں کا نام میری ہی ماں کی نام کے مطابق ہو گا یعنی "آمنہ" اور وہ یہ یہ کام کرے گا۔ میرے علم میں ایسی کوئی حدیثیں نہیں ہیں کہ انھیں متعارض کہا جائے۔ البتہ حدیث میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ فلاں سال پیدا ہوں گے، کب ہوں گے؟ ہمیں کوئی پتا نہیں۔ جب بھی آئیں اس کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیے تاکہ امام مہدی کے اچھے رفیق بننے کا شرف حاصل ہو سکے۔

۷۰ سوال ۱۰۔ حدیث قدسی چونکہ خدائے پاک کے الفاظ ہیں تو حدیث قدسی کو قرآن پاک میں کیوں نہیں شامل کیا گیا؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب نہیں سمجھا، یہی اصل جواب ہے کیونکہ ضرورت نہیں تھی کہ قرآن مجید کو ایک لامحدود کتاب بنایا جائے۔ بہتر یہی تھا کہ قرآن مجید مختصر ہو۔ ساری ضرورت کی چیزیں اس کے اندر ہوں اور وقتاً فوقتاً اس پر زور دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چیزیں بیان کریں جو حدیث میں بھی آئی ہیں اور حدیث قدسی میں بھی۔ اس سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں لیکن اس کو قرآن میں شامل کرنے کی ضرورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس نہیں فرمائی۔ حدیث قدسی کی جو کتابیں ہیں ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو قرآن پر اضافہ سمجھی جا سکتی ہے، بلکہ قرآن ہی کی بعض باتوں کو دوسرے الفاظ میں زور دے کر بیان کیا گیا ہے۔

۷۱ سوال ۱۱۔ آپ نے تقریر میں فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انشورنس کا نظام رائج تھا۔ ذرا وضاحت فرمائیں کہ کیا موجودہ انشورنس کے نظام میں اور اس انشورنس میں فرق ہے؟ کیونکہ موجودہ انشورنس کے نظام کو غیر شرعی کہا جاتا ہے؟

جواب: زمانہ حال میں دو طرح کے بیمے یا انشورنس ہے ایک سرمایہ دارانہ Capitalist انشورنس اور دوسرے کو تعاونی Mutualist انشورنس کہتے ہیں۔ Capitalist میں سرمایہ دار انشورنس کمپنیاں قائم کرتے ہیں اور Clients سے اتنی رقم لیتے ہیں جو انشورنس کے متوقع ہرجانوں سے کچھ زیادہ ہو۔ گویا پوری منفعت سرمایہ دار لے لیتے ہیں۔ Mutualist سسٹم میں Clients منفعت میں شریک ہوتے ہیں۔ مثلاً موٹر کار کی انشورنس کمپنی کو لیجیے۔ پانچ سو آدمی اس کے ممبر بنتے ہیں اور ہر شخص ہر سال ایک سو روپیہ ادا کرتا ہے۔ اگر کمپنی کو پہلے سال پچاس ہزار روپے کی آمدنی ہوئی جب کہ ایک ممبر کے حادثے کا معاوضہ دو ہزار روپے دینا پڑا۔ اس کے علاوہ دس ہزار روپے ملازمین کو تنخواہوں کے لیے دینے پڑے اور باقی رقم محفوظ رہی۔ دوسرے سال پرانے ممبروں سے سو روپے کی جگہ کچھ کم رقم لی جاتی ہے۔ Capitalist انشورنس میں پوری منفعت سرمایہ دار لے لیتے ہیں۔ Mutualist سسٹم میں Clients کو استفادے کا

موقع ملتا ہے۔ عہد نبوی میں جو انشورنس کا نظام تھا۔ وہ Mutualist سے کچھ قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ وہ حقیقت میں ایک دوسرے کے تعاون اور امداد باہمی کے اصول پر مبنی تھا۔ یعنی ایک قبیلہ کے جملہ افراد اپنے قبیلے کے انجمن کے خزانے کو سالانہ تھوڑی تھوڑی رقم دیتے ہیں۔ مثلاً ہر شخص ایک درہم' دو درہم دیتا ہے اور جب کبھی کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو کمیٹی کا یہ سرمایہ جو سارے افراد قبیلہ کی طرف سے آیا تھا' اس شخص کی ضرورت کے لیے کام آتا ہے جسے ہرجانہ ادا کرنا ہے پھر اس میں Mutualist سسٹم کو بڑھا کر یہ نظام قائم کیا گیا تھا کہ اگر ایک قبیلہ کے خزانے میں رقم کافی نہ ہو' تو اس کے ہمسائے میں جو کمیٹی ہے' وہ بھی اس کی مدد کرے اور بالآخر حکومت مدد کرے۔ یہ دو مختلف سسٹم رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ٹیکنیکل چیز کو میں چند الفاظ میں پوری طرح واضح نہیں کر سکتا۔

۷۲ سوال ۱۲۔ کیا غلطی تسلیم کرنے کے بعد احادیث کی روشنی میں' انتقام' سزا' جرمانہ' ضروری ہے یا معاف کر دینا اسلام کے اصولوں کے منافی ہے؟ جواب ضرور دیں التجا ہے۔

جواب: مجھے اعتراف ہے کہ میں آپ کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔ یہاں لفظ "غلطی" سے جرم مراد لیتا ہوں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ بعض جرم ایسے ہیں جن کے لیے شریعت نے سزا مقرر کر دی ہے' اسے حد کہا جاتا ہے مثلاً چوری' مے نوشی اور قتل وغیرہ۔ یہ سات آٹھ جرائم ہیں جن کے لیے حد مقرر ہے۔ ان پر معافی مانگنے کے باوجود سزا معاف نہیں ہوتی۔ مثلاً کوئی شخص چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا' چاہے وہ معافی مانگ لے۔ قتل کے سلسلے میں قاضی سزائے موت تو دے گا لیکن سزائے موت کا نفاذ مقتول کے قریبی رشتہ داروں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ خون کی جگہ خون بہا لے کر اس ملزم کو چھوڑ دیں۔ یہ ساری تفصیلیں ہمیں حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

۷۳ سوال ۱۳۔ قرآن نظم اور معنی دونوں کا مجموعہ ہے' جب کہ حدیث صرف قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' تقریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے' اگرچہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمہ کسی اور نے کیا ہو۔ تو حدیث کے قرآن سے برابر ہونے کے کیا معنی ہیں؟

جواب: پہلے میں کافی وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ اس کو مختصراً" پھر دہراتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک شخص یہ کہے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ قرآن ہے' میں اس پر عمل کرتا ہوں لیکن اپنے آپ کو حدیثوں کا پابند نہیں کرتا۔ تو ایسے شخص کو مسلمان قرار نہیں دیا جا سکتا اسے امت سے خارج کر دیا جائے گا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے

بعد چونکہ حدیث کے ثابت کرنے کا وہ وسیلہ نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں روبرو ہو کر، شخصی طور پر سننے میں ہوتا تھا اور حدیث کی تدوین، تحفظ اور نقل ایک نسل کے بعد دوسری نسل میں جانا، اس احتیاط سے نہیں ہو سکتا جو قرآن کے متعلق ہوئی ہے، تو اب ہم قرآن اور حدیث میں فرق کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن اصولاً" دونوں یکساں ہیں کیونکہ قرآن خود کہتا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ (۴:۸۰) ان حالات میں میری دانست میں دونوں کی حیثیت یکساں ہے لیکن ثبوت اور شہادت کی ضرورتوں کے تحت ہم ان میں فرق کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کے حضور میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۷۴ سوال ۱۴۔ اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر السلام علیکم یا اھل القبور کہنا فاتحہ پڑھنا اور ان کے طفیل سے خدا سے فضل و کرم کی التجا کرنا یہ امور قبر پرستی میں شامل ہیں یا نہیں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مزارات کی زیارت فرماتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم السلام علیکم یا اھل القبور کہا کرتے تھے۔ ان کے لیے فاتحہ پڑھتے تھے تو میں اگر کروں تو سنت ہی کی پیروی ہو گی، بدعت اور جدید چیز نہ ہو گی۔ باقی کسی کے طفیل سے اللہ کے فضل و کرم کی التجا کرنا، یہ نیت پر منحصر ہے۔ اگر آپ یہ خیال ظاہر کریں کہ چونکہ میں اس صاحب قبر کو رشوت دے چکا ہوں، اس پر پھول چڑھا چکا ہوں، لٰہذا ان کا فریضہ ہے کہ جو چیز اللہ میاں نہیں چاہتے وہ کر ڈالیں، یہ چیز شرک ہو گی۔

۷۵ سوال ۱۵۔ یتیم بچے کو اس کے دادا کی وراثت سے کیوں محروم کیا گیا۔ وراثت سے محرومی کے پس پشت جو مصلحت کار فرما ہے اس پر روشنی ڈالیے؟

جواب: قانون کا ایک اصول ہوتا ہے اور اس اصول سے بعض وقت اتفاقاً" کسی فرد کو نقصان پہنچ سکتا ہے، تو ایک فرد کے نقصان کی خاطر عام اصول کو بدلا نہیں جا سکتا۔ عام اصول یہ ہے کہ ایک شخص کی وفات پر اس کے فلاں فلاں قریبی رشتہ داروں کو ایک حصہ وراثت میں دیا جاتا ہے جو قرآن نے مقرر کر دیا ہے۔ اگر اتفاقاً" اس قانون کی وجہ سے کسی ایک فرد کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کا حل بھی قرآن و حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ وصیت کا ایک قانون اسلام میں پایا جاتا ہے کہ جس شخص کو وراثت میں سے حصہ نہیں ملتا تو اسے مرنے والا شخص وصیت کے ذریعے سے کوئی چیز دے دے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی شخص کے مرنے پر اس کے بیٹے کو حصہ ملے اور پوتے اپنے دور میں حصہ پائیں گے۔ ان کو اس مرنے والے شخص سے یعنی دادا سے حصہ لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک خاص صورت میں جب کہ اس پوتے کا باپ مر چکا

ہے' دادا کے لیے ممکن ہے کہ اپنے مال کا ایک حصہ' وصیت کے ذریعے سے' اس پوتے کو دے دے تاکہ اسلامی قانون کے عام قاعدے کو بدلنے کی ضرورت پیش نہ آئے اور اس انفرادی دشواری' پیچیدگی اور مصیبت کو' جو پوتے کو پیش آنے والی ہے۔ اسے بھی دور کر دیا جائے۔ یہ ہے فلسفہ اسلامی قانون کا کہ قانون' قانون ہی رہے اور جو استثنائی صورتیں پیش آئیں' ان کا بھی استثنائی حل پیش کیا جائے۔

خطبہ ۳

تاریخ فقہ

محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ! محترم بھائی بہنو!
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

۷۶۔ الحمدللہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و آلہ واصحابہ اجمعین؟

۷۷۔ ان تقریروں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے' اس سلسلے میں آج تیسری تقریر علم فقہ کے متعلق ہے۔ اور یہ ترتیب کہ اولاً قرآن کریم' پھر حدیث' اور پھر فقہ' اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ فقہ مبنی ہے ان دو سابقہ چیزوں پر۔ یعنی پہلے معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کیا چیز ہے؟ حدیث کیا چیز ہے؟ اور وہ کس طرح ہم تک پہنچے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا دین' ہماری فقہ' اور ہمارا قانون' جن دو چیزوں پر مبنی ہیں وہ اس قدر قابل اعتماد بھی ہیں یا نہیں کہ ان کو ایک غیر جانبدار انسان قبول کر سکتا ہو۔

۷۸۔ میں سمجھتا ہوں کہ گزشتہ دو تقریروں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اپنے دین کے ماخذوں کے متعلق ہم مسلمانوں کو کسی سے شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس طرح قرآن اور حدیث ہم تک پہنچے ہیں اس سے زیادہ احتیاط کے ساتھ دنیا کی کسی اور قوم کی اساسی چیزیں ان تک نہیں پہنچیں۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں قابل اعتماد ماخذوں سے مسلمانوں نے اپنا قانون کس طرح بنایا اور وہ کس طرح آج تک چلا آ رہا ہے۔ ایک چیز کا آپ سے شروع ہی میں ذکر کرتا ہوں کہ قرآن مجید اپنی معجزانہ حیثیت کے باوجود' کہ وہ خدا کا کلام ہے' اور حدیث اپنی الہامی حیثیت کے باوجود کہ پیغمبر' خدا کی طرف سے الہام شدہ باتیں ہی بیان کرتا ہے اور خدا علام الغیوب ہے' صرف قرآن اور حدیث انسان کے لیے ناکافی ہوتے' اگر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہمیں یہ نہ بتایا ہوتا کہ قرآن و حدیث کے ناکافی ہونے کی صورت میں کیا کیا جائے؟ چنانچہ میں آپ کو دوبارہ یاد دلاؤں گا اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ وہ ایک مشہور صحابی گزرے ہیں' اور اگر انھیں لمبی عمر ملتی تو صحابہ میں غالباً سب سے بڑے فقیہ ہوتے' بہر حال ابھی وہ نوجوان تھے لیکن ان کی ذہانت کے باعث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گورنر بنا کر یمن بھیجا۔ آخری وقت باریابی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ اے معاذ!

تم اپنے فیصلے کس طرح کیا کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا: "بکتاب اللّٰہ" (اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق) جواب صحیح تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اگر اس میں نہ پاؤ تو؟ میرا اشارہ اصل میں اس نقطہ کی طرف ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے ہیں کہ قرآن کریم عام حالات میں تو نہیں لیکن کسی خاص حالت میں ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر تم مطلوبہ چیز اس میں نہ پاؤ تو تم کیا کرو گے؟ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: "بسنة رسول اللّٰہ" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عمل کیا کروں گا) یہ جواب بھی صحیح تھا مگر حدیث و سنت کی الہامی کیفیت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "فان لم تجد" (اگر تم اس میں بھی نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟) تو اس پر وہ فرماتے ہیں "اجتہد برایی ولا آلو" (یعنی میں اپنی رائے کے مطابق کوشش کروں گا اور استنباط مسائل کے لیے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کروں گا)۔ اس جواب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر خوش ہوئے کہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا "اے اللہ تیرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول نے جو چیز بیان کی ہے' اس پر میں خوش ہوں" یعنی دعائے برکت دی' اور اس کو قبول کیا اور برقرار رکھا کہ یہی طریقہ ہونا چاہیے' انسانی نقطہ نظر سے۔ اگر قرآن مجید اور حدیث ناکافی ثابت ہوں تو ممکن ہے مسلمانوں کی قوم بے بس ہو جاتی اور اپنی ضرورت پورا نہ کر سکتی' جو ایک قیامت تک چلنے والے دین کے لیے نامناسب ہوتا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہمیں بتا دیا کہ اگر قرآن و حدیث میں نہ ملے تو اجتہاد کرو۔ میں اس کی طرف بعد میں رجوع کروں گا' کہ اجتہاد کے معنی کیا ہیں۔

۷۹۔ فقہ ایک عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں "جاننا" اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں "قانون"۔ قرآن مجید میں قانون کے متعلق ایک بہت ہی لطیف انداز میں ذکر آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا تصور قانون کیا تھا۔ وہ آیت یہ ہے: مثل كلمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت فرعها فى السماء (۱۴:۲۴) (اچھی بات کی مثال ایک اچھے درخت کی طرح ہے اس کی جڑ تو زمین میں گڑی ہوئی رہتی ہے لیکن اس کی شاخیں آسمان تک پھیل جاتی ہیں)۔ دوسرے الفاظ میں قانون کی بنیاد بیج جیسی چھوٹی سی چیز کی طرح ہے لیکن اس سے جو درخت نکلے گا وہ آسمان تک پھیل جائے گا اور اس کی شاخیں ہر چیز کو ڈھانپ سکیں گی۔ چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ اگر ہم قرآن اور حدیث کو جڑیں یا بیج تصور کریں تو اس جڑ یا بیج سے نکلا ہوا درخت اتنا تناور اور اتنا شاخ در شاخ پھیل گیا ہے کہ انسان کی ہر ضرورت کو' اور قیامت تک کے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کی جدید ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل ہے اور ظاہر ہے کہ شاخ در

شاخ روزانہ اس درخت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ ان حالات میں شاید مناسب معلوم ہو گا کہ میں تمہید کے طور پر اسلامی قانون کا دیگر ممالک کے قانون سے کچھ موازنہ کروں۔

۸۰۔ محققین اور مؤرخین کا بیان ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی قانون ساز قوم رومیوں کی گزری ہے۔ اور ان کے برابر کسی قوم نے قانون کی خدمت نہیں کی۔ یورپ کی حد تک یہ صحیح ہو گا کیونکہ رومیوں سے پہلے یورپ میں جو قومیں گزری ہیں' ان میں شاید یونانی سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ یونانیوں سے پہلے جو قومیں گزریں' ان کے آثار مفقود ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ قدیم قوموں کے پاس کیا قانون تھے؟ سب سے بڑی ممتاز قوم رومیوں سے پہلے یونانیوں کی گزری ہے۔ یونانیوں نے بہت سے علوم کی خدمت کی لیکن قانونی نقطہ نظر سے ان کے ہاں کوئی زیادہ وقیع چیز نہیں ملتی۔ لہٰذا ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یورپ میں رومیوں نے قانون کی واقعی بڑی خدمت کی۔

۸۱۔ رومی قانون کا مشہور مؤرخ کولینے COLINET لکھتا ہے کہ رومی قانون پہلے بالکل ابتدائی قسم کا (Primitive) تھا۔ وہ کھلے دل سے یہ اعتراف کرتا ہے کہ رومیوں کی سلطنت توسیع پا کر جب ایشیا میں پہنچی تو اس وقت وہاں کے قانون سے متاثر ہو کر رومیوں نے اپنے قانون میں اصلاحیں کیں۔ چنانچہ رومی قانون کا جو قدیم ترین مصنف گزرا ہے یعنی گائیس GAIUS وہ ایشیائے کوچک یعنی موجودہ ترکی کا باشندہ تھا' یورپین نہیں تھا۔ بعد میں اس قانون کی توسیع اس بنا پر عمل میں آئی کہ رومی سلطنت یورپ' افریقہ اور ایشیا کے براعظموں میں پھیل گئی تھی' اور مختلف قوموں پر وہ حکومت کرتے تھے۔ اس لیے انھیں اپنے قانون میں بہت سے اضافے' تبدیلیاں اور ترمیمیں کرنا پڑیں اور اس قانون نے بے شک ترقی کی۔ اس ترقی یافتہ قانون کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چار پانچ سال پہلے فوت ہونے والے حکمران جسٹینین (Justinian) نے مدون کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم ایک اعتبار سے جسٹینین کے مجموعہ قوانین کا مقابلہ فتاوائے عالمگیری سے کر سکتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر' علم دوست بادشاہ ضرور تھے۔ لیکن عالم یا فقیہ نہیں تھے۔ یہی حال جسٹینین کا ہے۔ وہ بہت ذہین بادشاہ تھا لیکن خود ماہر قانون نہیں تھا۔ اس نے عالموں کی سرپرستی کی اور انھیں ملک میں پائے جانے والے سارے قوانین پر' جن کے بعض اجزاء میں تضاد پایا جاتا تھا' نظرثانی کی دعوت دی۔ اس طرح ایک کوڈ یا مجموعہ قوانین مرتب ہوا۔ یورپ میں یہ ایک قابل فخر چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قانون دلچسپ ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو آج بھی قابل عمل ہیں اور ان میں ردوبدل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن اسی قانون کی اساس یہ ہے کہ انسان خود قانون ساز ہے۔ یعنی ایک انسان دوسرے انسان کے بنائے ہوئے قانون قبول بھی کر سکتا ہے اور ان کو

رد بھی کر سکتا ہے' نتیجہ یہ ہے کہ اس قانون میں استحکام (Stability) نہیں رہا۔ چنانچہ ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ خود Justinian نے اپنی تیس بتیس سالہ حکومت میں' اپنے ہی تیار کردہ قانون میں اتنی تبدیلیاں کیں کہ وہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس کے برخلاف اگر قانون کی اساس اللہ کے احکام ہیں تو اس میں استحکام اور پائیداری ہو گی۔ جو انسانی قانون کے اندر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے ہی برابر سمجھتا ہے' اس پر اعتراض کرنے کی جسارت کرتا ہے اور اس کے خلاف رائے دینے کی ہمت کرتا ہے۔ دیگر ممالک میں بھی ہمیں یہ چیز نظر آتی ہے۔ لیکن سارے قوانین سے موازنہ کرنے کا موقع نہیں کیونکہ وقت کم ہے۔

۸۲۔ غرض جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس وقت دنیا کے سامنے ایک قانونی چیلنج تھا کہ اگر تم میں ہمت ہے تو اس رومی قانون سے بہتر قانون بناؤ۔ اس چیلنج کا ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اور وہ قانون بنایا جو جسٹینین کے قانون سے بھی حقیقتاً بہتر ہے۔ اس میں وہ کمزوری بھی نہیں ہے جو Justinian کے قانون میں تھی بلکہ استحکام' استقامت اور پائیداری بھی ہے۔ اسلامی قانون میں جو وسعت اور ہمہ گیری ہے وہ رومی قانون میں نہیں ہے۔ مثلاً جسٹینین کے کوڈ میں دینی امور اور عبادات کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح اور بہت سی چیزیں جو اسلامی قانون میں ملتی ہیں' وہاں نظر نہیں آتیں۔ اگر کوئی شخص غیر جانبداری سے رومی قانون اور اسلامی قانون کا موازنہ کرے تو وہ یقیناً یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اسلامی قانون ہی بہتر ہے۔ میں نے چند ابواب کی حد تک رومی اور اسلامی قواعد کا تفصیلی مقابلہ کیا ہے اور ذاتی علم کی بنا پر یہ دعویٰ کر رہا ہوں۔

۸۳۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلامی قانون کس طرح بنا؟ اسلامی قانون ربانی وحی کے ذریعے سے آئے ہوئے اوامر کی تبلیغ کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے احکام پر مشتمل ہے۔ ان احکام کا کچھ حصہ آپ نے املا کرایا اور کہا کہ یہ اللہ کا حکم یعنی قرآن ہے' تم اسے زبانی یاد کرو' اسے نمازوں میں پڑھو' کبھی نہ بھلاؤ۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور احکام بھی دیے جو (سورۃ ۵۳: ۳ تا ۴) کے مطابق اگرچہ ربانی وحی ہی پر مشتمل تھے لیکن جو قرآن میں داخل نہیں کیے گئے۔ ان کو سنت بھی کہتے ہیں۔ اللہ کے احکام' اللہ کے پیغمبر کے احکام یعنی حدیث و سنت' یہ دونوں چیزیں ایک دن میں مدون نہیں ہوئیں۔ جیسا کہ میں نے آپ سے بیان کیا قرآن مجید کو نازل ہوتے ہوتے تیئس (۲۳) سال لگے۔ یہی حال اور یہی مدت حدیث کی بھی ہے۔ لیکن شروع میں کچھ بھی نہ تھا لوگ مسلمان ہونے لگے تھے اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قانون کے معنی ہیں "طرز عمل" یا

"اصول کار" تو ابتداء میں اسلامی قانون کیا تھا' کیونکہ اس وقت سوائے "سورہ اقرا" کی پہلی پانچ آیتوں کے' کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اس کا جواب بہت سادہ ہے۔ اسلامی اصول یہ ہے کہ جس چیز کی ممانعت نہ کی جائے وہ مباح ہے۔ دوسرے الفاظ میں مکہ معظمہ ہی کے کافرانہ معاشرے میں بت پرستی کے سوا' جو بھی معاشرتی رسم و رواج تھے اور جو بھی عرف و عادت پائی جاتی تھی' اس پر عمل کرنے کی مسلمانوں کو اجازت تھی' آپ کو شاید برا لگے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتداء میں مسلمان شراب بھی پی سکتے تھے اس لیے کہ شراب ابھی حرام نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی قانون شروع ہوتا ہے' شہر مکہ کے رسم و رواج سے' اور اس رسم و رواج میں رفتہ رفتہ ترمیم اور تبدیلی ہوتی گئی۔ قرآن و حدیث کے احکام کے مطابق قدیم رسم و رواج میں جو جو تبدیلی ہوئی وہ ۲۳ سال کے عرصے میں ترجیحی بنیاد پر ہوئی کہ کن چیزوں کو سب سے پہلے منسوخ کیا جائے' ان کے بعد کن چیزوں کو' ان کے بعد کن چیزوں کو' اور کن نئی چیزوں کا اضافہ کیا جائے' ظاہر ہے کہ مکے کے رسم و رواج کے متعلق اسلام کے امتناعی اور اصلاحی احکام کا سب سے پہلا عنصر' سب سے پہلی چیز بت پرستی کی مخالفت تھی۔ یعنی اللہ ایک ہے۔ بتوں کی پرستش نہ کرو۔ اللہ کا کسی کو شریک نہ بناؤ۔ عقائد کے متعلق ایک چیز اور بھی تھی کہ ہماری زندگی کا تعلق صرف اسی دنیا سے نہیں بلکہ اس کے بعد آخرت کی زندگی بھی ہے۔ مرنے کے بعد حساب کتاب دینے کے لیے اللہ ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا اور ہمارے نیک و بد اعمال کے مطابق ہمیں جزا یا سزا دے گا۔ یہ بالکل ابتدائی چیزیں تھیں۔ اللہ پر ایمان اور قیامت پر ایمان۔ ایک چیز اور تھی کہ جب اللہ کو ہم ایک مانتے ہیں اور اسے اپنا مالک اور خالق جانتے ہیں تو اس کے متعلق ہمیں اپنے فرائض کس طرح انجام دینے چاہئیں؟ ظاہر ہے کہ اللہ ہمارا محتاج نہیں بلکہ ہم اللہ کے محتاج ہیں۔ لہٰذا اللہ کی بندگی اور شکر گزاری بھی ہمارا فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے نماز کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ نماز اور عقائد یہ دو عنصر تھے جو شروع میں آئے۔ پھر رفتہ رفتہ دیگر امور کا اضافہ ہوتا گیا میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا ماخذ قرآن و حدیث تو ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ' بلکہ ان سے کچھ پہلے ہی شہر مکہ کا رسم و رواج بھی اسلامی قانون تھا۔ یہ رسم و رواج ایک عارضی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ قران و حدیث جو باضابطہ ماخذ قانون تھے ان میں یہ بھی قوت تھی کہ اس غیر اہم یا غیر دوامی عنصر یعنی رسم و رواج کو منسوخ کر سکے۔ اس سے انکار کیے بغیر کہنا یہ پڑتا ہے کہ پہلا ماخذ ملک کا رسم و رواج تھا۔ دوسرا باضابطہ ماخذ قرآن اور حدیث ہیں۔ لیکن حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے متعلق مشہور حدیث سے یہ ظاہر ہے کہ عہد نبوی ہی میں قرآن و حدیث کے علاوہ اجتہاد کو بھی ایک تیسرے ماخذ قانون کی حیثیت حاصل تھی۔

۸۴۔ ہمارے پاس اصول فقہ کی کتابوں میں ایک اور ماخذ بھی بیان ہوتا ہے جسے اجماع کا نام دیتے ہیں' یعنی کسی بات پر علمائے امت کا متفق ہو جانا' عہد نبوی میں اس کی ضرورت ہی نہیں تھی اس لیے کہ اگر کوئی سوال پیدا ہوتا تو لوگ فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ فرمادیتے جو قطعی اور آخری ہوتا۔ آپس میں مشورہ کرکے کسی پر متفق ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس پہلو پر مزید گفتگو بعد میں ہوگی۔

۸۵۔ ان ماخذوں کے ساتھ ساتھ عہد نبوی میں ایک اور چیز بھی ملتی ہے جو آئندہ بھی ہمیں کام آسکتی ہے' اسے ہم "معاہدہ" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اگر کسی دوسرے ملک سے اور کسی دوسری حکومت سے ہم معاہدہ کرلیں اور بعض شرطیں قبول کرلیں' کہ ہم یہ کریں گے اور تم یہ کروگے۔ تو جب تک وہ معاہدہ برقرار رہے گا' وہ پابندیاں یا وہ شرطیں جو ہم نے قبول کی تھیں' ہمارے قانون کا جزو بن جائیں گی اور ہمارے لیے واجب التعمیل رہیں گی۔ دوسرے الفاظ میں یہ معاہداتی پابندیاں اور معاہدے کے ذریعے سے قبول کی ہوئی شرطیں اسلامی قانون ہیں' لیکن غیر تابدی اور عارضی۔ جب تک معاہدہ برقرار رہے گا' وہ شرطیں ہمارے قانون کا جزو رہیں گی۔

۸۶۔ ایک اور ماخذ قانون جو عہد نبوی میں پایا جاسکتا تھا لیکن مجھے اب تک عہد نبوی میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکی۔ قدیم ترین مثال جو مجھے اس کی ملی ہے' وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت کے ایک واقعے سے متعلق ہے یہ اصول مماثلت RECIPROCITY ہے' جس میں معاہدے کے بغیر غیروں کے احکام ہمارے قانون میں داخل ہو جائیں۔ پہلے میں اس واقعے کو بیان کرتا ہوں جس سے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا' کہ مماثلت' جو اس کا نام دیا گیا ہے کیا چیز ہے؟ ایک دن خلیفہ وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سرحد کے علاقے کا ایک گورنر خط بھیجتا ہے کہ ہماری سرحد کے پار جو بیز نطینی (رومن) وغیرہ ہیں' ان کے یہاں کے تاجر ہمارے ملک میں آنا چاہتے ہیں' اور ہمارے ملک میں تجارت کرنا چاہتے ہیں۔ احکام دیجیے کہ ان سے ہم کس اساس پر چنگی وصول کریں؟ اس گورنر کو کوئی علم نہیں تھا کہ اسلامی قانون چنگیوں کے متعلق کیا ہے؟ اس نے قرآن دیکھا' قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملا اور اس بارے میں اس کو کوئی بھی معلومات نہیں تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ جس علاقے کے لوگ آئیں' اگر اس علاقے میں مسلمان تاجر جاتے ہیں تو جس نرخ پر ان سے چنگی لی جاتی ہے' اسی نرخ پر تم لے لو۔ یہ Reciprocity یعنی مماثلت کا قانون ہے۔ اس سے پہلے بیز نطینی حکومت سے اس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس علاقے

میں جس شرح سے چنگی لی جاتی ہے' اسی شرح سے وہاں والوں سے ہمارے یہاں چنگی لی جائے گی۔

۸۷۔ ان ماخذوں کے علاوہ ایک ماخذ' جس کا کچھ پہلے ذکر کرنا چاہیے تھا' وہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ "سورہ انعام" میں ایک مقام پر تقریباً بیس پچیس پیغمبروں کے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس فہرست کے دینے کے بعد یہ آیت ہے: "اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ" (۹۰:۶) (یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے' اس لیے (اے محمدؐ) آپ بھی ان کی پیروی کریں' تاریخی نقطہ نظر سے اس اہم آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر پیغمبر اسلام کے زمانے تک اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے جو پیغام بھیجے ہیں' وہ بھی خدائی احکام ہیں' اور وہ بھی ویسے ہی قابل تعظیم ہیں' جیسے پیغمبر اسلام پر نازل شدہ قوانین۔ لا نفرق بین احد من رسلہ (۲۸۵:۲) (سب پیغمبر مساوی رتبہ رکھتے ہیں بحیثیت پیغمبر کے) تو حکم دیا جاتا ہے کہ سابقہ پیغمبروں کے قوانین بھی واجب التعمیل ہیں' اور پیغمبر اسلام کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے اس حکم کے ساتھ کچھ شرطیں ہوں گی۔ قانون ساز اللہ کی ذات ہے۔ اس نے اگر حضرت آدم علیہ السلام یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کچھ احکام دیے' تو وہی قانون ساز اس میں کچھ ترمیم اور تبدیلی بھی کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر خدا نے ہمارے پیغمبر کو حکم دیا کہ تم اپنے سے پہلے پیغمبروں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے احکام میں سے فلاں چیز پر عمل نہ کرو بلکہ یوں کرو' تو پرانا قانون واجب التعمیل نہیں رہے گا۔ بلکہ جدید حکم پر عمل کرنا ہو گا۔ دوسری شرط اس قانون سے متعلق یہ ہو گی کہ اس کا علم' ہمیں قابل اعتماد صورت میں پہنچے کہ یہ چیز حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں تھی' یہ چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں تھی' یہ چیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں تھی۔ اگر کسی حکم کا قابل اعتماد ثبوت ملے تو واجب التعمیل ہو گا ورنہ نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ایسی باتوں کا ذکر ملتا ہے اور قرآن میں بھی ایسی آیتیں ہیں کہ فلاں چیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قانون میں تھی' فلاں چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قانون میں تھی' تو اس پر ہم عمل کریں گے۔ مگر اس میں دشواری یہ پیدا ہو گئی ہے کہ خود قرآن مجید میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ یہود اور نصاریٰ اپنی کتاب میں تحریف کرتے ہیں۔ ان حالات میں کہ براہ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قانون ہم تک قابل اعتماد صورت میں نہیں پہنچا ہے لہٰذا ہم ان کی کتابوں کے احکام پر عمل کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے جب تک کہ ان کے کسی حکم کے متعلق ہمیں کسی اور ذریعے سے اس بات کا ثبوت نہ مل جائے کہ وہی صحیح اور قابل اعتماد ہے۔

۸۸۔ جیسا کہ میں بیان کر رہا تھا۔ اسلامی قانون کے جو متعدد ماخذ ہیں ان میں سابقہ پیغمبروں کی شریعتیں

بھی داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک مثال آپ کو دیتا ہوں جس سے میرا مفہوم شاید زیادہ واضح ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی "سورہ نور" میں زنا کی سزا سنائی گئی ہے کہ ایک سو درے لگائے جائیں اور اسلامی قانون میں پیغمبر اسلام کے عمل کی بنا پر شادی شدہ لوگوں کے زنا کرنے کی صورت میں "رجم" یعنی پتھراؤ کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو "رجم" کا حکم ہے یعنی کسی مجرم کو پتھر مار کر سزائے موت دینا اس کی اساس کیا ہے؟ چونکہ قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں ہے' اس لیے بہت سے لوگوں کو بدگمانی ہو سکتی ہے' شاید ہوئی بھی ہے' کہ "رجم کا قانون اسلام میں نہیں پایا جاتا۔ صرف سو درے لگائے جائیں' یہی کافی ہے' اگر آپ غور کریں تو نظر آئے گا کہ ایسا نہیں ہے' بلکہ قرآن مجید میں بالواسطہ طور پر اس قانون کا حکم ہے کہ "رجم" کیا جائے وہ واسطہ یہ ہے کہ قرآن نے کہا کہ تم سے پہلے کے جو پیغمبر گزرے ہیں' ان کے قانون پر عمل کرو۔ اور "رجم" کے متعلق قانون توریت میں موجود ہے' انجیل میں بھی موجود ہے۔ جو کتابیں آج کل ہمیں عیسائیوں اور یہودیوں کی شائع کردہ اور ترجمہ کردہ ملتی ہیں' ان میں بھی یہ قانون آپ کو ملے گا۔ اس قانون کی صحت ہمارے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کر کے اس کی توثیق بھی کی ہے۔ کہ یہ قانون تھا۔ اگر قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن نے اس قانون کو منسوخ نہیں کیا' اور جب منسوخ نہیں کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ برقرار ہے۔ جب وہ برقرار ہے تو ہمارا قانون ہے۔ ہمارا بنایا ہوا نہیں' خدا کا بنایا ہوا قانون ہے اور ہمارے لیے واجب التعمیل ہے۔ چنانچہ توریت میں شادی شدہ لوگوں کے زنا سے متعلق صراحت سے ذکر ہے کہ ان کو رجم کیا جائے۔ لیکن غیر شادی شدہ لوگوں کے زنا سے متعلق توریت میں حکم ہے کہ ان کو صرف مالی جرمانہ کیا جائے' اور کچھ نہیں۔ اس قانون کو قرآن نے منسوخ کر دیا۔ صرف جرمانے پر اکتفا کرنا' بداخلاقی میں اضافہ کرنا ہے۔ اس کو ایک زیادہ روکنے والی چیز کی ضرورت ہے۔ لہٰذا حکم ہوا کہ ایک سو درے لگائیں جائیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایک پرانے قانون کے ایک جزء کو سکوت کے ذریعے سے برقرار رکھا گیا اور دوسرے حصے کو صراحت کے ساتھ منسوخ کیا گیا' تو دو اسلامی قانون ہوئے اور دونوں پر عمل واجب ہے۔ یہ تھا میرا منشاء کہ پرانے انبیاء کی شریعت' مسلمانوں پر واجب التعمیل ہے' دو شرطوں کے ساتھ' ایک تو ان میں ترمیم یا تبدیلی قرآن نے نہ کی ہو اور دوسرے یہ کہ ان کا ہم تک پہنچنا قابل اعتماد وسائل سے ہوا ہو۔

۸۹۔ اب ہم اسلامی قانون کی ترقی کے متعلق ایک اور پہلو کو لیں گے۔ قانون کا کچھ حصہ صراحت کے ساتھ قانون ساز یعنی خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اس میں گویا انسان کے بنانے کا کوئی سوال نہیں ہے لیکن اگر کسی وقت قرآن و حدیث میں سکوت ہو' جیسا کہ میں نے ابھی معاذ بن

جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے ذریعے سے آپ کو بتایا تو ایسے حالات میں ہم کو اجتہاد کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی سوچ کر' اپنی عقل سلیم کے لحاظ سے ہم کوئی قاعدہ استنباط کریں جو ہمیں مناسب معلوم ہو اور ہماری عقل اور ہمارا ضمیر اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔ یہ کام قانون کے ماہرین ہی کرسکتے ہیں۔ فرض کیجیے ایک طبیب ہے' اس کا قانون سازی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ایک روٹی پکانے والا نانبائی ہے' اس کو قانون سازی سے کوئی تعلق نہیں وغیرہ وغیرہ۔ قانون سازی کا کام قانون کے متخصصین ہی کرسکتے ہیں' کوئی اور نہیں۔ لہٰذا ہم دیکھیں گے کہ اسلامی معاشرے میں قانون بنانے کا کام کون کرتے ہیں اور قانون کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام کون کرتے ہیں؟ یہ دو لوگ ہیں ایک تو حاکم عدالت اور دوسرے جسے ہم مفتی کا نام دیتے ہیں یعنی اس سے پوچھتے ہیں کہ اس بارے میں کیا قانون ہے اور وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلامی قانون یہ ہے یا یہ ہونا چاہیے' لیکن مفتی اس کا نفاذ نہیں کرتا۔ حاکم عدالت کسی مقدمے میں فریقین کے مابین اس کا نفاذ کرتا ہے۔ لیکن مفتی قانون بتاتا ہے' قانون کا نفاذ نہیں کرتا۔ اس فرق کے باوجود دونوں ذیلی قانون سازی کا کام کرتے ہیں۔ اساسی قانون کی حیثیت تو قرآن و حدیث رکھتے ہیں لیکن قرآن و حدیث ساکت ہوں تو اجتہاد کے ذریعے سے' استنباط کے ذریعے سے' یہ لوگ قانون معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں' وہ ہمیں بتاتے بھی ہیں اور ہم پر نافذ بھی کرتے ہیں۔

۹۰۔ ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں۔ قرآن مجید میں چوری کی سزا مقرر کی گئی ہے' لیکن اگر کوئی شخص کفن چوری کرے یعنی ایک ایسے شخص سے اس کا مال لے جو اپنی مدافعت نہیں کرسکتا یعنی کسی مردہ شخص کی قبر کھولے' قبر کے اندر سے اس کا کفن چرا لے جائے تو کیا اسے چوری کہا جائے گا؟ ہمارے فقہا کہتے ہیں کہ وہ چوری نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کفن چوری کی سزا کیا ہوگی؟ کیا وہی سزا ہوگی جو عام چوری کی ہے یا اس کے لیے کسی اور قانون کی ضرورت ہوگی؟ اس میں سوائے استنباط' اجتہاد اور غور و فکر کے' قانون معلوم کرنے کے اور کوئی صورت ممکن نہیں کیونکہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے فقہاء استنباط کرتے ہیں' اور استنباط کے لیے قیاس سے کام لیتے ہیں۔ میں تفصیلوں میں نہیں جاتا' صرف آپ کو مثال دے کر سمجھانا چاہتا ہوں کہ کن صورتوں میں فقہاء کو یا مفتیوں کو اور قاضیوں کو قانون معلوم کرنے اور قانون میں ترقی دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کیونکہ چوری کے متعلق قانون تھا لیکن کفن چوری کے متعلق قانون نہیں تھا' اسے ہمارے قاضی اور مفتی نے معلوم کیا۔ پھر وہ ہمارے قانون کا جزوء بنا اور ہمارے قانون میں اس سے ترقی ہوئی۔ یہ کام ہمیں عہد نبوی ہی سے نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ اس کی صراحت ایک حدیث میں ملتی ہے۔ ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں

سے کہہ دیا تھا کہ تمھیں کوئی چیز معلوم کرنا ہو تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھ لو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک ماہر قانون تھے اور صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چھوٹی چیز کے متعلق زحمت دینے کے بجائے' حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جاتے اور ان سے پوچھ لیتے۔ انھیں ایک طرح سے اجازت تھی کہ وہ چھوٹے موٹے مسائل میں فتویٰ دیں۔ کوئی مشکل مسئلہ ہو تو ظاہر ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہتے کہ ٹھہرو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ اگر انھیں معلوم ہوتا تو وہ کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق سابق میں یہ حکم دے رکھا ہے' تم اس پر عمل کرو۔ اس طرح قاضی کے فیصلے بھی عہد نبوی سے شروع ہوئے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ مفتیوں کی تعداد کتنی تھی۔ صرف ایک واقعہ میرے ذہن میں تھا' وہ میں نے آپ سے بیان کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق صراحت سے تاریخوں میں ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مفتی بنا کر' نامزد کر رکھا تھا۔ ممکن ہے اور صحابی بھی ہوں۔ رہا قاضی تو اسلامی سلطنت کی توسیع کے ساتھ ان کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے' خاص کر' یمن' میں جو ایک بڑا صوبہ تھا اور ذہنی لحاظ سے' اس زمانے میں' بہت ترقی یافتہ تھا۔ وہاں کے لوگ خانہ بدوش نہیں تھے۔ بستیوں میں زندگی گزارنے والے اور تجارت' کاشتکاری کرنے والے لوگ تھے۔ اس لیے یمن کے متعلق ایک سے زیادہ سرکاری افسروں کا ذکر ملتا ہے۔ گورنر بھی اور اس طرح کے دیگر عہدیدار بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا ذکر تھوڑی دیر ہوئی میں نے آپ سے کیا تھا یعنی معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ وہ قاضی بھی تھے لیکن ان کا ایک اور فریضہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ انتظامی امور بھی سرانجام دیتے تھے' یعنی گورنر بھی تھے اور قاضی بھی تھے۔ انھیں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے متعلق تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسپکٹر جنرل تعلیمات بھی تھے۔ چنانچہ طبری نے لکھا ہے کہ ان کا فریضہ تھا کہ گاؤں گاؤں کا دورہ کریں اور لوگوں کو تعلیم دیں۔ غالباً وہ ہر جگہ کوئی مدرسہ کھولتے ہوں گے۔ پھر مقامی لوگوں کو قرآن پاک پڑھانے کی تربیت دے کر آگے روانہ ہو جاتے ہوں گے۔ بہر حال "کان یتنقل من عمالة عامل الی عامل" کے الفاظ تاریخ طبری میں آتے ہیں۔ وہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جایا کرتے تھے اور ان کا کام لوگوں کو تعلیم دینا تھا۔ ان قاضیوں میں سے ایک جو یمن' بھیجے گئے یہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری ہیں۔ ان کا ذکر میں بالخصوص اس لیے کر رہا ہوں کہ ان کا تقرر نامہ بھی تاریخ میں محفوظ ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں نظم ونسق کا اصول یہ نہ تھا کہ کوئی شخص تنہا کسی مقام پر پہنچ جائے۔ جیسے حمید اللہ بہاولپور آ کے یہ کہہ دے کہ میں لیکچر دینے آیا ہوں وائس چانسلر کو خبر بھی نہ ہو۔ اس کے برخلاف مرکز یعنی پایہ تخت سے ایک تحریری پروانہ نامزد شدہ

گورنر کو بھی دیا جاتا' اور ایک خط مقامی باشندوں کے نام بھی ہوتا۔ جس میں یہ کہا جاتا کہ میں تمہارے پاس فلاں شخص کو گورنر بنا کر یا قاضی بنا کر یا عامل بنا کر بھیج رہا ہوں۔ جب وہ آئیں تو ان کی اطاعت کرنا' ورنہ میری عدم اطاعت متصور ہو گی۔ اور قاضیوں کو پروانہ نامزدگی دیا جاتا جس میں ان کے فرائض کا بھی کچھ ذکر ہوتا تھا۔ یہ طریقہ بھی ہمیں عہد نبوی ہی میں ملنے لگتا ہے۔ اور حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو دیا ہوا ہدایت نامہ محفوظ ہے اس کا ذکر میں نے ایک اور وجہ سے بھی کیا ہے یعنی حضرت ابو موسیٰ الاشعری کی عظیم الشان شخصیت کی بناء پر' ان کا ایک قصہ بھی آپ سے بیان کرتا چلوں اور بہت ادب کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ابن سعد کے مطابق وہ ان پڑھ تھے' لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک وہ امی رہے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی عظیم صلاحیتوں اور وسیع تجربے کی بناء پر' کہ عہد نبوی میں وہ مختلف عہدے انجام دے چکے تھے' ان کو عراق کی فتح کے بعد بصرے کا گورنر نامزد کیا۔ چونکہ خود انھیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا اس لیے وہاں انھوں نے ایک لکھے پڑھے' اچھے ماہر شخص کو سیکرٹری بنا لیا' جو ایک عیسائی تھا۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو بلا بھیجا۔ وہ اپنے سیکرٹری کے ساتھ کچھ انتظامی فرائض کے لیے مدینہ آئے تو مسجد کے اندر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے کے لئے چلے گئے' لیکن سیکرٹری صاحب باہر ہی رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا تمہارا سیکرٹری ساتھ نہیں آیا' کہاں ہے؟ کہا کہ باہر ہے۔ آپ نے پوچھا کہ مسجد میں کیوں نہیں آیا؟ تو بتایا کہ عیسائی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ مناسب معلوم نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا سیکرٹری کو بدل دو۔ بظاہر ہمیں موجودہ زمانے میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق و امتیاز نامناسب معلوم ہو گا لیکن آپ اس پر غور کیجئے کہ ایک گورنر ہے جسے بیسیوں قسم کے اختیار حاصل ہیں' اس کا فیصلہ بھی فی الفور نافذ ہو جاتا ہے اور بالخصوص اس علاقے میں جہاں ابھی پوری طرح امن قائم نہیں ہوا۔ اس کو فتح ہوئے مشکل سے چند مہینے گزرے ہیں۔ وہاں کے گورنر صاحب کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ وہ سیکرٹری کو حکم دیتے ہیں' معلوم نہیں سیکرٹری صاحب کیا لکھتے ہیں۔ گورنر کی مہر کے ساتھ پروانہ چلا جاتا ہے۔ اس لیے احتیاط لازم تھی۔ آج اگر بالفرض ہمارے محترم جنرل ضیاء الحق کو لکھنا پڑھنا نہ آئے تو وہ کسی ہندو کو اپنا سیکرٹری نہیں بنائیں گے' یا کسی روسی کو اپنا سیکرٹری نہیں بنائیں گے۔ یہی فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ سیکرٹری بدل ڈالو۔ مگر وہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسرے موقعوں پر عیسائیوں سے سرکاری کاموں میں مدد بھی لیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں تعصب تھا۔ وہ غیر مسلم افسروں سے بوقت ضرورت استفادہ کرتے تھے۔ صرف اس وقت روکتے تھے۔ جب عقل سلیم اس کی متقاضی ہوتی کہ

ان پر اعتماد نہ کیا جائے۔ ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں مثلاً ہرمزان نامی ایک ایرانی تھا۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارہا مشورہ کیا کرتے تھے۔ سیاسی معاملات میں بھی اور جنگی معاملات میں بھی۔

۹۱۔ عہد نبوی میں اسلامی قانون کی ترقی کے لیے جو اولین ماخذ تھے' وہ میں نے بیان کیے ان کے علاوہ دو نئے عناصر کا اضافہ ہوا۔ ان میں سے ایک مفتی ہیں اور دوسرے قاضی۔ قاضیوں کو عام طور پر نئی قانون سازی کی ضرورت پیش آتی ہے مقدمات ان کے سامنے آتے ہیں اور ہر مقدمے کے مواقع' حالات اور روداد یں مختلف ہوتی ہیں اور انھیں اسی کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ایسی متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں کہ گورنر اور قاضی' جو دور دراز علاقوں میں تھے یا تو خود لکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے اور ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ان گورنروں اور قاضیوں نے اپنی صوابدید اور اپنی فہم کے مطابق فیصلہ کر ڈالا۔ اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی۔ اگر آپ کو نامناسب معلوم ہوا تو فوراً تصحیح کے احکام صادر فرما دیے۔ اس دوسری قسم کی ایک مثال آپ کو دیتا ہوں۔ ایک شخص کو قتل کر دیا جاتا ہے' اس کا خون بہا کس کو دیا جائے؟ پرانے زمانے میں عرب میں رواج تھا کہ خون بہا مقتول کے مرد رشتہ داروں کو دیا جاتا تھا' یعنی بیٹے کو' باپ کو' بھتیجے کو وغیرہ۔ مقتول کی بیوہ کو اس میں سے کوئی حصہ نہ ملتا تھا۔ اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے ضحاک نامی ایک گورنر کو قاضی کے فیصلے کے متعلق خط بھیجا کہ فلاں شخص کے خون بہا سے اس کی بیوہ کو بھی اسی تناسب سے حصہ ملنا چاہیے جس تناسب سے وراثت میں اس کا حصہ ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں تھا' حدیث میں بھی اس وقت اس کا ذکر نہیں تھا' جب تک یہ واقعہ پیش نہ آیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے ذریعے سے یہ نیا اضافہ سامنے آتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اسلامی قانون کے دو مستقل' غیر تبدل پذیر ماخذ یعنی قرآن و حدیث مکمل ہو جاتے ہیں۔ قانونی نقطہ نظر سے جب کوئی نئی گتھی پیدا ہوتی تو اسے سلجھانے کے لیے مسلمان سب سے پہلے قرآن اور پھر حدیث سے رجوع کرتے اور اگر ان دونوں میں کوئی حل نہ ملتا تو پیغمبر کے عطا کردہ عظیم الشان اصول یعنی اجتہاد پر عمل کرتے۔ یہ اصول بعد میں مسلمانوں کے بہت کام آیا ورنہ اسلامی قانون منجمد ہو جاتا' اور مسلمان اسے ناکافی پا کر شاید غیر اسلامی قوانین اختیار کر لینے پر مجبور ہوتے۔ اجتہاد کے ذریعے سے ہر نئی چیز کے بارے میں قانون بنانے کا موقع مل گیا۔

۹۲۔ اسی طرح قاضیوں کے نام حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہمیں ایک خط ملتا ہے جس میں یہ حکم تھا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے مشورہ بھی کر لیا کرو۔ یہ نہیں کہ من مانا فیصلہ کرو اور اسے نافذ کر دو۔ اگر تمھیں

قانون معلوم نہیں ہے تو خود بھی سوچو اور عالم لوگوں سے جو تمھارے آس پاس موجود ہوں' ان سے بھی مشورہ کرو۔ یہ ایک طرح سے اجتماعی (Collective) اجتہاد کی صورت ہو سکتی ہے۔ خود خلفاء کا بھی یہی معمول تھا۔ حضرت ابو بکر' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق ہمیں کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کوئی پیچیدہ مقدمہ ان کے سامنے آتا' جس کے بارے میں انھیں قرآن و حدیث میں وضاحت کے ساتھ کوئی قانون نہ ملتا تو اجتماع عام کیا جاتا۔ اذان ہوتی' لوگ دوڑتے ہوئے مسجد کی طرف آتے' مسجد میں خلیفہ ان سے مخاطب ہو کر پوچھتا کہ اس معاملے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ اس اجتماع میں ہر شخص رائے دینے کا مجاز تھا' بڑا ہو یا چھوٹا' مرد ہو یا عورت' ہر ایک مشاورت میں شریک ہو سکتا۔ عورتوں کا ذکر میں اس لیے کرتا ہوں کہ ایک ایسی مثال ہمیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ملتی ہے۔ اس زمانے میں یہ معاشرتی خرابی پیدا ہو گئی تھی کہ بیٹی کا نکاح کرنے سے پہلے لوگ بڑا مہر حاصل کرنے کی کوشش کرتے' اور ہونے والے داماد سے کہتے کہ اتنی رقم دو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ اس طرح بہت سی لڑکیاں بوڑھی ہو جاتی ہیں' اور شوہر کا خواب دیکھتی رہتی ہیں' نکاح کا موقع نہیں ملتا۔ انھوں نے حکم جاری کر دیا کہ فلاں مقدار رقم سے زیادہ مہر نہ باندھا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ وقت تھے' بہت بڑے صحابی تھے' دیگر صحابہ نے اعتراض بھی نہیں کیا' اس اعلان پر مسجد میں ایک عورت اٹھ کھڑی ہوتی ہے' اور کہتی ہے کہ اے عمر' تمھیں ایسا حکم دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا' یہ قانون نامناسب ہے۔ وہ حیران ہوئے' پوچھا "کیوں ناجائز ہے؟" اس بوڑھی عورت نے کہا: "قرآن مجید (۴:۲۰) میں ایک جگہ ذکر آیا ہے کہ تم عورت کو مہر میں ایک قنطار یعنی بہت بڑا خزانہ دے چکے ہو تو بھی طلاق کی صورت میں اس سے واپس نہ لینا۔ جب خدا نے یہ اجازت دے دی ہے کہ مہر ایک قنطار باندھا جا سکتا ہے تو عمر کو کیا حق ہے کہ اس قانون کو منسوخ کرے"۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت خدا ترس آدمی تھے' فوراً کہہ اٹھے "عمر نہیں سمجھا' بوڑھی عورت سمجھ چکی ہے اس کا بیان ٹھیک ہے۔ میں اپنا حکم واپس لیتا ہوں"۔ حاصل کلام یہ کہ مشورے کی عام اجازت ہے' اس میں عالم و جاہل' بچہ و بوڑھا' مرد اور عورت کا کوئی فرق نہیں۔ ہر شخص رائے دے گا۔ اس رائے پر اگر لوگوں کا اتفاق ہو تو اس پر عمل کیا جائے گا' ورنہ نہیں بہرحال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں ہمیں حکومت کی طرف سے اجتماعی مشورہ' مفتیوں اور قاضیوں کی طرف سے انفرادی آراء کا ملنا نظر آتا ہے۔ اس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

۹۳۔ چونکہ مسلمان ابتدائی زمانے ہی میں تین براعظموں' یعنی ایشیاء' یورپ اور افریقہ میں پہنچ گئے

تھے‘ جہاں بیسیوں قوموں سے انھیں سابقہ پڑا‘ ان کی رعیت میں دس پندرہ مذہب والے لوگ پائے جاتے تھے جن کے عادات و رواج مختلف تھے‘ لہٰذا انھیں نئے نئے مقدمے اور مسائل پیش آتے رہے اور ان کے متعلق فیصلے بھی مختلف ہوتے رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ قرآن مجید میں غیر مسلم رعایا سے جزیہ لینے کا حکم ہے اور وہاں اہل کتاب کا ذکر ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں شمالی افریقہ کا وہ علاقہ فتح ہوا جہاں بربر نامی قوم رہتی ہے۔ سوال پیدا ہوا کہ آیا بربر قوم سے جزیہ لیا جائے یا نہیں۔ اس واقعے سے کچھ پہلے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ایران کے مجوسیوں یعنی پارسیوں کے متعلق یہی سوال پیدا ہوا تھا۔ جواب آسانی سے مل گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اٹھ کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجوسیوں سے ‘ سنوا بهم سنة اهل الكتاب في غير اكل ذبائحهم ولا نكاح نسائهم پارسیوں سے وہی برتاؤ کرو جو اہل کتاب سے ہے (یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کا قانون ان سے بھی متعلق کرو‘ بجز دو باتوں کے: ان کا ذبیحہ نہ کھاؤ اور ان کی عورتوں سے نکاح نہ کرو) لیکن حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بربر کا مسئلہ پیدا ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم موجود نہیں تھا۔ قرآن مجید میں بھی صراحت نہیں تھی۔ آخر مشورہ کے بعد خلیفہ نے حکم دیا کہ ان سے جزیہ لو۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ صرف اہل کتاب ہی نہیں‘ ساری غیر مسلم اقوام سے جو ہماری رعیت ہوں‘ جزیہ لیا جائے۔ سندھ پہنچے تو یہاں جو قوم تھی‘ ان سے جزیہ لیا جانے لگا پھر دوسرے علاقے میں پہنچے تو برہمنوں سے بھی جزیہ لیا جانے لگا۔ غرض امام ابو یوسف کے الفاظ میں سارے غیر مسلموں سے جزیہ لیا جانے لگا۔ چاہے وہ آگ کی پوجا کریں یا درخت یا پتھر کی پوجا کریں‘ سب کے ساتھ اسی حیثیت سے برتاؤ کیا جانے لگا‘ جو اہل کتاب کے متعلق قرآن نے کہا ہے۔ اور استنباط کیا کہ قرآنی احکام توضیحی (Illustrative) ہیں‘ تحدیدی (Limitative) نہیں‘ یعنی یہ منشاء نہیں کہ صرف اہل کتاب سے جزیہ لو بلکہ اس طرح کی صورت میں اوروں سے بھی تم لے سکتے ہو۔

۹۴۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا جسے قانونی نقطہ نظر سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے ایک فاضل صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلم کی حیثیت سے کوفہ بھیجا۔ (یوں سمجھیے کہ کوفہ کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے)۔ بہرحال انھیں معلم کی حیثیت سے کوفہ بھیجا گیا۔ وہ مورخ نہیں تھے‘ صوفی نہیں تھے‘ وہ خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح نامور سپاہی بھی نہیں تھے لیکن قانون میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ وہ وہیں درس دیتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے درس میں قانونی مباحث اور قیاسانہ عناصر ہمیشہ زیادہ ہوتے تھے۔ جب وہ وہاں

بھیجے گئے۔ تو انھیں ایک پروانہ یا تقرر نامہ دیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے: "اے کوفہ کے مسلمانو! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت محترم صحابی کو تمھارے پاس بھیج رہا ہوں۔ تمھیں شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں اپنے آپ پر ایثار کر کے ایسے شخص کو تمھیں دے رہا ہوں۔ اس سے تمھیں معلوم ہو گا کہ ان کی کیا اہمیت ہے"۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی وفات تک وہاں شعبہ قانون کے استاد کی حیثیت سے درس دیتے رہے۔ اس شہر کے باشندوں میں انھیں ایک لائق یمنی شاگرد، علقمہ نخعی نامی ملا، جو ان کا بہترین طالب علم تھا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد یہ شاگرد جامع مسجد کوفہ میں قانون کا معلم بنا اور اس نے درس جاری رکھا۔ ان کی وفات ہوئی تو ابراہیم نخعی ایک اور یمنی باشندہ جو کہ شاگرد تھا اور کوفہ میں ہی رہتا تھا، وہ ان کا جانشین بنا۔ غرض یہ سلسلہ جاری رہا اور یہ شہرت پھیل گئی کہ کوفہ کی مسجد میں فقہ کی تعلیم بہت اچھی ہوتی ہے۔ ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد ان کے ایک شاگرد، حماد بن ابی سلیمان، جو عرب نہیں بلکہ ایرانی تھے، وہ جانشین ہوئے۔ وہ بھی قانون کے ماہر تھے اور فقہ کی تعلیم دیتے تھے۔ جب ان کی وفات ہوئی تو ان کا جانشین ایک اور ایرانی شاگرد بنتا ہے۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ وہ بہت کمسن تھے، اس کے باوجود سب سے بہتر شاگرد سمجھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ خود حماد بن ابی سلیمان کے شاگرد یعنی امام ابو حنیفہ کے جو ہم درس طلباء تھے وہ بھی اصرار کرنے لگے کہ: اے ابو حنیفہ، استاد کے بعد تم اس کام کو جاری رکھو۔ ابو حنیفہ بہت ذہین آدمی اور انسانی نفسیات سے آشنا تھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ مجھ جیسے نوجوان کو استاد کی جگہ لوگ دیکھیں گے تو غالباً پسند نہیں کریں گے۔ جب تک انھیں کوئی تشویق نہ دی جائے اور یہ نہ بتایا جائے کہ واقعی ان کے لیکچر بہت اہم ہیں۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ نے اپنے ساتھیوں سے، جو ان کے رفیق درس تھے، کہا کہ میں اس شرط کے ساتھ قبول کرتا ہوں کہ ایک سال تک تم میرے طالب علموں کی حیثیت سے لیکچروں میں حاضر رہو گے۔ اگر تم اس پر آمادہ ہو تو میں قبول کرتا ہوں۔ وہ بھی مخلص دین دار لوگ تھے۔ انھوں نے کہا "بہت خوب"۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ابو حنیفہ وہ استاد ہیں کہ ان کے ہم درس بھی ان کے شاگرد بننے کو تیار ہیں، تو انھیں خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی ہوا کہ واقعی یہ قابل شخص ہو گا۔ جب ہی تو اس کے ہم جماعت اس کے شاگرد بننے پر آمادہ ہیں۔ امام ابو حنفیہ کی اور دوسری خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ جب کبھی ان کے پاس کوئی غریب طالب علم آتا تو وہ مالی مدد بھی کیا کرتے۔ اس طرح لوگوں میں ان کی شہرت و عزت اور ان کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا۔ بنی امیہ کا آخری دور تھا۔ یہ زمانہ سیاسی نقطہ نظر سے بہت خراب تھا۔ ملک میں دہشت گردی اور خون ریزی عام تھی۔ حکومت کے جبر و تشدد کے خلاف عوام میں بغاوت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ غرض

بہت ہی نازک زمانہ تھا۔ اس دور کے آخری زمانے یعنی ۱۲۰ھ کے ایک واقعے کی طرف اشارہ کروں گا۔ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے زید بن علی زین العابدینؒ کو حکومت کے مظالم کی وجہ سے حکومت کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوئی' اور وہ بغاوت پر کمربستہ ہو گئے۔ امام ابو حنیفہ ان کو بہت چاہتے تھے اور وہ دل سے خواہاں تھے کہ بنو امیہ کے حکمرانوں کی جگہ زید بن علی خلیفہ بن جائیں۔ ایک دن زید بن علی نے ان سے کہا کہ بہت سے لوگ مجھے مدد دینے پر آمادہ ہو چکے ہیں' اور میں اب حکومت کے خلاف ایک مسلح بغاوت کرنا چاہتا ہوں۔ امام ابو حنیفہ نے انھیں رقم دی' لیکن ساتھ دینے سے انکار کر دیا' یہ کہا کہ اگر مجھے یقین ہو تا کہ تمھارے ساتھی' آخر تک ساتھ دیں گے تو میں بھی اس فوج میں شریک ہو تا' یعنی حکومت کے خلاف بغاوت میں حصہ لیتا۔ مگر مجھے اطمینان نہیں ہے۔ میں تمھیں رقم کی حد تک مدد دیتا ہوں۔ چنانچہ وہی پیش آیا جس کا ابو حنیفہ کو اندیشہ تھا۔ یعنی ان کے ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے حکومت نے انھیں گرفتار کر لیا اور انھیں قتل کر دیا۔ زید بن علی کی قانون دانی کی وجہ سے ابو حنیفہ کو ان سے محبت تھی۔ زید بن علی بہت بڑے فقیہ تھے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے فقہی معاملات میں ان سے استفادہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ امام ابو حنیفہ سے زیادہ معمر اور پرانے ماہر تھے۔ زید بن علی نے جو کتاب لکھی اس کا نام ہے "المجموع فی الفقہ" یہ مشہور کتاب ہے اور اسلامی قانون کی قدیم ترین کتاب ہے' جو ہم تک پہنچی ہے۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ کی کتابیں آج کل جس انداز و ترتیب کی ہوتی ہیں' وہی نہج اس میں موجود ہے۔ آغاز ہوتا ہے "کتاب الطہارۃ" سے' جس میں وضو کے احکام اور غسل کے احکام ہیں۔ پھر نماز کے احکام' روزہ وغیرہ' عبادات کا بیان' پھر معاملات' پھر دوسری چیزوں کا بیان۔ یہ طرح زید بن علی نے ڈالی اور لوگوں کو اتنی پسند آئی کہ بعد میں کسی نے اس میں ترمیم نہیں کی۔ یہ دور گزر گیا اور بنی عباس بر سر اقتدار آئے۔ لوگوں کو توقع تھی کہ بنو عباس کے زمانے میں دنیا جنت بن جائے گی مگر انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ مختلف وجوہ سے لوگوں کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں' صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس دور میں امام ابو حنیفہ نے ایک کارنامہ انجام دیا' جو اسلامی قانون کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم اور یادگار کارنامہ ہے۔ اس زمانے میں امام مالک' امام اوزاعی وغیرہ بڑے بڑے فقیہ موجود تھے۔ انھوں نے کتابیں بھی لکھیں لیکن ان کی کوششیں انفرادی تھیں۔ امام ابو حنیفہ نے سوچا کہ انفرادی کوشش کی جگہ' اسلامی قانون کی تدوین اگر اجتماعی طور پر کی جائے' تو بہتر ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بہت سے شاگردوں میں سے چالیس ماہرین قانون منتخب کر کے ایک اکیڈمی قائم کی۔ انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا کہ جو لوگ قانون کے علاوہ دیگر علوم اور معاملات کے ماہر ہوں' انھیں بھی اکیڈمی کا رکن بنایا جائے۔ غرض مختلف صلاحیتوں کے ماہرین کو اس اکیڈمی میں جمع کیا گیا۔ اصول یہ تھا کہ ایک فرضی سوال پیش کیا

جائے کہ اگر یوں ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ اس مسئلے پر بحث ہوتی۔ بعض اوقات ایک سوال پر ایک ایک ماہ تک بحث ہوتی اور بالآخر جب سب لوگ ایک نتیجے پر پہنچ جاتے تو اس اکیڈمی کے سیکرٹری امام ابو یوسف اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ ایسی کچھ تحریریں ہم تک پہنچی ہیں، جن میں "قال" "قلنا" "قال" "قلنا" یعنی سوال و جواب کی صورت میں کسی مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔

۹۵۔ خلاصہ یہ کہ امام ابو حنیفہ کے زمانے میں اسلامی قانون کی تدوین کی دو کوششیں ہوئیں۔ ایک کوشش حکومت کی طرف سے ہوئی۔ دوسری کوشش پرائیویٹ طور پر امام ابو حنیفہ کی طرف سے۔ سرکاری کوشش خلیفہ منصور کی تھی۔ اس نے چاہا کہ اسلامی قانون کو مدون کیا جائے اور ساری اسلامی سلطنت میں اسے نافذ کیا جائے۔ اس زمانے میں امام مالک کی بڑی شہرت تھی۔ چنانچہ خلیفہ نے امام مالک کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم اپنی کتاب فقہ کو مکمل کر لو۔ میں تمھاری فقہ کو حکومت کا قانون بنا کر نافذ کرنا چاہتا ہوں۔ امام مالک بہت خدا ترس تھے۔ انھوں نے کہا، نہیں، ایک آدمی کی رائے سب پر نافذ نہیں کی جاسکتی۔ لوگوں کو اختلاف کی اجازت ہونی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے انکار کر دیا۔ مگر اسلامی قانون کی تدوین کی ضرورت تھی۔ وہ کام امام ابو حنیفہ نے انجام دیا اور سالہا سال کی کوشش سے ایک ایسا قانون بنایا جس کے متعلق میں پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ Justinian Code سے زیادہ مکمل اور زیادہ مناسب ہے۔

۹۶۔ اس زمانے میں اور بھی فقیہ پیدا ہوئے اور ان فقہاء کے شاگرد بھی بنتے گئے۔ ایک مختصر جملے پر میں اسے ختم کرتا ہوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو فقہاء تھے، ان میں ایک عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، جن کا میں نے ابھی ذکر کیا، جن کے چوتھی نسل کے شاگرد امام ابو حنیفہ تھے۔ دوسرے فقیہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے ان کے شاگرد کے شاگرد امام مالک ہیں۔ مالکی مذہب گویا اس صحابی کی راہ سے پہنچتا ہے۔ ایک اور صحابی عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کا قانون، اسلامی فرقوں میں سے خوارج کا قانون ہے۔ ایک اور صحابی ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ان کے قانونی احکامات ہمارے شیعہ بھائیوں کے پاس، زید بن علی، اثنا عشری یا فاطمی ائمہ وغیرہ، کے ذریعے سے پہنچتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ان علماء کے شاگردوں کے شاگرد، مثلاً امام شافعی ہیں کہ بیک وقت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد امام محمد کے شاگر اور امام مالک کے بھی شاگرد ہیں۔ امام شافعی کے شاگرد ہیں امام احمد بن حنبل اور ان کے شاگرد ہیں ظاہری مذہب کے پیشوا، داؤد ظاہری۔ غرض شیعہ سنی کا کوئی فرق نہیں، سب ایک دوسرے کے شاگرد ہیں اور خود ایک دوسرے کے مماثل۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

۹۷۔ مختلف سوالات کیے گئے ہیں' اپنی بساط کے مطابق جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال ۱۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "فان لم تجد" سے قرآن و حدیث کا ناکافی ہونے کا استدلال کیا گیا۔ حالانکہ "فان لم یکن" کے الفاظ نہیں فرمائے۔ قرآن میں اپنے ذہن کے مطابق کوئی چیز تلاش نہ کر سکنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن میں ہے ہی نہیں۔ آیت: الیوم اکملت لکم دینکم کی روشنی میں کیا یہ کہنا بہتر نہ ہو گا کہ اصولی طور پر قرآن کامل اور کافی ہے لیکن اگر اس سے کوئی مسئلہ انسانی ذہن کسی وقت استنباط نہ کر سکے' تو اجتہاد کر لے۔ اس صورت سے انسانی ذہن کا قصور ہو گا' نہ کہ کتاب اللہ کا ناکافی ہونا ثابت ہو گا۔

جواب۔ الفاظ کا پھیر ہے۔ دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ البتہ میں یہ عرض کروں گا کہ آیت: "الیوم اکملت لکم دینکم" (۵:۳) میں قرآن و حدیث اور اجماع' تینوں شامل ہو جائیں گے تنہا قرآن ہی نہیں ہو گا۔ کیونکہ قرآن ہی نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔ قرآن نے کہا ہے کہ "من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ" (۴:۸۰) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا اللہ کی اطاعت کرنا ہی ہے) وہاں یہ نہیں کہا گیا کہ صرف قرآن پر عمل کرو۔ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر قرآن میں نہ ملے تو حدیث میں تلاش کرو' حدیث میں نہ ملے تو اجتہاد کرو۔ تو آپ کا اور میرا مقصد ایک ہی ہے۔ الفاظ کی ترتیب میں تھوڑا سا فرق ہے۔

۹۸ سوال ۲۔ اسلامی قانون میں دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے' کیا اس صورت سے عورت کو آدھا مرد نہیں بنایا گیا؟

جواب۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال میں ایک بنیادی اصول کو نظرانداز کر دیا گیا ہے' وہ یہ کہ قدرت کبھی دو چیزوں کو بالکل مماثل نہیں بناتی۔ ایک کو دوسرے کی تکمیل کے لیے Complementary بناتی ہے۔ ورنہ اگر ایک ہی طرح کی دو چیزیں ہوں تو وہ Redundant یعنی مکرر ہو جائیں گی۔ اور یہ قدرت کی طرف سے ایک ضیاع ہو گا۔ قدرت نے مرد کو یا عورت کو مکمل شخصیت نہیں بنایا کہ Self-Reproduction کریں عورت کو مرد کی ضرورت نہ ہو' وہی تنہا اپنے بچے پیدا کرے یا مرد کو بیوی کی ضرورت نہ ہو' وہی تنہا ایک دوسرا انسان خود ہی تخلیق کرے۔ بلکہ اس کی جگہ ایک کو دوسرے کے تعاون سے مکمل کرنے کا بندوبست اپنی حکمت کے تحت کیا ہے۔ ان حالات میں اگر اسلامی قانون دو عورتوں

کی شہادتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیتا ہے تو اس کے اس پہلو پر جانے کی جگہ کہ دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے' اگر اس پر سوچیں کہ ایسا کیوں کیا گیا' تو میرے خیال میں زیادہ صحیح اصول ہو گا' اور اس کا جواب میں اپنی طرف سے یہ دوں گا کہ دونوں کے فرائض منصبی مختلف رکھے گئے ہیں۔ ایک عورت کو' چاہے وہ مانے یا نہ مانے' بچے کی ماں بننا پڑے گا' اور اسے بچے کی پرورش کا فریضہ بھی انجام دینا ہو گا۔ اسی طرح مرد کبھی بچہ جن نہیں سکے گا' چاہے وہ کتنا ہی خواہشمند کیوں نہ ہو۔ ان حالات میں جب عورت کا یہ فریضہ کہ وہ اپنے دودھ پیتے ننھے بچے کی پرورش کرے اور ساتھ ہی اس کے ذمے وہ فرائض بھی کر دیے جائیں جو مرد انجام دیتا ہے تو نہ عورت اپنا کام انجام دے سکے گی نہ مرد اپنا کام انجام دے سکے گا۔ مختلف وجوہ سے اسلامی شریعت نے عورت کو پردہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ عورتوں کو مردوں کے ساتھ مخلوط ہونے کی تشویق نہیں دلائی۔ ان حالات میں جس طرح مرد کو اور مردوں سے ملاقات کی آسانی ہوتی ہے' اس طرح ایک عورت کو دوسرے مردوں سے ملاقات کرنے کی سہولت ہماری اسلامی سوسائٹی میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ ناگزیر تھا کہ ایک کی جگہ دو عورتوں کی شہادت طلب کی جائے۔ تاکہ دونوں کی شہادت سے واقفیت اور معلومات مکمل ہو سکیں۔ اس میں عورتوں کی توہین نہیں ہے بلکہ عورت کے فرائض منصبی کی موجودگی میں اس کی سہولت اور امکانات کا لحاظ رکھ کر اس کو یہ موقع دیا گیا ہے' ورنہ ممکن ہے' یہ کہہ دیا جاتا کہ عورت کی شہادت قبول ہی نہ کی جائے۔ اس کے برخلاف یہ کہا گیا کہ نہیں عورت کی شہادت قبول کی جائے' وہ بھی انسان ہے۔ جیسے وراثت میں اسلام سے پہلے عورت کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا' قانون وراثت کے نقطہ نظر سے غالباً پنجاب کی روایات میں بھی یہ چیز رہی ہے کہ عورتوں کو حصہ نہیں ملتا۔ اسلام نے کہا کہ نہیں عورتوں کو بھی حصہ ملے گا۔ لیکن چونکہ عورت کے واجبات کمتر ہوں گے لہٰذا عورت کا حصہ کم ہو گا۔ آپ کو علم ہو گا کہ ایک عورت خواہ وہ بیٹی ہو یا بیوی ہو یا ماں ہو' ہمیشہ کسی مرد کے زیر کفالت رہتی ہے۔ اسے نفقہ دلایا جاتا ہے اور اگر اس کا قریبی رشتہ دار' بیٹا یا باپ یا شوہر وغیرہ نفقہ نہ دیں تو قانون اس مرد کو مجبور کرتا ہے کہ وہ نفقہ دے۔ عورت کی پرورش کا انتظام مرد کے ذمے کر دیا گیا ہے۔ لیکن اگر کبھی مرد کو ضرورت پیش آئے تو کسی عورت کو مجبور نہیں کیا جاتا کہ وہ اس مرد کا نفقہ ادا کرے۔ ان حالات میں ناگزیر تھا کہ قانون وراثت میں عورت کو حصہ کم دیا جائے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ چونکہ عورت کے سارے مصارف قانوناً" دوسرے کی طرف سے ادا ہو جاتے ہیں' اس لیے عورت کو حصہ بالکل ہی نہ دیا جائے۔ یہ ہو سکتا تھا مگر اسلام نے عورت کے ساتھ ایک ایسا برتاؤ کرنا مناسب سمجھا جو اس کے وقار اور اس کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔ ان حالات میں' میں سمجھتا ہوں کہ قانون شہادت میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا کہ چونکہ عورت

کو مردوں کے ساتھ ملنے جلنے کے مواقع مقابلتہ" کم ہوتے ہیں' لہٰذا ایک کی بجائے دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے لیکن یہ واضح رہے کہ میں قانون شہادت کا ماہر نہیں ہوں۔

۹۹ سوال ۳۔ غلامی کو یکسر ختم نہ کر کے انسانیت کے ناسور کو برقرار رکھا گیا ہے' اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟

جواب۔ اس کا جواز یہ ہے کہ بعض انسان معقول چیز کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان کو مجبور کرنا پڑتا ہے کہ یہ چیز مان لو۔ ہمارے زمانے میں بھی ایسی قومیں ہیں' مثلاً جنوبی افریقہ میں' جہاں اپنے باپ آدم ہی کی دوسری اولاد کو' جس کا رنگ اتفاق سے کالا ہو گیا ہے' مساوات کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں' چاہے ساری دنیا متفقہ طور سے مجلس اقوام متحدہ میں اس کا مطالبہ کیوں نہ کرے۔ کیا ان حالات میں یہ مناسب نہ ہو گا کہ ایسے لوگوں کو جو ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے ہیں' ایک ایسے ذریعے سے مجبور کیا جائے' جو غلامی کا نام تو رکھتی ہے' لیکن حقیقت میں ان انسانوں کے لیے ایک تربیت گاہ ہے جو دوسرے انسانوں کو اپنے برابر تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ اس لیے اسلام نے غلامی کو لازمی نہیں قرار دیا ہے بلکہ جائز قرار دیا ہے تاکہ بوقت ضرورت اس سے استفادہ کیا جائے۔ میں آپ کو پیچھے لے جانا چاہتا ہوں کہ غلامی شروع کیسے ہوئی؟ اس کے بعد آپ واقعی یہ سمجھیں گے کہ غلامی اتنی بری چیز نہیں ہے۔ غلامی کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پرانے زمانے میں ہمارے ہی آباؤ اجداد جب لڑتے تھے اور کسی دوسرے انسان کو مغلوب کر لیتے تھے تو اسے قتل کر کے' کھا جاتے تھے۔ اس کے بعد کے زمانے میں نیک طینت انسانوں نے سوچا کہ ان کو مار کر کھا جانے کے بجائے' ان سے خدمت لی جائے۔ اپنے دشمن کو قتل کرنے کی بجائے' اس کو زندہ رکھا جائے' اور پھر زندہ رہنے کے بعد' اسلام میں اس کے امکانات بھی رہیں کہ اس کو آزاد کیا جائے۔ غلام بنانا اسلام ہی میں نہیں ہے بلکہ دنیا کی کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں ملتی جس کے ہاں غلام نہ ہوں۔ اسلام نے غلامی کے متعلق جو احکام دیے ہیں' میں ان کا بھی مختصراً" ذکر کرتا ہوں۔ پہلی چیز وہی ہے جو میں بیان کر چکا ہوں کہ غلام بنانا واجب نہیں ہے' صرف جائز ہے اس سے حسب ضرورت استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام نے حکم دیا کہ غلاموں کو آزاد کرنا ایک بہت بڑی نیکی ہے: "فلا اقتحم العقبۃ وما ادراک ما العقبۃ فک رقبۃ" (۹۰: ۱۱' ۱۲' ۱۳)۔

۱۰۰۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ توریت اور انجیل میں غلام بنانے کا تو ذکر ہے لیکن غلام کی آزادی کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔ ایک بھی ایسی آیت توریت اور انجیل میں نہیں ہے جس کی رو سے غیر یہودی غلاموں کو آزاد کیا جا سکتا ہو۔ اس کے برخلاف قرآن نے کہا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنا' ایک بہت بڑی نیکی

ہے۔ اور آگے چلئے، مختلف گناہوں کا کفارہ دینے کے لیے قرآن نے حکم دیا ہے کہ غلام کو آزاد کرو۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنی بیوی کو "ظہار" نامی طلاق دے کر پچھتائے یا کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے تو علاوہ خون بہا کے، قرآن نے یہ حکم دیا ہے کہ غلام کو آزاد کر کے کفارہ دو۔ اگر غلام تمھارے پاس نہ ہو تو اس صورت میں دوسرے کام سرانجام دے سکتے ہو، مگر غلام کو آزاد کرنے کا حکم شروع میں آتا ہے۔ ایسی تین چار چیزیں تو قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ اور آگے چلئے۔ قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ اگر کوئی غلام اس پر آمادہ ہے کہ اپنی مالیت کی رقم جمع کر کے، اپنے آقا سے مطالبہ کرے کہ اس رقم کو لے کر اس کو آزاد کر دے، تو آقا انکار نہیں کر سکتا۔ قانون اس آقا کو مجبور کرے گا کہ اس معاوضے کو قبول کرے اور غلام کو آزاد کر دے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کاروبار کر کے اور دوسرے وسائل سے اپنی مالیت جمع کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور مطلوبہ رقم جمع ہو جائے تو آقا کو دے کر فی الفور آزاد ہو جائے گا۔ اس سے بھی آگے چلئے۔ قرآن مجید میں ایک آیت ہے جسے ہم اسلامی حکومت کے بجٹ کا اساسی اصول کہہ سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ سرکاری آمدنی کو کن مدات میں خرچ کیا جائے: "انما الصدقات للفقراء والمساکین و العاملین علیھا والمؤلفتہ قلوبھم وفی الرقاب" (الایۃ) (۹: ۶۰) اس میں "فی الرقاب" ایک لفظ آیا ہے۔ لفظی معنی یہ ہیں کہ سرکاری آمدنی خرچ کی جائے، گردنوں کے چھڑانے کے لیے، اس پر سارے مفسرین اور فقہاء متفق ہیں کہ "رقاب" سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں، ایک تو وہ مسلم یا غیر مسلم غلام جو ہماری ملکیت میں ہوں، ان کی رہائی کے لیے یہ سرکاری رقم لگائی جائے دوسرے ہماری رعایا کے مسلم یا غیر مسلم لوگ جو دشمن کے ہاتھوں قید ہو جائیں۔ ان کے فدیہ دینے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر حکومت کے بجٹ میں سالانہ ایک مخصوص رقم ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے رکھنا لازمی ہو تو بہت آسانی سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کچھ ہی دنوں کے بعد اس ملک میں ایک بھی غلام باقی نہیں رہے گا۔ کیا ایسی کوئی مثال دنیا کی کوئی متمدن سے متمدن حکومت بھی پیش کر سکتی ہے؟ آج بھی لوگوں کو غلام بنایا جاتا ہے۔ ان کی مرضی کے خلاف Concentration کیمپوں میں بھیجا جاتا ہے، جہاں وہ غلاموں سے بھی بدتر زندگی گزارتے ہیں۔ بہرحال میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر غلامی انسانیت کے لیے ناسور ہے تو کم از کم، اسلامی غلامی، انسانیت کے ناسور کا علاج ہے۔

۱۰۱ سوال ۴۔ براہ کرم شرع اور قانون فقہ کا فرق واضح فرمائیں۔ اگر ایک ہی مفہوم میں یہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں تو عرب دنیا کی یونیورسٹیوں میں کلیتہ الشریعتہ والقانون علیحدہ علیحدہ کیوں بیان ہوتے ہیں؟

جواب۔ عرض یہ ہے کہ اصولاً ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، لیکن اسلامی ممالک میں ہماری بد قسمتی سے ہماری حالیہ تاریخ میں ہم کو ضرورت پیش آئی کہ اپنا قانون چھوڑ کر غیروں کے قانوں پر عمل کریں۔ ہمارے فرنگی حاکموں نے ہمارے لیے ایسے قانون بنائے جن کو ہم اسلامی قانون کے مطابق نہیں پاتے۔ وہ قانون اسلامی قانون نہیں ہے۔ لہٰذا شرعی قانون اور غیر اسلامی قانون میں فرق کرنے کے لیے ایک کو "شریعتہ" یا اسلامی فقہ اور دوسرے کو صرف "قانون" کہا جاتا ہے۔

۱۰۲سوال ۵۔ دو جڑواں بہنیں پیدا ہوئیں۔ ان کے بازو آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ اسی طرح جوان ہو گئیں۔ انھیں ایک ساتھ بھوک لگتی ہے۔ اکٹھے ہی بخار ہوتا ہے۔ لیکن جب شادی کا مسئلہ پیدا ہوا تو بعض نے کہا کہ ان کی شادی نہیں ہو سکتی۔ بعض نے کہا کہ ان کی شادی دو الگ الگ مردوں سے ہونی چاہیے۔ مولانا مودودی صاحب نے فتویٰ دیا کہ ان بہنوں کی شادی ایک مضبوط صحت مند مرد سے کر دینی چاہیے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ جواب ضرور دیں۔

جواب۔ یہ سوال مشکل ہے، اس لیے میرا جواب متذبذب ہی رہے گا۔ اور وہ یقینی جواب نہیں ہو گا۔ ابھی چند مہینے پہلے کی بات ہے، پیرس کے اخباروں میں ایک مماثل خبر شائع ہوئی۔ وہاں جو حل کیا گیا تھا، اس کا ذکر وہاں کے ایک فرانسیسی اخبار میں آیا، وہ میں آپ سے بیان کر دیتا ہوں کہ ان دو بہنوں کی شادی، ایک جڑواں جوڑے سے کی گئی جس میں دونوں مرد ہی تھے۔ ایک حل یہ بھی ہے جس پر اب آسانی سے عمل ہونے لگا ہے۔ جراحی (سرجری) اب اتنی ترقی کر گئی ہے کہ جڑواں لوگوں کے اگر صرف ہاتھ جڑے ہیں یا صرف پیٹھ جڑی ہے، یا صرف پاؤں، تو آسانی سے آپریشن کے ذریعے سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ اس طرح جڑے ہوئے ہیں، مثلاً پیٹ مشترک ہے، تو ظاہر ہے، اس صورت میں ان کا آپریشن کرنا ناممکن ہے۔ بہرحال یہ ایسی نادر صورتیں ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی عام قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب ایک اچھے عالم تھے، اور خدا ترس بھی تھے۔ انھوں نے جو فتویٰ دیا ہے اس پر عمل کیا جا سکتا ہے اگرچہ وہ مجھے دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا معلوم ہوتا ہے جس کی قرآن (۲۳:۴) نے "وان تجمعوا بین الاختین" کہہ کر صریحاً ممانعت کی ہے۔ میں بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ ان جڑواں بہنوں کا دو الگ مردوں سے نکاح کیا جائے۔ اور جب ایک بہن کے پاس اس کا شوہر آئے تو تھوڑی دیر کے لیے دوسری بہن چادر اوڑھ کر خود کو غائب کر لے، دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنے کے مقابل میں یہ کم تر برائی ہو گی۔۔ شاید اس عمل سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے جو فرانس میں پیش آیا تھا۔ بذات خود کوئی خاص جواب دینے سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں۔

۱۰۳سوال ٦۔ فقہ جعفریہ اور فقہ حنفیہ میں کیا فرق ہے؟ ان میں اختلاف کی وجہ کیا ہے' جب کہ امام ابو حنیفہ' امام جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد بیان کیے جاتے ہیں۔ فقہ جعفریہ کے نافذ کرنے میں کیا قباحت درپیش ہے؟

جواب۔ اس سوال میں ذرا سی خامی ہے۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ استاد اور شاگرد سو فیصد متفق ہوں گے۔ چونکہ امام ابو حنیفہ نے امام جعفر الصادق سے درس لیے تھے۔ لہٰذا ان دونوں کے خیالات میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرے نزدیک علمی اور واقعاتی نقطہ نظر سے سو فی صد صحیح نہیں ہو گا۔ دونوں میں اختلاف رائے تھا۔ حتیٰ کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے دو شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد میں اختلاف رہا ہے۔ یہاں تک گمان کیا جاتا ہے کہ فقہ حنفی میں ۱۵ فی صد باتوں میں امام ابو حنیفہ کی رائے پر' اور باقی چیزوں میں ان کی رائے کے برخلاف ان کے شاگردوں' امام ابو یوسف اور امام محمد' کی رائے پر عمل کیا جاتا تھا' تو ان حالات میں یہ کہنا کہ فقہ جعفری اور حنفی بالکل یکساں ہیں درست نہیں' جب وہ یکساں نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ جو لوگ امام ابو حنیفہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں وہ امام جعفر الصادق کی رائے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ کیونکہ امام جعفر الصادق نبی نہیں ہیں۔ انسان ہیں۔ نبی کے سوا' کم از کم سنیوں کے نزدیک' کوئی اور معصوم نہیں ہوتا' اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی پوری صراحت کے ساتھ بیان فرما دیا کہ علماء میں آپس میں اختلاف رائے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں' بلکہ وہ خدا کی رحمت ہی ہے۔ ان حالات میں اگر امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے استاد امام جعفر الصادق رحمتہ اللہ علیہ سے اختلاف کرتے ہیں تو استاد کی توہین کے لیے نہیں بلکہ پوری دیانتداری کے ساتھ پوری خدا ترسی کے ساتھ وہ جو رائے رکھتے ہیں' اسے بیان کرتے ہیں۔ جب قانون میں اختلاف ہے تو ان حالات میں اگر ایک ہی قانون سارے فرقوں کے لوگوں کے لیے نافذ کیا جائے' تو دوسرے فرقوں کے لیے دل شکنی کا باعث ہو گا۔ فرض کیجئے کہ پاکستان میں جعفری فقہ نافذ کرنا چاہیں اور یہاں حنفیوں کی تعداد بہت بڑی اکثریت رکھتی ہے' تو اگر حنفی لوگ قبول کریں تو بے شک مجھے کوئی عذر نہیں' لیکن حنفی لوگ قبول کرنا نہ چاہیں تو انھیں مجبور کرنا' ایک شورش پیدا کرنے کا وسیلہ بنے گا اور بالکل بے سود سی چیز ہو گی۔ وہ اس پر عمل نہیں کریں گے۔ میں ایک مثال آپ کو دیتا ہوں اس سے اندازہ ہو گا کہ دونوں قوانین میں کس قسم کا فرق پایا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کی وفات ہو جائے اور اس کا ایک بھانجا اور ایک بھتیجا موجود ہو تو حنفی قانون کہتا ہے کہ بھانجے کو کچھ بھی حصہ نہیں ملے گا' اور پوری رقم بھتیجے کو ملے گی اور جعفری قانون کہتا ہے کہ پورا ورثہ بھانجے کو ملے گا' بھتیجا محروم رہے گا' ان حالات میں آپ بتائیں کہ ہم ایک ہی قانون کیسے سارے لوگوں پر نافذ کریں' جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ

یوں ہونا چاہیے اور کچھ لوگ اس ماخذ یعنی قرآن و حدیث سے استنباط کر کے یہ کہتے ہیں کہ یوں نہیں ہونا چاہیے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ایک ہی قانون سارے فرقوں کے لوگوں پر نافذ کرنا مناسب نہیں، یعنی جہاں تک Personal قوانین کا تعلق ہے۔ البتہ جو اجتماعی قوانین ہیں، ان میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً پارلیمنٹ کے انتخابات، انتظامیہ Administration کے معاملات وغیرہ۔ اس میں ملک کے مختلف نمائندوں کی اکثریت جو اصول طے کرے گی، اس پر عمل کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان مسائل کے متعلق تفصیلیں قرآن و حدیث میں ہمیں نہیں ملیں گی۔ مثلاً نظام حکومت کیا ہو؟ اس بارے میں اسلام کوئی حکم نہیں دیتا۔ بادشاہت بھی جائز ہے اور اگر جمہوریت ہو تو وہ بھی جائز ہے، اور جماعت کی حکومت ہو تو وہ بھی جائز ہے۔ ان سب کو جب اسلام جائز قرار دیتا ہے تو ان حالات میں ہر دور کے اور ہر ملک کے لوگ باہم مشورت کے ساتھ خود ہی طے کریں گے، کہ ہمیں کون سا طرز حکومت اپنے زمانے کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ آپ شاید اس بات کی ضرورت سمجھیں کہ میں بتا دوں کہ میں کیوں بادشاہت کو بھی جائز قرار دیتا ہوں۔ بعض احباب فوراً کہیں گے کہ قرآن مجید میں ملکہ سبا، بلقیس کے ضمن میں ذکر آیا ہے کہ "ان الملوک اذا دخلوا قریہ افسدوھا" (۲۷:۳۴) (جب بادشاہ کسی بستی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد برپا کرتے ہیں) اس سے ہمارے بھائی استدلال کریں گے کہ بادشاہت کے خلاف حکم ہے، مگر میں بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں اچھے بادشاہوں کا ذکر بھی ہے، اور برے بادشاہوں کا بھی، جہاں ایک طرف فرعون اور نمرود جیسے ظالم بادشاہوں کا ذکر آیا ہے، وہاں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان جیسے پیغمبروں کو بھی بادشاہ کا لقب دیا گیا ہے، جب ایسے جلیل القدر پیغمبر بادشاہت کر چکے ہیں، تو پھر ہم اسے حرام کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ قرآن میں یہ آیت جو بلقیس کے سلسلے میں آئی ہے اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ یہ بلقیس کے خیالات تھے جو قرآن نے نقل کیے ہیں اس سے زیادہ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ کے خیال میں بادشاہت مناسب ہے تو اسے اختیار کیجئے، آپ کے خیال میں مناسب نہیں ہے تو نہ کیجئے۔ خود ہمارے رسول اکرم نبی ہی نہیں ساتھ ساتھ بادشاہ بھی رہے ہیں۔ یہ آپ کی توہین نہیں بلکہ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری کا مصداق ہے۔

۴۰۱سوال ۷۔ کیا عصر حاضر کے اہم مسائل کو مشاورتی طریق پر، ممالک اسلامیہ کے ممتاز علماء اور اسکالر کا ایک عالمی بورڈ بنا کر، حل کیا جا سکتا ہے؟ اس کا طریق کار یا اس کے عملی انتظامات کیا ہونے چاہئیں؟

جواب۔ میں اسے ناقابل عمل پاتا ہوں۔ اس لحاظ سے کہ ان علماء کی ضرورت صرف ایک دن کے لیے یا ایک ہفتے کے لیے نہیں ہوگی۔ ساری دنیا کے ماہر ترین علماء کو آپ بے شک بہاولپور میں جمع کر سکتے ہیں۔

ایک دن کے لیے یا ایک ہفتے کے لیے' یا ایک ماہ کے لیے لیکن ان کو ساری عمر یہاں رکھا جائے یہ ناممکن ہو گا۔ عالمی بورڈ کا یہ منصوبہ ناقابل عمل ہے لیکن اگر اجماع کی صورت پیدا کرنے کے لیے کوئی ادارہ تشکیل دینا مقصود ہو تو اس بارے میں تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں۔ البتہ مختصراً" کچھ عرض کیے دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اسلامی ممالک کا جو ذکر یہاں کیا گیا ہے' وہ ناکافی ہو گا۔ مسلمان علماء چاہے جہاں کہیں ہوں' روس میں ہوں یا امریکہ میں' یا پاکستان میں' ان کے ساتھ تعلق رکھنے' اور ان کے مشوروں سے استفادہ کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ انھیں ایک جگہ بلا لیا جائے یا ایک جگہ رہنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے برخلاف یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ملک میں علماء کی ایک انجمن بنے' جس کو ایک صدر مرکز سے منسلک کر دیا جائے۔ صدر مرکز کی طرف سے جب ایک سوال کسی ملک کو جائے گا۔ مثلاً فرانس کو' تو وہ فرانس کی انجمن کا سیکرٹری فرانس میں رہنے والے سارے مسلمان ماہرین فقہ اسلامی کو اس کی نقل بھیجے گا' اور ان سے کہے گا' کہ اس بارے میں آپ اپنی رائے سے جلد از جلد مدلل طور پر اطلاع دیجئے" جب وہ جوابات جمع ہو جائیں تو ان کا خلاصہ کر کے صدر مرکز کو بھیج دے گا۔ اس طرح صدر مرکز کے پاس تمام ممالک کی انجمنوں سے جوابات آئیں گے۔ صدر مرکز کے سیکرٹریٹ میں' ان جوابات کو مرتب کیا جائے۔ اگر اتفاق رائے ہے تو اسے اجماع قرار دیا جائے اور اگر اتفاق رائے نہیں ہے تو صدر مرکز کو چاہیے کہ دوبارہ وہی سوال ساری شاخوں میں گشت کرائے' اور موافق و مخالف دونوں فریقوں کی آراء کے ساتھ دلائل کی وضاحت بھی کرے۔ اس مکرر گشت کے موقع پر ممکن ہے جو لوگ ایک خاص رائے رکھتے تھے اب اپنے فریق مخالف کی دلیلوں کو معقول سمجھ کر' اپنی رائے بدل دیں۔ جب بار دیگر جوابات آئیں گے' اس وقت ان کو دوبارہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ اتفاق رائے ہو گیا ہے تو الحمد للہ اور اگر اتفاق نہیں بھی ہوا ہے' تب بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اتنے لوگ یا فلاں فلاں لوگ یہ رائے رکھتے ہیں' فلاں فلاں لوگ دوسری رائے رکھتے ہیں۔ یہ طریقہ قابل عمل ہو گا۔ اس سے ایک شخص جو خاص معین مقام پر نہیں ہے بلکہ اس کا ملک دوسرا ہے' اس کی رائے سے ہم یہاں رہ کر بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۰۵ سوال ۸۔ قرآن کریم نے ربا کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ کون سا ربا ہے؟ کیا کمرشل انٹرسٹ پر اس کا اطلاق ہو گا یا نہیں ہو گا۔ اگر ہو گا تو اس کی علت کیا قرار دی جائے گی؟

جواب۔ میں معاشیات Economics کا ماہر نہیں ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ربا ممنوع ہے۔ ربا کا مقصد یہ رہا ہے کہ یک طرفہ جو کھم سے منفعت حاصل کی جائے۔ مثلاً میں ایک شخص سے کچھ رقم بطور قرض حاصل کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اس کو قرض کی ادائیگی تک سالانہ مثلاً ۵ فی صد زائد رقم بطور سود ادا

کروں گا۔ قرض کی رقم سے میں تجارت کرنا چاہتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ مجھے اس تجارت کی منفعت میں سے ۵ فی صد سود سالانہ ادا کرنا ہے۔ اگر منفعت اس سے زیادہ ہو۔ اس صورت میں تو کوئی دشواری نہ ہو گی۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے ایک سال خسارہ ہو۔ اس خسارے کے باوجود میرے لیے لازم ہو گا کہ قرض دھندہ کو حسب وعدہ ۵ فی صد سالانہ ادا کروں۔ کیونکہ وہ نقصان میں شریک نہیں' صرف منفعت میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ اسے اسلام کے اخلاقی اقدار کے منافی قرار دے کر منع کر دیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف اگر ایسے بینک کا سود ہو جس میں قرض دہندہ اور قرض حاصل کنندہ' دونوں منفعت اور خسارے میں برابر کے تناسب سے شریک رہنے پر آمادہ ہیں' تو وہ ربا نہیں رہتا۔ اسے اسلام جائز قرار دیتا ہے ☆۔

۱۰۶سوال ۹۔ حکومت جو دیگر ممالک سے سودی قرضے لیتی ہے کیا اس قسم کا سود ادا کرنا جائز ہو گا؟

جواب۔ اس کا جواب میرے لیے ناممکن ہے' اس لیے کہ حکومت بعض وقت مجبور ہوتی ہے اور وہی اپنے مفاد کو بہتر سمجھتی ہے۔ چونکہ میں اس کے رازوں میں شریک نہیں ہوں اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ حکومت ہی نہیں' ہم آپ بھی بوقت ضرورت قرض لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ اس وقت کوئی اللہ کا بندہ مال دار شخص ہمیں بے سود قرض دینے کے لیے نہیں ملتا تو ہم کیا کریں؟ مجبوراً قرض لیں گے' اور سود ادا کرنے کا وعدہ کریں گے۔ خدا شاید ہمیں معاف کر دے گا لیکن اس سود خوار کو معاف نہ کرے گا۔ حکومت بھی اگر سودی قرض لینے پر مجبور ہے تو ممکن ہے' خدا اس کی نیک نیتی سے واقف ہو' اور اسے معاف کر دے۔ اگر اس کا منشاء شاندار محل بنانا ہے تو اللہ اسے سزا بھی دے سکتا ہے۔

۱۰۷سوال ۱۰۔ داڑھی عرب کا خاص رواج تھا' یہاں تک کہ مشرک لوگ بھی داڑھی رکھتے تھے۔ رسم و رواج شرعی نقطہ نظر نہیں بن سکتے۔ لیکن آج کل داڑھی کو سنت مؤکدہ سمجھا جاتا ہے۔ از راہ کرم! اس کی وضاحت کریں۔ شکریہ!

جواب۔ میں عرض کروں گا کہ مشرکین عرب ہی نہیں' کارل مارکس بھی داڑھی رکھتا تھا' انڈو چائنا کے ہوچی منہ کی بھی داڑھی تھی' لینن کی بھی داڑھی تھی۔ آپ پیرس آئیں گے تو دیکھیں گے کہ

☆ ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء کے پاکستان ٹائمز میں رفیع اللہ شہاب صاحب نے میرے اس بیان پر اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ الفقہ علی مذاہب الار بعہ ج ۳' ص ۴۲ کے مطابق فریقین کی شرکت صرف منفعت میں ہوتی ہے' اور خسارے کو صرف سرمایہ دار برداشت کرتا ہے لیکن ناقد صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ مذکورہ حوالے کو ذرا غور سے پڑھیں تو انہیں نظر آئے گا کہ وہاں ان کے بیان کے برعکس بیان ہوا ہے۔ لغوی (زمانہ جاہلیت کے) معنوں اور فقہی (اسلامی) احکام میں فرق کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

ہزاروں فرانسیسی غیر مسلم داڑھی رکھتے ہیں۔ آپ داڑھی کے فرنچ کٹ سے بھی واقف ہوں گے۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ داڑھی دوسروں کی تقلید میں رکھی جائے۔ آپ بھی قائل نہیں ہوں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس بارے میں قرآن و حدیث میں کیا احکام ہیں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اشارۃً" ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے نیچے اترے تو دیکھا کہ ان کی قوم یعنی یہودی گاؤ پرستی میں مشغول ہیں۔ وہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ گئے تھے۔ ان پر خفا ہوئے۔ قرآنی الفاظ (۹۴:۲۰) ہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی کو کھینچ کر ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا۔ یہ اشارۃً" ذکر ہے یعنی داڑھی رکھنا پیغمبروں کی سنت ہے۔ حدیث میں اس سے زیادہ صریح الفاظ ملتے ہیں "داڑھی رکھو" اس حدیث اور سنت رسول کے پیش نظر داڑھی رکھنا محض رسم و رواج نہیں بلکہ اسلامی حکم بن جاتا ہے۔ حکم کے متعلق آپ کو معلوم ہو گا کہ درجات پائے جاتے ہیں۔ یعنی اگر فرض کیجئے کہ قران میں صیغہ امر استعمال کر کے کہا گیا ہے کہ "زکوٰۃ دو" اور وہی صیغہ امر استعمال کر کے یہ بھی کہا گیا ہے کہ "خیرات دو" تو ظاہر ہے دونوں کا حکم یکساں نہیں ہے۔ اگر زکوٰۃ دینے سے میں انکار کروں تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلوار کھینچ کر مجھے مجبور کر سکیں گے کہ زکوٰۃ دوں۔ لیکن اگر میں خیرات دینے سے انکار کروں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ممکن ہے مجھے کہیں کہ "یہ برا مسلمان ہے" لیکن مجھے تلوار کے ذریعے مجبور نہیں کریں گے۔ یعنی احکام میں درجہ بندی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ داڑھی رکھنا بے شک اسلامی حکم ہے' لیکن اس درجے کا حکم نہیں ہے جیسے اللہ کو ایک ماننا یا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا نبی ماننا' یا مثلاً نماز پڑھنا' روزہ رکھنا وغیرہ۔ اس کا درجہ نسبتہً" فروتر ہو گا۔

۱۰۸ سوال ۱۱۔ جیسا کہ آپ کہہ چکے ہیں کہ لونڈیوں کو اس لیے پردہ نہ کرنے کی اجازت تھی کہ وہ کام کاج کرتی تھیں' انھیں سودا سلف خریدنے کے لیے باہر جانا پڑتا تھا۔ جب کہ آج کل کے دور میں عورت کو ملازمت کے سلسلے میں باہر جانا پڑتا ہے' تو کیا ان کے لیے بھی وہی حکم ہو گا جو لونڈیوں کے لیے تھا' کیونکہ احکام علت پر مبنی ہوتے ہیں۔ علت کے بدل جانے سے احکام بدل جاتے ہیں۔ فقہی نقطہ نظر سے اس مسئلے کی وضاحت کیجئے۔

جواب۔ مجھے یقین ہے کہ میری بہنیں جو یہاں موجود ہیں وہ لونڈی بننا پسند نہیں کریں گی۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ لونڈیوں کو پردہ نہ کرنے کی جو اجازت دی گئی ہے' اس کی علت وہی ہے جو میں نے بیان کی۔ میں نے تو صرف ایک ذاتی رائے ظاہر کی تھی۔ قانون ساز صرف حکم دیتا ہے' قانون کی وجہ اور ضرورت کی توضیح وہ خود نہیں کرتا۔ اسے ہم سوچتے ہیں اور ہماری سوچ چونکہ ہماری ہوتی ہے' قانون ساز یعنی خدا اور رسول

(صلی اللہ علیہ وسلم) کی نہیں ہوتی۔ اس لیے میں یہ کہوں گا کہ اگر میری رائے میں لونڈیوں کے پردہ نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انھیں بہت سے کام انجام دینے پڑتے تھے تو میری اپنی رائے ہے' اور یہ رائے واحد علت قانون نہیں ہو گی۔ ہمارے دوست کا کہنا ہے کہ احکام علت پر مبنی ہوتے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ احکام ہمیشہ علت پر مبنی نہیں ہوتے۔ یہ ممکن ہے کہ شارع' قانون ساز' حاکم یعنی خدا ہماری آزمائش کے لیے ہمیں ایک چیز کا حکم دے جس کی کوئی خاص علت نہ ہو۔ وہ ہمیں صرف آزمائش کے لیے حکم دے رہا ہے' یہ نہیں کہ ہماری اس میں فلاں مصلحت ہے' یا اس میں ہمارا فلاں فائدہ ہے۔ اس آزمائش کو آپ علت قرار دے سکتے ہیں لیکن وہ علت ایسی نہیں ہو گی جو میری آپ کی سمجھ میں آئے۔ جس چیز کے متعلق قانون کے سرچشمے یعنی قرآن اور حدیث میں صراحت سے ایک حکم دیا گیا ہے' وہاں اجتہاد اور عقل کام نہیں کر سکتی۔ قرآن میں صراحت ہے کہ یوں کرو تو کرنا پڑے گا' چاہے ہمیں اس کی وجہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

۱۰۹سوال ۱۲۔ اسلامی نقطہ نظر سے حکمرانوں کو منتخب کرنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کیا موجودہ طریقہ انتخابات اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے؟

جواب۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کے جواب میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں کیونکہ ابھی میں تھوڑی دیر پہلے اس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ اسلام میں بادشاہت کی بھی اجازت ہے' جہاں بادشاہ کا بڑا بیٹا خود بخود ولی عہد بن جاتا ہے اور "ورث سلیمان داؤد" کی آیت قرآنی (۲۷:۱۶) اس کی اجازت بھی دیتی ہے' جمہورت کی بھی اجازت ہے' جماعتی Collegial حکومت کی بھی اجازت ہے۔ وہاں وہ نظام بھی پایا جا سکتا ہے جو ان سب کا ایک مجموعہ یا ان میں سے چند کا مخلوط مجموعہ ہو' جیسے خلافت راشدہ میں تھا۔ خلافت راشدہ بادشاہت نہیں تھی یعنی باپ کے بعد بیٹا خلیفہ بن جائے' ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں انتخاب ہوتا تھا۔ وہ جمہوریت بھی نہیں تھی کیونکہ جمہوریت میں معین مدت کے لیے (چار پانچ سال کے لیے) کسی کو منتخب اور مقرر کیا جاتا ہے اور پھر نئے انتخابات ہوتے ہیں۔ خلاف راشدہ مجموعہ تھی بادشاہت اور جمہوریت کی یعنی ایک شخص کا تاحیات انتخاب ہوتا تھا اور یہ ساری چیزیں اسلام نے جائز قرار دیں۔ اسلام میں کسی معین طرز حکومت کو لازم قرار نہیں دیا گیا بلکہ عدل و انصاف کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ چاہے اس کو کوئی بھی انجام دے۔ اگر آج حضرت ابوبکر' حضرت عمر یا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنھم زندہ ہوں تو میں بخوشی انھیں سارے آمرانہ اختیارات سونپنے کے لیے آمادہ ہوں کیونکہ مجھے ان کی خدا ترسی پر پورا اعتماد ہے۔ اس کے برخلاف اگر آج یزید زندہ ہو تو اس کو انگلستان کے مہر لگانے والے بادشاہ کے برابر بھی اپنا حکمران بنانے کے

لیے تیار نہیں ہوں۔ غرض یہ کہ خواہ انتخاب کیا جائے' خواہ نامزد کیا جائے یا کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے۔ انسانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی چیز بھی آغاز انسانیت سے لے کر تاقیامت کار آمد ہو نہیں سکتی۔ آج یہ چیز مفید ثابت ہوتی ہے کل اسی چیز کو برا کہہ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے اور نئی چیز بنائی جاتی ہے۔ چنانچہ ابتدائی چار خلفاء کے زمانے میں جانشین کے انتخاب کا کوئی قانون نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف کی صورتیں پیدا ہوئی تھیں۔ اسی بنا پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مناسب خیال کیا کہ حکومت میں استقلال پیدا کرنے کے لیے اور حکومت کو خانہ جنگیوں سے بچانے کے لیے بادشاہت کا نظام نافذ کیا جائے۔ اپنے بیٹے کو بادشاہ بنانے کے لیے نہیں بلکہ امت کی بھلائی کے لیے انھوں نے بجائے جمہورت کے بادشاہت کو نافذ کیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہت نامناسب پائی گئی تو ہم نے بادشاہت کے خلاف بغاوت بھی کی۔ غرض یہ کہ انسان کبھی ایک ہی چیز پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ حکومت کے اچھے یا برے ہونے کا انحصار حکمران کی شخصیت پر ہے۔ اچھا حکمران چاہے ڈکٹیٹر ہو' خوشی سے عوام اسے قبول کر لیتے ہیں۔ ظالم حکمران چاہے جمہوریت کا صدر ہی کیوں نہ ہو' اسے ہم رد کر دیتے ہیں۔

خطبہ ۴

تاریخ اصول فقہ و اجتہاد

محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ! محترم مہمانان گرامی!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

۱۱۰۔ آج کا موضوع اصول فقہ کے متعلق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مقابلتہ "ایک ٹیکنیکل مضمون ہونے کی وجہ سے کم دلچسپ ہو گا۔ لیکن جیسا کہ آپ ابھی ملاحظہ فرمائیں گے یہ وہ موضوع ہے جس پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ قانون میں مختلف قوموں نے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا کارنامہ غالباً اصول فقہ ہے۔ مسلمانوں سے پہلے بھی دنیا میں قانون موجود تھا لیکن اصول فقہ جیسی چیز دنیا میں کہیں نہیں ملتی اور آج بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک امتیازی اضافہ ہے' جس کی بدولت علم قانون کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے۔ آپ سب واقف ہیں کہ قانون دنیا کی ہر قوم میں ملتا ہے۔ یہ قانون دو قسم کے رہے ہیں۔ انتہائی تاریک زمانوں سے لے کر آج تک اول تو بن لکھا قانون ہمیں ہر جگہ ملتا ہے یعنی رسم و رواج' جو ہر ایک ملک میں پایا جاتا ہے' جس کا مؤلف یا قانون ساز ہمیں معلوم نہیں ہوتا لیکن اس پر سب لوگ عمل کرتے ہیں۔ دوسرا قانون وہ ہوتا ہے جو کسی بادشاہ یا کسی حکمران کی طرف سے مدون کر کے نافذ کیا جاتا ہے اور بالعموم تحریری صورت میں ہمیں ملتا ہے۔ بہرحال انسان اپنی فطرت کے بنیادی تقاضوں کے پیش نظر اپنی خواہش سے اپنے لیے کوئی قانون بنا کر اس پر عمل کرتا ہے' لہٰذا قانون ہر انسانی معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہے۔

۱۱۱۔ جہاں تک تحریری قانون کا تعلق ہے' غالباً قدیم ترین قانون جو ہم تک پہنچا ہے وہ حمورابی بادشاہ کا ہے۔ یہ عراق کا بادشاہ تھا اور جدید ترین مغربی تحقیقات کے مطابق یہ وہی شخص ہے۔ جسے ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کہا جاتا ہے۔ اس رائے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کا زمانہ ایک ہے (اٹھارہ سو پچاس برس قبل مسیح) اور ملک بھی ایک ہی ہے۔ حمورابی کا قانون ہم تک تحریری صورت میں پہنچا ہے۔ ایران میں سوس نامی مقام پر کچھ عرصہ قبل کھدائیوں میں ایک سیاہ رنگ کا پتھر ملا جس پر دو آدمیوں کی سی شکلیں ہیں۔ جن میں سے ایک خدا ہے اور دوسرا حکمران حمورابی' جو خدا سے احکام حاصل کر رہا ہے۔ یہ پتھر ایک ستون کی شکل میں ہے جس پر وہ قانون میخی رسم الخط میں کندہ کیا گیا ہے۔ اسے مغربی ماہرین نے اب پڑھ لیا ہے اور اس

کے ترجمے بھی دنیا کی اکثر بڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ یہ قدیم ترین تحریری قانون ہونے کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ بہترین قانون بھی ہے۔ ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں۔ اس قانون کی دفعات و مندرجات میں سے ایک قانون یہ ہے' جسے سب لوگ قبول کریں گے کہ قصاص لینا چاہیے۔ مثلاً میں کسی کو قتل کروں تو مجھے سزائے موت دی جائے۔ اس بنیادی اصول کو حمورابی بادشاہ کے مشیروں نے ترقی دے کر مضحکہ خیز حد تک پہنچا دیا ہے۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی گائے کو قتل کر دے تو اس قاتل کی گائے کو قتل کیا جائے۔ ممکن ہے آپ اسے قبول کر لیں۔ میں یہ کہوں گا کہ بجائے اس کے کہ گائے کو قتل کر کے ضائع کریں کیوں نہ اس محروم شدہ شخص کو صلہ دے دیا جائے جس کی گائے ماری گئی۔ خیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ گائے کے بدلے گائے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیٹی کو قتل کرے تو قاتل کی بیٹی کو قتل کیا جائے۔ بھلا اس بیچاری کا کیا قصور تھا۔ یہ ہمیں معلوم نہیں ہو تا کہ بجائے اس کے کہ اس کے قاتل کو سزا دی جائے قاتل کی بیٹی کو کیوں سزا دی گئی۔ یہ ادلے کا بدلہ (Tit for tat) ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ قصاص کے اس اصول کو حمورابی کے ہاں بے سمجھی سے گویا انتہا تک پہنچا دیا گیا۔ انصاف کے اس اصول کو آج ہماری عقل سلیم قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی لیکن اب سے چار ہزار سال پہلے کے لوگ سمجھتے تھے کہ یہی انصاف ہے اور یہی اچھا قانون ہے جو خدا کی طرف سے ہمیں ملا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی قوانین ہم کو ملتے ہیں۔ مثلاً مصر میں ہیرو غلیفی (Hieroglyphic) کے جو کتبے ہمیں ملے ہیں۔ ان میں بھی قوانین ہیں۔ رومی قانون بھی ملتا ہے۔ یونانی قانون بھی ملتا ہے۔ چینی اور ہندوستانی قانون بھی ملتا ہے۔ امریکہ کے پرانے باشندوں ریڈ انڈین (Red Indians) کے ہاں کے قوانین بھی ملتے ہیں۔ غرض دنیا کے ہر ملک میں قانون ملتا ہے۔ لیکن یہ قانون' علم قانون نہیں ہے بلکہ اسے ایک مجموعہ احکام کہا جا سکتا ہے یعنی یہ کرو اور وہ نہ کرو۔ علم قانون یا اصول قانون کی کمی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ یعنی یہ بحث کہ قانون کیا چیز ہے' یہ بحث کہ قانون کس طرح بنتا ہے' کس طرح بدلا جاتا ہے' کس طرح سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح قانون کے دو احکام میں اگر تضاد نظر آئے تو کس قاعدے پر عمل کیا جائے اور کس قاعدے پر عمل نہ کیا جائے؟ غرض یہ کہ قانون اپنے مجرد تصور میں کسی قوم میں موجود نہیں تھا۔ جب تک کہ اسلام کا دور نہیں آگیا اور تاریخ اسلام کی ابتدائی دو صدیوں کے فقہا نے اس میں اپنا اضافہ Contribution پیش نہیں کر لیا۔ جیسا کہ آپ سے میں نے عرض کیا کہ مسلمان اس بات پر فخر کر سکتے ہیں' اس معنی میں کہ قوانین تو دنیا کے ہر ملک میں موجود تھے لیکن علم القانون اپنے مجرد تصور میں کسی قوم نے پیش نہیں کیا تھا۔ یہ اصول فقہ وہ علم ہے جس کا اطلاق صرف اسلامی قانون

پر ہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی بھی قانون پر ہم کر سکتے ہیں۔ اصول فقہ کے جن مسائل کا ابھی میں نے ذکر کیا کہ قانون کیا ہے؟ کس طرح بنتا ہے؟ وغیرہ یہ سوالات میں مسلمان سے بھی کر سکتا ہوں' رومی اور یونانی سے بھی اور ہندو سے بھی کر سکتا ہوں کہ تمھارے ذہن میں قانون کا کیا مطلب ہے؟ قانون کیسے بنتا ہے؟ اور کون بناتا ہے؟ کب بنتا ہے؟ اور اس میں تبدیلی کس طرح ہو سکتی ہے؟ اسے منسوخ کس طرح کیا جاتا ہے؟ اس میں اضافہ کس طرح کیا جاتا ہے؟ قانون کس اساس پر بنایا جاتا ہے؟ یہ سوالات کسی بھی نظام قانون سے کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے جوابات چاہے مختلف ہوں۔ لیکن یہ علم جو ان مجرد تصورات کے متعلق ہے' اس کو پہلی مرتبہ مسلمان پیش کرتے ہیں اور اس کو اصول فقہ کا نام دیتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ نام کیوں دیا گیا۔ ایک رائے میں پیش کرتا ہوں' میری رائے قرآن مجید کی اس مشہور آیت سے ماخوذ ہے' جس سے آپ سب واقف ہیں: مثل کلمته طیبته کشجرة طیبته اصلها ثابت و فرعها فی السماء (۲۴:۱۴) (اچھی بات کی مثال ایک اچھے درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں تو زمین میں ثبت ہوتی ہیں لیکن اس کی شاخیں آسمان تک پھیل جاتی ہیں) یہاں دو خاص لفظ استعمال کیے گئے ہیں جڑ اور شاخیں۔ چنانچہ ہمارے فقہا نے اصول فقہ کو جڑ قرار دیا اور قانونی قاعدوں یا احکام کو "فرع" قرار دیا۔ یعنی علم اصول اور علم فروع۔ اصول کے لفظی معنی ہیں جڑیں۔ بہر حال چند اہم ابتدائی تصورات ہوتے ہیں۔ جن کی اساس پر قاعدے بنائے جاتے ہیں۔

۱۱۲۔ یہ چیز غالباً بالکل ابتدائی زمانے میں یعنی عہد نبوی میں یا عہد خلافت راشدہ میں نہ رہی ہو گی۔ لیکن بعد میں اس موضوع پر جو اولین کتابیں لکھی گئیں وہ مسلمان فقہا کی ہیں۔ گزشتہ صدی تک کسی قوم میں یہ چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا چرچا یورپ میں بھی ہونے لگا۔ مجھے یاد ہے' چالیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا جب میں ۱۹۲۸ء میں یونیورسٹی لاء کالج میں طالب علم تھا' ان دنوں ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام ہے "Angora Reform" یہ انگریزی زبان میں ایک فرانسیسی پروفیسر کی تالیف تھی۔ لندن یونیورسٹی کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب میں اس فرانسیسی پروفیسر کو دعوت دی گئی تھی۔ اس نے وہاں تین لیکچر دیے۔ جن میں سے پہلے لیکچر کا موضوع۔ Angora Reform تھا' اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں پرانی چیزوں کو منسوخ کر کے نئے قوانین نافذ کیے۔ مثلاً سوئٹزر لینڈ کے کوڈ اور اٹلی کے کوڈ وغیرہ وہاں نافذ کیے گئے اور اسلامی قاعدے قوانین رد کر دیے گئے اور دیگر چیزیں جو ترکی میں آئی تھیں مثلاً ترکی ٹوپی کی جگہ ہیٹ (Hat) کا استعمال وغیرہ۔ یہ لیکچر انہی چیزوں کے بارے میں تھا۔ چونکہ "Angora Reform" ایک نئی چیز تھی' اس لیے اس زمانے میں اس کا بڑا چرچا تھا۔ دوسرے مضمون کا عنوان "Roots of Law"

"یعنی قانون کی جڑیں تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ پہلی بار اس دوسرے مقالے کو پڑھ کر مجھے اپنی میراث کا علم ہوا کہ مسلمانوں نے کیا خاص کارنامہ (Contribution) انجام دیا ہے۔ چونکہ کاؤنٹ اوسٹروروگ (Ostrorog) نے' جو اس کتاب کا مؤلف ہے' بیان کیا ہے کہ یہ کسی اور قوم میں نہیں پایا جاتا اور یہ مسلمانوں کی عطا ہے اور اس میں ان چیزوں سے بحث ہوتی ہے' یہ اسلامی کارنامہ (Contribution) جو دنیاوی علم قانون پر روشنی ڈالتا ہے وہ اصول فقہ کہلاتا ہے۔ اصول فقہ کا کچھ مفہوم بیان کرنے سے پہلے مختصراً" میں بعض ان چیزوں کو دہراؤں گا جو گزشتہ دنوں اشارۃً" آپ سے بیان کر چکا ہوں۔

۱۱۳۔ اسلامی قانون رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد سے شروع ہوتا ہے' جس میں ابتدا میں کچھ پرانے رسم و رواج' جو مکہ میں تھے وہ بھی شامل رہے اور رفتہ رفتہ اس کی ترمیم و اصلاح قرآن و حدیث کے ذریعے سے ہوتی رہی۔ اس میں بعض اور چیزوں کو بھی گوارا کیا جاتا رہا' جیسے معاہدات' سابقہ امتوں کی شریعتیں جو اسلام نے برقرار رکھیں اور اسی طرح کی بعض اور چیزیں۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور قانون کا ایک سرچشمہ بند ہو گیا یعنی وحی کے ذریعے سے قانون کو بنانے اور بدلنے کی جو صلاحیت ہم میں پائی جاتی تھی وہ ختم ہو گئی تو ہم مجبور ہو گئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت جو چیزیں ہم میں چھوڑی ہیں انہی پر اکتفا کریں۔ عام حالتوں میں ہمارے لیے یہ بات مشکلات کا باعث بن جاتی' اگر اس قانون کی ترقی کی صورت خود قانون ساز نے یعنی خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نہ بتائی ہوتی۔ یہ چیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دنوں سے تعلق رکھتی ہے۔ یمن کو جب ایک گورنر بھیجا گیا' یعنی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ' تو ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا "فبم تحکم" (کس طرح احکام دیا کرو گے؟) جواب دیا۔ "بکتاب اللہ" (اللہ کی کتاب کے مطابق)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "فان لم تجد" (اگر تم قرآن میں مطلوبہ چیز نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟)۔ تو انھوں نے جواب دیا۔ "فبسنۃ رسول اللہ" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق احکام دیا کروں گا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مزید سوال کیا "فان لم تجد" (اگر سنت میں بھی مطلوبہ چیز نہ ملے تو کیا کرو گے؟) تو ان کے الفاظ تھے "اجتہد برایی ولا آلو" (میں اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کروں گا اور کوئی دقیقہ نہیں چھوڑوں گا) اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف پسند فرمایا بلکہ دعا دی اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر یہ کہا کہ "اے اللہ تو نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رسول کو جس چیز کی توفیق دی ہے اس سے تیرا رسول خوش ہے"۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ چیز اسلامی قانون کو زندگی دینے والی' برقرار رکھنے والی اور ہر ضرورت

میں کام آنے والی ہے۔ اس کی وجہ سے ایک غیر جانبدار شخص بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلامی قانون چودہ سو سال سے لے کر آج تک چلا آ رہا ہے اور اس میں آئندہ بھی چلنے کی قوت باقی ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی، تو صرف قرآن اور حدیث پر اکتفا کرنے کی صورت میں، ممکن ہے کہ بعض لوگ قرآن کریم کی آیتوں اور حدیثوں سے استنباط نہ کر سکتے اور وہ حیران رہ جاتے کہ ہم کیا کریں وا تحہ" یہ صورت بعض وقت پیش آتی ہے کہ ایک ہی چیز سے بعض لوگ کچھ سمجھ لیتے ہیں اور استنباط کر لیتے ہیں اور بعض دوسرے لوگوں کی نظر اس تک نہیں پہنچتی اور وہ ششدر و حیران رہ جاتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال آپ کو دوں گا جس کا تعلق امام اعظم سے ہے۔ اس سے ان کی ذہانت کا ذکر کرنا مطلوب نہیں ہے بلکہ صرف مثال دینا ہے کہ کس طرح ایک ہی چیز سے بعض لوگ سمجھ جاتے ہیں اور بعض لوگ سمجھ نہیں سکتے۔ لطیفے کے طور پر قصہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن ایک خاندان میں میاں بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ رات کے وقت پہلے شوہر نے یہ قسم کھائی اور اپنی بیوی سے کہا کہ طلوع آفتاب سے قبل اگر تو مجھ سے بات نہ کرے گی تو تجھے طلاق ہے۔ بیوی بھی بہت جلی بھنی تھی، اس نے بھی قسم کھا کر کہا کہ خدا کی قسم طلوع آفتاب سے قبل میں تم سے بات نہیں کروں گی۔ پھر دونوں چپ ہو گئے۔ سوئے یا نہیں یہ تو معلوم نہیں لیکن دونوں چپ ہو گئے۔ اس کے بعد اذان ہوئی اور طلوع آفتاب کا وقت آ گیا۔ شوہر پہلے نماز کو جاتا ہے اور پھر ابن سیرین نامی مشہور فقیہ کے پاس جا کر سارا قصہ سناتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میاں قصور تمہارا ہے، طلاق ہو گئی۔ کیونکہ تم نے کہا تھا کہ بیوی اگر طلوع آفتاب تک بات نہ کرے تو طلاق ہو جائے گی۔ اس نے بات نہیں کی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ روتا دھوتا امام ابو حنیفہ کے پاس پہنچا۔ وہی قصہ ان کو بھی سنایا۔ تو امام ابو حنیفہ نے کہا کوئی بات نہیں۔ تم شوق سے اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ طلاق وغیرہ کوئی نہیں ہوئی۔ وہ شخص حیرت زدہ رہ گیا اسی عالم میں واپس ابن سیرین کے پاس پہنچتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے بعد میں امام ابو حنیفہ کے پاس گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی۔ انھیں تعجب ہوا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسی شخص کے ساتھ امام ابو حنیفہ کے پاس آئے۔ کہنے لگے: "ابو حنیفہ اللہ سے ڈرو" تم کیا غضب کر رہے ہو۔ اس کی عورت کو طلاق ہو چکی ہے۔ تم کہتے ہو کہ طلاق نہیں ہوئی۔ وہ اس کے ساتھ رہے گا تو زنا کاری ہو گی۔ تم اس کے ذمہ دار ہو گے۔ خدا کے ہاں کیا جواب دو گے؟ امام ابو حنیفہ نے کہا: "میاں قصہ ذرا دوبارہ سناؤ"۔ اس نے سنایا۔ پہلے میں نے بیوی سے کہا تھا کہ اگر تو طلوع فجر تک بات نہ کرے تو طلاق ہے۔ بیوی نے اسی وقت جواب دیا کہ خدا کی قسم میں تجھ سے طلوع آفتاب تک بات نہیں کروں گی۔ تو ابو حنیفہ نے کہا کہ میں اپنی رائے پر قائم ہوں۔ طلاق نہیں ہوئی کیونکہ اس شخص نے یہ نہیں کہا کہ عورت کونسی بات کرے۔ جب اس نے کہا کہ

میں بھی تم سے بات نہیں کروں گی تو یہ بات کرنا ہی ہوا۔ ان حالات میں یہ شرط کہ عورت بات نہ کرے تو طلاق ہو گی' پیش ہی نہیں آئی آپ نے دیکھا کہ کس طرح ایک ہی واقعہ سے ایک شخص کچھ سمجھ لیتا ہے اور دوسرے شخص کی نظر اس نکتے تک نہیں پہنچتی۔

۱۱۴۔ غرض اسلامی قانون کی ترقی کے متعلق اگر اجتہاد کی اجازت نہ دی جاتی تو سب لوگوں کو صرف قرآن و حدیث پر اکتفاء کرنی پڑتی اور ممکن تھا کہ کسی وقت بڑے سے بڑے عالم اور فقیہ کو کسی نئے مسئلے کے متعلق نہ قرآن میں کوئی حکم ملے اور نہ حدیث میں۔ آپ نے پڑھا ہو گا کہ ایک بار حضرت عمر کے ایک فیصلے پر حضرت علی نے کچھ توجہ دلائی تو حضرت عمر نے بے ساختہ کہا "لولا علی لھلک عمر"۔ اس اجازت کے تحت جو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو دی گئی تھی کہ "اجتہاد کرو"' اجتہاد کا اصول ہاتھ آگیا۔ اور دشواریاں ختم ہو گئیں۔

۱۱۵۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں کبھی کبھی اجتماعی غور و فکر بھی ہوتا تھا۔ لوگ آپس میں بحث کرتے کہ اس بارے میں کیا کرنا چاہیے؟ ایک صاحب اگر ایک چیز بیان کرتے تو دوسرے صاحب اس پر اعتراض کرتے' نہیں صاحب'! یہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں فلاں خامی ہے' یوں کرنا چاہیے۔ اور اس آپس کے بحث مباحثے سے لوگ کسی نتیجے پر پہنچ جاتے۔ اس زمانے میں خاص کر یہ چیز مفید ثابت ہوئی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ احکام و اقوال ابھی تک جمع نہیں ہوئے تھے۔ بخاری' مسلم اور صحاح ستہ کی کتابیں ابھی لکھی نہیں گئی تھیں بلکہ لوگوں کے علم اور حافظے میں تھیں۔ جب آپس میں مل کر مشورہ کرتے تو اس وقت بعض بھولی بسری باتیں یاد آ جاتیں' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن یوں فرمایا تھا۔ اس طرح اسلامی قانون کے متعلق جو معلومات حدیث میں تھیں ان کو جمع کر کے قانونی احکام استنباط کرنے کا آغاز ہو گیا۔

۱۱۶۔ ان علمی مراکز میں جہاں نسلاً نسل تک فقہ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا' قانون کی تدوین کے کام میں بڑی ترقی ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ممتاز مدرسہ کوفہ کا تھا' جہاں اسلامی قانون کی تعلیم دی جاتی رہی۔ شہر کوفہ آج بھی عراق میں موجود ہے اور اگرچہ ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن اس کی تاریخی اہمیت بڑی رہی ہے اس علاقے کو کچھ خصوصیتیں حاصل ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان خصوصیتوں کے باعث یہ امتیاز اسے حاصل ہے یا یہ محض اتفاقی بات ہے۔ وہ خصوصیتیں یہ ہیں کہ جس مقام پر آج شہر کوفہ آباد ہے' پرانے زمانے میں اس کے نواح میں "حیرہ" نامی شہر آباد تھا' جس کے کھنڈرات اب بھی ملتے ہیں۔ حیرہ وہ شہر ہے جو زمانہ جاہلیت میں تہذیب و تمدن کا بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہ شہر اگرچہ ایرانیوں کے قبضے میں تھا' وہاں

یمنی عرب آکر آباد ہو گئے تھے۔ جزیرہ نمائے عرب میں یمن کا علاقہ سب سے زیادہ سرسبز و شاداب تھا اور قدیم زمانے میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا تھا۔ جب وہاں کے لوگ حیرہ میں آباد ہوئے تو ان کی تہذیب نے آس پاس کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ ایران کے شہنشاہ نے اپنے ولی عہد کو بچپن میں تعلیم و تربیت کے لیے حیرہ بھیجا۔ اسے پورا اعتماد تھا کہ عرب حکمران کی نگرانی میں تربیت پا کر اس کے بیٹے کا کردار سنور جائے گا۔ اس کا خیال صحیح ثابت ہوا اور بچہ جو بہرام گور کے نام سے مشہور بادشاہ گزرا ہے اس کا شکرگزار رہا، چنانچہ اس بادشاہ کی جو تصویریں ملتی ہیں ان میں اسے بدوی لباس میں ایک اونٹ پر سوار دکھایا گیا ہے۔ بہرحال حیرہ وہ مقام تھا جہاں پرانے زمانے میں ایک بہت ہی ممتاز عربی سلطنت گزر چکی ہے اور عربی یعنی یمنی اور ایرانی روایات کا سنگم ہو کر ایک نئی شکل کا تمدن اس مقام پر نظر آتا ہے۔ یہ اور علاقوں سے ممتاز اور برتر تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں عراق فتح ہوا تو انھوں نے اپنی سیاسی فراست کی بنا پر فوراً ہی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ عربوں کو عرب سے بھیجا کہ جا کر اس مفتوحہ علاقے کے اندر کسی ایسے مقام پر آباد ہو جاؤ جو فوجی نقطہ نظر سے اہم ہو تاکہ بوقت ضرورت تمہیں کمک پہنچائی جا سکے اور تم بوقت ضرورت فوراً فساد اور فتنے کے مقام پر جا کر دشمن کی سرکوبی کر سکو۔ انھوں نے، علاوہ اور شہروں کے، حیرہ کو اسلامی چھاؤنی بنانے کے لیے بھی انتخاب کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی فراست سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ پرانے شہر کے اندر مسلمانوں کو بسانا مناسب نہیں۔ اس مقام کو تو انھوں نے چن لیا لیکن شہر کو نہ چنا۔ چنانچہ حکم دیا کہ اس شہر کے مضافات میں ایک نیا شہر بسا لو۔ تمھارے علاقے میں اجنبی نہ رہیں اور ان کے علاقے میں تم نہ رہو۔ یہ خالص اسلامی شہر ہو۔ اس میں بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو نو آبادکار بھیجے وہ بیشتر یمن کے تھے۔ یمن ہی سے دوبارہ مہاجرین کا ایک سیلاب آتا ہے اور اسی پرانے مقام پر بستا ہے۔ لیکن صرف یمنی ہی نہیں، ان میں غالباً اٹھاون ایسے صحابہ بھی تھے جو جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ الغرض اسلامی روایات کے حامل لوگوں کی ایک جماعت تھی جو شہر کوفہ میں آباد ہوئی اور اس طرح پرانی روایات میں ایک نئی روایت کا اضافہ ہوتا ہے۔ جب اس مقام پر کئی ہزار کی اسلامی آبادی ہو گئی تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی تعلیم کی ضرورت ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہاں کی جامع مسجد میں، جو اس وقت گورنر کے مکان کا جزء تھی، ایک بڑے عالم صحابی کو بھیجا۔ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ جن کے تقرر نامے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ لکھا کہ "اے اہل کوفہ میں اپنے آپ پر تم کو ترجیح دیتا ہوں اور ایثار کر کے میں اس شخص کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں جس کی مجھے ضرورت ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے نہایت ہی محترم صحابی عبداللہ بن مسعود ہیں جو بطور معلم کے تمھارے پاس آتے ہیں۔ ان سے استفادہ کرنے میں غفلت نہ کرنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق جیسا میں نے بیان کیا' وہ فطرۃ" قانون کی طرف مائل تھے۔ وہ وہاں مقیم رہے اور اپنے شاگردوں کو زیادہ تر فقہ کی تعلیم دیتے رہے۔ ان میں قانونی نکتہ آفرینی اور استدلال کا خاص ملکہ تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے ایک شاگرد علقمۃ النخعی' پھر ان کے شاگرد ابراہیم نخعی' پھر ان کے بعد ان کے شاگرد حماد بن ابی سلیمان جو ایرانی تھے' پھر ان کے بعد امام ابو حنیفہؒ جو ایرانی تھے' وہ اس سلسلے میں چوتھی نسل میں وہاں کار فرما ہوئے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی اور وفات ۱۵۰ھ میں۔ عباسی خلافت ۱۳۲ھ میں شروع ہوئی۔ گویا بنی امیہ کا آخری دور اور بنی عباس کا ابتدائی دور ان کے سامنے گزرا۔ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا دوبارہ ذکر اس لیے آیا ہے کہ ان کی تالیفات میں ایک تالیف "کتاب الرائی" کے نام سے ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اگر قرآن و حدیث میں صراحتاً" حکم موجود نظر نہ آئے تو اجتہاد کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اجتہاد رائے کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ تھے "اجتھد برایی" (اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا) تو امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھ ڈالی۔ "کتاب الرائی" یعنی آدمی رائے کس طرح سے قائم کرے۔ مسائل میں رائے کا استعمال کس طرح ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے یہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ غالباً جب بغداد پر ہلاکو خاں کا حملہ ہوا اور وہاں کی لاکھوں کتابیں دریائے دجلہ میں پھینک کر تباہ کر دی گئیں تو ممکن ہے اس کتاب کے نسخے بھی اس ضائع شدہ ذخیرے میں رہے ہوں اور ضائع ہو گئے ہوں۔ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ اس کے مندرجات کیا تھے' صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ وہ قدیم ترین کتاب ہے جس کی طرف ہمارے مؤلف اشارہ کرتے ہیں اور جو اصول فقہ کے موضوع کی گویا اولین کتاب ہے۔

۱۱۷۔ اصول فقہ غالباً اپنے موجودہ مفہوم میں پورے کا پورا اس میں نہیں ہو گا۔ لیکن رائے سے استفادہ کر کے قانون کو بدلنا' قانون کا مفہوم معلوم کرنا' اس کی تاویل کرنا' غالباً اس میں بیان کیے گئے ہوں گے۔ یہ اولین کتاب ہے جس کا ذکر ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس موضوع پر پہلے بھی تحریراً" اور عملاً کام کیا گیا ہو یعنی امام ابو حنیفہ کے استادوں نے بھی رائے سے کام لے کر فتوے دیے ہوں اور سوالوں کا جواب دیا ہو۔ لیکن یہ کہ انھوں نے اس پر کوئی کتاب لکھی تھی' اب تک ہمیں اس کا پتا نہیں چلا۔ اس لیے فی الحال ہم فرض کریں گے کہ اس موضوع پر پہلی کتاب امام ابو حنیفہ کی "کتاب الرائی" ہے۔ امام ابو حنیفہ نے قانون کی بہت بڑی خدمت کی۔ اس خدمت میں ایک تو "کتاب الرائی" کا لکھنا ہے' اس کے علاوہ ایک اور چیز کی

طرف اشارہ کروں گا۔ وہ یہ کہ انھوں نے انٹرنیشنل لا پر بھی ایک کتاب لکھی، جس کا انشاء اللہ کل کے لیکچر میں صراحت سے بیان ہو گا۔ انٹرنیشنل لا بھی ایک ایسا علم ہے جو اسلام سے پہلے عملاً دنیا میں موجود نہیں تھا۔ اس چیز کو علمی حیثیت سے 'ساری دنیا کے لوگوں کے استعمال میں آنے والا' انٹرنیشنل لا بنانا مسلمانوں کا کام ہے۔ اس موضوع پر امام ابو حنیفہ نے ایک کتاب لکھی، جسے "کتاب السیر" کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک اور چیز جس کا مجھے ذکر کرنا ہے وہ یہ کہ انھوں نے علم کا ذوق بھی اپنے شاگردوں میں پیدا کیا۔ اس ذوق کا مطلب یہ نہیں کہ مولوی نے جو بتایا اسے طوطا مینا کی طرح حفظ کریں اور حسب ضرورت دھرا لیا کریں۔ یہ امام ابو حنیفہ کا تصور تعلیم نہیں تھا۔ وہ اپنے شاگردوں میں اجتہاد، فکر اور آزادی رائے کی صلاحیت راسخ کر دیتے تھے۔ چنانچہ ہر مسئلے پر ان کے شاگرد آزادانہ اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے اور بحث و تمحیص کے بعد معقول دلائل کی بنیاد پر ردو قبول ہوتا۔ استاد یا شاگرد ہٹ دھرمی نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ فقہ حنفی میں امام ابو حنیفہ کی رائے پر شاید پندرہ فیصد احکام میں عمل کیا جاتا ہو اور باقی پچاسی فیصد مسئلوں پر صاحبین کی رائے، یعنی اگر امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی متفق ہوں تو ان کی رائے پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کی رائے پر نہیں دیا جاتا۔ یہ سب اس تربیب کا نتیجہ ہے جو امام صاحب اپنے شاگردوں کو دیتے رہے کہ اندھی تقلید نہ کرنا۔ خود سوچنا، آزادی رائے رکھنا اور حق کے سوا کسی اور چیز کو قبول نہ کرنا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسف نے ایک کتاب لکھی تھی۔ جس کا نام "کتاب الاصول" تھا تصور کیا جاتا ہے کہ یہ اصول فقہ کے متعلق تھی یا غالباً "کتاب الرائی" کی شرح ہو گی۔ امام ابو حنیفہ نے اپنی "کتاب الرائی" لکھنے کے بعد اس کا درس بھی دیا ہو گا۔ درس کے دوران میں شرح ہوئی ہو گی اور اعتراضات بھی ہوں گے۔ اس مباحثے کے نتیجے کے طور پر امام ابو یوسف نے "کتاب الاصول" لکھ ڈالی۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب بھی ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ دوسرے شاگردوں میں ممتاز شاگرد امام محمد الشیبانی ہیں۔ ایک حالیہ شائع شدہ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس مطبوعہ کتاب میں امام محمد شیبانی کی "کتاب الاصول" کے کچھ حوالے بھی آ گئے ہیں۔ یہ مطبوعہ کتاب ایک معتزلی مذہب کے امام ابوالحسین البصری کی تالیف (المعتمد فی اصول الفقہ) ہے۔ معتزلی فرقے کی کتابیں بہت کم ملتی ہیں۔ اتفاق سے المعتمد کے چار پانچ مخطوطے ملتے ہیں۔ دو استانبول میں ہیں۔ یمن کے ایک نسخے کے فوٹو مصر میں ہیں۔ دوسرا مخطوطہ میرے پاس ہے جو شہر بیت الفقیہ (یمن) کے قاضی صاحب نے از راہ نوازش مجھے بطور تحفہ دیا تھا۔ ایک نامکمل نسخہ میلانو (اٹلی) میں بھی ہے۔ ان سب نسخوں کی مدد سے اس کتاب کو شائع کیا گیا ہے۔ جو معتزلی اصول فقہ کی ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ لیکن مجھے

اس کتاب سے زیادہ اس کے ایک جملے پر آپ کی توجہ منعطف کرانی ہے۔ لکھا ہے کہ امام محمد الشیبانی نے کہا کہ "اصول فقہ چار چیزیں ہیں۔ قرآن' حدیث' اجماع اور قیاس"۔ یہ گویا ان کی کتاب کا خلاصہ تھا۔ جس کی طرف ابوالحسین البصری کی کتاب میں اشارہ ملتا ہے۔ اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ کے ایک ہی نہیں' متعدد شاگردوں نے "کتاب الرائی" کی شرح کے طور پر اصول فقہ کی کتابیں لکھ ڈالیں۔ اس رائے کے قائم کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے بیان کیا کہ امام ابوحنیفہ کی طرف "کتاب السیر" منسوب ہے' یعنی انٹرنیشنل لا پر انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی۔ اگرچہ سوائے چند اقتباسات کے وہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی لیکن اسی نام کی کتابیں ان کے کم سے کم تین یا چار شاگردوں نے لکھی ہیں۔ ابراہیم الفزاری ایک شاگرد تھے ان کی "کتاب السیر" مخطوطے کی صورت میں موجود ہے۔ محمد شیبانی نے "کتاب السیر الصغیر" اور "کتاب السیر الکبیر" کے نام سے دو کتابیں لکھیں۔ یہ دونوں بھی ہم تک پہنچ چکی ہیں۔ اس طرح امام ابوحنیفہ کے ایک اور شاگرد زفر نے بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب السیر" تھا۔ امام ابوحنیفہ کے معاصرین میں امام مالک اور امام اوزاعی نے بھی "کتاب السیر" کے نام سے ایک ایک کتاب لکھی ہے' ایک اور معاصر' واقدی نے جو مشہور مورخ تھے' انٹرنیشنل لا کے موضوع پر اسی نام کی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ جس طرح امام ابوحنیفہ کی "کتاب السیر" سے متاثر ہو کر اور انٹرنیشنل لا پر ان کے لیکچروں کی اساس پر' ان کے کئی شاگردوں نے "کتاب السیر" کے نام سے کتابیں تصنیف کیں۔ اسی طرح شاید "کتاب الرائی" کی تدریس کے سلسلے میں بھی وہی صورت پیش آئی اور ان کے بعض شاگردوں نے اس موضوع پر بھی کتابیں لکھیں' ممکن ہے کہ اس کو اصول کا نام بھی خود امام ابوحنیفہ نے دیا ہو' "کتاب الرائی" کی تدریس کے سلسلے میں اس امر کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتاتا ہے کہ کتاب الاصول یعنی علم الاصول کی جو کتابیں مسلمانوں میں پائی جاتی تھیں ان میں سے ابتدائی تین کتابیں یعنی امام ابوحنیفہ کی "کتاب الرائی" اور امام ابویوسف' امام محمد شیبانی کی "کتاب الاصول" ہم تک نہیں پہنچیں۔ جو کتاب ہم تک پہنچی ہے وہ امام محمد شیبانی کے ایک شاگرد امام شافعی کی ہے۔ امام شافعی بیک وقت کئی سلسلوں اور روایتوں (Traditions) سے منسلک تھے۔ وہ ایک سو پچاس ہجری میں پیدا ہوئے۔ اسی سال امام ابوحنیفہ کا انتقال ہو گیا۔ براہ راست وہ امام ابوحنیفہ سے استفادہ نہیں کر سکے' لیکن سالہا سال تک ان کے ممتاز شاگرد امام محمد شیبانی کے شاگرد رہے۔ اسی طرح مدینہ منورہ جا کر امام مالک سے بھی سالہا سال تک درس لیتے رہے۔ انھوں نے فلسفہ ؍ منطق کی بھی تعلیم پائی اور علم الکلام کی بھی۔ اس زمانے میں معتزلہ فرقے کا بہت بول بالا تھا۔ ان سے مباحثے بھی کرتے رہے۔ اس لیے امام شافعی کی ذات میں کئی ایسی چیزیں

جمع ہو گئیں جن کے باعث وہ اسلام کی بہت اہم خدمات انجام دے سکے، جن میں سے ایک حسب ذیل ہے۔ مسلمانوں میں جیسا کہ آج ہے، پرانے زمانے میں بھی کچھ لوگ قدامت پسند تھے اور کچھ جدت پسند۔ ان دو متضاد رجحانات کے لوگ ہر معاشرے اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔ بہر حال اس زمانے میں اگر بعض لوگ حدیث کی تعلیم پانے اور جمع کرنے کے کام میں مشغول تھے تو کچھ لوگ دوسرے علوم سے دلچسپی رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض فقہاء جنھیں قانون کے علم سے دلچسپی تھی، منطق اور فلسفے کی مدد سے اسلامی قانون کو ترقی دینے میں مشغول تھے۔ ان کی توجہ حدیث کی طرف سے ہٹ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امام شافعی کے زمانے میں اہل حدیث اور اہل رائے میں ایک شدید کشمکش پیدا ہو گئی۔ اہل حدیث سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ احکام واقوال کو جمع کرنے اور مطالعہ کرنے میں مشغول تھے اور اہل رائے سے مراد وہ فقہا تھے جو اسلامی قانون کو جمع کرنے اور قیاس واستنباط کی مدد سے اس کو ترقی دینے میں مشغول تھے۔ دونوں میں کشمکش اس بنا پر تھی کہ اہل الرائے کو حدیث سے واقفیت کم تھی اور وہ اس بات کو فرض کر لیتے تھے کہ حدیث میں یہ چیز نہیں پائی جاتی۔ اس سکوت کے باعث وہ قیاس کر کے نئے احکام دیا کرتے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ اس مسئلے کے متعلق حدیث میں ذکر موجود ہوتا للہذا اہل حدیث کہتے یہ لوگ تو کافر ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے ہوتے ہوئے اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ عمداً ایسا نہیں کرتے تھے۔ انھیں واقفیت نہ ہوتی تھی۔ امام شافعی کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے اہل حدیث (محدثوں) سے بھی تعلیم پائی اور اہل الرائے فقہا سے بھی۔ انھیں فلسفہ و کلام پر بھی دسترس حاصل تھی۔ ان کی ذات میں ایسا اچھا اسلامی عالم پیدا ہو گیا جو گویا ایک نقطہ اتصال پیدا کرنے اور ربط پیدا کرنے کا باعث بن سکا۔ چنانچہ امام شافعی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ رہا ہے کہ اہل حدیث اور اہل الرائے کو متحد کر دیں۔ حدیثوں سے وہ زیادہ واقف تھے اور استنباط و استقراء اور اجتہاد کے فن میں بھی وہ ماہر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایسی چیز بیان کرتے جس سے اہل حدیث بھی خوش رہتے اور اہل الرائے بھی خوش ہوتے۔ امام شافعی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے انھوں نے "کتاب الرسالہ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصول فقہ کی قدیم ترین کتاب جو دنیا میں پائی جاتی ہے، وہ "کتاب الرسالہ" ہے۔ اب اس کے ترجمے مختلف مغربی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہو۔ ☆ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام شافعی نے الرسالہ، لکھ کر ایک نئے علم کی بنیاد ڈال دی، کم از کم بنیاد مستحکم کر دی۔ اس لیے کہ اس میں جو چیزیں بیان کی گئی ہیں

☆ مفتی امجد العلی کا اردو ترجمہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے اشتراک سے شائع ہوا۔

بعد کی صدیوں میں ذرا بھی بدلتی ہوئی نظر نہیں آئیں حتیٰ کہ اصطلاحات بھی جو امام شافعی نے استعمال کی ہیں۔ من و عن آج چودہ سو سال تک چلی آ رہی ہیں۔ رسالہ کے معنی ہوتے ہیں خط۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ امام شافعی نے اپنے ایک شاگرد کی درخواست پر' جس نے کہا تھا کہ استاد ہمیں اس موضوع پر یعنی اصول فقہ پر ایک تحریر لکھ دیجئے جس سے ہم استفادہ کریں' ڈیڑھ سو صفحوں کا ایک خط لکھ بھیجا۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ قانون کسے کہتے ہیں؟ قانون کس طرح بناتے ہیں؟ ان کے ماخذ کیا کیا ہیں؟ ان ماخذ میں اختلاف ہو تو کس طرح دور کیا جاتا ہے؟ نیا قانون کس طرح بناتے ہیں؟ پرانا قانون کس طرح منسوخ کرتے ہیں؟ الفاظ کو سمجھنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ اس میں لغت' قواعد زبان' بلاغت و عروض کے علوم پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مثالیں بھی دی گئی ہیں اور ساتھ ساتھ بہت ہی دقیق انداز میں اپنے مخالفین کے جوابات بھی دیے ہیں۔ امام شافعی کے زمانے میں معتزلہ فرقہ عروج پر تھا۔ اس فرقے کا نظریہ یہ تھا کہ حدیث پر اعتماد کرنا آسانی سے ممکن نہیں۔ چنانچہ اب یہ مشہور ہو گیا ہے کہ معتزلہ حدیث کو رد کرتے تھے۔ لیکن یہ افتراء ہے' حقیقت میں ایسا نہیں میں نے ابوالحسین البصری کی جس کتاب کا ذکر کیا ہے وہ معتزلہ فرقے کے مؤلف کی تالیف ہے۔ اس میں وہ تفصیل سے بتاتا ہے کہ حدیث پر کس طرح اعتماد کیا جائے' حدیث کے متعلق اس کی جو رائے رہی ہے کوئی سنی بھی اس کے بیان کردہ اصول سے بہ مشکل اختلاف کر سکے گا۔ تو وہ کیا چیز تھی جس کی بنا پر معتزلہ کو مطعون کیا جاتا تھا کہ وہ حدیث کو قبول نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں امام شافعی نے کیا کیا' اس کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

۱۱۸۔ معتزلہ فرقے کے علماء کی رائے یہ تھی کہ "اگر کسی حدیث میں کوئی حکم دیا گیا ہو یا اس سے کوئی قانون بنتا ہو تو ضروری ہے کہ اس حدیث کے راوی ایک سے زیادہ ہوں۔ خبر واحد یعنی ایک راوی کی بیان کردہ حدیث پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے نہیں کہ وہ غلط ہے بلکہ اس لیے کہ قانون کا تقاضا ہے کہ کسی دعویٰ کی تائید دو گواہ کریں۔ اس رائے کی دوسرے مسلمان فقہاء نے تردید کی۔ اہل حدیث کے محدثین نے اور امام شافعی نے اس کا جواب عالمانہ انداز میں دیا۔ اس کے بعد سے معتزلہ کا جو اعتراض تھا کہ خبر واحد ناقابل اعتماد ہے' اس کی اہمیت بالکل ختم ہو گئی اور صرف ایک راوی کی بیان کردہ حدیث پر بھی سب لوگ عمل کرنے لگے۔ امام شافعی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سے ایسے بہت سے واقعات انتخاب کر کے بیان کیے جن میں کسی ایک آدمی کی شہادت پر کسی حکم کی تعمیل کی گئی ہو مثلاً انھوں نے کہا کہ ایک دن فجر کی نماز کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو بھیجا کہ مختلف محلوں میں جا کر لوگوں سے باواز بلند کہہ دو کہ قبلہ اب بیت المقدس کی جگہ کعبہ کی طرف ہو گیا ہے۔ ایک ہی

شخص بھیجا گیا۔ اس نے کہا کہ نماز میں اپنے رخ کو بجائے بیت المقدس کے کعبے کی طرف موڑ لو۔ تب لوگوں نے اس پر عمل کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عہد نبوی میں ایک آدمی کی شہادت پر عمل کیا جاتا تھا اور یہ کبھی نہیں کہا گیا کہ ''اگر دو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطلاع دیں تو ہم مانیں گے ورنہ ہم رد کر دیں گے''۔ اسی طرح انھوں نے ایک اور مثال دی ہے کہ ایک دن مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرر کردہ ایک شخص ڈھنڈورا پیٹتا ہوا نکلتا ہے اور چلا چلا کر کہتا ہے کہ اے مسلمانو! شراب کی ممانعت کا حکم نازل ہوا ہے' شراب نہ پیئو۔ یہ صرف ایک آدمی تھا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں (اور یہ صحیح بخاری کی حدیث ہے) کہ یہ ان کے بچپن کا واقعہ ہے۔ جب وہ شخص ڈھنڈورا پیٹتا ہوا ان کے مکان کے پاس سے گزرا' اس وقت وہ اپنے والدین کے مہمانوں کو شراب کے پیالے پیش کر رہے تھے۔ شراب کی ممانعت کا حکم سنتے ہی ان کے باپ نے کہا' بیٹا اٹھو اور اس شراب کو ضائع کر دو۔ چنانچہ میں نے ایک ہتھوڑا لیا اور شراب کے پیپے کو توڑ کر اسے بہا دیا۔ جو لوگ شراب پی رہے تھے انھوں نے بھی پیالے پھینک دیے۔ وہاں بھی صرف ایک شخص کی اطلاع پر سب لوگوں نے عمل کیا۔ امام شافعی نے بہت سی مثالیں دی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر عمل کرنے کے لیے ایک شخص کی گواہی کافی ہے۔ امام شافعی کا یہ کارنامہ تھا کہ اہل حدیث اور اہل الرائے کو متحد کر دیا تاکہ اس طرح اسلامی قانون کی زیادہ بہتر خدمت ہو سکے۔ اب تک اہل حدیث صرف حدیث کو پڑھتے' یاد رکھتے اور بیان کرنے پر اکتفا کرتے تھے اور دیگر علوم سے انھیں واقفیت نہیں ہوتی تھی۔ منطق' فلسفہ' استدلال وغیرہ سے انھیں کوئی تعلق نہیں تھا' نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بعض وقت وہ لفظی مفہوم لے کر اس کے اطلاق پر اصرار کرتے جو نامناسب بات تھی۔ دوسری طرف اہل الرائے ہر چیز میں قیاس کرتے اور اچھی طرح تحقیق نہ کرتے کہ حدیثوں میں کسی مسئلے کے متعلق کیا احکام موجود ہیں؟ اس سے بے خبر رہ کر وہ اپنی رائے سے قانون سازی کرتے۔ یہ امام شافعی ہی کا فیضان ہے کہ محدثین اپنے مواد میں ایک نظم پیدا کرتے ہیں اور بالا ابواب حدیثیں لکھتے ہیں۔ ایک ہی موضوع پر متعدد حدیثیں ہوتی ہیں تو انھیں ایک ہی جگہ جمع کرتے ہیں تاکہ ہم غور کر سکیں کہ کونسی حدیث مقدم ہے کونسی حدیث مؤخر ہے' کونسی ناسخ ہے' کونسی منسوخ ہے۔ ایک طرف یہ اور دوسری طرف اہل الرائے بھی حدیث کا مطالعہ کرنے لگے۔ اس طرح امام شافعی کی کوشش سے اسلامی قانون کی ترقی کے لیے ایک نئی راہ کھل گئی۔

۱۱۹۔ اس وقت تک چار کتابوں کا بیان ہوا ہے۔ ''کتاب الرائی'' امام ابو حنیفہ کی' ''کتاب الاصول'' ان کے دو شاگردوں کی اور ''کتاب الرسالہ'' امام شافعی کی۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک کہ تقریباً چودہ سو سال

کا زمانہ ہوتا ہے انہی ابتدائی کتابوں کی شرح کے سوا اور کوئی چیز نہیں ملتی۔ اس علم سے شغف زیادہ تر ترکستان والوں کو رہا۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس علم کو ترقی ترکوں نے دی اور ایسی بیسیوں کتابیں لکھی گئیں جو یا تو تکرار پر مبنی ہیں' یا شرح پر یا خلاصوں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ایک بڑی ضخیم کتاب ابوالحسین البصری نے لکھ ڈالی جو دو جلدوں میں ہزار ڈیڑھ ہزار صفحوں پر چھپی ہے۔ اس کا پڑھنا ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس کا خلاصہ امام بیضاوی نے بیس صفحوں میں کر ڈالا جو چیستان بن کر رہ گیا۔ پھر بیضاوی کے اس مختصر رسالے کی شرح اور حاشیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کتاب تو درس کے طور پر بیضاوی کی پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن اس کو سمجھانے کے لیے شرحوں اور حاشیوں اور حاشیۃ الحواشی کی ضرورت پیش آتی۔ غرض یہ سلسلہ اب تک چلا آرہا ہے۔

۱۲۰۔ زمانہ حال میں اس میں اگر کسی نے نئی چیز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ ہمارے مرحوم سر عبدالرحیم تھے' جو ایک زمانے میں ہندوستان کی اسمبلی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ بعد میں وہ پاکستان میں بھی رہے۔ انھوں نے قانونی حیثیت سے پاکستان کی بڑی خدمت کی ہے۔ ایک زمانے میں جب وہ مدراس ہائی کورٹ کے جج تھے تو کلکتہ یونیورسٹی کی دعوت پر غالباً ٹیگور لا لیکچرز کے سلسلے میں' انھوں نے اصول فقہ پر کچھ لیکچر دیے تھے جو محمڈن جیورسپروڈنس (Muhammadan Jurisprudence) کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گئے ہیں۔ ان میں انھوں نے ایک تھوڑی سی جدت کی ہے۔ اور یہ کہ پرانی اصول فقہ کی کتابوں کے بیانات کو اور مواد کو بھی بیان کر دیا ہے اور حالیہ زمانے میں یورپ میں فلسفہ قانون وغیرہ کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں' ان سے بھی استفادہ کر کے اسلامی اور یورپی اصول قانون کے موازنے کی کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے سر عبدالرحیم کی محمڈن جیورسپروڈنس اصول فقہ کی ایک ایسی کتاب ہے جو ہمارے پرانے اصول فقہ کی کتابوں میں ایک نیا باب کھولتی ہے۔ اس میں ہمیں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جن کا ذکر پرانی اصول فقہ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر پرانی اصول فقہ کی کتابوں میں پہلا سوال یہ ہو گا کہ قانون کے ماخذ کیا ہیں؟ وہ کہیں گے کہ قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس۔ ان میں یہ ذکر نہیں ہو گا کہ قوانین کس کس موضوع کے ہوتے ہیں۔ کچھ عبادات ہیں' کچھ معاملات ہیں' کچھ قانون تعزیرات و قانون وراثت ہے۔ لیکن اور بھی چیزیں ہیں' جیسے انٹرنیشنل لا اور کانسٹی ٹیوشنل لا وغیرہ۔ ہماری پرانی فقہ کی کتابوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ جسٹس سر عبدالرحیم نے اصول قانون کے یورپی مؤلفین کی طرح ان قوانین کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ ان کا علمی کارنامہ ہے کہ قدیم و جدید معلومات کو اپنی جامع کتاب میں سمو دیا ہے۔

۱۲۱۔ اب آخر میں مجھے اجتہاد کے بارے میں اشارۃً' کچھ کہنا ہے جس کا اعلان میرے لیکچر کے موضوع

کے طور پر کیا گیا ہے۔ اجتہاد کیا چیز ہے؟ میرے گزشتہ دنوں کے بیانات سے آپ اندازہ کر چکے ہوں گے کہ اجتہاد کرنے کی اجازت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس شرط پر دی تھی کہ قرآن و حدیث میں ان کو سکوت نظر آئے۔ اگر قرآن میں صراحت ہے تو پھر اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن میں سکوت ہے لیکن حدیث میں اس کی صراحت آتی ہے تو بھی اجتہاد کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اجتہاد صرف اس وقت کیا جاتا ہے جب یہ دونوں بنیادی اساس یعنی قران و حدیث ہمارے سوال کے متعلق خاموش نظر آئیں۔ قانون سازی کی اس کوشش یعنی اجتہاد کو' ہمارے فقہا نے بہت ترقی دی اور اس کے لیے لطیف فرق کی بنا پر بہت سے نام دیے ہیں۔ چنانچہ اجتہاد کا لفظ بھی ہے قیاس کا لفظ بھی ہے' استدلال کا لفظ بھی ہے اور اسی طرح استصلاح کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سب بالکل مترادف چیزیں نہیں بلکہ ان میں باہم لطیف سا فرق پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں "استحسان" کا میں خاص طور پر ذکر کروں گا۔ استحسان حنفی مذہب کی ایک خصوصیت ہے جس کو دوسرے فقہی مکاتب فکر کے لوگ پسند نہیں کرتے۔ یہ ناپسندیدگی ایک غلط فہمی کی بنیاد پر ہے' لیکن بہرحال اسے پسند نہیں کرتے چنانچہ آپ کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ امام شافعی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "الرد علی الاستحسان" جو استحسان کی تردید کے دلائل پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں نظر آتا ہے کہ انھوں نے استحسان کا ایک فرضی مفہوم لے کر اس کی تردید کی ہے۔ حنفی مکتب فکر کے مطابق استحسان کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی مسئلے کے ظاہری حالات کی بنا پر کوئی بات ذہن میں آتی ہے تو اس پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ گہرے غور و فکر کے بعد عمیق تر حقائق کے پیش نظر حکم دیا جائے۔ چنانچہ استحسان سے کام لینے والے حنفی ائمہ محض ظاہری حالات کو کافی نہیں سمجھتے اور ایک عمیق تر سبب معلوم کر کے اس کی بنیاد پر احکام دیتے ہیں۔ ایک مثال میں آپ کو دوں گا۔ فرض کیجیے کہ میں آپ میں سے کسی کے سپرد کچھ امانت کروں' کہ اسے فلاں کو پہنچا دو تو توقع یہی کی جائے گی کہ آپ وہی چیز منزل مقصود تک پہنچا دیں گے۔ آج کل ہمارے ڈاک خانوں سے منی آرڈر بھیجا جاتا ہے۔ ایک رقم آپ ڈاک خانے کے سپرد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس امانت کو تم فلاں شخص تک پہنچا دو۔ جو رقم آپ ڈاک خانے کے سپرد کرتے ہیں' امانت کا عام اصول تو یہی ہے کہ وہی رقم پہنچائی جائے۔ لیکن ڈاک کے موجودہ نظام کے مطابق آپ کی رقم سرکاری خزانے میں جمع ہو جاتی ہے اور منی آرڈر وصول کرنے والے کو متبادل رقم ادا کر دی جاتی ہے۔ اصل رقم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ یہی استحسان کا مفہوم ہے۔ اگرچہ یہ طریقہ امانت کے قانون کے ابتدائی یا سطحی مفہوم سے کسی حد تک مختلف ہے لیکن اس طریقے سے امانت کا حق ادا کرنے میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے' اور اصلی

اور متبادل رقموں کی مالیت میں کوئی فرق بالکل نہیں ہوتا۔

۱۲۲۔ اس مختصر تشریح کا منشا اصل میں یہ تھا کہ مسلمانوں نے علم قانون کو اپنے اجتہاد فکر کی بدولت اس طرح مدون کیا کہ اسلامی قانون کو اس کے قانون ساز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی غیر موجودگی کے باعث کوئی دشواری پیش نہ آئی اور آج بھی اسلامی قانون اسی اصول کی وجہ سے اپنی جگہ محفوظ اور ہر دور میں قابل عمل ہے۔ ایک نکتہ بیان کر کے میں اس لیکچر کو ختم کرتا ہوں۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی قانون کو یا تو خود قانون ساز بدل سکتا ہے یا اس سے بالاتر شخصیت۔ اس سے کمتر شخصیت کو قانون بدلنے کی اجازت نہیں۔ اگر اللہ نے کوئی حکم دیا ہے تو اللہ ہی اس کو بدل سکتا ہے۔ اسی طرح نبی کے حکم کو یا خود وہی نبیؑ بدلے گا یا اللہ اور یا اللہ کا بھیجا ہوا کوئی دوسرا نبی۔ نبی سے فروتر شخص مثلاً کوئی فقیہ اسے نہیں بدل سکتا۔ اس لحاظ سے اسلامی قانون کے جو احکام قرآن میں ہیں انھیں کوئی اور شخص نہیں بدل سکتا لیکن ایک فقیہ کی رائے دوسرا فقیہ رد کر سکتا ہے اور اپنی رائے پیش کر سکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ لیکچر میں بیان کیا تھا کہ یہ چیز انفرادی قیاس و رائے اور استنباط ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ اجتماعی رائے کے متعلق بھی درست ہے۔ کم از کم حنفی مذہب میں یہ بات قبول کر لی گئی ہے کہ نیا اجماع پرانے اجماع کو منسوخ کر سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک چیز پر اجماع پایا جاتا ہے۔ اجماع کے سامنے ہم سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ قیامت تک کوئی شخص اس کے خلاف زبان نہ کھولے۔ اگر کوئی شخص جرأت کر کے ادب کے ساتھ' دلیلوں کے ساتھ' اس کے خلاف اپنی رائے پیش کرے اور پھر اس نئی رائے کو دوسرے فقہاء بھی قبول کریں تو ایک نیا اجماع ہو جاتا ہے۔ یہ نیا اجماع پرانے اجماع کو منسوخ کر دیتا ہے۔ یہ اصول مشہور حنفی امام ابوالیسرا لبزدوی نے اپنی کتاب "اصول الفقہ" میں بیان کیا ہے۔ امام بزدوی چوتھی اور پانچویں صدی کے درمیان کے فقیہ گزرے ہیں۔ اسلامی قانون میں ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان کے اس بیان کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجماع ہمارے لیے مصیبت کا باعث نہیں بن سکتا۔ اجماع اگر کسی نامناسب چیز پر ہو گیا ہو اور حالات کے بدلنے کی وجہ سے ہم ان پر عمل نہ کر سکتے ہوں تو اس کی گنجائش ہے کہ اجماع کے بدلنے کا بھی ہم سامان پیدا کر لیں اور قیاس کے ذریعے سے ایک نیا اجماع پیدا کر کے پرانے اجماع کو بدل دیں۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

سوالات و جوابات

برادران اکرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

۱۲۳۔ متعدد سوالات آئے ہیں' اپنی بساط کے مطابق جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال ا۔ موجودہ دور میں پاکستان میں اجتہاد کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔ اسی طرح اس دور میں اجماع اور قیاس کا کیا طریقہ ہو گا۔

جواب۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان اور غیر پاکستان کا سوال بے محل ہے۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کا یہ مشترکہ معاملہ ہے۔ جس چیز کے متعلق قرآن و حدیث میں صراحت نہیں ہے اور ایک ایسا مسئلہ پیدا ہوا ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے تو اس کے لیے ہم اجتہاد کے ذریعے سے اسلامی نقطہ نظر معلوم کرنے کی کوشش' انفرادی طور پر بھی کریں گے اور باہمی مشاورت سے بھی یعنی اجتماعی طور پر بھی۔ سب لوگ متفق ہوتے ہیں تو فبہا ورنہ ہماری حکومت کو جو رائے اپنے پارلیمنٹ کے ارکان کی کثرت رائے کی بنیاد پر مناسب معلوم ہو گی' اس پر عمل کرایا جائے گا۔ اجماع اور قیاس کا ابھی یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ اصل چیز صرف اجتہاد ہے۔ کچھ خفیف سے فرق کی وجہ سے اس کے مختلف نام ہو گئے ہیں۔ کس طرح کا اجتہاد قیاس کہلائے گا' کس طرح کا اجتہاد استحسان کہلائے گا' یہاں مجھے تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ قیاس اور اجماع عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ صرف اتنا ہی فرق ہے کہ اجتہاد ایک آدمی کی رائے ہوتی ہے اور اجماع وہ ہے جس پر سارے فقیہ اور قانون کے ماہرین متفق ہو جائیں۔ میں غالباً گزشتہ کسی لیکچر میں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں میں اجماع کا تصور پایا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے گزشتہ چودہ سو سال سے اجماع کو ایک ادارے کی حیثیت دینے کی طرف ہم نے کوئی توجہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ کسی چیز پر اجماع ہوا ہے یا نہیں ہوا' اس کے معلوم کرنے کا آج ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں' ابتدائی صدیوں ہی سے مسلمان تین براعظموں ایشیاء' یورپ اور افریقہ میں پھیلے ہوئے تھے مگر کبھی یہ صورت ممکن نہ ہو سکی کہ کسی سوال کو سارے فقہاء کے پاس بھیج کر ان کی آراء کو جمع کیا جاتا' کیا سب لوگ اس جواب پر متفق ہیں؟ شاید پرانے زمانے میں یہ چیز ممکن بھی نہیں تھی' کیونکہ وسائل نقل و حمل کی دشواریاں تھیں۔ لیکن زمانہ حال میں اس کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اسلامی ممالک تک اپنے آپ کو محدود رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں بھی مسلمان موجود ہیں' ان کو ایک نظام کے اندر منظم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ مثلاً ہر ملک میں انجمن فقہاء قائم کی جائے۔ کسی مقام پر اس کا ایک صدر مرکز ہو۔ یہ مرکز پاکستان میں بھی ہو سکتا ہے اور پاکستان سے باہر بھی' حتیٰ کہ ماسکو اور واشنگٹن میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں کیونکہ یہ صرف مسلمانوں کا ایک مخصوص ادارہ ہو گا۔ جہاں بھی مرکز ہو اس کو ایک سوال پیش کیا جائے گا۔ اگر سیکرٹریٹ کی رائے میں وہ سوال واقعی اس کا متقاضی ہو کہ مسلمان فقہائے عالم اپنی رائے دیں' تو وہ اس

سوال کو ساری شاخوں کے پاس روانہ کردے گا' اسلامی ممالک کی شاخوں کو بھی اور غیر اسلامی ممالک کی شاخوں کو بھی۔ ہر شاخ کے سیکرٹری اپنے ملک کے سارے مسلمان قانون دانوں کے پاس اس سوال کی نقل روانہ کر کے درخواست کرے گا کہ تم اپنا مدلل جواب اس کے متعلق روانہ کرو' جب اس کے پاس یہ جوابات جمع ہو جائیں گے تو وہ مرکز کو روانہ کرے گا' کہ یہ متفقہ جواب ہے۔ اگر اختلافی جواب ہو تو اختلافات کے ساتھ' لیکن ہر فریق کی دلیلوں کے ساتھ۔ اس عملی پہلو پر بھی میں آپ کو توجہ دلاؤں کہ مرکز کی زبان عربی ہونی چاہیے اور انفرادی طور پر ہر ملک میں کوئی مقامی زبان ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر وہ سوال پاکستان میں آئے تو یہاں کے علماء اپنے جوابات اردو میں دے سکتے ہیں یا کسی اور زبان میں۔ لیکن یہاں سے مرکز کو جو جواب جائے گا وہ عربی میں ہونا چاہیے تاکہ ساری دنیائے اسلام کے فقہاء اس سے آسانی سے استفادہ کر سکیں۔ کیونکہ میری رائے میں ہم اچھا فقیہ اس کو کہیں گے جسے اچھی عربی آتی ہو غرض جب ساری شاخوں کے پاس سے جواب آجائے اور دیکھا جائے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے تو اس امر کا اعلان کیا جا سکتا ہے کہ اس جواب پر سب لوگ متفق ہیں۔ لیکن اگر اختلاف ہو تو اختلافی دلیلوں کا ایک خلاصہ تیار کیا جائے اور دوبارہ اس کو گشت کرایا جائے تاکہ جن لوگوں کی پہلے ایک رائے تھی' ان کے سامنے مخالف دلیلیں بھی آئیں۔ اور انھیں غور کرنے کا موقع ملے۔ ممکن ہے وہ اپنی رائے بدل کر اس دوسری رائے پر متفق ہو جائیں جو ان کے مخالفین کی تھی۔ جب اس طرح کافی غور و بحث کے بعد دوبارہ تمام شاخوں سے مرکز کے پاس جواب موصول ہو جائیں تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ کس چیز پر اجماع ہوا ہے اور کس چیز پر اختلاف رائے ہے۔ نیز یہ کہ اختلافی پہلو پر اکثریت کی رائے کیا ہے؟ ان سب نتائج کو ایک رسالے کی صورت میں شائع کیا جائے جس میں جوابات بمع دلائل درج ہوں۔ یہ میرا تصور ہے کہ ہمارے زمانے میں اجماع کو' اگر ہم ایک ادارہ بنانا چاہیں تو کس طرح بنائیں اور کس طرح اس سے استفادہ کریں۔ یہ قطعاً ممکن نہیں ہے کہ دنیا بھر کے ماہرین فقہائے اسلام کو مستقل طور پر کسی ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ وہ کسی چند روزہ اجتماع میں شرکت کے لیے تو آسکتے ہیں لیکن ساری عمر ایک مقام پر گزارنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے' اور نہ ہی ان ملکوں کے لیے جہاں کے باشندے ہیں' فائدہ مند چیز ہو گی۔ کیونکہ ان کی خدمات سے ان کے ہم وطن محروم ہو جائیں گے۔ اس کے برخلاف اگر اس طرح کی انجمن بنائی جائے تو وہ اپنی رائے آسانی کے ساتھ دے سکتے ہیں۔ اور اس سے ساری دنیا کے لوگ استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہمارے فقہاء وصول شدہ خط کا جواب بھی دیں۔ بدقسمتی سے خط کا جواب دینے میں تساہل و تغافل اب بہت عام ہو گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ امام بخاری کی التاریخ الکبیر پڑھ رہا تھا' جو محدثین کے حالات کی

کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے حضرت ابن عباس کاایک قول نقل کیا ہے۔ بخاری حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ "خط کا جواب دینا اسی طرح واجب ہے جس طرح سلام کا جواب دینا"۔ اگر اس پر ہمارے زمانہ حال کے فقہاء عمل کرنا پسند کریں تو امت ان سے استفادہ کرے گی۔ ورنہ جہاں ہماری دیگر بے شمار برائیاں ہیں۔ ان میں یہ برائی بھی سخت ہے کہ لوگ کم ہی جواب دینا پسند فرماتے ہیں۔

۱۲۴سوال ۲۔ اسلامی قانون میں فیصلہ ظاہری عمل کی بنیاد پر دیا جاتا ہے، جس طرح جبری طلاق۔ ایسا کیوں ہے؟ نیت پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ نیت ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی اور اس کا امکان بھی ہے کہ ایک آدمی ابتداء ایک نیت رکھتا تھا اور جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ جھوٹ بیان کرتا ہے کہ میری نیت یہ نہ تھی۔ ان حالات میں حدیث کے الفاظ کو اگر ہم دیکھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرار دیا ہے کہ ظاہر پر عمل کیا جائے، کیونکہ باطن کا علم صرف خدا کو ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن ایک جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قریبی صحابی حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور متبنیٰ حضرت زید کے بیٹے☆ بھی تھے انھوں نے ایک دشمن کا دست بدست مقابلہ کیا۔ آخری لمحے میں جب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی تلوار اس کے سر کے قریب پہنچ رہی تھی تو اس نے اشہدان لا الٰہ الا اللّٰہ بلند آواز سے کہہ دیا۔ اس کے باوجود حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہاتھ نہیں روکا اور اس کا سر قلم کر دیا۔ جب اس کی اطلاع

☆ حضرت زید بن حارثہ کی آزادی اور تبنیت نبوی بڑا اثر انداز واقعہ ہیں۔ یہ کم عمری میں بازار میں بکنے کے لیے آئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے خرید کر اپنے شوہر (رسول اللہ) کو (قبل اسلام) تحفہ دیا کہ شخصی خادم رہے۔ کچھ عرصہ بعد ایک اجنبی شخص مکہ آکر پوچھتے پاچھتے آنحضرت تک پہنچا اور کہا میں شمالی عرب کے مشہور قبیلہ کلب کا سردار حارثہ ہوں، ایک مقامی جنگ میں دشمن میرے کم عمر بچے زید کو گرفتار کر کے لے گیا اور غلام کے طور پر بیچ دیا۔ طویل تلاش سے معلوم ہوا کہ وہ اب آپ کے پاس ہے۔ جتنا چاہے فدیہ مانگو میں دینے کو تیار ہوں۔ التجا ہے کہ مجھ پر رحم کرو اور اسے چھوڑ دو۔ آنحضرت اس قصہ سے سخت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ فدیے کی ضرورت نہیں میں زید کو بلاتا ہوں اور اگر وہ تمھارے ساتھ جانا چاہتا ہے تو خوشی سے مفت جائے۔ زید کے آنے پر حضور نے پوچھا: کیا تم اس شخص کو پہچانتے ہو؟ کہا: ہاں یہ میرا باپ ہے۔ فرمایا: وہ آیا ہے تاکہ تم کو ساتھ لے جائے۔ زید نے بغیر تذبذب کے کہا: آقا آپ کا برتاؤ میرے ساتھ ایسا رہا ہے کہ میں اپنے باپ کے گھر کی شہزادگی پر آپ کے ہاں کی غلامی کو ترجیح دیتا ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اتنا متاثر ہوئے کہ فوراً کعبہ کے سامنے لے جا کر اعلان کیا کہ میں زید کو آزاد بھی کرتا اور متبنیٰ بھی بناتا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خفا ہوئے۔ اسامہ نے کہا کہ اس شخص نے تو صرف ڈر کر کلمہ شہادت پڑھا تھا' حقیقت میں دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تھے: "ھلا شققت قلبہ" (کیا تو نے اس کا دل چیر کر اس کے اندر دیکھا تھا کہ وہ ایسا تھا)۔

دوسرے الفاظ میں ظاہر پر عمل کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ مغرب کی اعلیٰ ترین ایجادوں کے باوجود انسان کے باطن کا حال معلوم کرنا اب تک ممکن نہیں ہو سکا۔ اگر کسی دن یہ ممکن ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ ہم اس پر عمل کریں' لیکن فی الحال اس پر عمل کرنا انصاف کے خلاف ہی ہو گا۔ لوگ اپنے برے اعمال کے خمیازے سے بچنے کے لیے جھوٹ بولا کریں گے اور اگر جھوٹ کو قانوناً" ہمارا قاضی یا حاکم عدالت قبول کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ انصاف نہیں ہو گا' ظلم ہو گا۔

۱۲۵سوال ۳۔ اگر نئے اجماع کو پرانے اجماع پر فوقیت دی جا سکتی ہے تو کیا یہ اصول صحابہ کے اجماع اور ائمہ اربعہ کے اجماع کو رد کرنے میں بھی قابل عمل ہو گا؟

جواب۔ بجائے اصولی بحث کرنے کے میں یہ سوال کروں گا کہ آپ کوئی ایسی چیز بتائیں جس پر صحابہ کا اجماع ہوا ہو' جس پر چاروں اماموں کا اجماع ہوا ہو' اور پھر میں آپ کو جواب دوں گا کہ اس کے بدلنے کی ضرورت ہو گی یا نہیں۔ فرضی سوالات میں وقت ضائع کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس پر سارے صحابہ متفق ہو چکے ہوں' جس پر سارے ائمہ حنفی' شافعی متفق ہوں' وہ قطعاً ایسی چیز نہیں ہو گی جو آج ہماری عقلوں کے لیے ناقابل قبول ہو۔ اسے اصولاً" میں قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ آپ مجھے معین مثال دیں پھر میں بتا سکتا ہوں کہ اس قاعدے کے اطلاق سے کہ نیا اجماع پرانے اجماع کو منسوخ کر دے گا۔ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ آسان چیز ہے۔ یعنی وہ معین سوال ہم اپنے زمانے کے فقہاء کے سامنے پیش کریں گے۔ جب تک ان کا اجماع نہ ہو' پرانا اجماع ہی واجب التعمیل ہو گا۔ صحابہ کا اجماع یا ائمہ کا اجماع ہی برقرار رہے گا جب تک کہ کسی مسئلے پر واقعتاً" یا اجماع میں عمل میں نہ آئے۔

۱۲۶سوال ۴۔ اگر خلافت علی منہاج النبوۃ ہو تو وہ حکومت کس مسئلے میں اجتہاد کرے گی۔ اگر کسی مسئلے میں اجتہاد کرے گی تو آیا عوام کے لیے قابل قبول ہو گا؟

جواب۔ اگر ایسی خلافت ہو جیسی کہ آج کل ہے۔ تو ظاہر ہے کہ حکومت کا اجتہاد قابل قبول نہ ہو گا۔ اس صورت میں جو قرآن و حدیث سے خود استدلال نہ کر سکتا ہو کیا کرے گا۔ کیونکہ آج کل بہت سے مسائل میں علمائے کرام نے مختلف آراء دی ہیں۔ اگرچہ میں سوال کا مقصد شاید نہیں سمجھا لیکن ایک بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا' وہ یہ کہ اسلام میں ایک روایت (Tradition) عجیب و غریب رہی

ہے جو کسی اور قوم میں ہمیں نظر نہیں آتی۔ یعنی اور ممالک میں قانون سازی حکومت کا اجارہ ہوتی ہے' جب کہ اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ چیز کبھی یوں نہیں رہی۔ اسلامی قانون کا یہ اصول ہے کہ عدالت کو حکومت سے آزاد رہنا چاہیے۔ یہ اصول مغرب میں بھی قبول کر لیا گیا ہے اور ہمارے ہاں بھی برقرار اور جاری ہے۔ اسی طرح عہد نبوی کے بعد سے لے کر آج تک اسلام میں قانون سازی ایک پرائیویٹ چیز رہی ہے۔ کبھی حکومت کا اجارہ (Monopoly) نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان فقہاء پوری آزادی کے ساتھ قانون کی ترقی میں مشغول رہے۔ قانون سازی صرف حکومت کی پارلیمنٹ تک محدود نہیں رہی' ورنہ اسلامی قانون کی ترقی اس طرح نہیں ہو سکتی تھی جس طرح عمل میں آئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کا یہ اصول' قانون اور حکم ہے بلکہ اسلامی روایت (Tradition) یہ ہے کہ قانون سازی حکومت کا اجارہ نہیں' ورنہ حکومت کی سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے قانون متاثر ہو گا۔ اگر میں وزیر قانون ہوں تو صدر مملکت کی ضرورت اور بعض وقت اس کی منشاء کا لحاظ کر کے مسودہ قانون پارلیمنٹ میں پیش کروں گا اور اپنے اثرات ڈال کر' کہ میں اکثریتی پارٹی یا حکومتی پارٹی کا لیڈر رہوں' اپنے ارکان کو حکم دوں گا کہ اس مسودہ قانون کے خلاف رائے نہ دو۔ اس صورت میں اکثریت کی رائے سے جو قانون بنے گا وہ سیاسی ضروریات سے متاثر ہو گا۔ اس کے برخلاف اگر مسلمان فقہاء کو حسب سابق آزادی رہے کہ قانون سازی وہ خود کریں یعنی احکام کے متعلق اپنے قیاس و اجتہاد کے ذریعے سے رائے دیں' تو وقتی سیاسیات اور حکومت کے احکام کا کوئی اثر نہیں پڑے گا' ایک شخص اپنی رائے دے گا' دوسرا شخص اس کے برعکس رائے دے گا' تیسرا شخص شاید دونوں کے بین بین رائے دے گا اور اس طرح ایک عام بحث مباحثے کے بعد ہم کسی بہتر نتیجے پر پہنچ سکیں گے جو ملت کے لیے' حکومت کے لیے اور ساری انسانیت کے لیے کار آمد ہو سکتا ہے۔ میرا تصور اس کے متعلق یہ ہے۔ ضروری نہیں کہ اس رائے سے آپ بھی متفق ہوں۔

۱۲۷سوال ۵۔ امت مسلمہ میں سب سے پہلا اجماع کب ہوا اور کس بات پر ہوا؟

جواب۔ مجھے معلوم نہیں۔ پہلا اجماع غالباً عہد صحابہ میں ہوا ہو گا۔ لیکن کس مسئلے پر اور کب ہوا تھا۔ یہ کہنا دشوار ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ہوا ہو۔ مثلاً زکوٰۃ نہ دینے والوں سے جنگ کے متعلق' کیونکہ یہ اولین مسئلہ تھا جس میں کچھ اختلاف پیدا ہوا تھا۔ بڑے بڑے صحابہ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے صحابی کی بھی رائے تھی کہ فی الحال اس پر اصرار نہ کیا جائے اور جو لوگ صرف زکوٰۃ دینے سے انکار کرتے ہیں' انھیں کافر نہ قرار دیا جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جواب دیا کہ قرآن میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ دونوں کو ایک ہی سانس میں بیان

کیا گیا ہے۔ "اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ" جس طرح ایک شخص نماز پڑھنے سے انکار کرے تو میں مرتد قرار دینے پر مجبور ہوں' یہی معاملہ زکوۃ کا بھی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پہلا اجماع ہو۔ یا شاید اس امر پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کو ایک خلیفے کی ضرورت ہے۔

۱۲۸ سوال ۶۔ کیا اجتہاد کا حق ہر شخص کو ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو ہر شخص کے اجتہادی اختلاف کی بنا پر اختلافات کی کثرت ہو جائے گی۔ اس کا حل کیا ہو سکتا ہے؟

جواب۔ میں نے ابھی آپ سے گزارش کی کہ اجتہاد کا حق فن قانون اور اسلامی فقہ کے ماہرین کو ہو گا' ہر عام آدمی کو نہیں ہو گا۔ ان میں اختلاف رائے ہو تو کوئی حرج نہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کس طرف اکثریت کی رائے ہے اور کس طرف اقلیت کی رائے ہے۔ اولاً" فریق ثانی یعنی مخالف کی دلیل کو معلوم کرنے کے بعد ہمیں موقع ملے گا کہ اسے قبول کریں یا رد کر دیں۔ اس میں میرے نزدیک کوئی دشواری نہ پرانے زمانے میں پیدا ہوئی اور نہ آئندہ زمانے میں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ کیونکہ اختلاف رائے کی وجہ سے فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اختلاف نیک نیتی سے کیا جائے' صرف اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے نہیں یا اس لیے نہیں کہ فلاں نے یہ بیان کیا ہے۔ لہٰذا میں اس کی تردید ضرور کروں۔ غالباً اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اختلاف رائے کو روکنا نہیں چاہیے۔ اسے صحیح رخ میں صحیح راستے پر لگانے کی کوشش کرنا مفید ہو گا۔

۱۲۹ سوال ۷۔ اگر ایک غیر مسلم آپ سے یہ کہے کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ براہ کرم آپ مجھے وہ فرقہ بتا دیں جس کے عقائد و نظریات پر عمل پیرا ہو کر وہ صحیح مسلمان بن سکے گا۔ نیز اس بارے میں آپ ذاتی طور پر اسے کیسے مطمئن کریں گے؟ شکریہ۔

جواب۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی فرقے کے اندر یا مذہب کے اندر ہے تو پورے خلوص اور پورے یقین کے ساتھ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا یہی مذہب ٹھیک ہے۔ لہٰذا اس کے پاس آنے والے طالب علم کو بغیر اصرار کے اس پر چلانے کی کوشش کرے گا۔ میرا اپنا طرز عمل اس بارے میں کچھ مذبذب سا رہا ہے۔ پیرس میں بعض نو مسلم فرانسیسی مجھ سے پوچھتے رہے ہیں کہ ہم نے سنا ہے کہ مسلمانوں میں بہت سے فقہی مذاہب (Schools of Law) ہیں' حنفی' شافعی' مالکی' ہم کسے اختیار کریں۔ مالکی مذہب میرا مذہب نہیں ہے۔ لیکن فرانس میں شاید اسی پچاسی (۸۰'۸۵) فیصد یا اس سے بھی زیادہ لوگ مالکی مذہب کے ہیں۔ لہٰذا میں ان سے کہتا ہوں کہ مالکی مذہب تمہارے ماحول کے لیے موزوں تر ہے۔ میں خود مالکی مذہب کا نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم اس ماحول میں جذب ہونے کے

لیے مالکی مذہب کے رہو تو یہ زیادہ مناسب ہو گا۔ یہ میرا طرز عمل رہا ہے۔ اس بارے میں آپ کو اختیار ہے آپ جس طرح چاہیں عمل کریں اور ظاہر ہے کہ آپ اسی مذہب کی طرف اس نو مسلم کو بلائیں گے جو آپ کی رائے میں صحیح ہو گا۔

۱۳۰ سوال ۸۔ اگر دو شرعی دلیلوں میں تعارض پیدا ہو جائے تو مجتہد کو کس طرف رجوع کرنا چاہیے اور کیوں؟

جواب۔ یہ مجتہد خود فیصلہ کرے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ اس کے سامنے دو دلیلیں ہوں تو اس کی رائے اس کا ذہن اور اس کا ضمیر جس چیز کی طرف مائل ہو گا۔ وہ اسی کا حکم دے گا۔ کوئی قاعدہ نہیں ہے بلکہ یہ انفرادی چیز ہو گی۔ محض سہولت ہمیشہ بہتر اور مفید چیز نہیں ہوتی۔

۱۳۱ سوال ۹۔ مجتہد کے استنباطی احکام کے لیے کون سا طریقہ کار ہے؟

جواب۔ اس کے لیے آپ اصول فقہ کی کسی کتاب کو آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ اجتہاد کی بحث میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کو کسی مسئلے کا حکم دینے کے لیے سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ قرآن میں وہ چیز نہ ملے تو حدیث کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ حدیث میں نہ ملے تو اس سے پہلے کے جو فقہاء اور مجتہد گزرے ہیں، یعنی جہاں ان میں اجماع پایا جاتا ہے تو اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور ان میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو ذہن سے سوچ کر ایسا حکم دینا چاہیے جو اس حکم دینے والے کی رائے میں سب سے زیادہ قابل قبول ہو۔ یعنی خدا ترسی کے ساتھ اس کو حکم نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ چونکہ فلاں صاحب مجھے بطور وکیل کے فیس دے رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی مرضی کے مطابق میں قانون وضع کر دوں۔ وکیل بے شک کوشش کرے گا کہ اس کا مؤکل مقدمہ جیت جائے۔ لیکن اگر اس سے اس کی پرائیویٹ حیثیت سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ ایسا نہیں کرتا۔ وہ ایسی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو اس کی رائے میں حق کے مطابق ہے اور خدا کی قبولیت کا امکان رکھتی ہے۔

۱۳۲ سوال ۱۰۔ امام شافعی حدیث کی تدوین کے سلسلے میں ایک شہادت کو بھی قبول کرنے پر زور دیتے ہیں۔ لیکن اسلامی قانون شہادت اکثر صورتوں میں واحد شہادت کو قبول نہیں کرتا۔ یہ تضاد کیسے حل کیا گیا ہے؟

جواب۔ میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ قاضی کے سامنے اگر ایک مقدمے کے فیصلے کے سلسلے میں کوئی مسئلہ آئے تو وہ گواہیاں طلب کرے گا۔ لیکن حدیثوں کا مسئلہ ہی دوسرا ہے۔ اگر ایک ثقہ راوی کے ذریعے سے کوئی حدیث ہم کو پہنچ چکی ہے یعنی خبر واحد ہے تو امام شافعی کہتے ہیں کہ اسے قبول کرو۔ مگر

اس بارے میں کہ عدالت کے سامنے کوئی دعویٰ پیش کیا جائے تو اکثر صورتوں میں اس کو دو گواہوں کی ضرورت ہو گی لیکن بعض صورتوں میں صرف ایک گواہی بھی کافی ہوتی ہے۔ مثلاً بچے کی پیدائش کے بارے میں صرف دائی کا بیان' کہ یہ بچہ اس عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے کافی سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس موقع پر دوسرے لوگ موجود نہیں ہوتے۔ لیکن زنا کے مقدموں میں چار گواہوں کی ضرورت قرآن نے قرار دی ہے' تو وہاں دو نہیں بلکہ چار کی ضرورت ہو گی۔ کہنا یہ ہے کہ حدیث کو قبول کرنا ایک الگ چیز ہے اور مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت کسی گواہی کو قبول کرنا ایک دوسری چیز ہے۔ معتزلہ فرقے میں خاص کر اس کے ایک مشہور امام "نظام" کا خیال تھا کہ اس حدیث کو ہم قبول نہ کریں جسے دو راویوں کے ذریعے ہم تک نہ پہنچایا گیا ہو۔ لیکن امام شافعی کا یہ جواب مجھے معقول نظر آتا ہے کہ عہد نبوی میں ایسا نہیں کیا جاتا رہا۔ لہٰذا ہمیں ضرورت نہیں کہ اس قدر اصرار کریں' ورنہ نتیجہ یہ ہو گا کہ حدیثوں کی بہت بڑی تعداد سے ہم محروم ہو جائیں گے اور یہ ہمارے لیے علمی اور دینی نقصان ہو گا۔ یہ کوئی تضاد نہیں ہے جس کے حل کرنے کی ضرورت ہو۔ حدیث کو ایک راوی کی بنیاد پر قبول کیا جائے۔ لیکن دعوے کو عدالت میں دو گواہوں کی بنا پر قبول کیا جائے۔

۱۳۳ سوال ۱۱۔ کیا شارع کی منشا کے بغیر یا خلاف' احکام میں تغیر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جنگ قادسیہ میں سعد بن ابی وقاص کا ابو محجن ثقفی کو شراب (خمر) پر معاف کر دینا یا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قبیلہ مزینہ کے ایک آدمی کی شکایت پر حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کو قطع ید کا حکم سنا کر منسوخ کر دینا۔

جواب۔ پہلے سوال کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ انتہائی خصوصی حالات میں ایسا بھی عمل میں آیا ہے کہ کسی قانون کا اطلاق نہ کیا گیا ہو یا ملتوی کیا گیا ہو۔ چنانچہ جنگ قادسیہ میں ایک سپاہی نے' جسے شراب نوشی کے الزام میں درے لگانے کی بجائے عارضی طور پر قید کر دیا گیا تھا' اس قید سے عارضی مدت کے لیے چھٹی لی اور جا کر ایسی بہادری سے لڑا کہ اس جنگ کی کایا پلٹ گئی۔ اس سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا۔ جب سعد بن ابی وقاص نے اسے کہا کہ جاؤ میں تمہیں معاف کرتا ہوں تو ابو محجن ثقفی کو بڑا دکھ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اگر مجھے درے لگا دیے جاتے تو اللہ کے ہاں معاف ہو جاتا۔ مجھے اللہ کے سامنے جواب دہی کے لیے تیار ہونا ہے۔ میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ شراب نہیں پیوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سعد بن ابی وقاص کی فراست تھی کہ اس شخص کے ضمیر کو بیدار کرنا چاہیے اور وہ تدبیر یہ ہے کہ اس کو معاف کر دیا جائے۔ ممکن ہے ان صحابہ کے متعلق اور صورتوں میں بھی ایسے ہی واقعات پیش آئے ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ یہ وہ شخص ہے کہ جب وہ کسی راستے پر چلتا ہے تو شیطان کو ادھر

سے گزرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ان میں اتنی بے نفسی Selflessness پیدا ہو گئی تھی کہ کبھی ذاتی خواہش کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ وہ اللہ' رسول اور اسلام کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک زمانے میں جب قحط پڑا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس زمانے میں قحط کے دوران غذائی اجناس کے چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹنا بالکل ہی بند کر دیا۔ یہ ان کا اجتہاد تھا۔ اس بارے میں ممکن ہے کسی کو منطق اور اصول کی بنا پر اختلاف ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ منطق والے صاحب اس زمانے میں برسراقتدار اور خلیفہ ہوتے تو وہ بھی وہی کرتے جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا۔ میرا خیال ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس جواب سے آپ کو اتفاق ہو گا یا نہیں۔

۱۳۴سوال ۱۲۔ فقہ اسلامی کے ضمنی ماخذ استحسان' مصالح اور عرف کی مختصر توضیح کیجیے۔

جواب۔ استحسان سے مراد یہ ہوتا ہے کہ فوری طور پر جو ظاہری مفہوم ذہن میں آتا ہے' اس کی جگہ اس کی عمیق تر وجہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے' اس کو استحسان کہا گیا ہے۔ فوری ذہن میں آنے والی چیز پر نہیں بلکہ اس عمیق تر چیز پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے' یہ استحسان کہلاتا ہے۔ مصالح مرسلہ بھی عملاً وہی چیز ہے۔ اس چیز میں مفاد عامہ کی مصلحت پیش نظر ہوتی ہے' کہ ایسا ہے تو منطق پر عمل کرنے کی جگہ امت کی مصلحت' سہولت آسانی اور ملک میں امن و امان کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنا بہتر ہے۔ یہ مصالح مرسلہ کہلاتے ہیں۔ عرف کے معنی میں بتا چکا ہوں کہ ملک کے رسم و رواج کو کہتے ہیں۔ اسے کس نے بنایا' کب بنایا' ہمیں کوئی علم نہیں۔ جس کو قانون نے منسوخ نہیں کیا۔ وہ عرف رہتا ہے اور برقرار رہتا ہے۔ یہ عرف ہر ملک کا ہو گا۔ چاہے ہندوستان یا پاکستان کا ہو۔ عرب کے قبیلوں کا ہو' چین کا ہو' افریقہ کا ہو۔ جہاں بھی ہم جائیں اور کوئی نیا طرز عمل کسی چیز کے متعلق نظر آئے جو قرآن و حدیث نے منسوخ نہیں کیا تھا تو اسے ہم قبول کر سکیں گے' اگر وہ ہماری رائے میں معقول بھی ہو۔

۱۳۵سوال ۱۳: کیا یہ درست ہے کہ عراق میں ذخیرہ حدیث بہت کم پہنچا' اس لیے امام حنیفہ نے قیاس سے فقہی مسائل استنباط کیے اور اس میں اہل عجم کے مزاج کی خوب رعایت کی' اس لیے اسے قبول عام حاصل ہوا۔

جواب۔ میں اس خیال کے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ امام ابو حنیفہ بہت ہی ابتدائی زمانے کے فقیہ ہیں۔ ان کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی تھی۔ جو کوششیں عہد نبوی سے اس وقت تک حدیث کو مدون کرنے کے لیے شروع ہوئی تھیں' ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں اور جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے وہ متخصص لوگوں (Specialists) کا کام تھا۔ کچھ لوگ حدیث سے دلچسپی رکھتے تھے اور کچھ لوگ فقہ سے

اور ابھی تک ایسی کتابیں شائع نہیں ہوئی تھیں، جیسے بخاری، مسلم، حدیث کی کتابیں ہیں کہ ان کو ایک فقیہ بھی آسانی سے حاصل کر کے پڑھے۔ اگر امام ابو حنیفہ فقہ کے کام کو چھوڑ کر حدیث کی تلاش میں لگ جاتے تو انھیں ساری عمر گزارنا پڑتی اور فقہ کا علم ان کی قانونی صلاحیت سے محروم ہو جاتا۔ عراق میں احادیث پہنچ چکی تھیں۔ مگر امام ابو حنیفہ نے بعض صورتوں میں حدیث نہ ہونے کی بنا پر اجتہاد کر کے ایک رائے دی۔ لیکن امام ابو حنیفہ کے فوراً ہی بعد یعنی پچاس ساٹھ سال کے اندر حدیث کے ذخیرے فقہاء کی دسترس میں بھی آ گئے۔ حنفی مذہب ہی کے فقہاء نے امام ابو حنیفہ کی رائے کے خلاف رائے دی اور وہ حنفی مذہب کا جزو بن گئی۔ جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ بہت سی صورتوں میں صاحبین کی رائے پر عمل کیا جاتا ہے، ابو حنیفہ کی رائے پر عمل نہیں کیا جاتا، لیکن اسے حنفی مذہب ہی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ایک زمانے میں فقیہوں کو حدیثوں کا علم کم تھا، لیکن انھوں نے حدیثوں سے انکار بالکل نہیں کیا تھا۔ یہ کہنا کہ یہ عجمیت اور ایرانیت کی بنا پر تھا، میری رائے میں قطعاً غلط ہے۔

۱۳۶ سوال ۱۴۔ آپ نے فرمایا کہ قانون بدلنے والا یا تو خود قانون ساز ہو یا اس سے بالاتر شخصیت۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قحط کے دور میں چوری کے لیے قطع ید کی سزا ملتوی کر دی جب کہ نہ تو وہ مقنن تھے، نہ وہ پیغمبر۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب۔ میں سمجھتا ہوں انھوں نے قرآن مجید کی اس آیت "الا من اضطر" (۲:۱۷۳) سے استدلال کیا ہے۔ اگر اضطرار کی حالت پیدا ہو جائے تو جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ "الضرورات تبیح المحظورات" حالت اضطرار میں ممنوعات بھی مباح ہو جاتے ہیں، یا (Necessity knows no Law) ضرورت کسی قانون کی پرواہ نہیں کرتی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیال یہ تھا کہ چونکہ قحط کے زمانے میں حالت اضطرار کی کیفیت ہوتی ہے، لہٰذا اس قدر رعایت کی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ممکن ہے بہت سے لوگ مر جاتے اور ان کے مرنے یعنی خود کشی کرنے کا وبال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پڑتا۔ ظاہر ہے کہ ایک خدا ترس حکمران اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتا۔

۱۳۷ سوال ۱۵۔ اجماع سے کیا مراد ہے، اجماع امت یا اجماع علماء؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس حدیث سے اجماع کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں تو اجماع امت کے لیے فرمایا گیا ہے۔ کیا یہ اجماع ممکن ہے؟ کیونکہ مسلمان دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس صورت میں کون سا اجماع قانون بن سکے گا، اجماع اہل عراق یا اجماع اہل پاکستان؟

جواب۔ میں سمجھتا ہوں کہ سوال کرنے والے دوست اگر میرے اس بیان سے واقف ہو چکتے جو ابھی

تھوڑی دیر پہلے میں نے بتایا کہ اجماع کو کس طرح منظم کیا جاسکتا ہے اور کس طرح Institutionalize کیا جاسکتا ہے' تو سوال کا ایک جزء باقی نہ رہتا۔ میں اس سوال کا جواب دے چکا ہوں کہ اجماع امت اور اجماع علماء میرے نزدیک ایک ہی چیز ہیں۔ اجماع امت سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہر ان پڑھ شخص کی بھی رائے لی جائے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ امت کے علماء کی رائے' جیسا کہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے عرض کیا ہے کہ کسی شخص کو کسی خاص علم سے کوئی واقفیت اور لگاؤ نہیں ہے تو اسے مہم جو (Adventurer) بن کر اس علم میں دخل دینا' نہ اس کے لیے مناسب ہوگا اور نہ اس علم کے لیے سود مند ہوگا۔ لہٰذا اس سے مراد علماء ہی ہیں اور علماء میں بھی شرط لگاؤں گا فقہاء کی' یعنی جس شخص کو علم قانون سے دلچسپی اور واقفیت ہے اور اس میں ایک حد تک خصوصی لگاؤ ہو اسی کو رائے دینے کا حق ہوگا۔ رائے دینے کے معنی یہ نہیں کہ رائے کو قبول بھی کیا جائے۔ وہ رائے دے گا' دوسرا شخص اس کے خلاف رائے دے گا۔ مثلاً میں نے رائے دی جو ناقص تھی' اسے آپ نے رد کرنے کی کوشش کی۔ اب تیسرا شخص فیصلہ کرے گا کہ میری رائے قبول کرے یا دوسرے شخص کی رائے۔ اس لیے میری رائے میں' رائے دینے میں کوئی ممانعت نہیں ہونی چاہیے بلکہ رائے قبول کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ خود فیصلہ کریں کہ کون سی رائے امت کے لیے اور اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی صلاحیت رکھنے والی ہے اور کون سی رائے نہیں۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

خطبہ ۵

اسلامی قانون بین الممالک

محترم صدر! محترم وائس چانسلر اور مہمانان گرامی!
السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ!

۱۳۸ - "انٹرنیشنل" کے لیے عام طور پر "بین الاقوامی" کا لفظ مستعمل ہوتا ہے اس کے باوجود میں نے عمداً "بین الممالک" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اولاً میں اس کی توجیہ کر دوں کہ یہ قانون اصل میں سلطنتوں کے آپس کے تعلقات کے متعلق ہوتا ہے' حالت جنگ میں بھی اور حالت امن میں بھی سلطنت کے باشندوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یعنی دو قوموں کے تعلقات سے اس میں بحث نہیں ہوتی بلکہ دو مملکتوں کے معاملات و مفادات سے بحث ہوتی ہے اس لیے میں اردو میں "بین الممالک" کی اصطلاح کو "بین الاقوامی" پر ترجیح دیتا ہوں۔ آج کل اس کے لیے "بین الملل" کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے جو اسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ ملت کے معنی قوم کے ہیں۔ سلطنت کے نہیں۔ لیکن کبھی کبھی عربی میں "بین الدول" کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے۔ یہاں "دولت" مملکت کے معنی میں ہے۔ اس مختصر توجیہ کے بعد اصل موضوع پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

۱۳۹ - جس طرح کل کے موضوع کے ضمن میں' میں نے عرض کیا تھا کہ اصول فقہ ایسی چیز ہے جس پر مسلمان فخر کر سکتے ہیں' اسی طرح آج کا موضوع یعنی قانون بین الممالک بھی ایک ایسا علم ہے جو مسلمانوں کا ہی رہین منت ہے اور مسلمانوں ہی نے سب سے پہلے اس کو وجود بخشا' یہ ذرا عجیب سا دعویٰ ہے اس لیے کہ جب اس قانون کا تعلق دو خود مختار سلطنتوں کے باہمی تعلقات سے ہے اور خود مختار سلطنتیں آج سے نہیں بلکہ ہزار ہا سال سے انسانی سماج میں موجود ہیں' ان میں جنگیں بھی ہوتی رہی ہیں' ان میں آپس میں پر امن تعلقات بھی رہے ہیں اس لیے یہ کہنا کہ انٹرنیشنل لا مسلمانوں کا رہین منت ہے اور مسلمانوں ہی نے اسے وجود بخشا ہے' یہ بات تھوڑی سی وضاحت کی محتاج ہے۔ اصل میں اگر ہم اس علم کے آغاز پر غور کریں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا

آغاز سلطنتوں سے نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے کے ایک زمانے میں افراد سے ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنی جگہ خود مختار ہوتا ہے اس لیے اس قانون کی اساس ابتداء" افراد کے باہمی تعلقات پر ہونی چاہیے۔ لیکن ہم اپنی علمی ضرورتوں کی وجہ سے اس کو افراد کے تعلقات سے نہیں ملاتے بلکہ ذرا اور بعد کے زمانے سے شروع کرتے ہیں۔ افراد کے بعد کنبوں اور خاندانوں کا زمانہ آتا ہے۔ ایک کنبے یا ایک خاندان کے تعلقات دوسرے کنبے یا خاندان سے ہوں' یہ بھی ایک معنی میں انٹرنیشنل چیز بن جاتی ہے۔ جب کہ ہر کنبہ اپنی جگہ خود مختار ہو اور دوسرا کنبہ بھی مساوی خود مختاری کا حامل ہو تو ان کے کچھ باہمی تعلقات ہوتے ہیں۔ جن کے لیے قاعدوں کی ضرورت ہو گی۔ لیکن اسے بھی ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی حیثیت اتنی اہم نہیں ہے کہ اس علم کے شایان شان ہو۔ اس کے بعد قبیلوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ ایک قبیلے میں بہت سے خاندان ہوتے ہیں اور ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ قبیلے خود مختار رہے ہیں۔ مثلاً اسلام سے پہلے عرب میں ہر قبیلہ اتنا ہی خود مختار ہوتا تھا جتنی آج کل کی بڑی سلطنتیں ہیں۔ وہ نہ صرف حالت امن کے تعلقات میں بلکہ حالت جنگ میں بھی خود مختاری رکھتا تھا۔ ہر قبیلے کا سردار دوسرے قبیلے کے خلاف اعلان جنگ کر سکتا تھا' صلح کر سکتا تھا' معاہدے کر سکتا تھا۔ غرض وہ تمام کام سرانجام دے سکتا تھا جن کو اب ایک سلطنت یا ایک مملکت اپنی امتیازی شان سمجھتی ہے۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے اہل علم قبائلی دور کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کا آغاز مملکت سے کرتے ہیں' چاہے وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔

۱۴۰۔ مملکت سب سے پہلے ایک شہر (City State) کی صورت میں وجود میں آئی ہے۔ غالباً فرنگی مصنفین اس کو سٹی اسٹیٹ سے اس لیے شروع کرتے ہیں کہ ایک زمانے میں یونان میں شہری مملکتیں پائی جاتی تھی۔ ان میں آپس میں جنگیں بھی ہوتی تھیں' پر امن تعلقات بھی رہا کرتے تھے۔ بہر حال جو بھی ہو اگرچہ اسلام سے بہت پہلے یونان میں سٹی اسٹیٹ کا وجود تھا لیکن یہ صرف یونان سے مخصوص چیز نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر حصے میں ہمیں نظر آتی ہے' حتیٰ کہ عرب میں بھی قبل از اسلام سٹی اسٹیٹ کا وجود نظر آتا ہے۔ عرب میں قبیلے بھی تھے اور شہر بھی تھے۔ قبیلہ اور شہر کا یہ فرق گویا اسلام کے انٹرنیشنل لا کا ایک پیشرو تھا۔ وہاں قبیلے خانہ بدوش آبادیوں پر مشتمل تھے۔ ان کے پاس کوئی ایسی بستی نہیں ہوتی تھی جہاں وہ سال کے بارہ مہینے رہیں۔ اس کے برخلاف شہر تھے جہاں کے رہنے والے خانہ بدوشی کی زندگی نہیں گزارتے تھے۔ اس طرح عرب

میں ہم کو بیک وقت شہری مملکتیں بھی ملتی ہیں اور قبیلے بھی ملتے ہیں۔ غالباً یونان بھی ایک زمانے میں ایسا رہا ہو گا لیکن جس زمانے کے حالات سے مغربی مصنفین بحث کرتے ہیں۔ اس زمانے میں وہاں شہری مملکتیں تھیں، یعنی لوگ بستیوں میں آباد تھے۔ بہر حال زیر بحث علم کا آغاز اس دور سے ہوتا ہے جب انسان فرد سے گزر کر، کنبے اور خاندان سے گزر کر قبیلے سے بھی گزر کر اس سے وسیع تر یونٹ یعنی شہری مملکتوں میں بسنے لگا تھا۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر صرف فرد کا معاملہ فرد کے ساتھ ہو تو وہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم اس علم کی تاریخ میں دو رجحانات دیکھیں گے۔ ایک تو یہ ہے کہ تنہا فرد چونکہ کمزور ہوتا ہے اس لیے وہ کسی فرد سے مل کر اپنے آپ کو ایک حد تک اپنے دشمن کے مقابلے میں محفوظ بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ مرد اور عورت دو مل کر ایک کنبہ بناتے ہیں تاکہ اپنے فرائض منصبی کی تکمیل کریں اور تنہا ہونے کی بجائے دو آدمی ہوں تو اپنے کسی بھی دشمن، خواہ وہ فطرت کے مظاہر ہوں، یا اپنے ہم جنس انسان ہوں یا کوئی جانور، ان سب کے مقابلے کی ان میں قوت آتی ہے۔ اس کے بعد جب افراد کو بھی محسوس ہوا کہ ہم دو آدمیوں کو دوسرے دو آدمی شکست دے سکتے ہیں جو ہم سے زیادہ طاقتور ہیں، تو انھوں نے سوچا کہ بہتر ہو کہ ہم بجائے زوجین کے (یعنی مرد اور عورت) کے بڑے کنبے میں رہیں تاکہ دوسرے دو افراد سے آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ جس سے کنبہ وجود میں آیا۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ کنبے بھی بہت کمزور ہیں اور ایک کنبے کا مقابلہ دوسرے کنبے سے ہو تو بعض اوقات مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں تو کنبے سے وسیع تر دائرے یعنی قبیلے میں رہنا پسند کیا گیا۔ اجتماعیت (یا اپنی تعداد کو بڑھانے) کا یہ رجحان، انٹرنیشنل لا اور انسانی فطرت کا ایک بنیادی پہلو ہے۔ اس لیے کنبوں سے گزر کر قبیلوں میں اور قبیلوں سے بھی گزر کر شہری مملکتوں میں انسان بسنے لگا۔ کیونکہ ایک شہر میں کئی قبیلے رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ کسی تنہا قبیلے کے مقابلے میں اپنے آپ کو محفوظ بھی پاتا تھا اور شہر کے اطراف مثلاً فصیل وغیرہ بنا کر اپنی حفاظت کا انتظام کرتا اور زیادہ اطمینان کے ساتھ زندگی گزارتا تھا۔

۱۴۱۔ قدیم یونان کی تاریخ میں شہری مملکتوں کے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی تھی جس کی بنا پر میں اس کو انٹرنیشنل لا قرار دینے کے لیے آمادہ نہیں۔ یونان کے باشندے سب ایک ہی نسل کے تھے، سب ایک ہی زبان بولتے تھے، ایک ہی مذہب رکھتے تھے لیکن الگ الگ شہروں میں رہتے اور ہر شہر اپنی جگہ مطلق آزاد و خود مختار ہوتا۔ آپس میں لڑائیاں اور جنگیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن

مغربی مصنفین کے بیان کے مطابق یونان کی شہری ریاستوں میں اگر کچھ معین قواعد تھے تو صرف اپنے ہم نسل یونانیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق تھے۔ ایک یونانی شہر جو خود مختار مملکت کی صورت رکھتا' دوسرے یونانی شہر کے ساتھ تعلقات میں چند معین قواعد پر عمل کرتا مگر باقی ساری دنیا کے متعلق اپنی اپنی صوابدید کے سوا کوئی معین ضابطہ یا قاعدہ نہیں تھا۔ کبھی کچھ برتاؤ ہوتا اور کبھی کچھ' کوئی اس سے باز پرس کا حق نہیں رکھتا تھا۔ یونانی قانون بین الممالک میں خامی یہ تھی کہ وہ صرف ایک محدود تعداد کے انسانوں سے متعلق تھا باقی ساری دنیا کو وحشی قرار دے کر یونانی اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے ساتھ کسی معینہ قاعدے پر عمل کریں۔ یہ معینہ قاعدے جو ہم وطن اور ہم نسل لوگوں سے متعلق تھے' وہ بھی آج ہمیں وحشت کے حامل نظر آتے ہیں لیکن بہرحال وہ معینہ قاعدے تھے۔ اس بنا پر ہم اس کو ایک اساس کے طور پر قبول کرتے ہیں کہ انٹرنیشنل لا کے آغاز میں قدیم ترین مثالیں ہم کو یونان میں ملتی ہیں' جہاں خود مختار شہری مملکتیں حالت امن و جنگ میں چند معینہ قواعد پر عمل کرتی تھیں۔ لیکن وہ صحیح معنوں میں انٹرنیشنل نہ تھا۔

۱۴۔ اس کے بعد فرنگی مصنفین کے نزدیک انٹرنیشنل لا کے ضمن میں رومی دور قابل ذکر ہے اس دور میں شہری مملکتیں باقی نہیں رہی تھیں لیکن شہر روما جو ابتداء" ایک خود مختار شہر تھا' ایک بڑی وسیع سلطنت کے پایہ تخت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جو یورپ کے علاوہ شمالی افریقہ اور ایشیا تک کے کچھ علاقوں پر مشتمل تھی۔ اس دور میں جنگ بھی ہوتی رہی اور پر امن تعلقات بھی ہوتے رہے لیکن میں اس دور کو بھی قانون بین الممالک کے لیے موزوں نہیں سمجھتا اس کی وجہ یہ ہے کہ فرنگی مصنفوں کے بیان کے مطابق' رومی سلطنت اگر جنگ یا امن کے زمانے میں معین قواعد پر عمل کرتی تو ساری دنیا کے ساتھ نہیں بلکہ صرف ان سلطنتوں کے ساتھ جن سے اس کے معاہدے رہے ہوں۔ مثلاً ایک سلطنت سے اس کے تعلقات پیدا ہوئے' دوستانہ معاہدہ ہوا اور پھر بعد میں کسی وجہ سے جنگ چھڑی تو وہ اس قابل سمجھی جاتی تھی کہ اس کے ساتھ معینہ قواعد پر عمل کیا جائے۔ باقی دنیا کے لیے کوئی قاعدہ نہیں تھا' صرف ذاتی صوابدید پر عمل ہوتا تھا۔ ایک مثال سے شاید آپ پر واضح ہو سکے کہ حقیقت کیا تھی۔ ابتدائی زمانے میں جنگ سے پہلے اعلان جنگ کی ضرورت سمجھی جاتی تھی اور اعلان جنگ کا طریقہ یہ تھا کہ فوج روانہ ہوتی' دشمن کی سرحد تک پہنچتی تو ایک پادری یا مذہبی رہنما' ایک نیزہ دشمن کی سرزمین میں گاڑتا اور یہی اعلان جنگ سمجھا جاتا تھا' اس کے بعد جنگ شروع ہو سکتی۔ بعد کے زمانے میں جب رومی سلطنت بہت وسیع

ہو گئی تو دشمن کی سرحد تک پہنچنے میں ہفتوں لگ جاتے تھے۔ ایسے میں ان پادریوں کو شہر روما سے وہاں تک جانے میں زحمت محسوس ہونے لگی۔ اس کا انھوں نے ایک حل سوچ لیا اور وہ یہ کہ شہر روما کے سرکاری خزانے میں مختلف ملکوں کی مٹی تھیلوں میں بھر کر رکھ لی گئی ۔ جب اعلان جنگ کی ضرورت ہوتی تو اس خاص ملک کا تھیلا نکالا جاتا اور پادری صاحب اس تھیلے میں نہایت ہی متانت کے ساتھ اپنا نیزہ گاڑ دیتے۔ اس طرح کی عجیب و غریب باتیں انسانی تاریخ میں ملتی ہیں۔ لیکن اس موضوع کے سلسلے میں صرف یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہم رومی عہد کو بھی انٹرنیشنل لا کے لیے موزوں قرار نہیں دیتے۔ ان کا قانون اگرچہ جنگ و امن کے متعلق ہی تھا لیکن وہ اسے ساری دنیا کے لیے یکساں نہیں برتتے تھے۔ انٹرنیشنل لا کے مشہور انگریز مورخ' اوپن ہائم نے اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ "رومن دور میں غیر ممالک کے ذکر یا ان کے معاملات پر بحث کی' نہ تو ضرورت ہے اور نہ گنجائش ہے۔" ان کی یہ رائے رومیوں کے اس دعویٰ پر مبنی ہے کہ دنیا رومیوں کا کرہ' اور رومیوں کی ملکیت ہے۔ کوئی اپنے گھر کے اندر قانون بین الممالک کا استعمال نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں' کہ رومی دور (Period) میں رومی سلطنت اور اس سے تعلقات رکھنے والے ملکوں کے باہر اجنبی ممالک سے تعلقات میں انٹرنیشنل لا کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

۱۴۳۔ اس کے بعد یکایک ایک ہزار سال کی جست لگا کر یورپی مورخ بیان کرتے ہیں کہ انٹرنیشنل لا چودھویں پندرھویں صدی عیسوی میں شروع ہوتا ہے۔ اس دوران میں جو اسلامی دور گزرا ہے اس کا کوئی ذکر وہاں نہیں ملتا۔ بہرحال جسے مغربی مصنفین ماڈرن انٹرنیشنل لا کہتے ہیں' میں اس کو بھی انٹرنیشنل لا کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۶ء تک معینہ قاعدوں پر یورپ میں صرف عیسائی سلطنتوں کے آپس کے تعلقات کے ضمن میں عمل کیا جاتا رہا۔ غیر عیسائی سلطنتوں کے لیے ان معینہ قواعد پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ۱۸۵۶ء میں پہلی مرتبہ مجبوراً" یورپی عیسائی سلطنتوں نے اعتراف کیا کہ اس قاعدے کا اطلاق ایک غیر عیسائی سلطنت یعنی ترکی کے ساتھ بھی ہوگا' اس کے بعد تقریباً ساٹھ ستر سال کا وقفہ پڑا اور دوسری سلطنت جس کو یورپی حکومتوں نے انٹرنیشنل لا کے قواعد کا اہل سمجھا وہ جاپان تھا' جب اس نے ۱۹۰۵ء کی جنگ میں روس کو شکست دی۔ اس کے بعد پہلی جنگ عظیم شروع ہوتی ہے۔ اس وقت کچھ اور سلطنتوں کو بھی اس کا اہل سمجھا گیا۔ اس سلسلے میں کچھ شرطیں رکھی گئیں' جن کو پورا

کرنے کے بعد کسی سلطنت کو لیگ آف نیشنز کا رکن بنایا جاتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنز کی بجائے "مجلس اقوام متحدہ" کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں بھی ہر ملک کو اپنی ذاتی حیثیت سے رکن نہیں بنایا جاتا جب تک کہ کم سے کم دو ایسی سلطنتیں جو پہلے سے مجلس اقوام متحدہ کی ممبر ہوں، سفارش نہ کریں اور یہ اطمینان نہ دلائیں کہ یہ واقعی ایک متمدن ملک ہے، انٹرنیشنل لا پر عمل کرتا ہے اور اس کا مستحق ہے کہ اس کے ساتھ انٹرنیشنل لا کے مطابق عمل کیا جائے۔

۱۴۴۔ ان حالات میں، میں اپنے اس ابتدائی بیان کو دھراتا ہوں کہ اگر انٹرنیشنل لا چند مخصوص قوموں کے لیے نہیں بلکہ اس کا اطلاق دنیا کے تمام ملکوں پر یکساں ہونا چاہیے، تو اس قانون کا آغاز مسلمانوں سے ہوا اور شاید اب بھی مسلمانوں ہی کے ہاں وہ قانون ہے، کسی دوسرے کے پاس تاحال نہیں آیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس وقت مجلس اقوام متحدہ کا خود بخود یا بہ استحقاق خود ممبر بننا کسی سلطنت کے لیے ممکن نہیں ہے، جب تک دو ممبر سلطنتیں اس کی سفارش نہ کریں اور اس کی ذمہ داری نہ لیں کہ یہ واقعی ایک متمدن سلطنت ہے۔ اس کے برعکس اسلامی قانون میں اس فرق و امتیاز کی گنجائش نہیں کہ کوئی ملک مسلمانوں کے معیار کے قواعد پر عمل کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ ہم دیکھیں گے کہ اگر کوئی دشمن ہمارے ساتھ غیر انسانی برتاؤ بھی کرے، تب بھی ہم اس کے ساتھ اپنے قواعد کے مطابق انسانیت کا برتاؤ کریں گے۔ ان حالات میں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ قانون بین الممالک، جو حقیقت میں بین الممالک بھی ہو اور قانون بھی ہو، مسلمانوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا آغاز کس طرح ہوا؟ اور چیزوں کی طرح یہ بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر مبنی ہے، کیونکہ جب مکہ معظمہ میں اسلام شروع ہوا تو ابتداء میں بہت سی علمی دشواریاں تھیں کیونکہ مسلمانوں کے پاس کوئی علیحدہ مملکت نہیں تھی۔ وہ ایک دشمن شہر یعنی مکہ ہی میں رہتے تھے اور ہم اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ وہ مملکت کے اندر ایک مملکت (State within a State) کی حیثیت رکھتی تھی۔ یعنی مسلمانوں کی آبادی شہر مکہ میں تو تھی، لیکن شہر مکہ کے پرانے نظام کے تحت نہیں تھی۔ شہر مکہ کا جو پرانا حاکم تھا اس کی وہ اطاعت نہیں کرتے تھے اور شہر مکہ کے جو قوانین تھے ان کی بھی وہ اطاعت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنے سردار، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے۔ ان کا اپنا علیحدہ قانون تھا، اپنی علیحدہ تنظیم تھی۔ میں یہ بھی کہتا چلوں کہ اسلام کے آغاز پر شہر مکہ واقعی ایک

شہری مملکت کی حیثیت رکھتا تھا۔ قریش میں کچھ آزاد قبیلے تھے جو خانہ بدوش لوگوں پر مشتمل تھے اور قریش ہی میں کچھ اور قبیلے تھے جو شہر مکہ میں بس گئے تھے۔ ایسے شہروں کے حالات پر اب تک کم کام کیا گیا ہے' البتہ طائف اور مکہ کے متعلق بعض چیزیں تحریر ہوئی ہیں لیکن اور بھی شہر تھے۔ مثلاً شہر مدینہ کے حالات پر قانونی نقطہ نظر سے میری نظر سے آج تک کوئی چیز نہیں گزری۔ اس کے متعلق بہت کم ایسی چیزیں ملتی ہیں جن کا تعلق اسلام سے پہلے کے ادوار سے ہو۔

۱۴۵۔ شہر مکہ میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو مسلمانوں کی حیثیت ایک مملکت در مملکت کی تھی لیکن جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں چند ہی ہفتوں کے اندر مسلمانوں نے ایک مملکت قائم کر دی جس کا دستور بھی ہم تک پہنچا ہے اور یہ ایک مثال ہے اس امر کی کہ مملکت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ پرانی سلطنتوں سے متعلق ہمیں بالکل معلوم نہیں کہ وہاں مملکت کس طرح قائم ہوئی۔ شہر مدینہ کے متعلق ہمیں معینہ طور پر تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو دیکھا کہ اس شہر میں کئی قبیلے رہتے ہیں جن میں تقریباً ۱۲۰ سال سے آپس میں لڑائی بھڑائی کا سلسلہ جاری ہے اور وہاں کوئی مرکزیت' تنظیم یا حکومت بالکل نہیں پائی جاتی۔ ایسے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز پیش کی کہ دفاعی و عدالتی اغراض کے لیے اہل مدینہ اپنے آپ کو منظم کر لیں اور اپنے لیے سردار منتخب کر لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تجویز کو مقامی باشندوں اور قبیلوں نے قبول کیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سردار کیوں بنا لیا گیا جب کہ مسلمان وہاں اکثریت میں نہیں تھے اور وہاں مسلمان بھی دو طرح کے تھے : مدنی مسلمان یعنی انصار اور مکی مسلمان یعنی مہاجر۔ ساتھ ہی ساتھ مدینہ کے مشرک بھی تھے' جنھوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ یہودی بھی تھے اور کچھ عیسائی بھی وہاں پائے جاتے تھے۔ اس تنوع اور باہمی اختلاف کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کا سردار منتخب کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ شہر مدینہ کے قبیلوں میں آپس میں سخت لڑائی جھگڑے تھے' اس لیے یہ عملاً ناممکن تھا کہ ان قبیلوں میں آپس میں سے کسی ایک قبیلے کے کسی شخص کو سردار منتخب کیا جائے تو دوسرے قبیلوں کے لوگ اسے قبول کریں۔ ب کو کیا جائے تو الف قبول نہیں کرتا' الف کو کیا جائے تو ج قبول نہیں کرتا۔ ان حالات میں انھیں مناسب یہ معلوم ہوا کسی اجنبی کو سردار بنا لیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سردار منتخب کر لیا گیا اور سردار اور رعیت کے حقوق و فرائض دونوں تفصیل کے ساتھ ایک دستاویز

میں لکھے گئے۔ یہی دستاویز ہے جسے ہم شہری مملکت مدینہ کا دستور کہہ سکتے ہیں۔ وہ دستور جو ہم تک پہنچا ہے' اس میں اندرونی انتظامات کے متعلق کافی تفصیل سے احکام دیے گئے ہیں اور مذہبی آزادی کا بھی اس میں صراحت سے ذکر ہے۔ دفاع کے انتظامات اور جنگ و صلح کے قواعد بھی اس میں درج ہیں۔ بہر حال جب یہ مملکت قائم ہو گئی تو بہت جلد مسلمانوں کو جنگوں سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ ۲ ہجری میں میدان بدر میں مکہ والوں کا' یعنی شہری مملکت مکہ کا' اس شہری مملکت مدینہ کے مسلمانوں سے مقابلہ ہوا۔ انٹرنیشنل لا میں چونکہ عموماً" دو ہی چیزوں سے بحث ہوتی ہے: حالت جنگ اور حالت امن میں غیروں کے ساتھ ہمارے تعلقات۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حالت امن کے صرف چند مہینے ملے اور اس کے بعد یہ جنگ پیش آئی۔ انٹرنیشنل لا کا دوسرا جز یعنی حالت جنگ کے قوانین کیا ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ہمیں اس کی نظیریں ملنے لگتی ہیں۔ یعنی اعلان جنگ کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ جنگ میں صرف بالغ مردوں کو قتل کیا جائے جو ہتھیار اٹھا کر حملہ کر سکتے ہیں یا دشمن کے ہر فرد کو' بچے کو بھی بیمار کو بھی' عورت کو بھی' غلام کو بھی قتل کر سکتے ہیں؟ صرف میدان جنگ میں قتل کیا جائے یا میدان جنگ کے باہر بھی اسے قتل کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح اگر مثلاً دشمن کے آدمیوں کو ہم جنگ میں گرفتار کر لیں تو ان جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ کیا انھیں قتل کر دیا جائے؟ یا انھیں مفت رہا کر دیا جائے؟ انھیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے یا انھیں تبادلہ اسیران کے طور پر یعنی ہمارا جو قیدی ان کے پاس ہے اس کے معاوضے میں دشمن کا قیدی جو ہمارے پاس ہے رہا کریں وغیرہ۔ اس طرح کی بیسیوں تفصیلیں جو قانون جنگ سے متعلق ہیں۔ اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل مسلمانوں کے لیے نظیر بنتا گیا' کبھی تو قولی حدیث کے ذریعے سے اور کبھی فعلی حدیث کے ذریعے سے۔ بہر حال دونوں طریقوں سے اسلامی قانون بنتا گیا اور انٹرنیشنل لا کا اسلامی تصور وجود میں آیا۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں اس کا کوئی امتیاز نہیں تھا کہ غیر مسلم اجنبی کس مذہب کا ہے' یہودی ہے' بت پرست ہے' لا مذہب ہے' اس کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا تھا' سب کے ساتھ معینہ قواعد برتے جاتے تھے۔ مثلاً اعلان جنگ کی ضرورت ہے تو یہ اعلان جنگ اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا تھا جس کا کوئی مذہب ہے' اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا تو جو بت پرست ہے' اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا جو کسی چیز کی قائل نہیں ہے وغیرہ۔

۱۴۶۔ غرض اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سالہ مدنی زندگی اسلامی انٹرنیشنل لا

کے اکثر قواعد کو معین و مدون کرنے کا باعث بنی۔ چنانچہ جب اس موضوع پر کتابیں لکھی جانے لگیں تو مسلمان مصنف حسب معمول پہلے قرآن کی طرف دیکھتے' اور قرآنی آیات کا ذکر کرتے' ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو بحث میں لاتے۔ کہ فلاں موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں کہا یا کیا تھا' لہٰذا وہ اسلامی قانون ہے۔ یہ اسلامی انٹرنیشنل لا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے دور سے تعلق رکھتا تھا۔ مکی زندگی کی طرف ہم کم ہی رجوع کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ مملکت در مملکت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زمانے میں جنگ بھی نہیں ہوئی۔ چاہے مسلمانوں کو اذیت دہی کے سلسلے میں قتل کیا جاتا رہا ہو' لیکن جنگ نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں فقہ کی ترقی ہوئی جس کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ جب مسلمان علماء فقہ پر کتابیں لکھنے لگے تو ان کا تصور مغربی تصور کے مقابلے میں بہت وسیع رہا۔ کسی بھی مغربی قانونی کتاب کو آپ اٹھا کر دیکھیں' ان میں عبادات کا ذکر نہیں ہوتا۔ مسلمانوں نے اپنے قانون کو زیادہ جامع بنانے کے لیے پہلے ہی دن سے اس کو دین و دنیا دونوں کا حامل بنایا اور اس میں صلوٰۃ' روزہ' حج' زکوٰۃ جیسی عبادتوں کا بھی ذکر کیا' تجارتی معاملات اور وراثت کا ذکر بھی کیا اور اس میں انٹرنیشنل لا کا بھی ذکر کیا' ایک لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان فقہاء کا تصور یہ رہا کہ انٹرنیشنل لا کوئی انٹرنیشنل چیز نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی چیز ہے۔ ہماری چیز اس معنی میں کہ اجنبی ممالک سے' حالت امن یا حالت جنگ میں جس قاعدے پر ہم عمل کریں' وہی ہمارا انٹرنیشنل لا ہے۔ یہ نہیں کہ اس کو اوروں کے مشورے اور رضامندی سے مدون کیا جائے اور پھر اس پر عمل کیا جائے بلکہ ان کے نزدیک اسلامی انٹرنیشنل لا اسلامی انٹرنل لا کا ایک جزو تھا۔ اسی لیے جب مسلمان فقہاء مجموعہ قوانین مدون کرنے لگے تو انھوں نے اس میں عبادات' معاملات' رواج اور وراثت وغیرہ کے ساتھ ساتھ انٹرنیشنل لا کا ذکر بھی ضروری سمجھا۔ اس کو بظاہر انھوں نے "سیر" کا نام دیا۔ میں بظاہر کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں۔ کیونکہ اس وقت ہمارے پاس جو قدیم ترین فقہ کی کتاب ہے۔ وہ امام زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب "المجموع فی الفقہ" ہے۔ امام زید' زیدیہ فرقہ کے بانی اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے' اور امام زین العابدینؒ کے بیٹے تھے' زید بن علی زین العابدین بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے "المجموع فی الفقہ" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے۔ اس میں ایک باب انٹرنیشنل لا سے متعلق ہے جس کو "کتاب السیر" کا نام دیا گیا ہے۔ "سیر" جمع ہے لفظ "سیرت" کی۔ مشہور حنفی امام سرخسی نے اپنی "کتاب المبسوط" میں لکھا ہے کہ سیرت سے مراد

حکمران کا وہ طرز عمل ہوتا ہے جو اجنبیوں سے حالت جنگ اور حالت امن میں ملحوظ رکھا جائے اور اس میں وہ اضافہ کرتے ہیں کہ غیر مملکت کے لوگ ہی نہیں ہمارے مملکت کے اندر کے باشندوں میں سے بھی کم از کم دو کے متعلق اس کا اطلاق ہو گا۔ ایک تو مرتدوں کے متعلق اور دوسرے باغیوں کے متعلق۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انٹرنیشنل لاء کا اسلامی تصور' اس تصور کے مقابلے میں جو آج کل مغرب میں پایا جاتا ہے' زیادہ وسیع ہے۔ بہرحال امام زید بن علی نے پہلی مرتبہ "سیر" کی اصطلاح انٹرنیشنل لا کے معنی میں استعمال کی اور اس وقت سے لے کر آج تک اس سے اختلاف نہیں کیا گیا۔ ہر مولف حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی' شیعی وغیرہ سبھی یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ایک واحد استثناء اور وہ بھی نامکمل استثناء اس فرقے سے متعلق ہے جسے ہم خوارج کا نام دیتے ہیں' اس مذہب کی فقہ کی کتاب میں' جو بڑی مشکل سے میں نے حاصل کی' اس میں اس باب کا عنوان بجائے "کتاب السیر" کے "کتاب الدماء" یعنی خونوں کا قانون رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں جنگ اور خون ریزی سے بحث ہوتی ہے۔ میں نے اس کی مزید تحقیق کی تو تاریخ سے معلوم ہوا کہ جو کتاب میرے پاس ہے وہ ایک ہم عصر مؤلف کی کتاب ہے جس کا حال میں انتقال ہوا اس میں اپنی کتاب کی معلومات' خصوصاً اس کتاب الدماء یعنی انٹرنیشنل لاء کے باب کے متعلق پانچویں صدی ہجری کے ایک مؤلف کی کتاب سے اخذ کی گئی ہیں اور وہ پرانا مؤلف اس کو "سیر الدماء" کا نام دیتا ہے۔ وہی "سیر" کا لفظ جو ہم استعمال کرتے ہیں وہ اس کو "دماء" یعنی خون کے ساتھ ملاتا ہے۔ "سیر الدماء" یعنی خونوں کے متعلق طرز عمل۔ لیکن حالیہ مولف نے "سیر" کے لفظ کو بوجھل پایا اور اسے حذف کر کے "کتاب الدماء" نام رکھا۔ الغرض' انٹرنیشنل لا کے متعلق قدیم ترین کتاب جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے' وہ امام زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کی ہے۔ جن کی وفات ۱۲۰ ہجری میں ہوئی۔ ایک معنی میں وہ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد سمجھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے اموی سلطنت کے خلاف بغاوت کی لیکن ان کے ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آخر کار وہ گرفتار ہوئے اور انھیں ۱۲۰ھ میں قتل کر دیا گیا۔ امام ابو حنیفہ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی' ۱۲۰ھ اور ۱۵۰ھ کے مابین انھوں نے ایک مستقل کتاب لکھی' جس کا نام "کتاب السیر" تھا۔ اس کی تاریخ دلچسپ ہے۔ امام ابوحنیفہ وہ فقیہ ہیں جنھوں نے فتویٰ دیا کہ اگر ساری تدبیریں اور کوششیں ناکام ہو جائیں تو اسلامی سلطنت کے مسلمان حکمران کے خلاف بھی تلوار لے کر بغاوت کی جا سکتی ہے۔ دوسرے فقہاء اس طرح فتویٰ دینے سے جھجکتے تھے بلکہ امام ابوحنیفہ نے یہ فتویٰ

دیا تو انھوں نے اس کی تردید کے لیے کتابیں لکھیں۔ بہرحال امام ابو حنیفہ کا فتویٰ اس حدیث پر مبنی ہے: من رأیٰ منکم منکرا" فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان۔ یعنی اگر کوئی کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اسے بزور بدل دے اور اس کی اصلاح کرے۔ اگر بزور بدلنے کا اس کے لیے امکان نہ ہو تو کم از کم زبان سے، یعنی سمجھا بجھا کر، اسے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اس کا بھی امکان نہیں ہے تو کم از کم دل ہی میں اس کو برا سمجھے۔ اگر کوئی شخص برائی کو دیکھ کر دل میں بھی اس کو برا نہیں سمجھتا تو وہ اچھا مسلمان نہیں۔ کم از کم دل میں برا سمجھنا یہ اضعف الایمان یا ضعیف ترین ایمان ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا استدلال تھا۔ دوسرے امام جو اس کے خلاف رائے رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ بغاوت نہیں کی جانی چاہیے، ان کا استدلال ایک دوسری حدیث تھی۔ وہ حدیث یہ تھی کہ اگر حکمران تمھارے ساتھ عدل کرتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرو اور اگر تم پر ظلم کرتا ہے تو صبر کرو۔ تو ایک ہی معنی میں دو حدیثیں ملتی ہیں جن میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ سیاق و سباق جدا جدا ہے۔ امام ابوحنیفہ بھی یہ نہیں کہتے کہ ہر وقت، ہر چھوٹی بات پر، حکومت سے بغاوت کرو بلکہ وہ شرط لگاتے ہیں کہ پر امن وسائل کی ساری کوششیں رائیگاں ہو جائیں تو اس وقت جائز ہے کہ حکمران کے خلاف ہتھیار اٹھائے جائیں۔ بہرحال جس موضوع سے میں بحث کر رہا ہوں اس میں یعنی انٹرنیشنل لا کی تاریخ میں اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ جب امام ابوحنیفہ نے وہ کتاب لکھی تو فوراً ایک معاصر فقیہ امام اوزاعی نے اس کی تردید میں ایک رسالہ لکھا۔ بدقسمتی سے اس وقت ہمارے پاس نہ امام ابوحنیفہ کی کتاب موجود ہے اور نہ امام اوزاعی کا رسالہ، بجز ان اقتباسات کے جو امام شافعی نے اپنی "کتاب الام" میں جمع کیے ہیں۔ اس سے نظر آتا ہے کہ کن چیزوں کے متعلق امام ابوحنفیہ کی رائے سے امام اوزاعی نے اختلاف کیا تھا جب امام اوزاعی نے، جو دمشق کے فقیہ تھے، امام ابوحنیفہ جو کوفہ یعنی عراق کے فقیہ تھے، کی کتاب پر ایک رسالہ لکھا تو امام ابوحنیفہ نے مناسب نہیں سمجھا کہ خود اس کا جواب دیں۔ ان کے ایک شاگرد امام ابو یوسف نے اس کا جواب لکھا۔ یہ کتاب بھی ہمارے پاس محفوظ نہیں، لیکن امام شافعی کی "کتاب الام" میں جو اقتباسات ہیں، ان میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔ چنانچہ ان اقتباسات کی مدد سے ایک کتاب مرتب کی گئی جو حیدر آباد دکن میں "مجلس دائرۃ المعارف" کے اہتمام سے شائع ہو گئی ہے۔ اس کتاب سے امام ابو حنیفہ، امام اوزاعی، امام ابو یوسف اور آخر میں خود امام شافعی کے نقطہ نظر اور ان کے اعتراضات و جوابات

کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح امام شافعی کی مذکورہ تصنیف کی بدولت ان نایاب کتابوں کا ایک بڑا نادر ذخیرہ ہمارے پاس محفوظ ہو گیا ہے اگرچہ وہ کتابیں کامل طور پر ہم تک نہیں پہنچیں۔ اس سلسلے میں ابن حجر نے اپنی کتاب "توالی التاسیس" میں جو امام شافعی کی سوانح عمری ہے' ایک جگہ لکھا ہے کہ "سیر" پر سب سے پہلے امام ابوحنیفہ نے ایک کتاب لکھی' جس کا جواب امام اوزاعی نے دیا اور اس کا جواب الجواب امام ابو یوسف نے لکھا' پھر ان پر تبصرہ امام شافعی نے اپنی "کتاب الام" میں کیا ہے۔ انٹرنیشنل لا سے متعلق تالیفوں کے آغاز کی یہ سرگزشت تھی۔

۱۴۷۔ اگرچہ انٹرنیشنل لا کا ذکر سب سے پہلے زید بن علی کی "کتاب المجموع" میں آیا ہے' لیکن اس کتاب کا صرف ایک باب اس موضوع سے متعلق ہے۔ جیسا کہ ابن حجر نے بیان کیا۔ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب سب سے پہلے امام ابوحنیفہ نے تصنیف کی اور یقیناً وہ اپنے معمول کے مطابق اپنے شاگردوں کو اس موضوع پر درس بھی دیتے رہے ہوں گے۔ امام ابوحنیفہ کے درس کا طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ اپنے خیالات بیان کرتے' پھر اپنے شاگردوں سے بحث بھی کرتے اور پوچھتے کہ تمھاری کیا رائے ہے؟ اس بحث کی وجہ سے مختلف پہلو واضح تر ہو جاتے تھے۔ امام ابو حنیفہ کے لیکچروں کے اقتباسات کی مدد سے ایک وسیع تر اور جامع کتاب لکھی جا سکتی تھی' اور غالباً ایسا ہوا ہو گا۔ امام ابو حنیفہ کی کتاب ہم تک نہیں پہنچی ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ بیس پچیس صفحوں کا رسالہ ہو گا۔ لیکن ان کے شاگردوں میں سے امام محمد شیبانی' امام زفر اور امام ابراہیم الفزاری کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں۔ کم از کم دو کی یعنی امام شیبانی اور امام فزاری کی کتابیں سینکڑوں صفحوں پر مشتمل ہیں۔ میرا خیال ہے' ممکن ہے صحیح نہ ہو' کہ جب امام ابوحنیفہ اپنی کتاب کا درس دیتے رہے تو اس درس کی یاد داشتیں کتابی صورت میں مدون ہوئیں جو بعد میں شاگردوں کی طرف منسوب ہو گئے۔ ان میں امام الفزاری کی کتاب ایک مخطوطے کی صورت میں مراکش میں موجود ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اس کو پڑھنے کی کوشش کی' لیکن چونکہ یہ کوفی خط میں ہے اس لیے بڑی مشکل سے صرف چند صفحے پڑھے اس کے بعد اسے التواء میں ڈال دیا۔ اب تک اس کے فوٹو میرے پاس پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی اشاعت کی نوبت ہی نہیں آئی۔

۱۴۸۔ امام محمد شیبانی نے جو امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سے تھے' اس موضوع پر دو کتابیں لکھیں' کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے انھوں نے السیر الصغیر لکھی تو امام اوزاعی نے طنزاً" کہا کہ عراق والوں کو اس موضوع پر لکھنے کی جرات کیسے ہوئی جب کہ وہ علم

حدیث سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ اس پر امام محمد شیبانی نے کتاب السیر الکبیر کے نام سے ایک جامع تر کتاب لکھی اور اس کا ایک ایڈیشن تیار کیا جو اتنا بڑا تھا کہ اسے جب خلیفہ ہارون الرشید کے پاس تحفہ دینے کے لیے لے جایا گیا تو گاڑی میں ڈال کر لے جانا پڑا۔ بہرحال کتاب السیر الکبیر ہمارے پاس پہنچی ہے' ایک شرح کی صورت میں۔ اس کو شرح سے الگ کرکے ہم دوبارہ مرتب کرسکتے ہیں لیکن شرح بھی بہت اچھی ہے۔ امام سرخسی نے جو پانچویں صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ گزرے ہیں' اس کتاب کی شرح لکھی ہے۔ امام سرخسی کی تالیف "شرح السیر الکبیر" کے بارے میں ایک بڑی عبرت ناک بات آپ سے عرض کرتا چلوں۔ امام سرخسی ایک بہت ہی ذہین' حق گو اور بے باک فقیہ تھے۔ ان کے بارے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ ان کو قید کر دیا گیا تھا۔ میرے استاد محترم' مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی رائے یہ تھی کہ غالباً امام سرخسیؒ کو ایک فتویٰ کی بنا پر قید کی سزا دی گئی تھی۔ ان کے زمانے میں جو قرہ خانی حکمران تھے' انھوں نے بہت سے ظالمانہ ٹیکس لگا دیے تھے۔ حکومت کی آمدنی حکمران کی فضول خرچی کے لیے کافی نہیں ہوتی تھی تو روز بروز نئے ٹیکس لگائے جاتے تھے۔ امام سرخسی نے فتویٰ دیا کہ ظالمانہ ٹیکس ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کون سا حکمران ہے جو اس گستاخی کو معاف کر سکتا ہے؟ لیکن وہ بہت بڑے فقیہ تھے اس لیے یہ جرات نہیں ہوئی کہ انھیں سزائے موت دی جائے بلکہ ان کو ایک اندھے کنویں میں قید کر دیا گیا۔ اس قید کے چودہ سال کے دوران میں کسی طرح انھیں حکمران یا محس کے مہتمم سے یہ اجازت مل گئی کہ ان کے شاگرد کنویں کی منڈیر پر آکر بیٹھیں اور استاد کے ارشادات کو نوٹ کرتے رہیں۔ محبس کے مہتمم کی اس علم دوستی کا میں بھی ممنون ہوں' یقیناً آپ بھی ہوں گے۔ اس چودہ سال کے عرصے میں باآواز بلند املا کرانے کے ذریعے سے امام سرخسی نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کی فہرست دیکھ کر میں حیرت زدہ ہو جاتا ہوں۔ غالباً آپ جانتے ہوں گے کہ "کتاب المبسوط" تیس جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ یہ پوری کتاب کنویں کے اندر سے املا کرائی گئی۔ شرح السیر الکبیر چار جلدوں کی ضخیم کتاب ہے وہ بھی اس قید خانے میں املا کرائی گئی۔ اس طرح شرح فلاں' فلاں کوئی درجن بھر کتابیں ہیں جو اس قید کے زمانے کی تالیف ہیں۔ خدا نے ہمیں آزادی نصیب کی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس آزادی سے فائدہ اٹھائیں اور اس عالم سے سبق لیں جس نے قید خانے کے اندر' جہاں ایک بھی کتاب ان کے پاس نہیں تھی' اپنا علمی کام جاری رکھا اور علم کی وہ خدمت انجام دی کہ بڑے سے بڑے عالم بھی اس کے عشر عشیر پر فخر کریں۔

۱۴۹۔ بہر حال ان تالیفوں میں سے ایک شرح السیر الکبیر ہے۔ یہاں ایک مسئلے کی وضاحت کر دوں کہ کیا کوئی شخص کتاب المبسوط اور شرح السیر الکبیر جیسی ضخیم کتابیں بغیر مواد سامنے موجود ہوئے املا کرا سکتا ہے؟ میری گزارش یہ ہے کہ استاد کے پاس کتابیں نہیں تھیں لیکن شاگردوں کے پاس کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ کوئی کتاب لائیں اور پڑھیں' استاد اس کی شرح کرے۔ چنانچہ کتاب المبسوط جو تیس جلدوں میں لکھی گئی ہے وہ اصل میں کتاب الکافی کی شرح ہے۔ سات آٹھ سو صفحوں کا اس کا مخطوطہ میں نے استنبول میں دیکھا ہے۔ اسے غالباً شاگرد پڑھتے تھے۔ شاگردوں کی آواز وہ کنویں کے اندر سے سن سکتے تھے اور اندر سے جملہ بہ جملہ اس کی شرح کرتے جاتے اور شاگرد نوٹ کرتے جاتے تھے' غرض شرح السیر الکبیر اس طرح تالیف ہوئی اور میری دانست میں آج دنیا میں اس موضوع کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم امام ابراہیم الفزاری کے رسالہ کو کتاب قرار دیں تو وہ ابھی تک چھپی نہیں ہے۔ سرخسی کی شرح السیر الکبیر سنہ ۱۳۳۵ھ میں حیدر آباد دکن میں شائع ہوئی تھی' لیکن بدقسمتی سے اب تک اس کا کوئی نیا مکمل ایڈیشن نہیں آیا۔ مصر میں اس کے نئے ایڈیشن کی کوشش شروع ہوئی لیکن آدھے سے بھی کم حصہ اب تک چار جلدوں میں شائع ہوا ہے' باقی حصہ میرے ان لیکچروں کے وقت تک چھپ نہیں سکا۔ اس کتاب کی اہمیت دیکھ کر یونیسکو Unesco نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا جائے یہ کام میرے سپرد ہوا اور میں نے اس کا ترجمہ مکمل کر کے بھیج بھی دیا' لیکن اب تک اس کی اشاعت کی بھی نوبت نہیں آئی۔ بہر حال اس ترجمہ کے سلسلے میں میرے سامنے حیدر آباد دکن دائرۃ المعارف کا ایڈیشن بھی رہا اور صلاح الدین منجد کا شائع کردہ نیا ایڈیشن بھی میرے سامنے رہا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں ناکافی ہیں۔ مجھے خوش قسمتی سے استنبول جانے کا سالہا سال تک موقع ملتا رہا اور تین تین مہینے ہر بار رہ کر وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کا موقع پاتا رہا۔ چنانچہ اس کتاب کے ترجمہ میں جہاں کہیں مجھے کوئی دشواری نظر آئی میں ان مخطوطوں کی طرف رجوع کرتا جو استنبول میں ہیں۔ ایک مخطوطہ مجھے بیروت میں بھی ملا اور ایک پیرس میں بھی ملا جو سب سے قدیم نسخہ ہے اور ان مخطوطوں کی مدد سے میں ان مقامات کا جن کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا' صحیح لفظ معلوم کر سکا اور اس طرح یہ ترجمہ مکمل ہوا۔

۱۵۰۔ انٹرنیشنل لا کی تاریخ میں' جیسا میں نے ابھی آپ سے عرض کیا' یہ کتاب جو امام محمد شیبانی نے لکھی ہے' بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے ہم عصر لوگوں میں ابراہیم الفزاری جو امام

ابو حنیفہ کے شاگرد تھے' انھوں نے بھی ایک کتاب لکھی۔ یہی نہیں بعض اور ممتاز اور مشہور فقہاء نے بھی اس موضوع پر کام کیا چنانچہ امام مالک نے بھی کتاب السیر کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ بدقسمتی سے اب یہ کتاب بھی ناپید ہے۔ ان کی کتاب المؤطا میں مشکل سے آدھے صفحے کا ایک باب ضرور ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہماری ضرورتوں کے لیے کافی نہیں۔ اسی طرح ان کے ایک اور معاصر' مشہور مورخ واقدی نے بھی "کتاب السیر" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ وہ بھی اب نایاب ہے لیکن امام شافعی کی "کتاب الام" میں سیر الواقدی کے نام سے ایک بہت طویل اقتباس ہے تقریباً پچاس ساٹھ بڑی تقطیع کے صفحوں کا۔ شاید وہ واقدی کی کتاب کی نقل یا اقتباس ہو۔ اس موضوع پر یہ ابتدائی کتابیں تھیں اور آخری کتابیں بھی یہی ہیں یعنی ایک خاص زمانے میں کسی خاص ضرورت سے مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں۔ پھر اس کے بعد شاید اس کی ضرورت نہ رہی اور یکایک یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اس علم سے مسلمانوں کی دلچسپی برقرار رہی اس معنی میں فقہ کی جتنی کتابیں ابتداء سے لے کر آج تک لکھی گئیں' چاہے وہ کسی بھی مذہب اور فرقے کی ہوں' حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی' شیعی یا فاطمی وغیرہ' ان سارے مؤلفوں کی کتابوں میں "کتاب السیر" کا باب ضرور ملتا ہے۔ مجھے کچھ مقابلہ کرنے کا موقعہ ملا تاکہ یہ معلوم کروں کہ شیعہ' سنی اور فاطمی وغیرہ مؤلفوں کے خیالات میں اس موضوع سے متعلق کوئی فرق ہے یا نہیں؟ حیرت ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں ملتا۔ ہم عقائد کی بنا پر ضرور جھگڑیں گے' سنی شیعوں سے' شیعہ سنیوں سے لیکن ان کی فقہ میں کوئی ایسا امتیاز نظر نہیں آتا کہ یہ شیعہ قانون ہے' یہ سنی قانون ہے۔ سبھی اپنے آپ کو اولاً قرآن اور ثانیاً سیرت پر مبنی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے میں کیا فرق ہو گا۔ تاریخی واقعات میں چاہے ایک کا راوی فلاں اور دوسری کا راوی فلاں دوسرا صحابی ہو لیکن جس چیز کا ذکر ہو گا اس چیز میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ گزشتہ تیرہ سو سال سے جو فقہ کی کتابیں چار دانگ عالم میں لکھی جاتی رہیں اور مختلف مذہبوں کے مؤلفوں کے قلم سے نکلی ہیں' ہم ان میں ہر جگہ "کتاب السیر" کو پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو کتاب کتابوں کا اقتباس کہی جاتی ہے یعنی "فتاوائے عالمگیری" اس میں بھی اس پر ایک باب ہے بہت سی دلچسپ معلومات اس سے ملتی ہیں خصوصاً اس بنا پر کہ بعض ایسی کتابیں جن سے عالمگیر بادشاہ کے زمانے میں استفادہ ممکن تھا۔ اب نایاب ہو گئی ہیں اور ان کے اقتباسات اس میں ملتے ہیں۔ ان کتابوں کا جو سلسلہ شروع سے جاری رہا وہ ایک معنی میں شرح اور تمثیل ہو سکتا تھا یعنی اصولوں کی حد تک کوئی فرق نہیں ہوتا مثالیں زیادہ

دی جاتی ہیں، تشریحیں اور تفصیلیں زیادہ کی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں مجھے ایسا نظر آیا کہ بعض ممالک کی خصوصیات کی وجہ سے بعض چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جن کو بعض دیگر ممالک کے لوگ بیان نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر امام سرخسی اپنی کتاب میں جنگ کے دوران میں بیلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ لوگ بیلوں پر بیٹھ کر دشمن سے جنگ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کسی ملک میں ہو گا جہاں بیل ہوتے ہیں ورنہ اور ملکوں میں مثلاً عرب میں بیلوں کا ذکر نہیں آئے گا۔ اسی طرح مالکی مذہب کے مؤرخ اور مؤلف جن کا تعلق شمالی افریقہ سے ہے اور ان کے تعلقات اسپین وغیرہ سے زیادہ قریبی رہے، اکثر زہریلی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی تیر میں زہر شامل کیا جاتا تھا تاکہ اگر دشمن زخمی ہو تو اس کا زخم اچھا نہ ہو پائے اس کا ذکر مجھے اور مقاموں کی کتابوں میں نہیں ملا۔ غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا رواج دوسرے ملکوں میں نہیں تھا۔ اسی طرح امام سرخسی کی کتابوں میں سامان کو لینے اور لے جانے کے لیے گاڑیوں کا ذکر آتا ہے۔ دوسرے مؤلفوں کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ غالباً ان کے زمانے میں جانور پر سامان لاد دیا جاتا تھا۔ گاڑی کے اندر سامان رکھ کر اس کو جانور کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچانے کا رواج ان ملکوں میں نہیں تھا۔ غرض بہت سی مخصوص معاشرتی مثالیں ہمیں ان کتابوں میں ملتی ہیں۔

۱۵۱۔ یہ چند تفصیلیں انٹرنیشنل لا کی تاریخ کے سلسلے میں، میں نے آپ سے بیان کیں۔ اب کچھ مختصراً" اس کے مندرجات کا آپ سے ذکر کروں گا کہ انٹرنیشنل لا میں کیا چیزیں بیان ہوتی ہیں۔ آج کل ہمارے زمانے میں "Public International Law" اور "Private International Law" دو مختلف فن اور مختلف علم سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے فقہاء کی کتابوں میں یہ امتیاز نہیں ملتا۔ ایک ہی کتاب میں دونوں علوم کے احکام بیان کرتے ہیں۔ کچھ مثالیں دے کر واضح کروں گا کہ ان دونوں علوم میں کیا فرق ہے۔ "Private International Law" میں ایک حکومت کے تعلقات دوسری سلطنت کی رعیت سے ہوتے ہیں اس کے برخلاف "Public International Law" میں ایک حکومت کے تعلقات دوسری حکومت سے ہوتے ہیں اس کی رعیت سے براہ راست تعلقات نہیں ہوتے۔ یہ بنیادی فرق ہے میں آپ کو کچھ مثالیں دیتا ہوں۔ مثلاً قومیت (Nationality) کا قانون کہ ایک شخص کو کس شہریت کا حامل سمجھا جائے گا یا وہ اپنی قومیت کو بدل سکتا ہے یا نہیں؟ اگر بدل سکتا ہے تو کن احکام و قواعد کے ذریعے سے اس کا ذکر پرائیویٹ انٹرنیشنل لا میں آئے گا۔ پبلک انٹرنیشنل لا میں اس کا ذکر نہیں آئے گا۔ اس

طرح اور بھی چیزیں ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان مؤلفوں کے تصور کے مطابق اس پرائیویٹ انٹرنیشنل لا میں مسلمانوں کے اندرونی تعلقات کا ذکر بھی آ جاتا ہے۔ مثلاً شیعہ اور سنی فرقوں کے تعلقات پر قانونی نقطہ نظر سے بحث ہوتی ہے۔ فرض کیجئے ایک حاکم عدالت کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ مرنے والا مذہباً" شیعہ ہے اور اس کی بیوی جو وارث بنی ہے' وہ سنی ہے۔ کس قانون کے مطابق وراثت تقسیم کی جائے؟ اس مسئلے کا تعلق مسلمانوں کے پرائیویٹ انٹرنیشنل لا سے ہو گا اسی طرح فرض کیجے کہ ایک مسلمان فرد رعیت نے کسی اجنبی ملک کے فرد رعیت سے کاروبار اور تجارت وغیرہ کے سلسلے میں معاہدہ کیا۔ اجنبی ملک کا قانون حکم دیتا ہے کہ جو شخص سرکاری طور پر بالغ نہ ہو یعنی اس کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہو تو اسے معاہدہ کرنے کا حق نہیں' اس کا کیا ہوا معاہدہ لغو سمجھا جائے گا۔ اسلامی قانون میں عمر کا تعین نہیں ہے بلکہ جسمانی بلوغ دیکھا جاتا ہے جو ممکن ہے اٹھارہ سال سے کم عمر میں ہو جائے۔ ایک مرتبہ کسی جھگڑے کی وجہ سے مقدمہ عدالت کے سامنے آتا ہے اور وکیل صاحب کہتے ہیں کہ میرے مؤکل نے جب معاہدہ کیا تھا' وہ نابالغ تھا' اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی' لہٰذا معاہدہ کالعدم قرار دیا جائے۔ اس قسم کے جو مسائل ہوتے ہیں ان کا تعلق پرائیویٹ انٹرنیشنل لا سے ہوتا ہے اور اس کے قواعد مقرر ہیں کہ مدعی علیہ کے قانون کے مطابق عمل کیا جائے گا' مدعی کے قانون کے لحاظ سے نہیں کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے برخلاف پبلک انٹرنیشنل لاء میں تین چیزوں یعنی قانون امن قانون جنگ اور قانون غیر جانبداری سے بحث ہوتی ہے۔ قانون غیر جانبداری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی جنگ میں ہماری حکومت مثلاً غیر جانبدار ہے تو اس کے تعلقات دونوں فریقین جنگ کے ساتھ کس طرح کے ہوں گے یا فریق جنگ کے تعلقات ان ملکوں سے جو جنگ میں شریک نہیں ہیں' کس طرح کے ہوں گے؟ اس کی کچھ تفصیلیں اس باب میں ملتی ہیں۔ قانون امن میں زیادہ تر تین چار چیزوں سے بحث ہوتی ہے۔ Sovereignty یعنی حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ سے کہ کس مملکت کو خود مختار سمجھا جائے۔ انٹرنیشنل لا کی جدید کتابوں میں' واقعتاً خود مختار سلطنتوں کے علاوہ باغیوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے' مگر اس وقت جب ان کی بغاوت ترقی کر کے ایک حد تک مستحکم ہو جائے اور وہ کسی علاقہ پر خود مختارانہ طور پر حکمرانی کرنے لگیں۔ اسی طرح اس میں Sovereignty کی تفصیلات ہوتی ہیں کہ کن کن چیزوں میں Sovereignty کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً فرض کیجے کہ برٹش انڈیا میں انگریزی دور میں ایک علاقہ تھا جس پر انگریز براہ راست حکومت کرتے تھے۔

لیکن کچھ ریاستیں بھی تھیں جیسے بہاولپور' حیدر آباد اور کشمیر وغیرہ۔ آیا ان ریاستوں کو انٹرنیشنل لا کی اغراض کے لیے مملکت تسلیم کیا جائے گا یا نہیں؟ اگر کیا جائے گا تو اس کے کیا قواعد ہوں گے؟ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ ریاست سو فی صد خود مختار نہ ہو لیکن اسے ایک حد تک خود مختاری حاصل ہو مثلاً اسے اس کی اجازت ہو کہ اپنا ایک سفیر رکھے' چاہے ساری دنیا کی مملکتوں میں نہیں' صرف ایک ہی سلطنت میں تو بھی ہم اسے انٹرنیشنل لا کا موضوع قرار دیں گے۔ غرض اس طرح کی تفصیلیں اس باب میں ملتی ہیں۔ ایک دوسرا باب جائیداد (Property) کے متعلق ہے جس میں زیادہ تر فتوحات سے بحث ہوتی ہے۔ ہم ایک دوسری سلطنت کا کچھ علاقہ فتح کر لیں تو کیا وہ خود بخود ہماری سلطنت کا جزو بن جاتا ہے یا اس کے لیے کوئی رسمی کارروائی درکار ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا ہوتی ہے؟ اسی طرح جائیداد کے فروخت کرنے کے متعلق بھی اس میں بعض دلچسپ چیزیں ملتی ہیں یعنی کبھی تو فتح کے ذریعہ سے کسی علاقہ پر قبضہ ہوتا ہے' کبھی تبادلہ علاقہ کے ذریعہ سے ایک علاقہ دوسری سلطنت کو دیا جاتا ہے یا کبھی تحفہ کے طور پر۔ اس کی بہت سی مثالیں اسلامی تاریخ ہند میں ملتی ہیں۔ دو حکمرانوں میں ایک علاقہ کے متعلق جھگڑا ہوتا ہے' بالاخر اس بات پر مصالحت ہو جاتی ہے کہ میری بیٹی کا نکاح تمہارے بیٹے سے ہو جائے تو میں جہیز میں وہ علاقہ تمہیں دے دو گا' ہار مان کر نہیں دوں گا وغیرہ وغیرہ اس طرح کی بہت سی چیزیں تاریخ میں پیش آتی رہی ہیں۔ جائیداد کے متعلق جو قواعد ہیں ان کا بھی اس میں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۵۲۔ اس میں ایک اور چیز کا ذکر آتا ہے : Jurisdiction یعنی دائرہ اختیار سماعت کے متعلق کہ ایک ملک کے قواعد دوسرے ملک کی رعیت پر چلیں گے یا نہیں' اور چلیں گے تو کس حد تک چلیں گے اور کون سا قانون نافذ ہو گا؟ اس سلسلے میں میں ایک چھوٹی سے چیز آپ کے سامنے عرض کروں۔ امام محمد شیبانی کی۔ "السیر الکبیر" میں ایک باب بہت دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر غیر ملک کے لوگ ہمارے ملک میں آئیں اور ہماری عدالت سے رجوع کریں تو ہمارا قاضی ان پر انہی کا قانون نافذ کرے گا۔ فرض کیجیے دو ہندو پاکستان آئے۔ ان میں آپس میں جھگڑا ہوا اور وہ ہماری عدالت سے رجوع کرتے ہیں تو ہندوؤں یا ہندوستان کا قانون ان پر نافذ ہو گا' پاکستانی قانون کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ ہمارے فقہاء اور ہمارے قاضیوں کو غیر ملکوں کے قانون سے واقفیت پیدا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ غالباً" عہد نبوی کی بعض مثالوں سے استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں چند یہودی حضور

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک نوجوان جوڑے کو پکڑ کر کہا کہ انھوں نے آپس میں زنا کیا' تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ توریت میں زنا کا کیا حکم ہے؟ شروع میں انھوں نے کہا کہ ان کے منہ پر کالک لگائی جائے اور انھیں گدھے پر اس طرح سوار کرایا جائے کہ گدھے کے منہ کی طرف ان کی پیٹھ ہو' گدھے کی دم کی طرف ان کا منہ ہو اور انھیں سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے گھمایا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا' نہیں تم جھوٹ کہتے ہو! پھر کہا کہ توریت کا نسخہ لاؤ اور جب نسخہ لایا گیا تو فرمایا کہ ایک نو مسلم یہودی' حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں پڑھو۔ یہودی نے پڑھنا شروع کیا۔ ایک مقام پر انگلی رکھ کر آگے بڑھ گیا۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا یہ انگلی اٹھا کر نیچے کی عبارت پڑھو۔ وہاں لکھا تھا کہ زنا کی سزا رجم ہو گی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجم کرایا۔ یہ نظیر بتاتی ہے کہ اجنبیوں پر اسلامی قانون نافذ نہیں کیا جاتا' بلکہ انہی کا قانون نافذ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام محمد شیبانی نے کئی صفحوں کی طویل بحث میں بتایا ہے کہ اجنبیوں پر اجنبیوں کا قانون ہماری عدالت میں کس انداز سے نافذ ہوتا ہے۔ اسی طرح انٹرنیشنل لا کے قانون میں امن (Law of Peace) کا تعلق سفارت سے ہے۔ قدیم زمانے میں سفیر مستقل نہیں ہوتے تھے بلکہ معینہ غرض کے لیے معینہ مدت کے لیے بھیجے جاتے تھے اور کام سرانجام دینے کے بعد واپس آ جاتے تھے اس سلسلے میں امیر علی نے History of Saracens میں لکھا ہے کہ مستقل سفیروں کا آغاز یورپ سے دو سو سال پہلے مسلمانوں میں ہوا۔ یہ ایک دلچسپ چیز ہے۔ قانون جنگ میں جن مسائل پر بحث ہوتی ہے وہ یہ ہیں کہ انسانوں کے متعلق قانون جنگ کیا ہے؟ جائیداد کے متعلق قانون جنگ کیا ہے؟ جنگ کے خاتمے پر جو معاہدہ یا صلح نامہ ہوتا ہے' اس میں کن عناصر و شرائط کا ہونا ضروری ہے؟ وغیرہ وغیرہ مختصر یہ کہ انٹرنیشنل برتاؤ یعنی ایک مملکت کے دوسری مملکت سے باہمی تعلق میں جن اصول و ضوابط پر عمل کیا جاتا ہے اس کا مجموعہ انٹرنیشنل لا کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔

سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ!

۱۵۳۔ کچھ سوالات جو آپ کی طرف سے آئے ہیں ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا

ہوں۔

سوال ۱۔ آپ نے فرمایا کہ بقول سید امیر علی مستقل سفیروں کا آغاز یورپ سے پہلے مسلمانوں نے تقریباً دو سو سال قبل کیا۔ یہ مسلمانوں کی کونسی حکومت کے زمانے میں ہوا؟

جواب : اگر آپ میرے ماخذ History of Saracens کو دیکھیں تو آپ کو اس کی تفصیل مل جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ بنو عباس کے آخری دور میں مسلمانوں کی آزاد سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں۔ اس سلسلے میں امیر علی نے لکھا ہے کہ خلیفہ کا ایک نمائندہ ان عملاً آزاد اسلامی مملکتوں میں ہوتا تھا اور ان عملاً آزاد مملکتوں کا ایک نمائندہ خلیفہ کے دربار میں "مستقلاً" رہتا تھا۔ یہ نہیں کہ کسی متعین کام کے لیے آیا اور چلا گیا ہو۔

۱۵۴ سوال ۲۔ مکی دور میں مسلمان ریاست مکہ کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے کیا تاریخی دلیل ہے کہ مسلمان اہل مکہ کے اس دستور کی اطاعت نہیں کرتے تھے جو اسلامی تعلیمات کے بھی خلاف نہیں تھا۔ کیا یہ اطاعت اولی الامر کے خلاف نہیں ہے؟ کیا اسے غیر مسلم' بغاوت کا نام نہیں دے سکتے؟

جواب : میں نے یہ بیان کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے اہل مکہ اپنے ہر مسئلے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چاہے ان کا آپس کا جھگڑا ہو یا کسی چیز پر بغیر جھگڑے کے عمل کرنے کا سوال ہو' شہری مملکت مکہ میں دو قسم کے وزیر عدلیہ پائے جاتے تھے' ایک دیوانی مقدمات کے لیے اور ایک فوجداری مقدمات کے لیے۔ لیکن مسلمان ان افسروں کے پاس نہیں جاتے تھے۔ غرض میرا منشا یہ ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں مسلمان اپنی ہر چیز کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے اس کو میں نے مملکت در مملکت کا نام دیا۔ جب مسلمان اہل مکہ کی مملکت کو قبول ہی نہیں کرتے تھے تو اس کے احکام کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اولی الامر اس وقت ہوں گے جب وہ ہمارے اولی الامر ہوں۔ اہل مکہ اس کو یقیناً بغاوت سمجھتے ہوں گے اسی لیے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اذیتیں بھی دیتے تھے بعض کو انھوں نے قتل بھی کیا اور یہ داستان تاریخ عالم کے المیوں میں سے ایک ہے کہ کس طرح اہل مکہ ہر اچھی چیز کو دیکھتے ہوئے بھی محض اپنی ہٹ دھری کے باعث اس کو قبول کرنے سے سالہا سال تک انکار کرتے رہے۔ لیکن الحمداللہ اس المیہ کا اختتام اچھا ہوا یعنی فتح مکہ کے دن ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے سارے اہل مکہ اپنی

دشمنی کو بھول کر خلوص دل سے اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا کہ شاید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں' ہر شخص آئے۔ چنانچہ کعبہ کی مسجد کے احاطے میں سب لوگ آئے اور سوچ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کوئی سزا سنائیں گے۔ غرض پریشانی کے عالم میں مکہ کے مفتوح لوگ وہاں آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ وہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں۔ ایک غیر مسلم نے جب کعبہ کی چھت پر سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان دیتے ہوئے سنا تو اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک دوسرے مشرک کے ساتھ کانا پھوسی کی کہ خدا کا شکر ہے' میرا باپ آج زندہ نہیں ہے ورنہ وہ برداشت نہ کر سکتا کہ خدا کے گھر پر ایک کالا گدھا چڑھ کر ہینگے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد حاضرین سے مخاطب ہو کر کچھ اشارۃ" انھیں بتایا کہ گزشتہ بیس سال سے تم میرے ساتھ جو سلوک کرتے رہے ہو' اب اس سلسلے میں مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب تاریخی نقطہ نظر سے بھی قابل ذکر ہے۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے بھی' اور اس کے نتائج بھی حیرت انگیز ہیں۔ اس وقت اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو یہ حکم دیتے کہ ان سارے اہل مکہ کو قتل کر ڈالو۔ آپ کے پاس فوج تھی' قوت تھی اور شہر پر قبضہ ہو چکا تھا۔ اور شاید وہ اس کے مستحق بھی تھے کہ انھیں سزائے موت دی جائے۔ کم از کم یہ حکم دے سکتے تھے کہ اہل مکہ کی ساری جائیداد لوٹ لو کیونکہ وہ مسلمانوں کی جائیدادیں لوٹ چکے تھے یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ ان کو غلام بنا لو۔ اس کے وہ مستحق بھی تھے اور اس کا امکان بھی تھا۔ مگر خدا کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے کچھ بھی نہیں کیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے ایک ہی جملہ نکلا "آج کے دن تم سے کوئی باز پرس نہیں' کوئی محاسبہ نہیں' جاؤ تم سب کو رہا کیا جاتا ہے۔۔۔۔" لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء اس پر وہی شخص جو ابھی تھوڑی دیر پہلے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کر رہا تھا' بے اختیار' یکایک اٹھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہو کر کہا اے محمدؐ میں عتاب بن اسید ہوں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور دشمن: اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھدان محمدا" رسول اللہ اس اعلان معافی کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ عتاب بن اسید ہی نہیں' سارے شہر مکہ نے راتوں رات خوشدلی کے ساتھ اسلام قبول کر لیا اور پھر جب دو سال بعد آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کی وفات ہوئی' اور بہت سے قبیلے مرتد بھی ہوئے' تو جن لوگوں نے اسلام پر برقرار رہ کر' بغیر ہچکچائے' اسلام کی خدمت کے لیے خود کو پیش کیا' ان میں سب سے آگے اسی شہر مکہ کے لوگ تھے' جسے مسلمانوں نے بزور' اور قوت کے ذریعے سے فتح کیا تھا۔ میں اس قصہ کی تکمیل کرتا ہوں کہ جب عتاب ابن اسید نے کلمہ پڑھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا جواب تھا؟ جواب یہ تھا کہ میں تمہیں شہر مکہ کا گورنر مقرر کرتا ہوں۔ ایک سیکنڈ پہلے کے دشمن کو اسی مفتوحہ شہر کا مطلق العنان حکمران بنا کر' مدینہ واپس جاتے ہیں اور مکہ میں اپنا ایک سپاہی بھی Garrison کے طور نہیں چھوڑتے اور اس پر آپ کو پچھتانا بھی نہیں پڑا۔ یہ چند باتیں ہیں جو ہمیں اس سلسلے میں پیش نظر رکھنی چاہیں۔ اسلام دیگر قسم کی دنیاوی اور مادی تحریکوں کی طرح نہیں تھا۔ وہ ربانی عنایت تھی جو انسان تک پہنچائی گئی اور اس پر عمل کرنے والا وہ کردار تھا جس نے تاریخ عالم میں اپنا لاثانی نقش چھوڑا ہے۔ آج بھی جو لوگ غیر جانبداری سے مطالعہ کر سکتے ہیں وہ اس پر سردھننے پر مجبور ہیں۔ ان حالات میں میں نہیں سمجھتا کہ مسلمانان مکہ کو اہل مکہ کی اطاعت کرنے کی ضرورت تھی' کیونکہ وہ ایک نئی آئیڈیالوجی پیش کر رہے تھے جس میں اہل مکہ کے لیے بھلائی تھی' بشرطیکہ وہ اسے قبول کرتے۔

۱۵۵ سوال ۳۔ انٹرنیشنل لا کے تاریخی ارتقاء کے سلسلے میں آپ نے یونانی اور رومی سلطنتوں کے قوانین کا ذکر کیا۔ اس سلسلے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا قوم سبا کے ساتھ سفارت کا ذکر قرآن پاک میں واضح طور پر ملتا ہے۔ اس ضمن میں اس کا کیا مقام ہے؟

جواب : یونانیوں اور رومیوں کے علاوہ اور بھی قوموں کے ذکر کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں' یہودیوں بلکہ ریڈ انڈین لوگوں کا بھی ذکر آ سکتا ہے۔ ہمارے پاس بہت سی معلومات ہیں لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے میں ان کا ذکر نہیں کر سکا۔ یہودی قانون کے سلسلے میں حضرت سلیمان علیہ السلام بھی آئیں گے۔ یہودی قانون صرف وہ نہیں ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھا بلکہ ان کے بعد کی صدیوں میں اس میں تبدیلیاں اور اضافے بھی ہوتے رہے۔ لیکن یہودی قانون کا کم از کم موجودہ توریت کی اساس پر تاریخ اسلام کے درخشاں ابواب سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب تثنیہ کو آپ پڑھیں' اس میں ان کے بیان کے مطابق خدا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیتا ہے کہ جب تم کسی شہر کے قریب پہنچو' اس پر قبضہ کرنے کے لیے' تو پہلے وہاں کے لوگوں کے سامنے امن پیش کرو' اگر وہ اس کو قبول کر کے اپنے دروازے کھول دیں تو تم شہر میں

فاتحانہ داخل ہو جاؤ اور مفتوحہ شہر کے سارے لوگ تمہارے غلام اور تمہارے خراج گزار بنیں گے اور تمہارے خدمت گار رہیں گے۔ اس کے برخلاف اگر وہ مقاومت کریں اور تم بعد میں اس شہر کو تلوار کے زور سے فتح کر لو تو وہاں کے کسی متنفس کو زندہ نہ رکھو، مرد، عورت، بچے بوڑھے، گدھے، اونٹ، جانور وغیرہ ان سب کو تہ تیغ کر کے ختم کر دو۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب قانون ہے۔ اس کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کی کتاب توریت ہمیں ملتی ہے، وہاں بھی اسی Genocide کے قانون پر عمل کیا جاتا ہے۔ ایسی باتیں ملتی ہیں کہ یہودی فلاں شہر میں گئے اور انھوں نے وہاں کی عورتوں، بوڑھوں، دودھ پیتے بچوں اور جانوروں وغیرہ سب کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد حضرت اشموئیل علیہ السلام کی کتاب دیکھیے۔ اس میں بھی ہمیں یہی چیزیں ملتی ہیں۔ یہ تھا وہ قانون جو یہودیوں کے دین نے سکھایا۔ شاید اسی کا اثر ہے کہ آج بھی ہم اسرائیل میں وہ بات نہیں پاتے جو ایک متمدن قوم میں ہونی چاہیے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام یقیناً پیغمبر تھے میں یہ بھی نہیں جانتا کہ موسیٰ علیہ السلام، یوشع علیہ السلام اور اشموئیل علیہ السلام کی طرف موجودہ توریت میں جو چیزیں منسوب ہیں وہ صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ یقیناً یہودی تاریخ میں بھی انٹرنیشنل لا ملتا ہے، حالت جنگ میں بھی اور حالت امن میں بھی۔ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا جو تعلق ملکہ سبا بلقیس سے رہا اس کی ایک مثال ہے۔ وہ حالت امن کے روابط کے سلسلے میں ورنہ جنگ دونوں میں نہیں ہوئی تھی۔

۱۵۶ سوال ۴۔ آنجناب نے فتنہ ارتداد کے خلاف جہاد کے بارے میں پہلے اجماع ہونے کی رائے ظاہر فرمائی تھی۔ بخاری شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیان میں مذکور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جو یہ کہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ دیا اور کچھ قرآنی آیات تلاوت کیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے تمام صحابہ خاموش ہو گئے۔ کیا اس واقعہ کو صحابہ کا پہلا اجماع قرار نہیں دیا جا سکتا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر صحابہ کے مابین ہوا؟

جواب : میں عرض کروں گا کہ اجماع اسی وقت ہوتا ہے جب قرآن و حدیث ساکت ہوں اور جب قرآن کی آیت پیش کی جائے اور اس پر سب سر تسلیم خم کریں تو میں اسے فنی نقطۂ نظر سے "اجماع" نہیں کہوں گا۔

۱۵۷ سوال ۵ ۔ پاکستان میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اپنی سوسائٹی کو اسلامی رنگ دینے کے لیے اسلامی قانون ضروری ہے۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ جب تک انفرادی اصلاح نہ ہو جائے' اس وقت تک اسلامی قوانین نہ پورے طور پر نافذ ہو سکتے ہیں اور نہ ہی معاشرے کو اسلامی رنگ دیا جا سکتا ہے۔ آپ کی رائے میں کونسا خیال درست ہے؟

جواب : اگرچہ یہ سوال آج کی تقریر سے متعلق نہیں' بہرحال میں یہ عرض کروں گا کہ اگر ہم اسلامی معاشرے کی اصلاح کے بعد اسلامی قانون نافذ کرنا چاہیں تو اس کے انتظار میں قیامت آ جائے گی۔ اس لیے بیک وقت اصلاح کی کوشش بھی جاری رکھنی چاہیے اور اسلامی قانون بھی نافذ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اسلامی قانون بہت سے لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ سزا کے خوف سے نیک بنیں۔ مثال کے طور پر چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا پر بہت سے لوگ اعتراض کرتے ہیں اور اسے وحشیانہ قرار دیتے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں عرض کروں گا کہ اگر ہاتھ کاٹنے کی سزا نافذ کی جائے تو مملکت کے سارے باشندے بے ہاتھ والے نہیں ہو جائیں گے۔ ایک یا دو آدمیوں کا ہاتھ کٹتا ہے پھر اس سے سب لوگوں کو عبرت حاصل ہو گی اور کسی کو چوری کی جرات نہیں رہے گی۔ یہ چیز بہتر ہے کہ ایک دو آدمیوں کے ہاتھ کٹیں پھر سارے لوگ اپنے گھر میں اطمینان سے سو سکیں۔ نہ چوری کا ڈر نہ ڈاکے کا خوف' یا وہ صورت جو میں نے اپنی آنکھوں سے پیرس میں دیکھی ہے کہ چور کو اپنے گھر سے بھی زیادہ آسائش سے جیل خانوں میں رکھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے بعض کام چوروں کو ترغیب ہوتی ہے کہ بجائے محنت کر کے کمانے کے' جس سے ذرا تکلیف ہوتی ہے' سرکاری مہمان نوازی کا لطف اٹھائیں۔ بہرحال عرض کرنا یہ ہے کہ میری رائے میں نفاذ قانون اسلامی اور تربیت اسلامی دونوں کاموں کو بیک وقت ہونا چاہیے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوا تھا۔ اس کے برخلاف عمل کیا جائے تو ہمیں قیامت تک انتظار ہی کرنا پڑے گا۔

۱۵۸ سوال ۶۔ اسلام میں دوسری ریاست پر جارحیت کرنا جائز نہیں لیکن مدینہ کی ریاست جب مضبوط ہو گئی تو مکہ پر حملہ کرنے میں پہل کی گئی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب : مکہ پر حملہ کرنے میں پہل مسلمانوں نے کی تھی' اس کا ثبوت آپ کو پیش کرنا چاہیے۔ غالباً" آپ کو یاد ہو گا کہ حدیبیہ کے مقام پر ۶ ھ میں مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان جو صلح ہوئی تھی' اس میں شرط یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے پر پوشیدہ یا علانیہ' ظلم و تعدی کرنے

سے باز رہیں گے۔ اس کے باوجود جب مکہ کے حلیف قبیلے بنو کنانہ اور مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ میں جھگڑا ہوا تو اہل مکہ نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنو کنانہ کو ہتھیار فراہم کیے' پھر چھپ کر قبیلہ بنو خزاعہ پر حملہ کیا اور مسلمانوں کو قتل بھی کیا۔ اسی صورت حال میں مسلمانان مدینہ سزا اور انتقام کے طور پر اہل مکہ پر حملہ کرتے ہیں۔ اسے جارحانہ حملہ قرار نہیں دیا جا سکتا ابتداء ان کی طرف سے ہوئی تھی اور جواب مسلمانوں نے دیا تھا۔ البتہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں پھر کہوں گا کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سپہ سالار کی حیثیت سے ایسا کارنامہ سرانجام دیا جس پر آدمی آج بھی ششدر رہ جاتا ہے۔ اس زمانے میں (۱۰) دس ہزار کی فوج چھپ کر کہیں جا نہیں سکتی تھی اور رفتار اتنی سست تھی کہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے اگر آج دو گھنٹے لگتے ہیں' تو اس وقت دو ہفتے لگتے تھے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی فوج مدینہ سے مکہ شہر کے مضافات میں پہنچ کر کیمپ ڈالتی ہے۔ اس وقت تک مکہ والوں کو کوئی اطلاع نہیں ہوئی تھی۔ پھر شہر مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوتا ہے تو ایک قطرہ خون بہائے بغیر پھر اس کے بعد کا قصہ میں نے ابھی آپ سے بیان کیا کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جملے سے' کہ آج تم پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں' جاؤ سب کو رہا کیا جاتا ہے' نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی کایا پلٹ گئی اور وہ سب کے سب راتوں رات پورے خلوص کے ساتھ مسلمان ہو گئے۔ بہر حال تاریخی واقعات کی روشنی میں فتح مکہ کو جارحانہ جنگ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۱۵۹ سوال ۷۔ رومن لا دنیا کے قدیم ترین قوانین میں شمار ہوتا ہے اور اس کے اثرات دنیا کی مختلف اقوام کے قوانین پر مرتب ہوئے ہوں گے۔ رومن لا میں کچھ قانون کافی اچھے ہوں گے۔ مختصراً" بتائیں کہ اسلامی قانون کس حد تک اور کن کن نمایاں شعبوں میں رومن لا سے متاثر ہوا ہے؟

جواب : اگر آپ کو عربی آتی ہے تو میں عرض کروں گا کہ آپ کے کتب خانے میں ایک کتاب هل للقانون الرومی تاثیر علی الفقه الا سلامی؟ ابھی ابھی آئی ہے' جو عربی زبان میں ہے۔ اس میں پانچ مؤلفوں کے مقالوں کا ترجمہ ہے اور ان پانچوں نے اسی موضوع سے بحث کی ہے کہ آیا اسلامی قانون پر رومی قانون کا اثر ہوا ہے یا نہیں؟ ان مؤلفوں میں سے ایک اطالوی ہے' ایک انگریز ہے' ایک فرانسیسی ہے وغیرہ وغیرہ۔ حیرت ہوتی ہے کہ پانچوں کے پانچوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلامی قانون پر رومی قانون کا قطعا" کوئی اثر نہیں ہوا اور اس پر وہ بھی حیرت کرتے

ہیں۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مؤلف نے اپنے مضمون کا عنوان ہی "The Mystery of the Formation of Muslim Law" رکھا اور اس مضمون میں اپنی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اسلامی قانون خود بخود کیسے بن گیا؟ دوسرے الفاظ میں سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی قانون پر اگر رومی قانون کا اثر ہوا ہوتا تو اس کا کوئی وسیلہ ہونا چاہیے تھا اولاً" رومی قانون لاطینی زبان میں ہے لیکن موجودہ صدی کے نصف دوم تک عربی یا کسی اور مشرقی زبان میں' اس کے کسی ترجمے کا پتہ نہیں چلتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی فتوحات کی ابتداء ہی سے قرآنی احکام کے تحت' ہر قوم کو قانونی خود مختاری دے دی تھی یعنی اگر دو عیسائیوں میں جھگڑا ہو تو قانون بھی عیسائی ہو گا' جج بھی عیسائی ہو گا' فریقین بھی عیسائی ہوں گے۔ غرض یہ کہ انھیں اسلامی عدالت میں آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر دو مسلمانوں میں جھگڑا ہوتا تو قرآن کے مطابق فیصلہ کیا جاتا' ایک اور چیز کی طرف میں اشارہ کرتا ہوں کہ اسلامی فقہ کی کتابوں اور رومی قانون کی کتابوں میں سے ایک ایک کو لیجیے' اگر ایک دوسرے سے ماخوذ ہے تو ظاہر ہے کہ جس نے اخذ کیا ہو تو ان پر اصل ماخذ کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی رہ جاتے ہیں۔ مگر ہمیں اسلامی قانون میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ مثلاً رومی قانون کو "لیس" کا نام دیتے ہیں اور مسلمان "فقہ" کا۔ "لیس" کے معنی ہیں حقوق اور فقہ کے معنی ہیں معرفت۔ مسلمانوں نے اپنے قانون کو لیس یا حقوق کا نام کبھی نہیں دیا اگرچہ موجودہ دور میں ترکی' ایران' مصر وغیرہ میں حقوق کی اصطلاح برتی جا رہی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے طلبہ یورپ کے مختلف ملکوں مثلاً فرانس' جرمنی' برطانیہ اور اٹلی وغیرہ میں قانون پڑھتے ہیں۔ وہاں اس کے لیے "حقوق" کا لفظ پڑھتے ہیں۔ تو وہ اصطلاح اپنے ہاں بھی برتنے لگتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے قانون کو علم الحقوق نہیں کہا بلکہ اسے علم الفقہ ہی کہتے رہے۔ میں مغربی ممالک کی فہرست میں انگلستان اور امریکہ کو شامل نہیں کرتا کیونکہ انگریزی لفظ Law کے معنے حقوق کے نہیں ہیں۔ میرے ذہن میں یہاں فرانسیسی' جرمن' اطالوی زبانوں کی اصطلاح ہے۔ خاص کر فرانس کی علمی تاثیر ترکی' فارسی اور عربی ممالک میں بہت رہی ہے۔

۱۶۰۔ دوسری چیز یہ کہ رومن لا کی کتاب کو کھولیے تو اس کا پورا مواد تین اقسام پر مشتمل نظر آئے گا۔ قسم اول کا نام ہوگا "Persons" یعنی اشخاص کا قانون پھر "Property" یعنی مال کے متعلق قانون' جب کہ تیسری قسم کو Actions مقدمات کا نام دیا گیا ہے۔ اسلامی قانون کی کتاب کو کھولیے تو پہلے عبادات ملیں گی یعنی نماز' روزہ' حج' زکوۃ۔ اس کے بعد معاملات ملیں گے اس کے

بعد قانون تعزیرات ہوگا۔ اگر رومی قانون سے اسلامی قانون متاثر ہوا ہوتا تو کم از کم ان خالص تکنیکی چیزوں میں تو اس کے اثرات باقی رہتے یعنی اسلامی قانون بھی اشخاص' مال اور مقدمات پر مبنی ہوتا۔ لیکن ایسا بالکل نہیں ہوتا۔ پھر اس کو بھی دیکھیے کہ اسلامی قانون میں بلا استثناء حنفی' مالکی' شافعی اور شیعہ وغیرہ تمام فرقوں کی کتابوں میں عبادات کا ذکر پہلے آتا ہے لیکن رومی قانون کی کسی کتاب میں عبادات کا کبھی ذکر نہیں آتا۔ غرض یہ کہ اسلامی قانون پر اگر رومی قانون کا اثر پڑا ہے تو جن لوگوں کو اس کا دعویٰ ہے وہ اس کا ثبوت پیش کریں۔ ہمیں تو کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

۱۶۱۔ اس سلسلے میں ایک اور چیز بھی بیان کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ جس زمانے میں مسلمانوں نے ان علاقوں کو فتح کیا جو بیز نطینی سلطنت کا حصہ تھے' اس زمانے میں وہاں پر رومی قانون نافذ ہی نہیں تھا' مختلف وجوہ سے مقامی باشندوں کو خود مختاری دے دی گئی تھی اور ان کے معاملات عدلیہ کو ان کے مذہب کے افسروں یعنی پادریوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جب رومی قانون کا اس علاقے میں وجود ہی نہیں تھا' جہاں مسلمانوں نے قبضہ کیا تھا' تو اس سے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک اور چیز بھی ہمارے مؤلف بیان کرتے ہیں کہ رومی قانون کی تعلیم شہر بیروت میں ہوتی تھی۔ بعض مؤلفوں نے کہا ہے کہ غالباً اس مدرسہ کے اثرات مسلمانوں پر پڑے ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مدرسہ اسلام سے دو سو سال پہلے بند ہوچکا تھا۔ اس زمانے میں وہاں اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ غرض اگر اس کتاب "هل للقانون الرومي تاثير على الفقه الاسلامي" کو پڑھیں' جو آپ کے کتب خانے میں آچکی ہے' تو آپ کو وہ ساری دلیلیں مل جائیں گی جو ان مختلف مؤلفوں نے اپنے نظریہ کے سلسلے میں پیش کی ہیں۔

۱۶۲ سوال ۔ ۸ کل آپ نے ایک سوال کے جواب کے سلسلے میں فرمایا تھا کہ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے امت مسلمہ کا اجماع دور صدیقی میں' مانعین زکوٰۃ کے بارے میں ہوا حالانکہ سب سے پہلے اجماع خلافت صدیقی پر ہوا تھا۔

جواب : ممکن ہے آپ کا بیان صحیح ہو۔ میں نے کہا تھا کہ شاید پہلا اجماع مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے بارے میں ہوا۔ باقی آپ کا جو بیان ہے کہ اجماع خلافت صدیقی پر ہوا' اس میں مجھے ذرا تامل ہے آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ چند صحابہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کبھی بیعت نہیں کی' چند نے کچھ دیر سے کی' اور اجماع کے معنی ہیں کہ سب متفق ہوں' ایک بھی

خارج نہ ہو' ورنہ اجماع نہیں ہوتا۔ غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کبھی بیعت نہیں کی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ بننے کے بعد جب جنگیں شروع ہوئیں تو ایک فوج میں شریک ہوکر مدینہ سے بھی چلے گئے اور ان کی وفات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانے میں اسی عدم بیعت کی حالت میں ہوئی۔ کچھ لوگ دیر سے بیعت کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ سے آپ سب لوگ واقف ہیں۔ ان حالات میں اس کو اجماع کہنے میں مجھے ذرا تامل ہے۔

۱۶۳ سوال ۹۔ شرعی قانون کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس کے ساتھ روحانی برتری اور تقدس کا تصور وابستہ ہوتا ہے۔ جو قانون موضوعہ کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس پر روشنی ڈالیے۔

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ اس پر کوئی روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں' آپ خود جس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں وہی کافی ہے۔ اسلامی قانون پر اگر عمل کریں تو صرف حکومت کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو دوزخ میں نہیں بھیجا جائے گا۔ اگرچہ غلام کو اپنے آقا کے احکام کی تعمیل پر جزا دینے یا انعام دینے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا وہ اپنے فریضہ کو انجام دے رہا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے۔ بے پایاں رحمت سے۔ اپنے غلام کو فرائض منصبی کی انجام دہی پر جنت کا بھی وعدہ کیا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو دنیوی قانونوں میں آپ کو نظر نہیں آئے گا۔

۱۶۴ سوال ۱۰۔ ایک اسلامی حکومت بین الاقوامی تعلقات میں دوسری مملکت سے تجارت بھی کرتی ہے۔ آج کل سب مملکتیں اپنا کاروبار سود کی بنیاد پر چلا رہی ہیں۔ اسلامی بین الاقوامی قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

جواب : میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ اگر آپ تجارت کریں تو سود کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اگر آپ قرض لیں تو سود کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اگر مسلمان آپس میں تجارت کا انتظام کریں اور باہم سود نہ لیں اور قرض کی صورت میں زیادہ سے زیادہ مضاربت کے اصول پر عمل کریں تو ہم سود سے بچ سکتے ہیں۔ انٹرنیشنل اور غیر انٹرنیشنل لا کے باعث سود کے متعلق اسلامی احکامات بدل نہیں سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس پر عمل کر سکتے ہیں یا نہیں کر سکتے۔ جب تک ہم غلام رہے' انگریز ہم پر برائی مسلط کرتے رہے۔ ہم مجبور تھے' لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ ہمارے پاس صلاحیتیں بھی ہیں' امکانات بھی ہیں جن سے مدد لے کر ہم

اپنے آپ کو اس سے بچا سکتے ہیں۔

۱۹۵ سوال :۱۱ مجید خدوری ایک عراقی عیسائی ہے۔ اس نے اپنی کتاب Islamic Law of Nations میں جہاد کی تعریف یوں کی ہے

" Jihad is a collective duty imposed upon Muslims to fight the unbeliever wherever he is. آپ نے اپنی کتاب The Muslim Conduct of State میں Islamic Faith اور Islamic Rules میں فرق کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ Islamic rule is estabilished by all means, Including jihad کیا اس نوعیت کا جہاد' اقوام متحدہ کے چارٹر سے متصادم نہیں۔ موجودہ دور میں جہاد کے قابل عمل ہونے پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں؟

جواب : مجھے یاد نہیں کہ آیا میں نے اپنی کتاب میں صرف یہ جملہ لکھا ہے' جہاں تک میں کہہ سکتا ہوں' اسلام نے جارحیت شروع کرنے کی اجازت نہیں دی صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی آیت ہے و قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلو نکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (۲ : ۱۹۰) یعنی ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ اس کے معنی دفاعی جنگ کے ہوں گے۔ قاتلوا فی سبیل اللہ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالٰی کے لیے جنگ کرو۔ اپنی بڑائی' برتری یا کسی اور دنیاوی فائدے کے لیے نہیں۔ اسے جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ باوجود جنگ شروع ہو جانے کے "تعدی اور تجاوز نہ کرو" بلکہ ایک ایسا برتاؤ ہو جو انسانیت کے لحاظ سے قابل قبول ہو۔ جب جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں' صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے تو پھر پر امن بقائے باہمی (Peaceful Co - existence) کے سلسلے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ اسلام خود یہی چاہتا ہے۔ ایک چھوٹا سا نکتہ اس سلسلے میں آپ سے بیان کر دوں۔ انجیل میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کا قول ہے جو' نقل کفر کفر نباشد کے طور پر' دھراتا ہوں۔ جو لوگ امن لاتے ہیں وہ اللہ کے بیٹے کہلاتے ہیں۔ یہاں امن لانے والے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ "مسلم" کا ترجمہ ہے۔ اس مشہور حدیث سے آپ واقف ہوں گے۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ مسلم کے معنی ہیں امن لانے والا۔ تو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے قول کا میں یہ ترجمہ کروں گا۔ کہ مسلمان ہی اللہ کے بیٹے ہیں یعنی اللہ تعالٰی کے محبوب بندے اور جب اسلام

خود امن پر زور دیتا ہے تو یہ کہنا کہ اسلام پر امن بقائے باہمی کے اصول کے خلاف ہے۔ میرے خیال میں درست نہیں ہو گا۔ باقی مجید خدوری کے اس بیان سے مجھے اتفاق نہیں کہ "To fight the unbeliever, wherever he is" جب تک اس کی تشریح نہ کی جائے اس وقت تک یہ بیان گمراہ کن ہو گا۔ البتہ یہ چیز صحیح ہے کہ اگر اعلان جنگ ہو چکا ہے تو دشمن کے لوگ جہاں بھی ہوں ہمیں ان سے جنگ کرنے کا حق ہوتا ہے۔ لیکن یہ حق ہمارے دشمن کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس قدر جواب آپ کے لیے کافی ہو گا۔

۱۲۶ سوال ۱۲۔ صرف لینن گراڈ میں Blockade کے نتیجہ میں بارہ ملین انسان لقمہ اجل بن گئے۔ Blockade کو جنیوا کنونشن کے آرٹیکل نمبر3 کے تحت ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی قانون بین الاقوام کا Blockade کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟ کیا کوئی Indispensable commidity of life روکی جا سکتی ہے؟

جواب: مجھے تھوڑا سا شبہ ہے کہ بارہ ملین آدمی لینن گراڈ کے محاصرہ کے دوران میں مرے۔ غالباً" پوری جنگ میں، جرمنی، روس، انگلستان، سب ملکوں کے ملا کر اتنے لوگ مرے ہوں گے۔ یہ نہیں کہ بارہ ملین آدمی صرف لینن گراڈ میں مرے ہوں۔ جہاں تک Blockade یا Siege کا تعلق ہے۔ عہد نبوی میں اس کی دو قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک تو جنگ کے دوران میں دشمن کے گاؤں یا محلے کا محاصرہ کیا جائے۔ جیسے مدینہ میں بنی قینقاع کے یہودیوں، بنی النضیر اور بنی قریظہ کے یہودیوں کا مسلمانوں نے محاصرہ کیا اور وہ بھوک سے مجبور ہو کر ہتھیار ڈالتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ چیز، اس نبوی طرز عمل کی بناء پر جائز ہو گی۔ ایک دوسری مثال خیبر کی جنگ ہے۔ وہاں بھی یہی چیز نظر آتی ہے۔ مسلمان محاصرہ کرتے ہیں۔ یہودیوں کے پاس جب تک گھر کے اندر کچھ چیزیں موجود تھیں وہ کھاتے پیتے رہے، جب مجبور ہوئے تو ہتھیار ڈال دیے۔ ایک دوسری مثال لیجئے، یہ مکہ سے متعلق ہے۔ غالباً" ٦ ھ کا واقعہ ہے۔ ایک نجدی شخص ثمامہ بن اثال رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اچھے طرز عمل سے متاثر ہو کر مسلمان ہوتے ہیں وہ خود کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے ایک منٹ پہلے میرے لیے دنیا کے بدترین شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم تھے یا پھر یہ کیفیت ہے کہ اب دنیا کے محبوب ترین شخص میرے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو چلتے ہوئے اعلان کیا کہ نجد کے غلوں کے انبار سے مکہ والوں کو اب ایک دانہ بھی فروخت نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ اپنے

وطن واپس پہنچ کر مکہ والوں کو اناج دینا بند کر دیا' جس کے باعث' ہمارے مورخ لکھتے ہیں' کہ مکہ میں قحط پیدا ہو گیا۔ کچھ دنوں تک جیسے بن بڑا کام چلتا رہا' پھر مکہ والوں نے یا شاید خود ابو سفیان نے تنگ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ تو حسن خلق کی تعلیم دیتے ہیں اور آپ کہتے ہیں لوگوں کے ساتھ احسان کرو۔ اب آپ ہی کے رشتہ دار بھوکے مر رہے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ نرمی فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ثمامہ بن اثال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھ بھیجا جائے کہ وہ برآمد کی ممانعت Blockade ختم کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل میں ہمیں دونوں طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ دشمن کو مجبور کرنے تک محاصرہ جاری رکھتے ہیں اور دشمن کو مجبور کیے بغیر کسی مصلحت سے محاصرے کو اٹھا لیتے ہیں' جس میں غالباً" یہ مصلحت ہوتی ہے کہ دشمن متاثر ہو گا۔ اسلام کے حسن سلوک کے باعث وہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ

خطبہ ٦

دین

(عقائد' عبادات و تصوف)

محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ کرام اور محترم مہمانان گرامی!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ!

۱۶۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات محض خوش اعتقادی کے لحاظ سے نہیں' واقعاتی حیثیت سے بھی بہت ہی جامع شخصیت ہے۔ اس شخصیت کی وضاحت کے لیے ایک مورخ اور سوانح نگار کو مختلف پہلوؤں کا ذکر کرنا پڑتا ہے۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری : سارے سابقہ پیغمبروں کے خصائص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ملیں گے۔

۱۶۸۔ اگر ہم لفظ نبی کے معنی محدود کرلیں کہ نبی دین سکھاتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دین کی تعلیم بھی دی ہے۔ اور اگر اس کے وسیع معنی لیں تو وہ تمام کارنامے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیے' وہ سب ہی منصب نبوت کے اجزاء یا شعبے ہوں گے۔ نبوت کی تمام شاخوں یا شعبوں کا اگر ہم علیحدہ علیحدہ ذکر کرنا چاہیں تو ایک نشست میں ساری چیزوں پر روشنی ڈالنا ناممکن ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ان سب کارناموں میں دین کی تعلیم ہی کو اولیت حاصل ہے' کیونکہ اسی کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے لے کر وفات تک' ساری عمر سعی فرماتے رہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں دین کے سلسلے میں ایک سہولت یہ حاصل ہے کہ خود آپ کی ہی ایک حدیث میں اس کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ حدیث صحاح ستہ کی ساری کتابوں یعنی بخاری و مسلم وغیرہ میں موجود ہے۔ ایک روایت میں یہ صراحت بھی آتی ہے کہ اس واقعے کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری دور بلکہ شاید آخری سال سے ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ ایک دن ایک اجنبی مسجد نبوی میں داخل ہوتا ہے' جسے کوئی نہیں پہچانتا۔ اس کے جسم پر سفید براق کپڑے ہیں اور اس کے سر کے بال بے حد سیاہ ہیں۔ لکھا ہے کہ وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر' آپ کے سامنے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا اور پوچھا کہ اے محمدؐ! ایمان

کیا چیز ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی اس جواب پر اجنبی سائل کہتا ہے:
"آپ نے بہت ٹھیک کہا" راوی کا بیان ہے کہ ہم سب لوگ حیرت زدہ تھے کہ یہ کون ہے جو سوال بھی پوچھتا ہے اور جواب کی توثیق بھی کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس نے دوسرا سوال کیا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ اس کی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریح فرمائی۔ اس جواب پر بھی اس نے کہا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" پھر پوچھا کہ احسان کیا چیز ہے؟ احسان کی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریح فرمائی۔ اس پر بھی یہی کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے آخری سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ تھے کہ "اس بارے میں سائل سے زیادہ مجھ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی علم نہیں۔" یعنی نہ میں جانتا ہوں اور نہ تم جانتے ہو۔ صرف خدا ہی جانتا ہے۔ اس کے بعد وہ شخص اٹھا اور باہر چلا گیا۔۔۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے کہا کہ دیکھو' یہ کون ہے؟ وہ اس کے پیچھے گئے اور چند لمحوں میں واپس آکر کہا کہ وہ غائب ہو گیا ہے' معلوم نہیں اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ دو مختلف روایتوں میں دو مختلف طریق سے بیان ہوا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً کہا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ چند دن کے بعد کہا کہ یہ شخص جبرئیل علیہ السلام تھے جو تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔ جس روایت میں ہے کہ کئی دنوں کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا اس روایت میں اس جملے کا اضافہ بھی ہے کہ آج تک جبرئیل علیہ السلام کو پہچاننے میں دشواری پیش نہیں آئی' کہ میں نہ پہچان سکوں۔ گویا اگر جبرئیل علیہ السلام امتحان کے لیے آئیں تو یہ ضروری نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو پہچان سکیں۔ بہر کیف اس حدیث میں تین چیزوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایمان کیا چیز ہے؟ اسلام کیا چیز ہے؟ احسان کیا چیز ہے؟ انھیں تین باتوں کو بالفاظ دیگر عقائد' عبادات اور تصوف کہا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ موضوع غیر دلچسپ ہے کہ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایمان سے کیا مراد ہے؟ اللہ کو ایک ماننا' رسول اللہؐ کو ماننا۔ اسی طرح عبادت کے بارے میں ہم میں سے ہر شخص واقف ہے کہ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ چار چیزیں ہم پر فرض ہیں۔ کچھ باتیں تصوف کے متعلق بھی ہر شخص کو معلوم ہیں۔ لیکن اگر ہم ان میں سے ہر چیز کے مختلف پہلوؤں کو لے کر دیگر مذاہب سے مقابلہ کریں تو اس موضوع میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۶۹۔ پہلے ایمان اور عقائد کو لیجیے۔ اس کے بہت سے اجزا اور عناصر ہیں۔ مثلاً "توحید الٰہی پر

ایمان' اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان' اس کے رسولوں پر ایمان' فرشتوں پر ایمان' آخرت اور روز جزاء پر ایمان' خیر و شر کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان۔ اگر ہم ان عقائد کا دیگر مذاہب کے مماثل عقائد سے مقابلہ کریں تو اسلام کی امتیازی حیثیت ظاہر ہوتی ہے اور ایسے نکتے نظر آتے ہیں جن پر واقعی آدمی سر دھننے لگتا ہے۔ عقائد کے سلسلے میں پہلی چیز اللہ پر ایمان ہے۔ بعض ادیان اللہ کے ایک ہونے کے قائل ہیں اور اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان بھی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ عیسائی بھی' جن کے متعلق عام طور پر یہ تصور ہے کہ وہ تثلیث پر ایمان رکھنے کے باعث ایک نہیں بلکہ تین خداؤں کو مانتے ہیں۔ اسی طرح پارسی بھی خدا کے ایک ہونے پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں بھی بعض فرقے ایسے ہیں جو توحید ربانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ اسلام کا نظریہ توحید' بہ نسبت اور دینوں کی تعلیم کے زیادہ معقول' زیادہ سادہ اور زیادہ اچھا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائیوں کے ہاں' جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا' تثلیث کا تصور پایا جاتا ہے۔ لیکن کسی عیسائی سے پوچھو اور اس سے کہو کہ تم تین خداؤں پر ایمان رکھتے ہو تو وہ تم سے لڑ پڑے گا۔ کہے گا قطعاً" نہیں' ہم ایک ہی خدا کو مانتے ہیں : باپ' بیٹا اور روح القدس' یہ تینوں ایک ہی خدا کے مظہر ہیں۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ صرف چند اشارے کروں گا کہ ان کا یہ بیان' کہ تثلیث سے مراد توحید ہی ہے' داخلی تضاد کے باعث ناقابل قبول ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ابھی حال ہی میں کوئی سال ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرا پیرس میں ایک عیسائی ادارے کی طرف سے مجھے دعوت ملی کہ کسی اسلامی موضوع پر لیکچر دوں اور اس میں اسلامی عقائد کا ذکر کروں۔ وہاں میرا تعارف کراتے ہوئے وہاں کی پرانسٹنٹ یونیورسٹی کے ریکٹر (Rector) نے بظاہر مجھ کو سمجھانے کے لیے اصرار اور تکرار سے کہا کہ عیسائی تین خداؤں کو نہیں مانتے ایک ہی خدا کو مانتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنی تقریر شروع کی اور اس کا مجھے جواب دینا ایک لحاظ سے ضروری ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اگر عیسائی واقعی صرف ایک خدا کو مانتے ہیں تو بسرو چشم' لیکن عیسائیوں کے ہاں ایک طرف اصرار کے ساتھ یہ ادعاء ہے کہ خدا ایک ہے اور دوسری طرف ان کے ہاں آمنت باللّٰہ کی طرح کی جو Creed پائی جاتی ہے اس میں ایسی چیزیں بیان ہوتی ہیں جو اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ تردید کرتی ہیں۔ غالباً آپ کو علم ہو گا کہ جس طرح مسلمانوں کے ہاں آمنت باللّٰہ و ملائکتہ و کتبہ ورسلہ کی طرح ایک (Creed) پائی جاتی ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کے ہاں بھی ہے' جس کے الفاظ کم و بیش اس طرح ہوتے ہیں کہ

میں خدا پر ایمان لاتا ہوں اور خدا کے اکلوتے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتا ہوں۔ جن کو فلاں بادشاہ کے زمانے میں تکلیف دے کر صلیب پر مارا گیا۔ پھر وہ جہنم میں گئے، تین دن وہاں رہے اس کے بعد آسمان پر گئے وہاں خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے۔ آئندہ زمانے میں وہ دو بارہ آئیں گے تاکہ زمین پر زندوں اور مردوں کا حساب لیں۔ پھر اس کے بعد کچھ اس طرح کے الفاظ ہوتے ہیں کہ "گوشت پوست ہی کے ساتھ ہمارا حشر ہوگا اور ابدی زندگی حاصل ہو گی۔" تو میں نے اشارہ کیا کہ "اگر یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر جانے کے بعد خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے تو کوئی شخص خود اپنے داہنے ہاتھ پر نہیں بیٹھتا۔ اس کے معنی یہی ہوں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام الگ ہیں اور خدا الگ ہے۔ وہ خدا کے معزز مہمان ہو سکتے ہیں کہ خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہیں لیکن وہ خود خدا نہیں ہو سکتے۔" اس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں کے ہاں توحید کا تصور ہونے کے باوجود اس کا اظہار (Formulation) اس طرح ہوتا ہے جو قابل قبول نہیں رہتا بلکہ خود اپنی تردید کرتا ہے۔

۱۷۰۔ غرض توحید کے متعلق مسلمانوں کا تصور اتنا سادہ ہے اور اس قدر پر زور ہے کہ اس طرح کی کوئی چیز دوسرے مذاہب میں نظر نہیں آتی۔ ابھی میں نے پارسیوں کے مذہب کا ذکر کیا ہے۔ زردشت بھی خدا کے ایک ہونے کا قائل ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہاں ثنویت یعنی دو خداؤں کا تصور بھی پیدا ہو گیا ہے۔ زرتشت کہتا ہے کہ برائی کو خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ نہ صرف یہ کہ خدا خود برا کام نہیں کرتا۔ بلکہ یہ بھی کہ برائی کا پیدا کرنے والا بھی خدا نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا کی ذات کے منافی ہے کہ خدا جیسی پاک ہستی برائی کو پیدا کرے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ برائی کا خالق الگ ہے اور بھلائی کا خالق الگ ہے۔ اس طرح دو الگ خالق یا خدا ہیں۔ یہ نظریہ تو نیک نیتی پر مبنی ہے کیونکہ خدا کی عظمت کا احترام کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ خدا برائی پیدا نہیں کرتا لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا میں چونکہ اکثر اوقات برائی کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اور بھلائی کو شکست ہوتی ہے، گویا بھلائی کا خدا مغلوب ہو جائے، کیا ہم اسے خدا تسلیم کریں گے؟ علمی نقطۂ نظر سے یہ دشواریاں جو اس طرح کے تصورات سے پیدا ہوتی ہیں وہ اسلامی تعلیم توحید میں بالکل نہیں، اسلامی عقیدہ توحید میں زور دیا گیا ہے کہ اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں۔ ایک طرف کامل نفی ہے۔ دوسری طرف استثناء کے ذریعے سے محدود بھی کر دیا گیا ہے کہ صرف یہی اللہ ہے۔ یہ زور بیان کسی اور مذہب کی تعلیم میں نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ یہودیوں کے ہاں بھی صرف اتنا ہے کہ

خدا ایک ہے لیکن یہ زور کہ لا الہ الا اللّٰہ (کوئی معبود نہیں بجز اللہ کے) وہ امر ہے جو یہود کی تعلیم میں بھی نہیں ملتا۔

١٧١۔ اس کے بعد دوسرا عقیدہ فرشتوں سے متعلق ہے۔ اس کو بھی اکثر مذہب قبول کرتے ہیں۔ پارسی' یہودی' عیسائی اور مسلمان سب اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن وقت کی کمی کے سبب میں اس پر بحث نہیں کروں گا۔

١٧٢۔ اس کے بعد عقائد کا تیسرا جزو کتابیں ہیں یعنی میں اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان لاتا ہوں۔ یہ اتنا اہم کلمہ ہے کہ اس کے مماثل ہمیں کوئی چیز دوسرے مذاہب میں نظر نہیں آتی' وہ اس لیے کہ اگر یہاں یہ کہا جاتا "میں کتاب پر ایمان لاتا ہوں" یعنی قرآن مجید پر تو یہ صرف ایک کتاب ہوتی لیکن ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ایک کتاب پر نہیں بلکہ خدا کی بھیجی ہوئی ساری کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس عقیدے میں ایک طرف فراخ دلی اور وسیع القلبی کا پہلو ہے اور دوسری طرف اسلام کے عالمگیر ہونے اور ابتداء سے لے کر قیامت تک مسلسل جاری رہنے کا تصور بھی ہے۔ کیونکہ اگر ہم کتابوں پر ایمان لائیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنی بھی کتابیں آئی ہیں وہ سب مختلف لوگوں کی نہیں ہماری اپنی کتابیں ہیں۔ مثلاً توریت یہودیوں ہی کی کتاب نہیں بلکہ ہماری کتاب بھی ہے۔ انجیل عیسائیوں ہی کی کتاب نہیں ہماری کتاب بھی ہے۔ ایسی تعلیم ہمیں دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ عام طور پر دوسرے مذاہب والے یہ کہتے ہیں کہ سارے مذاہب غلط ہیں۔ انھیں چھوڑ دو۔ صرف ہمارا مذہب سچا ہے۔ میں بھی بطور مسلمان کے یہی کہوں گا کہ میرا دین سچا ہے لیکن دوسرے مذاہب بھی اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے سچے اور الٰہی مذاہب ہیں' اگرچہ ان پرانے مذاہب پر عمل نہیں کرتا۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی ساری کتابیں خدا ہی کا حکم ہیں اور اسی بنا پر ہمارے لیے قابل احترام ہیں۔ مگر اس اصول کی بنا پر کہ آخری احکام واجب التعمیل رہتے ہیں اور اس سے پہلے کے احکام منسوخ سمجھے جاتے ہیں' ہم آخری کتاب پر عمل کرتے ہیں۔ اس سے پہلے کی کتابوں پر عمل تو نہیں کرتے لیکن ان کو تسلیم ضرور کرتے اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ اس میں ایک نفسیاتی فائدہ اور بھی ہے اگر میں کسی یہودی یا کسی عیسائی کو یہ کہوں کہ تیرا مذہب جھوٹا ہے۔ تیری نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تو اسلام قبول کر لے۔ تیرے پاس جو کتابیں ہیں وہ لغو اور جلا دینے کے قابل ہیں' تو اسے دکھ ہو گا۔ اور غالباً وہ جوش غضب سے اس

قدر مغلوب ہو جائے گا کہ اسلام کی حقانیت کے بارے میں میری کوئی بات سننے یا ماننے کے لیے تیار نہ ہو گا۔ اس کے برخلاف اگر میں اس سے یہ کہوں کہ تمھارا دین بھی سچا ہے۔ تمھارے ہاں کی کتاب بھی سچی ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب ہے اور وہی اللہ' جس نے تمھیں یہ کتاب دی' اس نے ایک آخری کتاب بھی بھیجی ہے۔ تم اس کو پڑھو اور غور کر کے دیکھو کہ اس میں کیا بیان ہوا ہے' وہ نسبتاً" زیادہ خوش دلی کے ساتھ اس کو پڑھنے اور غور کرنے کے لیے تیار ہو گا۔ اسی طرح اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا ہے' اس میں بھی وہی فراخ دلی' وسیع القلبی' تحمل اور روا داری کا پہلو نظر آتا ہے۔ میں نے مسند احمد بن حنبل میں ایک حدیث پڑھی ہے جو دوسری کتابوں میں بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے ہیں' جن میں ۳۱۵ رسول تھے۔ گویا ۳۱۵ صحیفے نازل ہوئے۔ باقی ایک لاکھ تیئیس ہزار چھ سو پچاسی پیغمبروں نے اپنے اپنے پیش رو نبی کی کتاب پر عمل جاری رکھا۔ ظاہر ہے کہ سارے پیغمبر مختلف زمانوں اور دنیا کے مختلف ملکوں میں آئے ہوں گے۔ اور ان کی زبانیں بھی مختلف رہی ہوں گی کہ ما ارسلنا برسول الا بلسان قومہ (قرآن' ۱۴: ۴)۔ •

۱۷۳۔ پیغمبر کے منصب اور مقصد کے بارے میں بھی مختصراً" کچھ عرض کر دوں تو بہتر ہو گا۔ کیونکہ اس بارے میں مختلف مذاہب میں کچھ تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے' بعض مذاہب میں عقیدہ یہ ہے کہ اللہ انسان کے قالب میں جنم لیتا ہے جس شخص کے اندر اللہ حلول کر جاتا ہے اس کا ہر قول اللہ کا قول اور ہر فعل اللہ کا فعل ہوتا۔ دوسرا تصور یہ ہے کہ اللہ اپنے کسی برگزیدہ بندے کے پاس اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ یہ پیغام اس تک مختلف طریقہ سے پہنچایا جاتا ہے۔ کبھی تو اللہ کی آواز براہ راست اس نبی کے کان تک پہنچتی ہے' جیسا کہ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ خدا نے ان سے بات کی' کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ پیغام ایک فرشتہ لاتا ہے اور انسان تک پہنچاتا ہے۔ فرشتے کا لفظ فارسی مصدر "فرستادن" کا اسم مفعول ہے یعنی بھیجا ہوا۔ اس سے مراد وہ نوری مخلوق ہے جو اللہ کا پیغام انسان تک پہنچاتی ہے۔ ان فرشتوں میں یہ خامی نہیں ہوتی کہ پیغام کا کوئی جزو بھول جائیں یا اس کے پہنچانے میں کوئی غلطی کریں۔ فرشتے خدا کا جو پیغام لاتے ہیں' اس کو ہم اصطلاحاً" "وحی" کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وحی کیا چیز ہے؟ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں' اور اسلام پر اعتراض کرتے رہے ہیں' وہ وحی پر بھی اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

یہ ایک بیماری ہے۔ گزشتہ صدی کا ایک مشہور جرمن مستشرق اشپرنگر برطانوی دور حکومت میں ہندوستان میں رہا تھا۔ اس نے علم طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی دان بھی تھا۔ چنانچہ اس نے سیرت النبی پر جرمن کتاب میں عربی ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن وحی کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مرگی کی بیماری معلوم ہوتی ہے۔ نزول وحی کے متعلق عربی کی کتابوں میں جو روایات اور بیانات ہیں کہ جب وحی آتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ ہو جاتا، آپ پسینے پسینے ہو جاتے اور سکتے کا عالم طاری ہو جاتا۔ تو اشپرنگر کہتا ہے کہ یہ علامات مرگی کی ہیں۔ چونکہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں، کہہ نہیں سکتا کہ اس کا یہ بیان کس حد تک صحیح ہے۔ بہر حال اس نے یہ اعتراض کیا ہے، لیکن اس کے متعلق اگر میں اپنی رائے ظاہر کر سکوں تو وہ یہ ہے کہ اشپرنگر نے وحی کے بارے میں اور وحی کی کیفیت سے متعلق ساری معلومات جمع نہیں کیں، بلکہ صرف چند چیزیں لیں اور ان کی اساس پر کہا کہ یہ فلاں بیماری کی علامات ہیں۔ میرے خیال میں یہ صحیح علمی اور دیانتدارانہ طریقہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ میں نے وہ حدیثیں جمع کیں جن میں وحی کے نزول کے وقت کا مشاہدہ مختلف صحابیوں سے مروی ہے۔ مثلاً ایک صحابی فرماتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ فلاں دن یکایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت متغیر ہو گئی۔ وحی نازل ہونے لگی اور اس وقت کی یہ کیفیت چند لمحوں کے بعد دور ہو گئی اور رسول اللہؐ اپنی معتاد بشری حالت میں آ گئے، وغیرہ وغیرہ۔ ایسی جو حدیثیں میں نے جمع کیں ان میں ایک بات غیر معمولی ہے، جس کی طرف اشپرنگر کے بیان میں کوئی اشارہ تک نہیں چہ جائیکہ وہ اس کی توجیہ یا اس سے استدلال کی کوشش کرتا۔ وہ یہ ہے کہ جب وحی نازل ہوتی ہے تو وہ تمام صحابہ جن کو اس کا مشاہدہ ہوا تھا، کہتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے بوجھل ہو جاتے کہ اس بوجھ کا تحمل تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ چنانچہ اگر آپ کسی اونٹنی پر سوار ہوتے اور اس وقت وحی نازل ہونے لگتی تو اونٹنی آپ کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکتی اور مجبور ہو جاتی کہ بیٹھ جائے۔ اگر وہ بیٹھنا نہ چاہتی یا بیٹھ نہ سکتی تو اس کے پاؤں سیدھے ہو جاتے اور اکڑنے لگتے، گویا کہ وہ اب چیخ کر ٹوٹ جائیں گے، ایک اور روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں کی کثرت تھی۔ حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زانو میرے زانو پر تھا۔ آپ پر وحی نازل ہونے لگی۔ اتنا بوجھ محسوس ہوا کہ مجھے خوف ہوا کہ میری ران کی ہڈی چیخ کر ٹوٹ جائے گی۔ رسول اللہؐ کی ذات نہ ہوتی تو میں چیخ کر اپنا پاؤں کھینچ لیتا۔

میرے لیے تقریباً ناممکن تھا کہ میں آپ کا بوجھ سہار سکوں۔ جیسا کہ میں نے کہا اس کی توجیہ اشپرنگر کے بیان میں اور اعتراض کی عبارت میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور مؤلفوں نے بھی خیال آرائی کی ہے لیکن وہ بھی اس نکتے پر چپ سادہ لیتے ہیں اور اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ بات میرے نزدیک بہت اہم اور غیر معمولی ہے۔ مجھے یا آپ کو ایسی کیفیت کبھی پیش نہیں آ سکتی۔ عام بشری کیفیت پر قیاس کر کے میں اس کی توجیہ کبھی نہیں کر سکوں گا کہ وحی کیا چیز ہے؟ وحی صرف پیغمبر پر آتی ہے اور پیغمبر کی بھی چوبیس گھنٹے وہ حالت نہیں رہتی بلکہ کبھی کبھی اللہ کوئی پیغام بھیجتا ہے تو اس پر وہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک طرف یہ چیز ہے دوسری طرف میرے ایک ڈاکٹر دوست نے مرگی کی بیماری کے متعلق علمی نقطۂ نظر سے کچھ تازہ ترین معلومات مہیا کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرگی کا بیمار تشنج کی حالت میں ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں مارتا ہے، بے قرار ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی زبان سے کچھ آوازیں نکلتی ہیں لیکن وہ بالکل ناقابل فہم ہوتی ہیں۔ وہ کچھ کہتا ضرور ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جسے ہم سننے والے سمجھ سکیں اور یہ کہ مرگی والے شخص کی اولاد میں بھی یہ مرض منتقل ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں غور کرنا چاہیے کہ تشنج اور ہاتھ پاؤں مارنے اور بے قرار ہو جانے کا کوئی ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور وحی کے مشاہدات سے متعلق روایتوں میں نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے مرگی کا انتساب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف درست معلوم نہیں ہوتا اس کے برعکس ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ رسول اللہ وحی کے وقت ہمیشہ ساکت و صامت ہو جاتے تھے۔ یہ نہیں کہ آپ ہاتھ پاؤں مارتے تھے یا تشنج کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، کبھی نہیں کبھی بھی نہیں۔ ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا۔ دوسری چیز ہمیں یہ بھی نظر آتی ہے کہ وحی کے دوران شروع سے آخر تک اور وحی کے ختم ہو جانے کے بعد رسول اللہؐ کی زبان سے جو آوازیں نکلتیں وہ قابل فہم عبارتیں ہوتیں، یعنی قرآن کی آیتیں جن کو سن کر ہر شخص سمجھ سکتا تھا، یہ نہیں کہ جانوروں کی طرح چیخیں مارتے ہوں یا جیسے کہ بیمار بعض اوقات کراہتا ہے اور ایسی آوازیں نکالتا ہے جو سمجھ میں نہیں آ سکتیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ ایک زمانے میں وحی کے دوران ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلند آواز سے وحی سناتے۔ بعض اوقات وحی کے ختم ہونے کے بعد سناتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک آیت ہے کہ لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ (۷۵: ۱۶) یعنی ابتداء ہی سے جیسے جیسے وحی نازل ہوتی اور جیسے جیسے فرشتہ آپ کو کچھ الفاظ پہنچاتا رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت اس کو باآواز بلند دہراتے رہتے۔ اس طرح کی فوری تبلیغ آپ کی نیک نیتی پر مبنی تھی کہ کچھ بھول نہ جائیں تو اللہ نے کہا ایسا نہ کریں۔ پہلے سکون کے ساتھ پوری وحی کو سن لیں۔ وہ آپ کے ذہن سے غائب نہیں ہوگی' ہم اسے محفوظ رکھیں گے۔ وحی کا نزول ختم ہونے کے بعد آپ اسے دوسروں تک پہنچائیں۔ اس کے بعد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس معمول کو بدل دیا اوروحی کے اختتام تک سکوت فرماتے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں ہمیں نظر آتا ہے۔ کہ مرگی کی بیماری' تشنج وغیرہ بے معنی آوازوں کا آپ کی زبان سے نکلنا' ان باتوں کا وہاں کوئی وجود نہیں ہے۔ اسی طرح رسول اکرمؐ کو چھ سات لڑکے لڑکیاں ہوئیں اور لڑکیوں کی اولاد اب تک دنیا میں باقی ہے اور مرض کے توارث سے تاریخ ساکت ہے۔

۱۷۴۔ اس کے علاوہ ایک طویل فہرست ایسی حدیثوں اور روایتوں کی ہے جن میں لکھا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے۔ یکایک آپ کی حالت غیر ہوگئی اور وحی نازل ہونے لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے آواز نکلنا بند ہوگئی اور آپ چپ چاپ کھڑے رہے۔ چند لمحوں کے بعد وہ حالت دور ہوگئی۔ پھر آپ نے خطبہ دینا شروع کیا اور فرمایا کہ مجھ پر ابھی فلاں وحی نازل ہوئی ہے اور اس کی تبلیغ فرمادی۔ ایک دوسری روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانا کھا رہے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک گوشت کا ٹکڑا تھا۔ یکایک آپ پر وحی نازل ہونا شروع ہوگئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ حالت دور ہوگئی۔ وہ ٹکڑا بدستور آپ کے ہاتھ میں رہا' گرا نہیں' یعنی اپنی ذات پر آپ کا کنٹرول برقرار رہا۔ اس طرح کی اور حدیثیں بھی ہیں جن میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ وحی کے نزول کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آپ پر ویسا ہی کنٹرول رہتا تھا جیسا کہ عام حالت میں ہوتا ہے' سوائے اس فرق کے کہ اس وقت آپ بے حرکت ہو جاتے اور آپ کے جسم سے پسینہ نکلنے لگتا۔ حتی کہ انتہائی شدید سردی کے زمانے میں بھی پسینے کے قطرے ایک قطار کی صورت میں آپ کی پیشانی سے گرنے لگتے۔ اس کے سوا اور کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یا یہ کہ آپ کے چہرے کا رنگ' چند لمحوں کے لیے غالباً خون کی تیز گردش کی وجہ سے' سرخ ہو جاتا یا ذرا سانولا ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ہمیں اور کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

۱۷۵۔ مغربی مورخوں کی تالیفات میں ایک اور چیز بھی نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب وحی نازل ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹ جاتے اور آپ کے چہرے کو ڈھانپ دیا جاتا' جیسا

کہ پرانے کاھنوں کی عادت تھی۔ میں نے اس بارے میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ آپ کے چہرے کو ڈھانپ دینا اور آپ کا لیٹ جانا' صرف ایک مرتبہ پیش آیا' ورنہ عام طور پر ایسی کوئی صورت کبھی واقع نہیں ہوئی۔ مثلاً اونٹنی پر ہیں' یا منبر پر کھڑے ہوئے خطبہ دے رہے ہیں تو وہاں چہرے یا جسم کو کسی کپڑے سے ڈھانپ دینے اور آپ کے لیٹ جانے کی کوئی صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ ایک واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عفت کے بارے میں جھوٹے بہتان لگائے گئے تھے تو ایک دن آپ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ملنے کے لیے' ان کے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں گئے کیونکہ اس زمانے میں وہ اپنے والدین کے گھر تھیں۔ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے گفتگو کی' کچھ سوالات کیے۔ پھر یکایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول شروع ہوا۔ راوی لکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی بیوی نے احتراماً" ایک چھوٹا سا کپڑا ڈال دیا' اس خیال سے کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متغیر حالت دیکھ کر ہم ہنس نہ پڑیں یا ان پر بے ادبی سے نظر نہ پڑ جائے۔ اس ایک روایت کے علاوہ اور اس خاص واقعہ کے علاوہ کہیں یہ نظر نہیں آتا کہ وحی کے نزول کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹ جاتے ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو لوگ ڈھانپ دیتے ہوں۔ ایک اور واقعے کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس میں لیٹنے کا ذکر نہیں ہے' لیکن چہرے کو ڈھانپنے کا ایک طریقہ نکل آتا ہے' وہ یہ ہے کہ ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ مجھے اسلام لانے سے پہلے یہ معلوم ہوا تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی ہے۔ پھر اللہ نے مجھے توفیق دی اور میں مسلمان ہوا تو میری تمنا تھی کہ وحی کے نزول کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں۔ میری اس تمنا سے کچھ اور لوگ بھی واقف تھے۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ حجتہ الوداع کے موقع پر' میری موجودگی میں' یکایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے لگی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نزول وحی کی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر تمھاری یہ تمنا برقرار ہے تو آؤ میں تمھیں دکھاؤں۔ تو یہ راوی کہتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ پردے کی دوسری طرف ہم لوگ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس پردے کو ذرا سا کھینچ کر کہا: اندر دیکھ لو میں نے دیکھا رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ ہو گیا اور سانس قدرے زور زور سے لے رہے ہیں۔ اس کے بعد پھر اس پردے کو کھینچ لیا گیا اور ہم ادب سے بیٹھے رہے۔ چند لمحوں کے بعد وحی کی یہ حالت ختم ہو گئی۔ ان دو واقعات کے سوا' جن میں ایک مرتبہ چہرے پر پردہ ڈالنے کا ذکر ہے اور ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردے کے پیچھے بیٹھنے کا ذکر ہے' اور کسی روایت میں ایسی تفصیل نہیں ملتی جو کاہنوں کی حالت اور اس طرح کی چیزوں سے مشابہت رکھتی ہو۔

۱۷۶۔ بہرحال وحی کیا چیز ہے؟ اس کی تشریح ہمارے لیے ناممکن ہے کیونکہ وحی ہم میں سے کسی پر نہیں آتی۔ وحی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت جیسی ہوتی تھی اسے ہم مختلف لوگوں کے مشاہدے کے حوالے سے بیان کر سکتے ہیں۔ کچھ مشاہدے تو وہ ہیں جو میں نے آپ سے بیان کیے۔ کچھ یہ ہیں کہ ایک صحابی نے جرات کر کے ایک مرتبہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہؐ آپ پر جب وحی نازل ہوتی ہے تو اس وقت آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ وہ جواب بھی دلچسپ ہے۔ اس جواب کا ذکر کر کے میں اس بحث کو ختم کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض اوقات میرے کانوں میں گھنٹی بجتی ہے اور بہت سخت تکلیف کی حالت ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میری جان نکل جائے گی۔ اس وقت میں کچھ آوازیں سنتا ہوں۔ وہ آوازیں میرے دماغ میں پتھر پر کندہ نقش کی طرف ثبت ہو جاتی ہیں۔ اس حالت کے ختم ہونے کے بعد وہ مجھے ایسے ہی یاد ہوتی ہیں گویا کہ مجھے زبانی یاد تھیں۔ تو لوگوں کے سامنے دہراتا ہوں۔ لیکن بعض اوقات کوئی شخص نظر آتا ہے' یا تو آدمی کی شکل میں اور اس وقت وہ آدمی کی طرح مجھ سے بولتا ہے۔ بعض اوقات وہ پرندے کی شکل میں ہوتا ہے یعنی ایک ایسا انسان جس کے پر بھی ہوں اور وہ فضا میں اڑتا رہتا ہے یا کھڑا رہتا ہے اور وہ مجھے مخاطب کر کے کچھ چیزیں کہتا ہے اور میں انھیں سنتا ہوں۔ میں بھول نہیں سکتا۔ وہ میرے حافظہ میں نقش ہو جاتی ہیں' اور پھر میں انھیں دہراتا ہوں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے۔ یہ الفاظ کافی اہم ہیں کہ اتنی شدید تکلیف ہوتی ہے گویا میری جان نکل جائے گی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محسوس کرتے تھے۔ اس لیے کوئی حیرت کی بات نہیں کہ آپ کا وزن بھی اتنا زیادہ ہو جاتا تھا کہ کسی اونٹنی کو بھی اس کا تحمل ممکن نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود محسوس کرتے تھے کہ یہ غیر معمولی حالت ہے یہ ہے وحی کی کیفیت اور اس سے زیادہ ہم کوئی اور چیز بیان نہیں کرسکتے۔ یہ خصوصی کیفیت ہے جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتی

ہے اور ہم اس کو عام انسانوں کی کیفیتوں اور ڈاکٹروں کے مرض کی تشخیص سے حل نہیں کر سکتے۔

۱۷۷۔ اسلامی عقائد: آمنت باللہ و ملئکتہ و کتبہ و رسلہ کے بعد والیوم الاخر ہے یعنی آخرت کا ذکر آتا ہے۔ عقائد کے نقطہ نظر سے آخرت پر ایمان تو ہمیں لانا ہی ہے لیکن نفسیاتی نقطہ نظر سے بھی یہ بات بڑی اہم ہے کہ ہر انسان سے اس کے اعمال کے متعلق حساب و کتاب لیا جائے گا اور اس کے نیک و بد اعمال کے مطابق جزا و سزا دی جائے گی۔ آخرت اور یوم حساب پر ایمان' جزا کی امید' اور سزا کا خوف' یہ ایسے تصورات ہیں جو انسان کو اچھے کام کرنے کی ترغیب دیتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور بچاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی چیز میرے ذہن میں آتی ہے۔ ہم سب اللہ کے بندے ہیں۔ وہ ہمارا آقا ہے اگر وہ ہمیں کچھ حکم دے تو مالک ہونے کی وجہ سے ہمیں ہر حکم دے سکتا ہے اور ہمارا فریضہ ہو گا کہ ہم اسے انجام دیں۔ اگر ایک ملازم' اس سے بھی بڑھ کر ایک غلام' اپنے آقا کے احکام کی تعمیل کرے تو اس کو جزاء کے پانے کا' کسی شاباشی کے حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی غلام اپنے آقا کے حکم کی اطاعت نہیں کرتا تو سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں' میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جنت کی اصولاً" کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ صرف دوزخ کی ضرورت ہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ کی اطاعت نہ کریں تو اللہ ہمیں سزا دے سکتا ہے۔ اسے اس کا کامل حق ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے احکام کی صرف تعمیل کریں تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ اللہ ہمیں جنت انعام میں دے۔ اس کے باوجود یہ اللہ کی مہربانی اور رحمت ہے کہ ہمیں جنت بھی دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تشویق بھی ہے اور تہدید و تنبیہ بھی ہے۔

۱۷۸۔ اب میں جنت اور دوزخ کے متعلق چند الفاظ آپ سے بیان کروں گا۔ ہندوؤں کا تصور اور بدھ مت والوں کا تصور اس کے بارے میں کچھ اور ہی ہے۔ یہ دلچسپ ضرور ہے لیکن ظاہر ہے کہ اسے مسلمان قبول نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات کا وجود ازل سے ابد تک صرف اتنا ہی ہے جتنا ایک بلبلے کا وجود' جو دریا میں موج کے تلاطم سے پانی کی سطح سے اچھل پڑتا ہے پھر آن کی آن میں دوبارہ گر کر دریا کے پانی میں غائب ہو جاتا ہے۔ انسانی کی ہستی بھی اس کائنات کے محض ایک جزو کی ہے۔ اسی طرح ان کا تصور تناسخ یہ ہے کہ اگر آدمی اچھا کام کرے تو اسے جزا ملے گی' میں ابھی بیان کروں گا کہ کیا ملے گی اور اگر برا کام کرے گا تو اسے سزا ملے گی۔ ہندوؤں کے عقائد کے مطابق یہ ہے کہ وہ سزا اس برائی کی نوعیت کے مطابق ہوگی۔ اگر اس نے تھوڑی

برائی کی ہے۔ مثلاً وہ بادشاہ ہے تو وہ مرنے کے بعد غلام کے طور پر پیدا ہو گا۔ اگر اس نے اس سے بھی زیادہ برائی کی ہے تو وہ مرنے کے بعد کتا یا بلی بن جائے گا' اس کی برائی اگر اس سے بھی زیادہ ہے تو وہ درخت بنے گا' اس سے بھی بڑی برائی ہے تو وہ پتھر بن جائے گا۔ جمادات' نباتات' حیوانات یہ سب ارتقائی مدارج ہیں' اس لحاظ سے وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی کو پتھر بننے کی سزا دی گئی ہے تو اس پتھر کو ارتقاء کے ذریعے سے صدیوں کی مدت کے بعد درخت بننے کا موقع ملے گا۔ اگر درخت اپنی مدت حیات میں مفید کام کرتا رہے تو اس درخت کو صدیوں بعد جانور بننے کا موقع ملے گا۔ وہ جانور اگر اچھے کام کرتا رہے تو اسے ادنیٰ ترین قسم کا انسان یعنی شودر بننے کا موقع ملے گا۔ اگر شودر کی حیثیت سے انسان اچھے کام کرتا رہے اور اپنے فرائض انجام دیتا رہے تو مرنے کے بعد وہ ویش بنے گا۔ اس کے بعد کھتری بنے گا۔ اس کے بعد برہمن بنے گا۔ اگر برہمن کی حیثیت سے اپنی زندگی اچھی طرح گزاری تو مرنے کے بعد دوبارہ خدا کی ذات میں ضم ہو جائے گا۔ جس طرح کہ وہ بلبلہ دوبارہ پانی میں گرا اور پانی بن گیا' تو برہمن دوبارہ خدا بن جائے گا۔ اگر برہمن نے زندگی برائی کے ساتھ گزاری تو اسے وہی سزا ملے گی اور دوبارہ اس کو جانور اور درخت اور پتھر وغیرہ بننا پڑے گا۔ اور اس طرح ہزاروں لاکھوں سال گزر جائیں گے۔ یہ ان کا آواگون یا تناسخ کا تصور ہے۔ مسلمانوں کا تصور اس بارے میں جنت اور دوزخ کا ہے۔ خود قرآن میں اور حدیث میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ جنت میں جانوروں اور پرندوں کا گوشت کھانے کو ملے گا۔ وہاں شراب کی' شہد کی اور دودھ کی نہریں ہوں گی۔ تو اس کا مفہوم یہ لینا پڑے گا کہ ہمارے عرفان و شعور کے مطابق' ہمارے ذہن میں آسائش اور لذت کا جو تصور ہے اس تصور کے مطابق بتایا گیا ہے کہ جنت میں یہ نعمتیں ہوں گی۔ ورنہ قرآن مجید میں صراحت سے کہا گیا کہ وہاں وہ چیزیں ہیں جن کا تمھیں تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ جب ہمیں ان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا' جیسے کہ حدیث میں صاف الفاظ ہیں کہ جنت میں وہ چیزیں ہیں جنھیں نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھا' نہ کسی کان نے کبھی سنا' نہ کسی کے دل و دماغ میں ان کا خیال تک کبھی گزرا' پھر اسے ہم کیسے سمجھائیں گے۔ نفسانی زندگی میں انسان چاہتا ہے کہ اس کو خوبصورت بیوی ملے۔ اچھی غذائیں ملیں وغیرہ وغیرہ۔ تو قرآن مجید میں سمجھانے کے لیے ایسی ہی چیزوں کا ذکر آیا ہے جو انسان کو فطرتاً" مرغوب ہیں۔ بہرحال حور و قصور کی حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں نہ بھی ہوں تو بھی کوئی تضاد نہیں۔ کیونکہ قرآن خود کہتا ہے کہ تمھیں وہاں پر تمھاری خواہش کی ہر

چیز ملے گی۔ اور حدیث میں صراحت ہے کہ وہاں جو چیزیں ہیں ان کا تمہیں تصور بھی نہیں ہو سکتا' تو دونوں امکانات باقی رہتے ہیں۔

۱۷۹۔ عقائد کے سلسلے میں آخری چیز' کہ برائی اور بھلائی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں' بہت پیچیدہ ہے۔ اس میں ایک طرف تو پارسیوں کے مذہب کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نیکی کا خدا الگ ہے اور برائی کا خدا الگ ہے۔ اس نظریے میں منطقی اعتبار سے یہ خامی ہے کہ اگر نیکی کسی وقت مغلوب ہو جائے تو دوسرے معنوں میں اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ نیکی کا خدا مغلوب ہو گیا اور اس کے باوجود ہم اسے خدا مانتے رہیں' اسے عقل قبول نہیں کرتی۔ اس کے برخلاف اسلام کہتا ہے کہ والقدر خیرہ وشرہ' من اللہ تعالی یعنی خیر و شر دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سزا کیوں دی جاتی ہے؟ جبر و قدر کا یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ اس پر دنیا کے ہر مذہب میں صدیوں سے بحث ہوتی آ رہی ہے اور اب تک اس کا کوئی حل نہیں نکل سکا؟ اگر ہم ایک جواب دیں کہ انسان مجبور ہے اور وہی کرتا ہے جو خدا نے مقرر کر رکھا ہے تو اس پر کچھ اعتراض ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ہم یہ کہیں کہ انسان قادر ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے تو اس پر کچھ اور اعتراض ہوتے ہیں یہ ایک دوہری مشکل (Dilemma) ہے' یعنی دونوں صورتیں قابل اعتراض ہو جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سختی سے تاکید کی کہ اس بحث میں نہ پڑو۔ تم سے پہلے کی قومیں اس مسئلے پر بحث کرنے لگیں اور گمراہ ہو گئیں۔ ان حالات میں اصولاً" مجھے مزید بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہونا چاہیے' لیکن میں تھوڑی سی توضیح کرتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ اگر انسان کو مجبور قرار دیا جائے یعنی وہ ایک مشین کی طرح وہی کام کرتا ہے جو خدا نے مقرر کر رکھا ہے' تو ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم برائی کریں تو سزا کیوں دی جاتی ہے؟ یہ اعتراض اور یہ سوال ٹھیک ہے۔ لیکن یہی بھلا مانس انسان یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اگر میں بھلائی کرتا ہوں تو وہ بھی خود بخود بلا ارادہ ہو گی۔ پھر مجھے جنت کا کیا حق ہے؟ اس پر وہ چیزیں ہمارے ذہن میں نہیں آتیں بلکہ ہم خود طے کرتے ہیں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے تو اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اللہ کو معلوم نہیں کہ انسان کیا کرنے والا ہے' حالانکہ وہ عالم الغیب ہے۔ ساری اگلی اور پچھلی چیزوں کو ان کے وجود میں آنے سے پہلے سے جانتا ہے۔ اگر ہم انسان کو قادر قرار دے دیں تو اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ اللہ کو علم نہیں ہے کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور اللہ ہمارے اس کام کو' جو ہم کرنے والے ہیں' خود پیدا

نہیں کرتا بلکہ وہ ہم پیدا کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ دوہری مشکل (Dilemma) جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بحث میں نہ پڑو۔ حقیقت میں یہ دونوں مختلف سطحوں کی مختلف درجات کی اور دو مختلف مداروں میں گھومنے والی چیزیں ہیں۔ انسان کی ذمہ داری اور جواب دہی‘ زمینی تصور ہے۔ اللہ کی قدرت‘ اللہ کا مقرر کرنا‘ یہ آسمانی تصور ہے۔ ان دونوں میں کسی طرح کے تصادم کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا۔ گویا میں اپنے ہر کام کا زمینی مفہوم میں ذمہ دار ہوں‘ اور ہر چیز آسمانی مفہوم میں خدا کی طرف سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تضاد یا تصادم نہیں ہے‘ یہ اس تصور کا خلاصہ ہے۔

۱۸۰۔ ایک آخری چیز پر میں اس بحث کو ختم کروں گا۔ ایک دن یکایک میرے ذہن میں انکشاف سا ہوا اور یہ عجیب و غریب انکشاف تھا۔ وہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنا خلیفہ کیوں بنایا؟ ہم میں دوسری مخلوقات کے مقابلے میں کوئی خاص فوقیت نہیں‘ کیا یہ استبدادی فیصلہ ہے؟ یا انتخاب ہوا ہے؟ میری توجہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف مبذول ہوئی: انا عرضنا الامانته علی السموت والارض والجبال فابین ان یحملنھا و اشفقن منھا و حملھا الانسان انه کان ظلوما" جھولا" (۳۳ : ۷۲) (ہم نے ایک امانت پیش کی‘ آسمان (اور آسمانوں پر رہنے والوں) کے سامنے اور زمین (اور زمین پر رہنے والوں) کے سامنے۔ حتی کہ پہاڑوں کے سامنے بھی۔ مگر کسی کو بھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس امانت کو قبول کرے سبھی ڈرے اور سبھوں نے انکار کر دیا اگر قبول کیا تو انسان نے‘ جو ظالم بھی ہے اور جاہل بھی ہے) میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ جب خلیفتہ اللہ کا عہدہ پیش کیا گیا تو ہر مخلوق نے چاہا ہو گا کہ وہ عہدہ مجھے مل جائے۔ سب نے پوچھا ہو گا کہ کس شرط پر یہ عہدہ مل سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "تقدیر تو میں کروں گا اور ذمہ دار تم ہو گے۔" سب نے کہا ہو گا کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تقدیر تو کرے اور ذمہ دار ہم ہوں؟" سب ڈرے اور کسی نے قبول نہ کیا سوائے انسان کے‘ جو ایک ظالم اور جاہل مخلوق ہے‘ اس نے کہا یا رب میں قبول کرتا ہوں۔ اس کا یہ بھولا پن اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند آیا کہ کہا کہ اچھا میں تجھے خلیفہ بناتا ہوں۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ انسان اتنا جاہل نہیں تھا جتنا ہمیں نظر آیا ہے۔ انسان نے غالباً یہ سوچا کہ "خدا ظالم تو ہو نہیں سکتا۔ وہ مجھے اس چیز کی سزا نہیں دے گا جو میں نے نہیں کی‘ لاؤ عہدہ قبول کر ہی لیں‘ پھر دیکھا جائے گا۔ وہ غفور و رحیم ہے۔" تقدیر و تدبیر کے متعلق میرا تصور یہ ہے کہ جب انسان نے یہ قبول کیا کہ اللہ کرے اور ذمہ دار میں ہوں تو

اب اسے یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ مجھے سزا کیوں دی جاتی ہے؟

۱۸۱۔ یہ عقائد کے متعلق مختصر سی گفتگو تھی۔ اب میں مختصراً" عبادات کے بارے میں کچھ بیان کروں گا۔ اسلام اپنے محدود معنی میں اطاعت کرنے اور اپنے آپ کو دوسرے کے سپرد کر دینے کا نام ہے۔ جب جبرئیلؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز پڑھنا' روزے رکھنا' زکوٰۃ دینا اور حج کرنا۔ نماز کا مقابلہ اگر ہم دوسری قوموں اور دوسری ملتوں کی عبادات سے کریں تو ہمیں اسلام کی بڑی فوقیت نظر آتی ہے۔ یہودیوں کی عبادت کا طریقہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی معبد کو جاتے ہیں اور ان کا امام توریت کھول کر گھنٹے دو گھنٹے تک مسلسل تلاوت کرتا ہے اور سارے لوگ مرد اور عورتیں ادب کے ساتھ سنتے ہیں۔ پھر تلاوت ختم ہو جاتی ہے۔ سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں کی طرح رکوع و سجدہ' قیام و قعود وغیرہ نہیں ہوتا۔ پارسیوں کے ہاں آپ نے سنا ہو گا۔ آتش پرستی ہوتی ہے۔ اس کی بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاتا۔ صرف اشارۃ" آپ سے ذکر کرتا ہوں۔ اس کی تھوڑی سی توجیہ بعد میں کروں گا۔ ہندوؤں کے ہاں گائے کی پوجا ہوتی ہے۔ عیسائیوں کے ہاں ایک طرح سے صلیب کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ کیا چیزیں ہیں؟ بظاہر یہودی اور پارسی اور عیسائی ہماری ہی طرح کے انسان ہیں۔ صاحب عقل و فہم بھی ہیں۔ اس کے باوجود یہ کیا بات ہے کہ وہ ایسی جاہلانہ حرکات کرتے ہیں کہ آگ کی پوجا کرتے ہیں' لکڑی کی پوجا کرتے ہیں اور گائے (جانور) کی پرستش کرتے ایک دن میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کسی کی تعریف دو طرح سے ہو سکتی ہے' براہ راست بھی اور بالواسطہ بھی مثلاً کسی مصور سے ہم کہیں کہ تم بڑے ماہر مصور ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اس تعریف سے خوش ہو جائے گا۔ لیکن اگر مصور سے مخاطب ہوئے بغیر اس کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کر کے ہم کہیں کہ کیا نفیس تصویر ہے تو اس بالواسطہ حمد و ثنا سے بھی اس مصور کو اتنی ہی خوشی ہو گی جتنی راست تعریف سے ہو سکتی ہے۔ پرانے مذہبوں میں بالواسطہ حمد و ثنا کو اختیار کیا گیا۔ مثلاً جس زمانے میں پارسی مذہب وجود میں آیا' اس وقت انسان نے آگ کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ آگ سے فائدہ اٹھانا اور اس کی ہلاکتوں سے بچنا' انسان نے سیکھ لیا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا کہ اللہ کی قدرت کے مظاہر اور شواہد میں سب سے طاقتور چیز آگ ہے۔ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جو بھی اس کے قریب جاتا ہے وہ جل کر ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا پارسی مذہب کے بانیوں نے کہا کہ

ہم خدا کی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو اس کے بہترین مظہر یعنی آگ کی پرستش کرنا چاہیے۔ ہندوستان میں جب آریہ آئے تو انھوں نے اپنی زرعی معیشت میں گائے کو سب سے زیادہ مفید اور منفعت بخش پایا' تو خدا کی اس سب سے بڑی نعمت کے گن گانے لگے' اور خدا کی نعمتوں کی سب سے بڑی علامت کے طور پر اس کا احترام کرنے لگے۔ اللہ ایک منعم ہے' لہٰذا اس کا شکر ادا کرنے کے لیے وہ اس کی سب سے اچھی نعمت کی تعریف کرتے ہیں اور اس کا ادب کرتے ہیں۔ یوں بالواسطہ وہ اللہ کا ادب کرنا چاہتے اور اللہ کی تعریف کرنا چاہتے ہیں۔ یہودیوں کے ہاں اپنی عبادت میں صرف توریت کی تلاوت کی جاتی ہے۔ جس کو وہ خدا کا کلام کہتے ہیں۔ خدا کے کلام کی تلاوت ان کے نزدیک عبادت ہے۔ کلام اللہ کی تلاوت کے معنی ہیں کہ ہم اللہ کے احکام سے واقفیت حاصل کریں اس پر عمل کریں اور اس کے مطابق اس تک پہنچیں۔ اس میں ایک عمیق مفہوم ہے : اللہ موجود ہے لیکن وہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ یہ نہیں کہ وہ نہ ہو۔ وہ ہے اور ہم ہی اندھے ہیں کہ اسے دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن بن دیکھے بھی ہم اس سے محبت کرتے ہیں اور اس تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اس کا راستہ بھی ہمیں معلوم نہیں۔ یہ راستہ صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ایک اندھے کی ظاہر ہے کہ صرف آواز ہی کے ذریعے سے رہنمائی کی جاسکتی ہے۔ اس لیے اندھے عاشق کو اس کا مہربان معشوق (اللہ سبحانہ و تعالیٰ) آواز کے ذریعے سے' کلام کے ذریعے سے اپنا راستہ بتاتا ہے۔ (مثلاً آگے بڑھ' داہنے مڑ' بائیں مڑ' سیڑھیوں پر چڑھ' اتر وغیرہ وغیرہ) یہ ہے رمز جو توریت کی تلاوت میں مضمر ہے۔ عیسائیوں کے ہاں ایک طرح کی وحدانیت کا تصور بھی ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ان لوگوں کو اس پر اصرار بھی ہے۔ ان کے ہاں عبادت کے مراسم میں کئی چیزیں شامل ہیں ایک طرف تو وہ یہودیوں کی توریت ہی کی طرح سے انجیل کے اقتباسات کو عبادت کے وقت تلاوت کرتے ہیں' دوسری طرف ایک چیز ہے جسے کمیونین کا نام دیا جاتا ہے۔ کمیونین' پروٹسٹنٹ لوگوں کے ہاں نہیں ہے۔ زیادہ تر کیتھولک اور آرتھوڈکس فرقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نماز یعنی عبادت کی تکمیل ہونے کے بعد ان کا پادری انھیں روٹی کا ایک ٹکڑا دیتا ہے۔ جسے وہ کھاتے ہیں۔ اور شراب کے چند گھونٹ دیتا ہے جسے وہ پیتے ہیں اور تصور یہ ہوتا ہے کہ ہم خدا کی ذات میں مدغم ہو گئے ہیں' کیوں؟ انجیل میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب رومیوں نے گرفتار کیا اور انھیں سولی پر چڑھایا جانے والا تھا تو آخری رات کو جب وہ اپنے حواریوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے تو انھوں نے یکایک ایک روٹی

اٹھائی اور اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھا کر کہا کہ اسے کھاؤ یہ میرا جسم ہے۔ پھر ایک گلاس اٹھایا اور کہا کہ اسے پیو یہ میرا خون ہے۔ انجیل کے اس بیان کردہ واقعہ کو عیسائیوں کے ہاں بہت اہمیت دی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم روٹی کھائیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسم بن جاتے ہیں اور شراب پئیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خون بن جاتے ہیں۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں اس لیے روٹی کھانے اور شراب پینے سے ہم خدا کو اپنے اندر مدغم کر لیتے ہیں۔ یہ تصور بھی رمز کی حد تک قابل قبول ہے۔

۱۸۲۔ اب ہم دیکھیں گے کہ اسلام میں عبادت کا کیا طریقہ ہے۔ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے جس میں اللہ کی حمد و ثنا ہے یعنی گویا ہم براہ راست حمد و ثنا کرتے ہیں۔ لہذا ہمیں ضرورت نہیں کہ کسی رمز کے ذریعے سے اللہ کی حمد کریں۔ راست اور بالواسطہ دونوں چیزیں حمد کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اور اسلام نے چاہا کہ اللہ جو ذات واجب الوجود ہے اس کی تعریف بھی راست ہی ہونی چاہیے۔ بہرحال اسلام نے بتایا کہ اللہ کی تعریف خود اللہ ﷻ بتائے ہوئے الفاظ کے ذریعے سے کریں۔ یہودیوں کے ہاں توریت کے متعلق جو تصور ہے کہ اللہ کا کلام ہمارا راہنما ہے اس لیے چاہیے کہ ہم اس کی تعمیل کریں۔ اپنی نماز میں ہم بھی قرآن مجید یا کلام اللہ ہی پڑھتے ہیں۔ عیسائیوں کے ہاں کیمونین کا جو تصور ہے کہ ہم خدا کی ذات میں ضم ہو گئے' وہ ایک مادی واسطے سے ہے۔ اسلام نے دیکھا کہ اللہ کی ذات مجرد ہے' اس لئے اسے تقرب بھی مجرد طور سے ہونا چاہیے۔ وہ طریقہ مسلمانوں کے ہاں تشہد ہے۔ نماز کے اختتام کے وقت قیام' رکوع' سجود' حمد و ثنا' غرض کائنات میں سے ایک نوع کے طریقہ عبادت کے ذریعے سے اللہ کو اپنی اطاعت شعاری کا یقین دلا کر ہم اپنے آپ کو اس بات کے قابل تصور کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہو۔ جب کسی چھوٹے کو بڑے کے حضور میں باریابی کا موقع ملتا ہے تو چھوٹا سلام کرتا ہے اور بڑا مہربانی سے جواب دیتا ہے۔ التحیات کے معنی ہیں آداب عرض کرنا۔ یہ چیز معراج کے واقعہ سے لی گئی ہے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج کے موقع پر اللہ کے حضور میں پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے التحیات للہ کہا۔ اس پر اللہ نے مہربانی سے جواب دیا: "السلام علیك ایها النبی و رحمته الله و برکاته"۔ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے اپنی امت کا بھی خیال فرمایا اور فوراً ہی کہا: "السلام علینا و علی عباد الله الصالحین" اور ہم سب حقیر امتیوں کو بھی' ان برکات میں جو اللہ کی طرف سے نازل ہو رہی تھیں' شامل کر لیا۔ حاضری اور ملاقات کو سلام اور جواب سلام کے ذریعے سے ہم نے رمز کے طور پر اختیار کیا ہے۔ اللہ کی ذات میں مدغم ہو جانے کا تصور

ہمارے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ اس کی جگہ ہم اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ اس کے حضور میں حاضر ہو کر آداب بجا لاتے ہیں۔ وہ ہمارے سلام قبول کرتا ہے اور ہم پر رحمت و برکت نازل کرتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی عبادت ایک طرح سے سارے مذاہب عالم کے بلکہ ساری کائنات کے طریقہ ہائے عبادت کا خلاصہ ہے۔ کائنات میں تین طرح کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ جمادات' حیوانات اور نباتات۔ جمادات کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کبھی حرکت نہیں کرتے۔ بلکہ ساکت رہتے ہیں۔ نماز میں ہم پہلے بے حرکت کھڑے ہو جاتے ہیں' گویا جمادات کی عبادت کا طریقہ ہماری عبادت میں قیام کے ذریعے سے شامل ہو گیا۔ حیوانات ہمیشہ رکوع کی حالت میں رہتے ہیں یہ ان کی عبادت ہے۔ ہماری نماز میں رکوع کی حالت اسی کی مماثل ہے۔ درختوں کا منہ ان کی جڑیں ہیں جو زمین میں گڑی رہتی ہیں یعنی نباتات اپنی عبادت میں سجدے کی حالت میں رہتے ہیں۔ لہٰذا اسلامی عبادت میں نباتات کا طریق عبادت شامل ہے۔ صرف جمادات' حیوانات اور نباتات ہی کی نہیں' نماز میں کچھ خالص انسانی خصوصیات بھی ہیں جیسے التحیات اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی عبادت سارے دینوں بلکہ ساری کائنات کی عبادتوں کا مجموعہ ہے' اس لیے ان سب سے فائق ہے۔

۱۸۳۔ اب میں روزے کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ حال ہی میں پیرس میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جسے ایک یورپین غیر مسلم (غالباً کیتھولک) ڈاکٹر ژوفرائے (جوفرائے) نے لکھا ہے۔ اس کا عنوان "روزہ" ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے بعض عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئیں۔ اس کا کہنا ہے کہ روزہ طبی نقطہ نگاہ سے بھی انسانوں کے لیے مفید ہے۔ وہ ایک دلچسپ انکشاف کرتا ہے کہ روزہ انسانوں میں ہی نہیں بلکہ کائنات کی اور چیزوں' مثلاً درختوں اور حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا ہمارے موضوع سے کوئی براہ راست تعلق نہیں تاہم آپ کی دلچسپی کے لیے عرض کرتا ہوں۔ جہاں تک حیوانوں کا تعلق ہے ان کے متعلق اس نے ذکر کیا ہے کہ ایسے وحشی جانور جو بالکل فطری حالت میں رہتے ہیں۔ جس زمانے میں برف باری ہوتی ہے' انھیں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ملتی اور بعض اوقات اس کا سلسلہ کئی کئی مہینوں تک جاری رہتا ہے۔ جن علاقوں میں برفباری شدید ہوتی ہے۔ وہاں برف کی وجہ سے مہینوں تک زمین نظر نہیں آتی۔ اس صورت میں ایسے جانور جو اپنی غذا خود حاصل کرتے ہیں' انھیں کوئی چیز نہ کھانے کو ملتی ہے نہ پینے کو' اس کے باوجود وہ نہیں مرتے۔ اس نے لکھا ہے کہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جانور'

پرندے، سانپ وغیرہ سب پہاڑوں کے غاروں میں چلے جاتے ہیں اور وہیں سو جاتے ہیں اس کو Hibernation کہتے ہیں۔ یعنی سردی کے زمانے کی نیند اس کا سلسلہ ہفتوں بلکہ مہینوں تک جاری رہتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ یہ نہ کھانے اور نہ پینے کی حالت، یعنی روزے کے باعث ان جانوروں میں نئے سرے سے جوانی آ جاتی ہے۔ جب سردیوں کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے اور بہار کا موسم آنے لگتا ہے تو ایسے پرندے، جو ان غاروں میں ہیں، ان کے پرانے پر جھڑ جاتے ہیں اور نئے پر نکل آتے ہیں۔ جن کی طراوت اور رنگوں کی خوشنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئے سرے سے جوان ہو گئے ہیں۔ اسی طرح سانپ کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ اس کی جھلی جھڑ جاتی ہے اور اس کو ایک نئی کھال یا نیا چمڑا ملتا ہے جو چمک دمک میں پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ان جانوروں میں واقعی ایک جوانی سی آ جاتی ہے۔ انھیں اپنی تعداد بڑھانے کے لیے نر کو مادہ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس زمانے میں ان روزہ رکھے ہوئے جانوروں میں پہلے سے زیادہ قوت اور پہلے سے زیادہ جوانی آ جاتی ہے۔ اسی طرح درختوں کے متعلق وہ بیان کرتا ہے کہ سردیوں خصوصاً برفباری کے زمانے میں، درختوں کے سارے پتے جھڑ جاتے ہیں انھیں کوئی پانی نہیں دیا جاتا۔ ان کی کسی قسم کی آبپاشی نہیں ہوتی۔ گویا وہ روزہ رکھتے ہیں۔ روزے کی مدت ہفتوں اور مہینوں تک چلتی ہے یہ روزہ ختم ہونے پر درختوں کو ایک نئی جوانی حاصل ہوتی ہے۔ یعنی جو نئی کونپلیں ان میں پھوٹتی ہیں اور نئے پھول اور پھل لگتے ہیں وہ ان درختوں کی نئی جوانی، نئے حسن اور نئی قوت پر دلالت کرتے ہیں۔ ان مشاہدات کی روشنی میں ڈاکٹر جوفرائے کا کہنا ہے کہ انسانوں کو بھی ہر سال روزے رکھنے چاہئیں۔ یہ ان کی صحت کے لیے بہتر ہو گا۔ یہ ان کو نئی توانائی اور نئی جوانی عطا کریں گے۔ اس نے بہت سی لمبی بحثیں کی ہیں کہ آج کل بہت سی بیماریاں ایسی ہیں جن کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ ان کا علاج طویل یا مختصر فاقہ کشی، یعنی روزے کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ آخر میں اس نے نتیجہ نکالا ہے کہ انسانوں کو ہر سال سات ہفتے لازماً روزہ رکھنا چاہیے اور ہر ہفتے میں ایک دن روزہ چھوڑ دینا چاہیے۔ اس طرح اسے (۷ x ۶ = ۴۲) بیالیس روزے رکھنے چاہئیں۔ اسے ہم ان کا چلہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کی رائے میں انسان کی صحت کو محفوظ رکھنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ یہ "طبی" مشورہ عیسائی دینی عقائد و احکام سے متاثر ہے۔

۱۸۴۔ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبوت ملنے سے قبل ایک صحرا میں معتکف ہوئے اور مسلسل چالیس دن روزہ رکھا تھا۔ ابتدائی عیسائی اس کی یاد میں خود بھی روزہ رکھنے لگے

مگر عملدر آمد ہر جگہ یکساں نہ تھا۔ سنہ ۴۳۹ء سے پہلے شہر روما کے عیسائی صرف تین ہفتے روزہ رکھتے تھے، تو اسکندریہ والے سات ہفتے جن میں سے سارے سنیچر اور اتوار مستثنیٰ ہوتے بجز ایک "مقدس سنیچر" کے۔ اس طرح چھتیس روزے ہر سال رکھے جاتے تھے، اور وہ خیال کرتے تھے کہ ۳۶ کی تعداد سال کا دسواں حصہ ہے اور مال کی طرح، غذا کا بھی دسواں حصہ "زکات" میں دینا چاہیے۔ (لیکن عیسائیوں کے ہاں شمسی سال رائج ہے جس کے ۳۶۵ یا ۳۶۶ دن ہوتے ہیں۔ اس لیے "سال کا دسواں حصہ" ایک فرضی امر تھا) اور یوں بھی صبح سے تین بجے تک ہی روزہ رکھا جاتا تھا اور روزہ اکیس سال عمر پر واجب ہوتا ہے۔ سنن ابن ماجہ میں ایک حدیث نبوی بیان ہوئی ہے کہ "ہر چیز پر زکات ہے، اور جسم کی زکات روزہ ہے۔" ایک اور حدیث یہ بیان کی ہے کہ جو کوئی رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھے پھر اس کے بعد کے مہینے شوال میں چھ دن روزے رکھے تو یہ پورا سال روزہ رکھنا متصور ہوتا ہے۔ یہ اصل میں ایک آیت کریمہ (۶ : ۱۶۱) پر مبنی ہے۔ "کوئی ایک نیکی کرتا ہے تو اسے دس گنا ثواب دیا جائے گا۔ یہ بہت ٹھیک بیٹھتا ہے کہ ایک مہینے کے دس مہینے اور چھ دن کے ساٹھ دن یعنی دو مہینے (۱۰ + ۲ = ۱۲) یا پورا سال) شمار ہوتا ہے ایک اور طریقہ حساب یہ ہے کہ رمضان کبھی انتیس کا ہوتا اور کبھی تیسا، اور ستہ شوال کے باعث کبھی ۳۵ اور کبھی ۳۶ دن روزے رکھے جاتے ہیں جن کا دس گنا کبھی ۳۵۰ اور کبھی ۳۶۰ دن ہوں گے جن کا اوسط ۳۵۵ ہو گا اور قمری سال میں اتنے ہی دن ہوتے ہیں۔

۱۸۵۔ ہندوؤں کے ہاں روزہ ہے لیکن زمانہ اور تعداد زیادہ معین نہیں۔ اور لزوم بھی کم ہے۔ بانیان مذہب کی تاریخ پیدائش اور سورج گرہن اور چاند گرہن جیسے اثر انداز کرشمہ ہائے قدرت کے موقعوں پر دیندار لوگ روزہ رکھتے ہیں۔ اور سہ پہر کے تقریباً تین بجے افطار کر لیتے ہیں؟ مکسیکو کے سرخ فام لوگوں کے دینی سرگردہ سالانہ (۱۶۰) دن روزہ رکھتے ہیں، گویا ایک دن آڑ، حدیث میں ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی بھی عادت تھی۔ بعض ممالک میں قدیم زمانے میں موسم بہار میں روزہ رکھنا واجب کیا گیا تھا تاکہ غیر شادی شدہ لوگوں میں زنا کاری کم ہو۔ ایک حدیث میں بھی ہے کہ کسی کے پاس بیوی نہ ہو تو باعفت رہنے کے لیے روزہ رکھا کرے۔

۱۸۶۔ دوسری قوموں کا حج یا تو اپنے کسی بزرگ، کسی ولی کسی بانی مذہب کی قبر کی زیارت کرنا ہے۔ یا مظاہر قدرت اور عجائبات میں سے کسی بہت ہی عجیب چیز کی زیارت کرنا ہے، چنانچہ ہندو دریائے گنگا کے منبع کی زیارت کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں بڑا ثواب ہے۔ دریائے گنگا اور

جمنا کا سنگم جو الہ آباد کے مقام پر ہے' اس کی زیارت میں بڑا ثواب سمجھتے ہیں۔ اسی طرح عیسائیوں کے ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو مبینہ قبر ہے' ہرچند کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر جا چکے ہیں اور قبر خالی ہے' لیکن ان کے نزدیک اس قبر کی زیارت کرنا بہت ثواب کا کام ہے۔ عام عیسائی جو بیت المقدس نہیں جا سکتے ہیں وہ سینٹ پیٹر کی قبر کی' جو ویٹی کن اٹلی میں ہے زیارت کرنا ثواب سمجھتے ہیں اور تو اور مذہب کے نام تک سے نفرت کرنے والے کیمونسٹ جب انگلستان جاتے ہیں تو ان کے نہایت ہی محترم افراد مثلاً وزیراعظم اور وزیر خارجہ بھی کارل مارکس کی قبر کی زیارت کو ضرور جاتے ہیں۔ جو انگلستان میں دفن ہے۔ گویا ان کے ہاں بھی حج پایا جاتا ہے لیکن یہ سارے حج یا تو مظاہر قدرت کے کسی مقام کی زیارت یا اپنے کسی مقدس آدمی کی قبر کی زیارت پر مشتمل ہیں۔ مسلمانوں کا حج ان سب سے مختلف ہے اور وہ ہے اللہ کے گھر کی زیارت۔ اس کے حضور میں اس کے مکان میں حاضر ہو کر باریابی حاصل کرنا۔ کعبے کو علامتی طور پر بیت اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک رمز ہے جس کی توجیہ ان نوجوانوں کے لیے شاید دلچسپی کا باعث ہو جنھوں نے کبھی اس پہلو پر غور نہیں کیا۔ اللہ کے اسماء حسنیٰ ننانوے ہیں۔ قرآن مجید میں ایسے نام بھی ہیں جو اللہ کی صفات کے مظہر ہیں مثلاً رازق' خالق وغیرہ وغیرہ' ان ناموں میں سے جو نام میری رائے میں انسان اور خدا کے تعلقات کی سب سے بہتر نمائندگی کرتا ہے وہ نام ہے "ملک" بادشاہ جب ایک نام کسی ایک غرض کے لیے منتخب کر لیا گیا تو انسانی سوسائٹی میں اس نام کے ساتھ جو لوازم ہیں ان کو بھی قبول کرنا ہو گا۔ بادشاہ سے کچھ چیزیں خاص طور پر منسوب ہیں مثلاً بادشاہ کا ایک تخت ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر آیا ہے خدا کا عرش ہے۔ عرش کے معنی تخت کے ہی ہیں۔ بادشاہ کے پاس فوجیں ہوتی ہیں۔ وللہ جنود السموات والارض (۴۸ : ۴) (آسمانوں اور زمینوں کی فوجیں اللہ ہی کی ہیں) بادشاہ کے پاس خزانے ہوتے ہیں۔ وللہ خزائن السموات والارض (۶۳ : ۷) (زمین اور آسمان کے خزانے اللہ ہی کے ہیں۔) بادشاہ کے پاس ملک ہوتا ہے: وللہ ملک السموات والارض (۳ : ۱۸۹) جب سلطنت کا رقبہ بہت وسیع ہو تو بادشاہ پایہ تخت یا صدر مقام تجویز کرتا ہے۔ پایہ تخت کے لیے انگریزی زبان کے ایک لفظ سے آپ واقف ہوں گے (METROPOLIS) یہ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی "شہروں کی ماں" اس معنی میں قرآن (۶:۹۲) کا لفظ ہے "ام القریٰ" اور شہر مکہ ام القریٰ ہی کے نام سے مشہور ہے' گویا اللہ کی سلطنت کا وہ صدر مقام ہے جب ایک میٹرو پولس یا ام القریٰ ہو تو وہاں

بادشاہ کا محل بھی ہو گا چنانچہ بیت اللہ الحرام' اللہ کا مکان یا اللہ کا گھر وہاں پر موجود ہے گویا کعبہ جو بیت الحرام ہے (قرآن ۵ : ۹۷) یہ اس بادشاہ کا محل ہے۔ کسی ملک میں بادشاہ ہو تو یہ ہمیشہ سے رواج رہا ہے کہ رعایا کے نمائندے پایہ تخت کو جا کر بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور اپنی اطاعت کا یقین دلاتے ہیں۔ حج کے سلسلے میں جب لوگ مکہ معظمہ جاتے اور کعبے کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو وہ حجر اسود پر اپنا ہاتھ رکھتے ہیں اور حجر اسود کو (اور اگر دور ہوں تو ہاتھ سے اشارہ کر کے اپنے ہاتھ) کو بوسہ دے کر طواف کا آغاز کرتے اور اسے جاری کرتے ہیں۔ اس کو ہمارے فقہاء دو ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اسے استلام بھی کہتے ہیں اور بیعت بھی کہتے ہیں۔ بیعت کے معنی ہیں اپنے آپ کو بیچ دینا۔ اپنے آپ کو (اللہ کے ہاتھ) فروخت کر دینا اور کہہ دینا کہ اے اللہ میں اپنی ذات کو تیرے سپرد کرتا ہوں۔ ہم اللہ سے ایک معاہدہ کرتے ہیں اور اس معاہدے کی تکمیل کرتے ہیں۔ معاہدے کرنے کا عام طور پر ایک طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا تھا چنانچہ ہم اپنا ہاتھ اللہ کے ہاتھ پر رکھتے ہیں۔ اس لفظ سے آپ گھبرائیے نہیں کہ اللہ کے ہاتھ پر ہم اپنا ہاتھ رکھتے ہیں۔ ایک متواتر حدیث ہے جسے پانچ صحابہ نے روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں الحجر الاسود یمین اللہ فی الارض (حجر اسود زمین پر اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے) چنانچہ اللہ کے دائیں ہاتھ پر ہم معاہدہ کرتے اور بیعت کرتے ہیں۔ جب اپنی بیعت کے ذریعے سے اپنے بادشاہ کو ہم اطمینان دلا دیتے ہیں کہ ہم اس کے سچے اور مخلص مطیع ہیں تو سب سے بڑا اعزاز' وہ مالک جو ہم کو عطا کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے گھر کی پاسبانی کے لیے ہمیں اپنا سنتری بنائے۔ کعبے کے اطراف ہم طواف کرتے ہیں یعنی بادشاہ کے گھر کی حفاظت کرتے ہیں۔ ساری عمر یا روزانہ چوبیس گھنٹے پہرہ دینے کے بجائے سات مرتبہ طواف کرنا کافی قرار دیا گیا ہے۔ سات کا عدد رمزیہ یا علامتی (Symbolic) ہے۔ چنانچہ وقت جس کی ابتداء معلوم ہے' نہ انتہا' اس لا محدود شے کو جب ہم نے شمار کی غرض سے محدود کرنا چاہا تو ہم نے سات کا ہی عدد استعمال کیا۔ ہفتے میں سات دن ہوں گے۔ وہی سات دن بار بار اپنے آپ کو دھراتے رہیں گے۔ اور بہت سی چیزیں ہیں مثلاً سبع السموات وغیرہ۔ سات کا ہندسہ بطور رمز غیر محدود کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے گھر کی پاسبانی کے لیے اگر ہم سات مرتبہ اس کی اطراف چکر لگائیں تو یہ ابدی طور پر اپنے فریضے کی انجام دہی کے ہم معنی ہو جاتا ہے۔ قصر شاہی کی پاسبانی بڑا اعزاز ہے' اور انتہائی قابل اعتماد سپاہیوں کو عطا کیا جاتا ہے کیونکہ بادشاہ کی جان و مال گویا ان سنتریوں کے رحم و

کرم پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ گفتگو حج کے ایک جزء یعنی کعبے کی زیارت اور کعبے کے طواف کے متعلق تھی۔ لیکن حج میں کچھ اور چیزیں بھی ہیں۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا اور چکر لگانا۔ اسی طرح عرفات کو جانا اور پھر منیٰ کو آنا۔ چند الفاظ ان کے متعلق بھی عرض کروں گا کہ ان میں کیا رمز پایا جاتا ہے۔ صفا اور مروہ کے متعلق آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ہے۔ اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور اپنی بیوی حضرت ہاجر کو ایک بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے اور جاتے وقت صرف ایک مشکیزہ پانی اور تھوڑی سی کھانے کی کوئی چیز دے گئے۔ دو ایک دن بعد جب پانی اور غذا کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو دودھ پیتا بچہ، حضرت اسماعیل علیہ السلام پیاس سے بے قرار ہو کر رونے چلانے لگا۔ حضرت ہاجر پانی کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ کسی طرف بھی پانی کے آثار نظر نہیں آتے۔ قریب ہی ایک چٹان تھی، سوچا کہ اگر میں چٹان پر چڑھوں تو شاید ذرا دور تک جائزہ لے سکوں۔ صفا کا پہاڑ ایک چھوٹی سی چٹان کی صورت میں اب بھی موجود ہے، اس پر چڑھتی ہیں۔ آس پاس نظر ڈالتی ہیں، کہیں پانی نظر نہیں آتا۔ پھر دیکھتی ہیں کہ آگے ایک اور چٹان ہے جسے مروہ کا پہاڑ کہا جاتا ہے۔ دوڑتی ہوئی وہاں جا کر اس کے اوپر چڑھتی ہیں۔ آس پاس دیکھتی ہیں تو وہاں بھی کچھ نہیں۔ ماں کی ممتا مایوس نہیں ہوتی۔ واپس آتی ہیں بچے کو دیکھتی ہیں پھر صفا پہاڑ پر چڑھتی ہیں پھر مروہ پر چڑھتی ہیں۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ اس طرح سات مرتبہ چکر لگاتی ہیں۔ وہی سات کا ہندسہ جو ابدیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ساتویں مرتبہ جب بچے کے پاس آئیں تو دیکھا کہ بچے نے جہاں پیاس سے مجبور ہو کر اپنے ننھے سے پاؤں کی ایڑیاں زمین پر ماری تھیں، وہاں سے ایک چشمہ (زمزمہ) پھوٹ پڑا اور پانی نکل آیا۔ اس سے زیادہ تفصیل غیر ضروری ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کو ارکان حج میں اس لیے شامل کیا گیا کہ یہ واقعہ ماں کی ممتا کی یادگار ہے اور ماں کی ممتا اس بے پناہ شفقت و محبت کی علامت ہے جو خالق کو اپنی مخلوق کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد حاجی مکے سے عرفات کو جاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں روایت کے مطابق جنت سے زمین پر آنے کے بعد مدت کے بچھڑے ہوئے آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت حوا کی دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ بھی اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے نسل آدم کے لیے ان کے جد اعلیٰ کی یہ سب سے اہم یادگار ہے۔ ہم بھی انھیں کی طرح خدا سے مغفرت کی التجا کرتے ہیں۔اس کے بعد منیٰ آتے ہیں۔ منیٰ کے متعلق روایت ہیں کہ جب اللہ نے آزمائش کے لیے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کا حکم دیا تو انھوں نے اس حکم کی تعمیل منیٰ میں کی تھی۔ لکھا ہے کہ وہ مکے سے اپنے بیٹے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چلے اور اللہ کے حکم سے بڑھتے بڑھتے مکے سے آگے تقریباً تین میل کے فاصلے پر منیٰ پہنچے۔ شیطان نے جب اللہ کے ان بندوں کو رضائے الٰہی کی طلب میں سخت ترین آزمائشوں سے بھی بڑی خوشی سے گزرتے دیکھا تو انھیں بہکانے کے لیے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ اولاً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ کہا کہ تم نے خواب کی بات پر کیسے یقین کر لیا کہ اللہ تمھیں ایسا حکم دے رہا ہے۔ ممکن ہے خواب میں شیطان آیا ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی فراست نبوی سے فوراً پہچان جاتے ہیں کہ یہ شیطان ہے۔ چنانچہ مٹھی بھر سنگریزے زمین سے اٹھا کر اس کو پھینک مارتے ہیں۔ شیطان بھاگ کر غائب ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک نئی شکل میں پھر آتا ہے اور اس بار حضرت ہاجر کے پاس پہنچتا ہے اور کہتا ہے مائی تیرا شوہر تیرے اکلوتے بیٹے کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ تو کیوں نہیں کہتی کہ میں اجازت نہ دوں گی۔ یہ ایک نئی صورت تھی، پہلے سے بھی زیادہ مشکل۔ لیکن حضرت ہاجر بھی شیطان کو پہچان جاتی ہیں۔ وہ بھی پتھریاں اٹھا کر مارتی ہیں اور اسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کرتی ہیں۔ شیطان غائب ہو جاتا ہے۔ پھر اس ننھے بچے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس آ کر کہتا ہے کہ منے تیرا باپ تیری گردن پر چھری پھیرنا چاہتا ہے۔ اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ باپ سے کہہ دو میں یہ نہیں چاہتا۔ کم عمری کے باوجود حضرت اسماعیل علیہ السلام میں نبوت کی فراست تھی۔ انھوں نے بھی شیطان کو پتھریاں پھینک کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد کے واقعے سے آپ واقف ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام کو زمین پر منہ کے بل لٹاتے ہیں۔ اپنی آنکھوں پر ایک پٹی باندھتے ہیں اور پورے عزم و استقلال سے بیٹے کی گردن پر چھری چلا دیتے ہیں۔ پھر پٹی کھولتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیٹا تو کھڑا مسکرا رہا ہے اور اس کی جگہ ایک بھیڑ یا بکری تھی، جو ذبح ہو گئی ہے۔ اللہ کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لینا مقصود تھا۔ انھوں نے دعویٰ کیا تھا کہ میں رضائے الٰہی پر ہر چیز قربان کر دوں گا۔ اللہ نے انھیں سخت ترین آزمائش میں ڈالا کہ بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد تقریباً سو سال کی عمر میں جو پہلا بیٹا ہوا، اسی کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔ بندگی اور حق پرستی کا یہ کمال دیکھیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس آزمائش میں بھی پورے اترے۔ سنت ابراہیمی کی ادائیگی کے لیے ہم منیٰ میں شیطان کو کنکریاں مارتے ہیں اور قربانی کرتے ہیں۔ یہ بھی ارکان حج میں شامل

ہے۔ جن تین مقامات پر شیطان پر پتھریاں پھینکی جاتی ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں جو شیطانی وسوسے آڑے آتے ہیں ان کا مقابلہ کریں۔

۱۸۷۔ زکوٰۃ کے بارے میں آج کچھ زیادہ عرض کرنے کا موقع نہیں ہے۔ صرف اتنا ہی کہوں گا کہ زکوٰۃ ارکان عبادات میں سے ایک ایسا رکن ہے جو مال کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے۔ اسلام دین اور دنیا کا جامع ہے فی الدنیا حسنتہ و فی الاخرۃ حسنتہ کی تعلیم دیتا ہے۔ لہٰذا زکوٰۃ میں بھی مالی ایثار کے ذریعے سے اصلاح باطن کا پہلو اور معاشرے کی مادی فلاح و بہبود کا پہلو بھی موجود ہے۔ اس کا کسی اور دن مفصل ذکر کروں گا' انشاء اللہ۔

۱۸۸۔ اب آخر میں میں تصوف کے متعلق بھی مختصراً" کچھ عرض کروں گا۔ جس حدیث شریف کا میں نے ابتداء میں ذکر کیا تھا۔ اس میں حضرت جبرئیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اولاً ایمان کے متعلق سوال کیا' پھر اسلام کے متعلق اور پھر احسان کے متعلق۔ احسان کے لفظی معنی کسی چیز کو حسن عطا کرنا' خوبصورت بنا دینا ہے۔ زندگی کا کوئی کام ہو اسے سنوارنا اور خوبصورت طریقے سے انجام دینا' یہی احسان ہے۔ جب ہم اس لفظ کو مذہبی اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ احکام الٰہی کو سچے دل سے قبول کرنا اور عبادت میں خلوص پیدا کرنا۔ ہمارے اسلاف نے اس اخلاص فی العمل کو "سلوک" اور "طریقت" کا نام دیا ہے۔ سلوک اور طریقت دونوں کے معنی ہیں راستہ چلنا اور اس سے مراد ہے اللہ کی طرف جانے کا راستہ۔ بعد میں اسی مفہوم کے لیے تصوف کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ تصوف کی وجہ تسمیہ بیان کرنے میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں' یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے۔ البتہ رسول اکرمؐ نے احسان کی جو تعریف بیان کی ہے اس کا ذکر ضروری ہے۔ جب رسول اکرمؐ سے جبرئیلؑ نے پوچھا کہ "احسان" کیا ہے؟ تو رسول اکرمؐ نے ایک ایسا جواب دیا جو اپنے اختصار اور معنی کی گہرائی کے باعث ایک معجزہ بیانی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ اللہ تمھارے سامنے موجود تمھاری حرکتوں کو دیکھ رہا ہے' اگرچہ تم اسے نہیں دیکھتے لیکن اللہ تمھیں دیکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر حضور خداوندی کا تصور انسان اپنے اندر اس طرح لائے کہ اسے اللہ اپنے سامنے محسوس ہو گویا کہ اللہ اس کے ظاہر و باطن کو دیکھ رہا ہے۔ اگر ہم اپنے اندر حضور خداوندی کے تصور کو اتنا ترقی دے لیں کہ یہ تصور ہماری پوری شعوری زندگی پر حاوی ہو جائے تو ظاہر ہے کہ ہمارے لیے یہ قطعاً" ناممکن ہو گا کہ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی

اور اس سے انحراف کریں۔ آقا سامنے موجود اور نگرانی کر رہا ہے تو کونسا غلام یا نوکر آقا کے احکام کی خلاف ورزی کی جرات کرے گا۔ یہ ہے تصوف کا خلاصہ باقی ساری چیزیں ذیلی ہیں ہم اپنی اصلاح نفس اور اپنی روحانی قوتوں کو ترقی دینے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کر سکتے ہیں۔ مثلاً نفلی روزے رکھنا، تسبیح پڑھنا، نفل نمازیں پڑھنا وغیرہ وغیرہ۔ ان کا ذکر حدیثوں میں بھی آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب لوگوں کو ایک ہی طریقہ نہیں سکھایا یعنی نوافل کے سلسلے میں کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ بتایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر شخص کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دوں کہ سعودی عرب کے علماء تسبیح پڑھنے کو بدعت قرار دیتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ چیز نہیں تھی۔ ایک حبشی طالب علم، جس نے فرانس میں تعلیم پائی تھی اور آج کل جدہ یونیورسٹی میں ملازم ہے، اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تسبیح پڑھنا جائز ہے؟ میں نے اس بارے میں کبھی تحقیق نہیں کی تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا مجھے دو ہزار مرتبہ روزانہ سونے سے پہلے پڑھنے کی تاکید فرمائی تھی۔ دو ہزار ایک ایسا ہندسہ ہے جس کا انگلیوں پر شمار کرنا مشکل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ذہین آدمی تھے، انھوں نے ایک ڈوری لی اور اس میں دو ہزار گرہیں ڈال دیں۔ اس کے ذریعے وہ تسبیح پڑھا کرتے تھے۔ اب چاہے تو اس تسبیح میں گرھیں ہوں یا اس کے اندر منکے ہوں یا کوئی اور چیز ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا یہ واقعہ میں نے اس حبشی طالب علم کو لکھ بھیجا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے ایک اور حدیث ملی جو صحیح بخاری میں ہے۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت کے پاس سے گزرے جس نے اپنے سامنے کنکریوں کا ایک ڈھیر رکھ لیا تھا۔ وہ درود پڑھا کرتی تھی۔ ایک کنکری اٹھاتی اور درود پڑھ کر بازو ڈال دیتی۔ اس کے بعد دوسری کنکری اٹھاتی۔ کنکریوں کا یہ ڈھیر گویا اس کی تسبیح تھی یہ ایک غیر ترقی یافتہ (Primitive) طریقہ ہے۔ لیکن مقصود یہی ہے کہ ہم اپنے انجام شدہ کام کی صحیح مقدار بھول نہ جائیں اور اس ذریعہ سے معلوم ہوتا رہے کہ کتنا کام ہو چکا ہے۔ اور کتنا کام باقی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو جن چیزوں کی تاکید کرتے تھے ان میں نفل روزے بھی تھے اور نمازیں بھی، درود اور وظائف بھی اور مختلف موقعوں پر پڑھنے کی مختلف دعائیں بھی۔ ہر صحابی اپنی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق مختلف طریقے اختیار کرتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے زمانے میں سلوک اور تصوف کی حقیقت بس یہی تھی۔ بعد کے زمانے میں تصوف میں دوسرے تصورات بھی شامل ہونے لگے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسائل پر بحثیں ہونے لگیں۔ ان چیزوں کو نبوی تصوف سے کوئی تعلق اس بنا پر نہیں ہے کہ یہ بحثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہیں پائی جاتیں۔ بلکہ بعد کے لوگوں کی پیدا کردہ ہیں۔ اسلامی تصوف وہی ہے جس کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معجزانہ جملے کے ذریعے فرمائی کہ اللہ کی عبادت یعنی اللہ کے احکام کی تعمیل اس طرح کرو گویا اللہ حاضر و ناظر ہے' ہمارے اعمال اور ہمارے خیالات ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ اگرچہ ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ خدا حافظ!

سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

۱۸۹۔ متعدد سوالات جو آپ کی طرف سے آئے ہیں ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال ا۔ اسلامی عقائد کے مطابق قسمت' تقدیر' مقدر کے معنی واضح کریں مثلاً ایک آدمی پانی میں ڈوب کر مرتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کی موت ایسے ہی لکھی گئی تھی۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے کو قتل کر دیتا ہے' مقتول کی قسمت میں ایسی موت لکھی گئی تھی۔ کیا قاتل کے مقدر میں ایسا نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو قتل کرے گا؟ اگر قسمت ایسی تھی تو روز آخرت اس کی سزا کیوں ہے؟ فرمان خداوندی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر درخت کا پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ وضاحت کریں۔ آپ نے فرمایا کہ برائی اور بھلائی automatic ہیں لیکن ایک بات مدنظر رکھیں کہ بھلائی کے لیے انسان کو قربانی دینا پڑتی ہے' تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ برائی میں انسان کو لذت نصیب ہوتی ہے۔ دنیاوی تکلیف کا صلہ ضرور ملنا چاہیے اور دنیاوی ناجائز عیش و عشرت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

جواب : معلوم نہیں میرے دوست نے میری پوری تقریر سنی ہے یا نہیں؟ کیونکہ تقدیر کے متعلق میں کافی تفصیل سے اپنے خیالات واضح کر چکا ہوں اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ ایک طرح کا مخمصہ (Dilemma) ہے۔ ہم اس مسئلے کا نہ ایک پہلو لے سکتے ہیں' نہ دوسرا پہلو جو پہلو بھی اختیار کریں گے' اس پر اعتراضات ہوں گے اس کا کوئی حل نہیں ملتا۔ اس لیے حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کے سامنے ہم ذمہ دار ہیں' یہ بھی صحیح ہے۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ بشمول ہمارے لیے ہمارے اعمال کو مقرر کرنے کے' وہ بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ یہ دونوں کس طرح ہیں' مجھے دوبارہ انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں لیکن ایک بات کو میں دہرائے دیتا ہوں۔ ہم لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ میں برائی کروں تو مجھے سزا کیوں دی جاتی ہے جب کہ خدا اس کو مقرر کرتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ بھلائی کا بھی یہی حال ہے۔ بھلائی بھی ہمارے مقدر میں ہے۔ اگر میں اس کو کرتا ہوں تو مجھے اس پر جزا پانے اور جنت میں جانے کا حق کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے اس کا اسی سیاق و سباق Context میں ذکر کیا تھا۔

۱۹۰ سوال ۲۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء اگر سائنسی نقطۂ نظر سے صحیح ہے تو اسلام اور سائنس میں تضاد ہے۔ آپ اس تضاد کو حل کرنے کے بارے میں ارشاد فرمائیں۔

جواب : آپ نے یہ پہلے ہی سے فرض کر لیا ہے کہ ڈارون کے نظریے کو اسلام نے رد کر دیا ہے۔ اس کو ثابت کرنا آپ پر واجب ہے۔ بعد میں دیکھیں گے کہ یہ چیز اسلام کے موافق ہے یا مخالف۔ میں عرض کروں گا کہ ڈارون کا نظریہ ہمارے ہاں بعض اوقات اس لیے پیچیدگی پیدا کرتا ہے کہ ہم فرض کرتے ہیں کہ ڈارون ایک ملحد تھا۔ خدا کو نہیں مانتا تھا حالانکہ ڈارون کی سوانح عمری پڑھئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ خدا کا قائل تھا۔ جب اس نے اپنے آبائی فن علم طب کی تعلیم مکمل کر لی' ڈاکٹر بن گیا تو یکایک کایا پلٹ گئی۔ دنیا سے وہ نفور ہو گیا اور خدا کی طرف مائل ہوا۔ چنانچہ کیمبرج یونیورسٹی کے شعبہ الٰہیات میں اس نے عیسائی مذہب کی تعلیم حاصل کی جہاں طلباء کو تقابل ادیان (Comparative Religion) کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہاں ڈارون نے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے عربی زبان بھی پڑھی۔ اس کے خطوط کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں کئی خط اس نے اپنے عربی کے استاد کے نام لکھے ہیں اور بے حد ادب و احترام سے اس کا نام لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں کیمبرج یونیورسٹی میں عربی نصاب کی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں یا تو "اخوان الصفا" کے اقتباسات ہوں گے یا ابن مسکویہ کی "الفوز الاصغر" کے انتخابات۔ ان دونوں کتابوں میں ارتقاء کا نظریہ بیان کیا گیا ہے اور آپ کو معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ ان مسلمان مؤلفوں کی زندگی میں کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور کبھی انھیں کافر قرار نہیں دیا گیا۔ اخوان الصفا اور ابن مسکویہ کی الفوز الاصغر' تیسری' چوتھی صدی ہجری کی کتابیں ہیں۔ ان میں لکھا ہے کہ خدا پہلے مادہ کو پیدا کرتا ہے اور اس مادہ کو ترقی کی قوت

عطا کرتا ہے۔ لہٰذا مادہ اولاً غبار یا دھویں کی صورت اختیار کرتا ہے پھر ترقی کرتے ہوئے پانی کی صورت اختیار کرتا ہے پھر ترقی کرتے ہوئے جمادات کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جمادات ترقی کرتے ہوئے مختلف قسم کے پتھر بنتے ہیں اور بالآخر وہ مرجان کی صورت اختیار کرتے ہیں جو ہوتے تو پتھر ہیں لیکن ان میں درخت کی سی شاخیں ہوتی ہیں۔ پھر جمادات کے بعد نباتات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ درخت ترقی کرتے جاتے ہیں۔ اور سب سے آخری مرحلے میں ایسا درخت ملتا ہے جو جانور کی خصوصیات سے بہت قریب ہوتا ہے۔ یہ ہے کھجور کا درخت۔ اور درختوں کے بالمقابل کھجور کے درخت میں نر اور مادہ الگ الگ ہوتے ہیں اور درختوں کے بالمقابل جن کی ساری شاخیں بھی اگر ہم کاٹ دیں تو درخت مرتا نہیں۔ کھجور کا سر کاٹ دیں تو وہ درخت مر جاتا ہے۔ اس لیے کھجور کے درخت کو اعلیٰ ترین پودے اور ادنیٰ ترین حیوان دونوں سے مشابہت ہے۔ پھر اس کے بعد ادنیٰ ترین قسم کا حیوان پیدا ہوتا ہے وہ ترقی کرتے کرتے کیا بنتا ہے۔ ابن مسکویہ بیان کرتا ہے اور "اخوان الصفا" میں بھی وہی بیان کیا گیا ہے کہ وہ بندر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ڈارون کا بیان نہیں یہ مسلمان حکماء کا بیان ہے۔ پھر اس کے بعد ترقی کرتا ہے تو ادنیٰ قسم کا انسان بنتا ہے۔ وحشی انسان' وہ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ترین انسان بنتا ہے۔ یہ بشر ولی اور پیغمبر ہوتا ہے' پھر اس سے بھی ترقی کر کے فرشتہ بنتا ہے۔ پھر فرشتوں کے بعد ذات باری تعالیٰ خدا ہی کی ذات ہوتی ہے۔ ہر چیز خدا سے شروع ہو کر پھر خدا ہی کی طرف جاتی ہے۔ والیہ المرجع والماب یہ ہے ہمارے حکماء کا بیان۔ جب یہ چیزیں مسلمان حکماء نے بیان کیں اور ان پر مسلمان فقہاء نے ان کی زندگی میں کبھی کفر کا فتویٰ نہیں دیا تو اس کو اسلام کے خلاف قرار دینا ایک غور طلب بات ہے۔ میں آگے چلتا ہوں قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق یہ ضرور بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے انھیں مٹی سے پیدا کیا۔ ہمارا تصور یہ ہے کہ اللہ ایک کمہار کی طرح مٹی کو لیتا ہے اور اس کی صورت بناتا ہے اس کے اندر روح پھونکتا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام بن جاتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔ میں انکار نہیں کرتا لیکن آپ ان آیتوں (۸ :۱، ۳۷ :۲۲، ۵ :۳۵ :۱۱، ۴۰ :۶۷) کو کیا کریں کہ جن میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو "مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا۔" ظاہر ہے کہ مٹی سے کبھی نطفہ پیدا نہیں ہوتا۔ حیوان اور انسان سے نطفہ نکلتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ نے سارے درمیانی مدارج کی تفصیل کو وہاں حذف کر دیا اور کہا کہ مٹی تمھاری اصل ہے۔ اور تمھاری پیدائش کا آخر وسیلہ تمھارے باپ کا نطفہ

ہے جو تمھاری ماں کے رحم میں رہتا ہے اور اس طرح تم پیدا ہو جاتے ہو۔ ایک آیت (۷۱ : ۱۴) کو لیجئے۔ خلقکم اطوارا" (خدا نے انسان کو طور بہ طور پیدا کیا) "طور" وہی لفظ ہے جس سے تطور (Evolution) کا لفظ بنایا گیا ہے۔ خدا نے انسان کو طور بہ طور پیدا کیا' اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اولاً جمادات کی شکل میں بنایا' پھر وہ جمادات ترقی کرتے ہوئے نباتات بنتے ہیں' پھر حیوان بنتے ہیں۔ غرض اس میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ شاید آپ کی واقفیت کے لیے ایک چیز عرض کروں کہ آپ کی یونیورسٹی لائبریری میں ایک چھوٹا سا مضمون[1] عربی زبان میں آپ کو ملے گا جس کا عنوان ہے "خلق الکائنات و تطور الانواع حسب آراء المفکرین المسلمین" اسے آپ دیکھ سکتے ہیں جس میں آپ کو یہ ساری تفصیلیں ملیں گی۔ اس میں بہ کثرت مسلمان عالموں اور صوفیوں کے بیانات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

۱۹۱ سوال ۳۔ کیا اسلام میں روحانیت و مادیت دونوں برابر ہیں یا روحانیت زیادہ ہے اور مادیت کم؟ پھر کیا روح کو دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے؟

جواب : مجھے اس بارے میں ماہر اور متخصص ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں۔ لیکن میں کہوں گا کہ انسان جب روح اور جسم دونوں سے بنایا گیا ہے تو ان دونوں پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جسم کے لیے ہم کھاتے ہیں' پیتے ہیں' سوتے ہیں' آرام کرتے ہیں' غرض مختلف کام سرانجام دیتے ہیں۔ ایک ہماری روح بھی ہے اس کے لیے بھی ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہے تاکہ اس کی زندگی برقرار رہے۔ وہ اسی طرح زندہ رہے جس طرح ہمارا جسم زندہ رہتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہمیں حکم دیا کہ نماز پڑھو' روزہ رکھو' زکوٰۃ دو' حج کرو۔ تو اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں ہی چیزوں کا ذکر کیا گیا۔ مادے کا بھی اور روح کا بھی۔ ان میں کیا تناسب ہو گا' میں نہیں جانتا' لیکن میں عرض کروں گا کہ جس طرح چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں یعنی چوبیس منٹ اپنی روح کے لیے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور باقی سارا وقت ہمیں دیا گیا ہے جس طرح چاہو' صرف کرو۔ چاہے محض مادیت کے لیے صرف کرو یا مادیت اور روحانیت دونوں کے لیے یہ انفرادی چیز ہو گی اور اس کے لیے کوئی حکم یا تعین شریعت کی طرف سے نہیں

۱۔ یہ مضمون جامعہ ارض روم (ترکی) میں چھپا تھا۔ یہی کچھ نظرثانی کے بعد "المصادر الاسلامیتہ لداروین فی نظریتہ عن اصل الانواع" کے عنوان سے اسلام آباد کے رسالے "الدراسات الاسلامیتہ" میں ۱۹۸۱ء میں چھپا۔

۱- شریعت کا حکم صرف یہ ہے کہ اپنی روحانی زندگی کے لیے روزانہ مثلاً پانچ وقت نمازیں پڑھو اور بعد میں سارا مابقی وقت میری مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں ہی انتخاب کروں گا کہ مجھے روحانیت پر توجہ کرنی چاہیے یا نہیں کرنی چاہیے۔

۱۹۲ سوال ۴۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ نفسیات مذہب کی بیخ کنی کرتی ہے کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: میں نہیں جانتا کہ آپ ان دونوں میں تضاد کیوں پاتے ہیں۔ نفسیات کے معنی صرف یہ ہیں کہ انسان خاص کر دوسرا انسان جو کام کرے گا اس کا اندازہ ہم پیش بینی سے کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق اس سے نپٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ چیز مجھے اسلام کے خلاف نظر نہیں آتی۔ اگر آپ اس کی توضیح کر سکتے کہ کس نقطہ نظر سے آپ اسے اسلام کی بیخ کنی کرنے والا علم کہتے ہیں تو شاید میں کوئی جواب دے سکتا۔

۱۹۳ سوال ۵ آپ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تھی تو آپ کا وزن بڑھ جاتا تھا۔ ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ جب انسان کسی مسئلے پر سوچ رہا ہو تو آس پاس کا علم نہیں ہوتا۔ مگر وزن بڑھنے کی کیا وجہ ہے؟ براہ کرم اس کا جواب ضرور دیں۔

جواب: میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ وحی کی ماہیت معلوم کرنے کے لیے جن قابل ترین مغربی لوگوں نے کوشش کی انھیں سوائے اس کے کوئی جواب نظر نہیں آیا کہ وحی ایک بیماری ہے۔ لیکن جب بیماری سے اس کو مشابہ قرار دیتے ہیں تو اس کی علامتیں وحی کی صورت میں نظر نہیں آتیں۔ میں نے بتایا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وزن بڑھ جاتا تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تجربہ صحابہ کو ہوا تھا۔ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ یہ ہمارے لیے بیان کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز صرف نبی کو پیش آتی ہے۔ ہم آپ کو پیش نہیں آئی۔ اس کی کوئی توجیہ میں نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ ایک واقعے کا اظہار کروں کہ جب وحی آتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک میں اتنا وزن ہو جاتا تھا کہ اونٹنی بھی آپ کا وزن برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

۱۹۴ سوال ۶۔ آپ نے فرمایا کہ ہندوؤں کے ہاں جنت و دوزخ کا تصور نہیں ملتا۔ تو ان کے ہاں سرگ اور نرک سے کیا مراد ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں تصور یہ ہے کہ عالم ارواح قدیم ہے اور نئی روح پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہی ارواح تناسخ یا جونی چکر یا آواگون کے نام سے دوسرے

اجسام میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ ان لیے اس عمل کو Transmigration of Soul بھی کہتے ہیں۔ براہ کرم اس کی صحیح حقیقت اور روح کے اسلامی تصور پر روشنی ڈالیے۔

جواب : میں اس کے متعلق صرف اس کے سوا کیا عرض کروں کہ روح کے متعلق جب رسول اللہؐ سے سوال کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جواب نہ دے سکے۔ انتظار کرنے پر وحی (۸۵ : ۱۷) آئی۔ یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی (آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ روح کیا ہے؟ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ کے حکم سے ہے) اس سے زیادہ تفصیل وہاں نہیں ملتی اور اس کے سوا میں کوئی چیز بیان کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ باقی ہندوؤں کے ہاں سرگ اور نرک وغیرہ تصورات کی طرف آپ نے اشارہ جو کیا ہے ان کی نوعیت اور تفصیل سے میں ناواقف ہوں۔ میں نے کہا کہ ہندوؤں کے مذہب میں بہت سے چیزیں ملتی ہیں۔ توحید کے تصورات بھی ملتے ہیں۔ توحید کے خلاف چیزیں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ سرگ اور نرک کا تصور ایک مخصوص مفہوم رکھتا ہے۔ اس سے مراد مسلمانوں کے ہاں کی ایسی جنت جس میں حوریں بھی ہوں' جس میں کھانے کو پرندوں کا گوشت بھی ملتا ہو' جہاں شراب اور شہد اور دودھ کی نہریں بہتی ہوں' اس طرح کی چیزیں ان کے ہاں نہیں ملتیں یہی حال سزا کے متعلق ان کے تصورات میں ہے جن کو وہ "نرگ" کے نام سے ادا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی کیفیت نہ مسلمانوں کو معلوم ہے' نہ عیسائیوں کو' نہ کسی اور قوم کو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ وہاں کی چیزوں کے متعلق نہ کبھی تم نے سنا نہ کبھی ایسی کوئی چیز دیکھی ہے' نہ ان کا تصور تمہارے ذہن میں آ سکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی چیز عرض کرنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں پاتا۔

۱۹۵ سوال ۷۔ درج ذیل آیت قرآنی میں مسجدوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں یعنی گرجا گھروں' کلیساؤں اور خانقاہوں کا ذکر بھی ہے' جن میں کثرت سے اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاتا ہے۔ براہ کرم وضاحت فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کو غیر مسلموں کی عبادت بھی اسی طرح پسند ہے جس طرح مسلمانوں کی؟

.... ولو لا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض لہدمت صوامع و بیع و صلوات و مساجد یذکر فیہا اسم اللہ کثیرا" (۴۰ : ۲۲)

جواب : یہاں گرائمر کے لحاظ سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا "یذکر فیہا اسم اللہ کثیرا"" (وہاں اللہ کا بہت نام لیا جاتا ہے) اس کا تعلق آخری لفظ سے ہے یا سارے بیان کردہ

مقامات سے ہے۔ یہ ایک سوال ہے جس کو میں حل نہیں کر سکوں گا۔ باقی اصل سوال کا جواب میں یہ دوں گا کہ جس زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں آئے تھے' اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون انسانیت کے لیے رائج تھا اور انسانوں کے لیے لازمی تھا کہ یہودیوں کی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق عمل کریں' اور یہی صحیح عبادت تھی۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ گئے تو ضروری تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق لوگ عمل کریں' مثلاً گرجاؤں میں عبادت کریں۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی آ گئے تو اب نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت واجب العمل رہی' نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر عمل کرنے کی ضرورت ہوئی۔ جنھوں نے مسجدوں میں نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ ان میں آپس میں کوئی تضاد نہیں۔ اور اللہ حکم دیتا ہے کہ نئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بعد سارے لوگ اسے قبول کر لیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ کچھ قبول کریں گے۔ کچھ قبول نہیں کریں گے۔ ان میں جنگیں بھی ہوں گی اور خدا کہتا ہے کہ ان جنگوں کے ذریعے سے اگر خدا ایسا نہ کرتا یعنی ایک آدمی دوسرے سے لڑ کر اپنی اپنی مدافعت کرتا' یا دوسرے کو شکست دیتا' ایسا نہ کرتا تو یہ عبادت گاہیں تباہ ہو جاتیں۔ بہت سیدھی سادی بات ہے کہ فرض کیجئے مسلمانوں پر یہودی حملہ کریں اور مسلمان مدافعت نہ کریں تو ظاہر ہے وہ مسلمانوں کی مسجدوں کو تباہ کر دیں گے۔ اسی طرح فرض کیجئے کسی وجہ سے انتقامی یا دفاعی جنگ کے باعث مسلمان یہودیوں سے جنگ کرتے ہیں۔ اگر یہودی اپنا مقابلہ نہ کر سکیں تو ظاہر ہے کہ مسلمان اور چیزوں کے ساتھ شاید ان کی عبادت گاہوں کو بھی ختم کر دیں گے۔ خدا ہی ایک ملت کو دوسری ملت سے جنگی مقابلہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس ذریعے سے دنیا میں انسانوں کی حفاظت کا انتظام ہوا ہے۔

دوسرے الفاظ میں اور چیزوں کی طرح تقدیر یہاں بھی کام کرتی ہے اور یہی تقدیر ہر انسان کو اجازت بھی دیتی ہے کہ اپنے دین کی حفاظت کی خاطر مقابلہ کرے' چنانچہ مسلمانوں کو اجازت ہے کہ اگر کوئی اس پر حملہ کرتا ہے تو اس سے جنگ کرے' اس کو قتل بھی کرے' اس کو اسیر بھی کرے' اس کو لوٹ بھی لے اور اس طرح خدا کے نام کا بول بالا کرنے کی کوشش کرے۔ یہ جنگ اپنی ذات کے لیے نہیں ہو گی بلکہ اس آیت کے مطابق وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (۲:۱۹۰) جنگ اللہ کی راہ میں کرو۔ یہ نہیں کہ اپنے لیے۔ "قاتلوا فی سبیل اللّٰہ" کن سے جنگ کرو؟ "الذین یقاتلونکم" جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ لیکن اس جنگ کے باوجود تعدی نہ کرو اور یہ بھی کہ تعدی کرنے والوں کو اللہ

پسند نہیں کرتا۔ مسلمانوں کو بھی تنبیہ کر دی گئی ہے کہ کبھی یہ نہ سمجھ لینا کہ آخری دین کامل ہونے کے باعث تمھیں کوئی خصوصیت حاصل ہو گئی ہے۔ تمھیں دراز دستی کی ہرگز اجازت نہیں۔ فی امان اللہ!!

خطبہ ۷

عہد نبویؐ میں مملکت اور نظم و نسق

صدر محترم! محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ کرام! محترم مہمانان!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ!

۱۹۶۔ قرآن مجید کے مطابق، مذہب اسلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے جسے اس آیت کریمہ (۲:۲۰۱) میں بیان کیا گیا ہے: "ربنا آتنا فی الدنیا حسنته وفی الاخرته حسنته" یعنی اسلام دین و دنیا دونوں جہانوں کی بھلائی چاہتا ہے، دونوں عالم کے لیے کوشش کرنے کی اجازت دیتا ہے اور دونوں جہانوں میں کامیاب بننے کا راستہ بتاتا ہے۔ دین اسلام میں جہاں ایک طرف نماز، روزہ اور حج جیسی روحانی چیزوں کا ذکر ہے، وہاں زکوٰۃ کا ذکر بھی ہے۔ جو ایک مالی مسئلہ ہے لیکن اسے رکن ایمان اور رکن دین بنایا گیا ہے۔ آج میرے پیش نظر صرف یہ بتانا ہے کہ کن حالات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر مجبور ہونا پڑا کہ ایک حکومت قائم فرمائیں۔ حکومت کی اقامت پر مجبور ہونے کا لفظ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ نبی دنیا اور دنیوی اقتدار کا طالب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک مملکت قائم کرتے ہیں اور اس مملکت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے حکمرانی بھی فرماتے ہیں۔ یہ کن حالات میں ہوا اور کس طرح یہ مشکل کام انجام پایا؟ اور پھر اس مملکت میں جس کا وجود ہی نہ تھا، ہر چیز کا نظم و نسق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کر دیا اور ایسا نظم و نسق چھوڑا کہ وہ آپ کے بعد صدیوں تک چلتا رہا اور نسل آدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام جہاں بانی سے فائدہ اٹھاتی آ رہی ہے۔ بہر حال قبل اس کے کہ اسلامی مملکت کے متعلق کچھ عرض کروں، غالباً بے محل نہ ہو گا کہ جزیرہ نمائے عرب میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مملکت کی کیا صورت حال پائی جاتی تھی، اس کی طرف کچھ مختصراً" اشارہ کروں۔

۱۹۷۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ شہر روما ہی نہیں، بلکہ ایتھنز شہر کے وجود میں آنے سے بھی پہلے جنوبی عرب خصوصاً" یمن میں ایک مملکت پائی جاتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں عرب کا تمدن یورپ کے قدیم تمدنوں سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ جو مملکتیں یمن میں قائم کی گئی تھیں، ان کا نظم و

نسق اچھا خاصا ترقی یافتہ نظر آتا ہے۔ یمن کے آثار قدیمہ سے اور وہاں کے کتبوں سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں' ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں کو امور حکمرانی اور رعایا کے فلاح و بہبود کے انتظامات سے بہت دلچسپی رہی اور وہاں ایسے کارنامے وجود میں آئے کہ آج ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک چھوٹے سے صحرائی ملک میں یہ کام کیسے انجام پائے؟ مثال کے طور پر قرآن مجید (۳۴: ۱۶) کی تلاوت کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وہاں ایک مرتبہ "سیل العرم" کے سانحہ کا ذکر ہے جو یمن میں رونما ہوا تھا۔ ایک مقام پر دریا میں بند باندھ کر ایک بہت بڑا تالاب بنایا گیا تھا۔ بند ٹوٹ جانے سے زبردست سیلاب آیا اور بہت نقصان ہوا تھا۔ وہاں کی رعایا کو ترک وطن کر کے دیگر علاقوں میں بسنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ وہ تالاب جو آج بھی یمن میں موجود ہے' اپنی اس شکستہ حالت میں بھی اتنا عظیم الشان ہے کہ اس کی مرمت کے لیے کئی ارب روپے درکار ہیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب قدیم یونان کا مشہور شہر ایتھنز ابھی وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ بہر حال عرض کرنا یہ ہے کہ یمن میں ملکہ بلقیس کی حکمرانی تھی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہم عصر تھی۔ اس کے بعد عرصہ دراز تک مختلف حکمران وہاں حکومت کرتے رہے اور وہاں کی فطری زرخیزی اور مختلف قیمتی پیداواروں کی وجہ سے اس ملک پر ایشیا' یورپ اور افریقہ' غرضیکہ ہر طرف سے حملے بھی ہوتے رہے۔ چنانچہ یونانیوں نے بھی یمن پر حملہ کیا اور ان کے یونانی کتبے بھی آج تک ہمیں یمن میں بعض مقامات پر ملتے ہیں۔ عہد نبوی سے پہلے حبشہ کے بادشاہ نے وہاں کے حکمرانوں کو شکست دے کر یمن پر قبضہ کر لیا۔ کہتے ہیں کہ وہاں جو عیسائی حبشی بادشاہ تھا' اس نے اپنے پایہ تخت صنعاء میں ایک عظیم الشان گرجا بھی بنایا تھا۔ اسے جلن یہ ہوئی کہ لوگ صحرا کے بے آب و گیاہ' شہر مکہ میں حج کے لیے کیوں جاتے ہیں؟ چنانچہ اس بادشاہ نے ایک فوج تیار کرائی اور کعبہ کو ڈھانے کے عزم سے مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ قرآن مجید (۱۰۵) کے "سورہ فیل" میں اسی کا ذکر ہے۔ ہمارے مورخ لکھتے ہیں کہ جس سال اصحاب الفیل کا مکہ پر حملہ ہوا اسی سال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حملہ یمن کے مقامی لوگوں کی مرضی کے خلاف ہوا تھا یمن میں حبشیوں کی حکومت تھی جو اجنبی لوگ تھے۔ چنانچہ مقامی یمنی باشندوں نے حبشیوں کے تسلط سے آزاد ہونے کے لیے ایک قومی تحریک شروع کی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے یمن کے سردار ایران گئے' اور ایران کے بادشاہ سے مدد کی درخواست کی۔ اس روایت کے دلچسپ الفاظ یہ ہیں کہ ایک سردار نے کسریٰ سے کہا کہ ہمارے ملک پر کوؤں نے قبضہ

کر لیا ہے آپ ہمیں مدد دیجئے۔ اس نے پوچھا کون سے کوئے؟ ہندوستان کے کوئے یا افریقہ کے؟ کسریٰ نے خیال کیا کہ عرصے سے مجھے جو تمنا تھی کہ میں یمن پر قبضہ کروں، اب یہ موقع ہاتھ آیا ہے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ لہٰذا اس نے فوج سے مدد کی، جنگ میں حبشیوں کو شکست دی اور اس علاقے پر ایرانیوں کے ماتحت مقامی سردار کی سربراہی میں یمنی حکومت قائم ہوئی۔ اس زمانے میں مکہ سے عبدالمطلب یمن جاتے ہیں اور اس حکمران کو اپنی طرف سے اور اپنے ملک کی طرف سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ان کی تفصیل ہمیں ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن اور مکہ کے تعلقات بہت قریبی تھے۔

۱۹۸۔ یمن میں یمنی حکمران برائے نام حاکم تھا۔ جلد ہی ایرانیوں نے اپنے قبضے اور اپنی فوج کی موجودگی سے بے جا فائدہ اٹھا کر اسے بے دخل کردیا اور خود ہی وہاں حکومت کرنے لگے۔ عہد نبوی کے دور آخر میں جب یمن میں اسلام کی اشاعت ہوئی تو اس زمانے میں ایوان میں ایرانی حکومت ضعف و انحطاط کا شکار ہو چکی تھی اور رومی سلطنت سے جنگ میں شکست کھانے کے بعد اس کی فوجی طاقت کمزور ہو گئی تھی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر یمنیوں نے ایران کے خلاف بغاوت کی۔ اس وقت یمن کا جو ایرانی گورنر تھا، اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح اس نے اپنے آپ کو اور اپنے ہم نسل ایرانی ساتھیوں کو، جو یمن میں تھے، بچانے کی کوشش کی۔ جس سے یمن میں ایک انٹرنیشنل پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ اس پہلو پر بحث کا موقع نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عرب میں قدیم ترین حکومتیں ہمیں یمن میں نظر آتی ہیں اور صرف وہیں نہیں اور مقامات پر بھی حکومتوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۹۹۔ اب میں مکے کی طرف آتا ہوں کیونکہ یہاں پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی۔ ہم اولاً یہ معلوم کریں گے کہ وہاں کوئی حکومت تھی یا نہیں؟ اگر تھی تو کس قسم کی حکومت تھی؟ مکہ کے متعلق آپ سب اچھی طرح واقف ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس شہر کی بنا ڈالی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ نے حکم دیا کہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ماں حضرت ہاجر علیہا السلام کو فلسطین سے لا کر اس بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ دیں تب وہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام واپس چلے جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پیاس محسوس ہوتی ہے۔ جہاں وہ پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہے تھے وہاں زمزم کا چشمہ ابل پڑتا ہے۔ اتفاق سے ایک قافلہ ادھر

سے گزر رہا تھا۔ پانی کے آثار دیکھ کر قافلے والے وہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ پھر وہاں پانی کی کثرت کی خبر سن کر اور لوگ بھی آ کر بسنے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ آبادی بڑھنے لگتی ہے۔ حضرت اسماعیل السلام اپنی ماں کے ساتھ وہیں رہتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی شادی مقامی عرب قبیلے کے ایک گھرانے میں ہوتی ہے اور اس قبیلے کی آبادی مکے میں پھیلتی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اب تک ایک اہم واقعہ' یعنی کعبے کی از سرنو تعمیر کا ذکر کرنا ہے' اسلامی روایت کے مطابق جب حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں آئے اور جنت کی جگہ زمین پر رہنے لگے تو یہاں ان کو ایک طرح کی کمی محسوس ہوئی۔ وہ جنت میں دیکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی عبادت کے لیے بیت المعمور کے اطراف طواف کرتے ہیں۔ زمین پر کوئی عبادت گاہ موجود نہیں تھی۔ انھوں نے اللہ سے دعا کی کہ مجھے عبادت گاہ کی نعمت سے محروم نہ رکھا جائے۔ چنانچہ اللہ نے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کی مدد کے لیے مامور کیا کہ زمین پر بھی بیت المعمور کی طرح سے عبادت گاہ تعمیر کی جائے۔ فرشتوں نے زمین پر بھی بیت المعمور کے عین نیچے ایک مقام کا انتخاب کیا اور وہاں کعبہ کی تعمیر کی۔ حدیث میں علامتی طور پر (Symbolically) یہ الفاظ ہیں کہ اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر پھینکا جائے تو سیدھے کعبے کی چھت پر گرے گا۔ یہ کعبہ جو حضرت آدم علیہ السلام کے لیے بنایا گیا وہ زمین پر حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے زمانے تک قائم رہا۔ طوفان کے بعد اس کے کوئی آثار باقی نہیں رہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں اس کی تعمیر جدید کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ان کے بعد جو بڑے پیغمبر آئے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اللہ نے انھیں حکم دیا کہ کعبہ کی از سرنو تعمیر کریں۔ انھوں نے کہا کہ آمنا و صدقنا سر آنکھوں پر' لیکن مجھے معلوم نہیں کہ پہلا کعبہ کس مقام پر واقع تھا؟ اللہ نے کہا کہ دیکھو' تمھارے سامنے بادل کا جو ٹکڑا اس وقت حرکت کرتا ہے' تم اس کے سائے کے پیچھے پیچھے چلو اور جس مقام پر یہ سایہ رک جائے گا' وہی مقام ہے جہاں کعبہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سائے کے پیچھے چلتے گئے۔ بالآخر وہ اس مقام پر پہنچے جہاں اب کعبہ ہے اور یہاں بادل نے حرکت ختم کر دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سائے کے طول و عرض پر نشان لگائے اور یہ تھا کعبہ کا خاکہ۔ انھوں نے وہاں تھوڑی سی کھدائی کی تو دیکھا کہ پرانی بنیاد کے آثار وہاں موجود ہیں۔ اسی بنیاد پر انھوں نے نئی عمارت کی تعمیر شروع کر دی۔ اس وقت ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام بھی بڑے ہو چکے تھے۔ چنانچہ اپنے بیٹے کی مدد سے انھوں نے وہاں چار دیواروں سے گھیر کر ایک بہت ہی سادہ قسم کی عمارت بنائی۔ جب وہ دیواریں

قد سے بھی اونچی ہونے لگیں تو اس وقت انھیں ضرورت پیش آئی کہ دیواروں کو مزید بلند کرنے کے لیے کوئی سہارا لیا جائے۔ چنانچہ وہ ایک پتھر پر کھڑے ہو کر کعبہ کی تعمیر کرنے لگے۔ یہ پتھر "مقام ابراہیم" کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ ایک زمانے میں وہ کعبہ کے عین سامنے دیوار کے پاس تھا' جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام عمارت بناتے تھے۔ اسلامی مورخ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ طغیانی آئی تو یہ پتھر بہہ گیا اور بہت مشکل سے دستیاب ہوا۔ تب اس کو پرانے مقام پر رکھنے کی بجائے کعبہ کے اندر رکھ دیا گیا۔ پھر کچھ زمانے کے بعد اس کو نکالا گیا اور ایک دوسرے مقام پر رکھ دیا گیا اور اب سعودی دور میں تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ کعبہ کے سامنے اس کو ایک کانچ کے صندوق کے اندر بند کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک عبادت گاہ تعمیر کی اور اس کو خدائے واحد کا مکان (بیت اللہ) قرار دیا۔ بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے' اس میں لکھا ہے کہ جب وہ عراق سے ترک وطن کر کے فلسطین آئے تو انھوں نے مختلف مقامات پر "بیت ایل" تعمیر کیے۔ "بیت" وہی لفظ ہے جو عربی میں ہے اور "ایل" کے معنی اللہ کے ہیں۔ یہ لفظ ہم کو "جبرئیل" اور "اسرائیل" وغیرہ میں نظر آتا ہے۔ "بیت ایل" کے معنی ہیں "اللہ کا گھر" بائبل کے مطابق انھوں نے فلسطین کے بہت سے مقامات پر اللہ کی عبادت گاہیں تعمیر کیں اور مقامی باشندوں کو بتایا کہ اپنے پروردگار اور خالق کی کس طرح عبادت کریں۔

۲۰۰ ۔ یہ مقام حیرت نہیں کہ جب ابراہیم علیہ السلام اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ عرب میں آئے تو مکہ میں اس بچے اور اس کی اولاد کے لیے اور دوسرے رشتہ داروں کے لیے بھی انھوں نے ایک "بیت ایل" یا بیت اللہ تعمیر کیا جو اب تک چلا آتا ہے۔ قرآن مجید (۳ : ۹۶) میں ذکر ہے کہ کعبہ دنیا میں وہ قدیم ترین عبادت گاہ ہے جو اللہ کے لیے تعمیر کی گئی ہے۔ اگر ہم یہ بیان ان معنوں میں لیں کہ وہ قدیم ترین گھر جو اب تک موجود ہے تو اس میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ لیکن اگر یہ کہیں کہ سب سے پہلے جو گھر تعمیر کیا گیا وہ کعبہ ہے تو اس لحاظ سے اعتراض ہو گا کہ آخر اور بھی تو پیغمبر دنیا میں آ چکے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام وغیرہ ہوئے ہیں ان کے زمانے میں بھی اللہ کی عبادت و اطاعت ہوتی تھی اور ان کے ہاں بھی کوئی عبادت گاہ ہو گی جو کعبہ سے پہلے ہو گی اس لیے اگر ہم کعبہ کا بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار نہ دیں بلکہ اس سے پہلے کے پیغمبر یعنی حضرت آدم

علیہ السلام کی بنائی ہوئی عبادت گاہ قرار دیں تو پھر قرآن کے بیان میں کسی کو اعتراض نہیں ہو گا۔ صرف میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو مکان بنایا' اس پر یہودیوں اور عیسائیوں کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اور بھی مقامات پر "بیت ایل" بنائے تھے۔ جب اور بھی گھر بنائے تھے تو حجاز میں بنانے پر کیوں اعتراض کیا جائے؟ بہرحال بیت اللہ کا حج جو حضرات ابراہیم علیہ السلام نے معین کیا تھا' اس کا سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا اور اس کے نگران پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے اور ان کے بعد ان کی اولاد اس کی متولی رہی۔ بعد میں جنگیں ہوئیں اور بیرونی لوگ مکہ پر آ کر قابض ہوتے رہے ہیں۔ یہ ایک طویل قصہ ہے جس کو میں اس وقت بیان نہیں کر سکتا۔ کہنا یہ ہے کہ جس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اس وقت مکہ کی چند خصوصیتیں ہمیں حیرت انگیز نظر آتی ہیں' وہ یہ کہ مکہ نہ صرف بہت مالدار اور تجارتی شہر تھا بلکہ ساتھ ساتھ اس کے نظم و نسق کے لیے ایک حکومت بھی پائی جاتی تھی۔ جس میں بارہ وزیر ہوا کرتے تھے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جن پر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ میں اس کا حال مختصر طور پر آپ سے بیان کروں گا۔ جہاں تک تجارت کا تعلق ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بہت پہلے نسلاً نسل کے انتظامات کا نتیجہ تھی۔ قرآن مجید کی (۱۰۶) "سورۃ قریش" سے آپ واقف ہیں جس میں مکے والوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ اللہ ہی نے تمھیں سردی اور گرمی کے سفر کے ذریعہ مال بھی دیا اور خوف سے بھی تم کو بچا لیا لہٰذا اس اللہ کا تمھیں شکر گزار ہونا چاہیے۔

۲۰۱۔ جغرافیائی نقطہ نگاہ سے مکہ ایک اہم مقام تھا کہ عرب کے شمال اور جنوب کے لوگ جب تجارت کے لیے جاتے تھے تو انھیں مکہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یورپ کی تجارت ہندوستان سے مکہ کے راستے سے ہوا کرتی تھی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ مکہ کی جغرافیائی اہمیت کیا تھی۔ اس زمانے میں تجارتی قافلوں اور کاروانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ غذاء' پانی اور ٹھہرنے کی جگہ کا بندوبست کریں۔ مکہ میں جو زمزم کا چشمہ یا کنواں تھا وہ ایسی چیز تھی کہ اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا تمام قافلے وہاں سے گزرا کرتے تھے۔ مکے کی اس تجارتی حیثیت کو اور بھی مستحکم کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جد امجد عبد مناف بن قصیٰ نے ایک مرتبہ اپنے بیٹوں میں سے ایک کو قیصر کے پاس بھیجا' دوسرے کو کسریٰ کے پاس بھیجا' تیسرے کو نجاشی کے پاس اور چوتھے کو یمن کے حکمرانوں کے پاس بھیجا اور ان سے ایلاف یعنی

معاہدہ یہ کیا کہ ہمیں اس بات کی اجازت ہو کہ ہم تجارتی قافلے تمھارے ملک میں لائیں۔ اپنا مال وہاں فروخت کریں اور تمھارے ملک کی پیداوار خرید کر اپنے ملک کو لے جائیں۔ اس تجارتی معاہدے کو ان حکمرانوں نے بھی پسند کیا اور قبول کر لیا۔ اس کے متعلق ہمارے پاس تفصیلی معلومات ہیں لیکن اس وقت میں ان کو بیان نہیں کروں گا کہ اس پر میرا ایک مضمون البلاغ کراچی (جون ۱۹۶۸) میں چھپ چکا ہے۔

۲۰۲۔ مکے والوں نے یہ سوچا کہ ممکن ہے لٹیرے بدوؤں کے قبیلے تجارتی قافلوں کو اپنے علاقوں سے گزرتے دیکھ کر چھاپہ ماریں اور انھیں لوٹ لیں' اس لیے مکے کی زیارت گاہ اور مال تجارت کی حفاظت کا کچھ نہ کچھ انتظام کیا جائے۔ چنانچہ مکے کے افسروں نے ان تمام قبائل کے سرداروں سے جو کاروان تجارت کے راستوں پر پڑتے تھے' گفتگو کی اور ان سے کہا کہ ان تجارتی قافلوں سے ہمیں جو منفعت ہو گی اس میں سے کچھ حصہ تمھیں بھی دیا جائے گا۔ اس لالچ میں انھوں نے قبول کیا کہ ہم تمھارے کاروانوں پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مکی سرداروں نے کہا کہ اگر تمھارے پاس کچھ فروخت کرنے کا سامان ہو' مثلاً بھیڑ بکریوں کے چمڑے یا زیتون کا تیل وغیرہ' تو وہ ہمیں دے دو' ہم اسے فروخت کریں گے اور قیمت اور پورا منافع بغیر کسی معاوضے کے تمھیں پہنچا دیا کریں گے۔ غرض ان قبائلی سرداروں سے معاشی معاہدوں اور ہر طرف سے انتظامات کے باعث مکہ معظمہ عرب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز اور انتہائی مال دار شہر بن گیا تھا۔ اس کی دولت مندی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ ہجرت مدینہ کے بعد کے ابتدائی زمانے میں ایک اسلامی دستے نے ایک بار مشرکین مکہ کے ایک کارواں پر چھاپہ مارا تھا اور اس میں جو مال غنیمت ملا' اس کی مالیت ایک لاکھ درہم تھی۔ اس زمانے میں ایک لاکھ درہم کی قیمت آج کل کے کروڑوں روپے کے برابر تھی یہ صرف ایک کارواں کا سرمایہ تھا' اس سے ہم قریش کی دولت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چونکہ قریش کاروانی راستوں کے قبیلوں سے دوستی اور حلیفی کر چکے تھے' اس سے وہ مزید فائدہ یوں اٹھانے لگے کہ اگر کسی اور قبیلے کا کارواں سفر پر جانا چاہتا تو ایک قریشی شخص' معاوضہ لے کر' اس میں شریک ہو جاتا۔ اسے خفارہ یا بدرقہ کہتے۔ اور اس کی وجہ سے قریش کا کوئی حلیف قبیلہ اس کارواں کو بھی نہ چھیڑتا۔

۲۰۳۔ جہاں تک سیاسی نظم و نسق کا تعلق ہے' شہر مکہ میں ایک شہری مملکت تھی جس کا رقبہ (حدود حرم کی اساس پر) تقریباً ایک سو تیس مربع میل تھا۔ وہاں بادشاہت کی جگہ ایک طرح کی

جماعتی گورنمنٹ تھی، یعنی ایک مجلس وزراء اس کے انتظام کی ذمہ دار تھی۔ اس کی تفصیلیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ نہایت ہی مختصراً ذکر کروں گا کہ اس میں دیوانی مقدمات اور فوجداری مقدمات کے لیے الگ الگ وزیر تھے، کعبہ کے انتظام کے لیے، یعنی دروازہ کھولنے اور بند کرنے کے لیے ایک وزیر تھا، اس طرح وہاں غیب دانی کے لیے یعنی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کوئی کام ہمیں کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے، ان کے پاس تیر ہوا کرتے تھے جن سے وہ فال نکالا کرتے تھے۔ ان تیروں کی نگرانی کرنے والا ایک وزیر ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح کعبے میں باہر سے آنے والے زائرین چڑھاوے چڑھایا کرتے تھے، ان چڑھاوؤں کی حفاظت کے لیے ایک اور وزیر مقرر تھا۔ اسی طرح ٹیکسیشن کے لیے بھی ایک وزیر تھا۔ یعنی شہر مکہ کے باشندے ہر سال اپنے افسر متعلقہ کو کچھ رقم بطور ٹیکس دیتے تھے جس کا اولاً مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ اگر کوئی حاجی کسی وجہ سے مکہ میں اپنے آپ کو بے بس پائے یا اس کے پاس پیسے بالکل نہ رہیں، یا اس کی سواری کا اونٹ مرجائے تو ایسے مجبور لوگوں کی مدد کے لیے اور حج کے زمانے میں باہر سے آنے والوں کی ضیافت اور مہمانداری پر خرچ کرنے کی غرض سے ایک ٹیکس لیا جاتا تھا جس کا انتظام، ظاہر ہے کہ ایک خصوصی وزیر کے سپرد ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ اور وزارتیں بھی تھیں۔

۲۰۴۔ چنانچہ ایک اور ادارہ دارالندوہ تھا یعنی پارلیمنٹ جب کبھی کوئی مشکل مسئلہ پیدا ہوتا تھا، مثلاً کسی دشمن کے حملے کا خطرہ یا کوئی اور معاملہ درپیش ہوتا تو سارے معمر باشندوں سے گفتگو ہوتی تھی۔ لکھا ہے کہ ہر وہ شخص، جس کی عمر چالیس سال ہو جاتی، وہ خود بخود اس مجلس مشاورت یا اس پارلیمنٹ کا رکن بن جاتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دو آدمیوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا یعنی ان کو چالیس کی عمر کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا رکن بنا لیا گیا تھا۔ ان میں ایک ہمارے "دوست" ابوجہل صاحب بھی تھے۔ ان کی فراست اور عقلمندی کا بڑا چرچا تھا۔ چنانچہ ان کو نوجوانی میں ہی اس کا رکن بنا دیا گیا تھا۔ اسی طرح ایک اور شخص کا بھی ذکر آتا ہے۔ سب سے عجیب و غریب جو بات ہمیں نظر آتی ہے، وہ وزارت خارجہ کا عہدہ ہے۔ وزارت خارجہ کا دائرہ کار یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب کبھی کسی بیرونی قبیلے سے گفتگو کی ضرورت پیش آتی، کسی جھگڑے کا تصفیہ اور مصالحت کرانی ہوتی یا دشمن کے مطالبات کو نہ ماننے کی صورت میں اعلان جنگ کرنا پڑتا یا کوئی قبیلہ قریش کی برتری اور فضیلت پر اعتراض کرتا تو اس کو جواب دینے اور قریش کی خوبیاں، اور اعتراض کرنے والے قبیلے کی برائیاں بیان کرنا ہوتا۔ تو ایسے تمام خارجہ معاملات کے انتظام و انصرام

کے لیے بھی ایک عہدہ دار پایا جاتا تھا' یہ تمام وزارء عہد نبوی تک پائے جاتے تھے۔ ان میں سے اکثر نام بہت مشہور و معروف ہیں مثلاً دیوانی مقدمات حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد تھے' وزارت خارجہ کا منصب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد تھا' اسی طرح فوج میں دو جھنڈے ہوتے تھے' ایک کو لواء اور دوسرے کو رایہ کہتے تھے۔ ان کے فرق سے میں یہاں بحث نہ کروں گا۔ ایسا ایک جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر العبدری کے پاس رہتا تھا اور دوسرا جھنڈا حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد تھا۔ یہ تمام نام سیرت النبی اور تاریخ اسلام میں آتے ہیں۔ یہ اسلام سے پہلے کی مشہور شخصیتیں تھیں اور مکے کی حکومت میں ان کو خاصا مقام حاصل تھا۔ دوسرے لفظوں میں شہر مکہ میں ایک مملکت پائی جاتی تھی اور یہ مملکت ایک شہری مملکت تھی۔ اس کا انتظام بجائے ایک فرد کے ہاتھ میں ہونے کے ایک نمائندہ جماعت کے سپرد کیا گیا تھا۔ جس کا ہر فرد وراثتی اصول پر ہمیشہ ایک ہی قبیلے سے ہوا کرتا تھا۔ یہ ہے مختصر خلاصہ اس سیاسی نظام کا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت شہر مکہ میں پایا جاتا تھا۔

۲۰۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سنہ ۵۶۹ عیسوی میں ہوتی ہے' ابتدائی چالیس سال تک وہ اس شہر کے ایک معمولی باشندے رہے۔ کوئی ایسی بات ہمیں نظر نہیں آتی جو قابل ذکر ہو' بجز اس کے کہ اور قبیلوں کی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان بنی ہاشم کا بھی ایک فرد اس نظام حکومت میں شامل تھا یعنی ایک وزارت اس خاندان کے بھی سپرد تھی' وہ وزارت زمزم کے کنویں کے انتظام کے متعلق تھی۔ اس میں منفعت بھی تھی۔ اگرچہ ہمیں صراحت سے معلوم نہیں لیکن اور مقاموں' مثلاً شام وغیرہ میں اس کا پتا چلتا ہے کہ عبادت گاہ کے کنویں کا پانی حاجیوں کو دیا جائے تو انعام یا ٹیکس کے طور پر اس پانی دینے والے کو لوگ اپنی طرف سے رقم دیا کرتے تھے۔ اگر مکے میں بھی ایسا ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس سے کافی منفعت ہوتی ہو گی۔ یہ قدیم کنواں چونکہ بڑی مدت غائب رہنے کے بعد عبدالمطلب نے دریافت کیا تھا' اس لیے انھیں کی نگرانی میں رہا اور غالباً ان کی خاطر شہری مملکت کے نظام میں ایک نئی وزارت کا اضافہ کر دیا گیا۔ عبدالمطلب کی وفات کے بعد یہ انتظام ان کے بیٹے ابو طالب نے سنبھالا۔ ابو طالب بہت فراخ دل تھے لیکن ان کی مالی حالت خراب تھی اور اکثر قرض لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ اپنے بھائی حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کچھ رقم قرض لی اور کہا کہ ایک سال بعد ادا کردوں گا۔ ایک سال بعد آپ رقم ادا نہ کر سکے تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے کہا کہ اگر تم مزید مہلت چاہتے ہو تو میں اس شرط پر آمادہ ہوں کہ زمزم کی نگرانی مجھے دے دی جائے۔ اس طرح چاہ زمزم ابو طالب کی جگہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبضے میں آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں فتح مکہ کے وقت بھی وہی اس کے مالک تھے اور اس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توثیق بھی کی۔ غرض یہ کہ بنی ہاشم کو بھی مکہ شہر کے انتظام میں دستوری طور پر ایک مقام حاصل تھا۔ بعد کے زمانے میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے نظم و نسق میں کیا حصہ لیا اور مکہ شہر میں ان کی کیا حیثیت تھی؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ شہر مکہ میں جو لوگ مسلمان ہوتے رہے ان کی تعداد بہت ہی آہستہ آہستہ بڑھی، لیکن وہ تھے سارے ہی قبیلوں کے، اور انھوں نے مملکت کے اندر ایک مملکت بنا لی۔ وہ مکہ شہر میں رہتے تھے لیکن اگر انھیں عدالتی مسئلے کی ضرورت پیش آتی تھی تو وہ شہر کے ان مشرک افسروں کے پاس نہیں جاتے تھے جن کے پاس عدل گستری کا کام تھا۔ اگر انھیں فوجی دفاع کے سلسلے میں ضرورت پیش آتی تو ان کو مکہ والوں سے امداد کی توقع نہ تھی۔ غرض وہ ہر کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے جو ان کے قانون ساز بھی تھے، حاکم عدالت بھی، کمانڈر انچیف بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ جلدی ہی مسلمانوں کو مکہ کو خیرباد کہنا پڑا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت مکہ کے اکثر مسلمان بھی ہجرت کر کے مدینے میں جا بسے۔

۲۰۶۔ جیسا کہ اپنے گزشتہ لیکچر میں اشارۃً عرض کر چکا ہوں کہ مدینے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مہاجرین کے معاشی مسائل حل کرنے کے لیے مواخات کا انتظام کیا۔ اس کے بعد جو کام ہوا، اس کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے یعنی مملکت کا قیام۔ مدینے میں کسی مملکت کا وجود نہیں تھا۔ شہری مملکت کا نہ کسی اور قسم کی مملکت کا۔ یہاں اسلام سے پہلے کئی رشتہ دار قبیلے آباد تھے مگر ان قبیلوں میں ہمیشہ آپس میں خانہ جنگی ہوتی رہتی تھی چنانچہ آخری جنگ ہجرت نبوی سے پانچ سال پہلے ہوئی تھی جس میں بہت ہی خوں ریزی ہوئی اور اس کے اثرات خود اسلامی معاشرے پر بھی پڑے۔ اشارۃً میں دو چیزوں کا ذکر کرتا ہوں۔ لکھا ہے کہ ہجرت سے پہلے جب مدینے کے کچھ لوگ "اوس" قبیلے میں سے اور کچھ لوگ "خزرج" قبیلے کے بھی مسلمان ہوئے تو چونکہ ان دونوں قبیلوں میں جھگڑا تھا، اگر امام "خزرجی" ہوتا تو "اوسی" مسلمان اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتے۔ اور اگر "اوسی" امام ہوتا تو "خزرجی" لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتے اس لیے ضرورت پیش آئی کہ مکے سے ایک امام بھیجا جائے تاکہ

اس کے پیچھے "اوسی" اور "خزرجی" دونوں نماز پڑھ سکیں۔ ایک اور واقعہ جس کو ہم اس سے بھی زیادہ افسوس ناک کہہ سکتے ہیں' یہ نظر آتا ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں میں نقیب النقباء اسعد بن زرارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بہت اچھے' راسخ العقیدہ اور اسلام کے لیے سرگرم کار مسلمان تھے۔ وہ "خزرج" قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے قبا پہنچے' تو ایسے بہت سے لوگ' جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے دیکھ چکے تھے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے' آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں' سلام عرض کرتے ہیں اور مہمان نوازی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ لیکن ان میں اسعد بن زرارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نظر نہیں آتے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پوچھا کہ اسعد بن زرارہ کہاں ہیں تو قبا کے باشندوں "اوسیوں" نے شرمندگی کے انداز میں کہا کہ گزشتہ جنگ بعاث میں انھوں نے ہمارے بعض سرداروں کو قتل کیا تھا' اس لیے انھیں جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ ہمارے علاقے میں آئیں۔اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ میں حکومت کرنے کے لیے کن دشواریوں کا سامنا تھا۔ بہرحال اسی رات کا کافی حصہ گزرنے پر ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے بھیس بدلے ہوئے' چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے آتا ہے۔ جب حضورؐ کے پاس پہنچتا ہے تو نقاب اٹھاتا ہے۔ یہ تھے اسعد بن زرارہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیرت سے پوچھتے ہیں کہ تم کیسے آئے؟ انھوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں اور میں نہ آؤں' یہ ناممکن تھا۔ جان پر کھیل کر حاضر ہوا ہوں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوشش کرتے ہیں کہ قبیلہ "اوس" ان کو باقاعدہ طور پر پناہ دینے کا اعلان کرے تاکہ اگر وہ آئیں تو کھلم کھلا آ سکیں اور انھیں کوئی "اوسی" شخص نہ ستائے۔ مگر وہ ہچکچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ حکم دیں گے تو ہم تعمیل کریں گے لیکن ہم خود پناہ دینا نہیں چاہتے۔" بالآخر ایک "اوسی" سردار نے اس کو قبول کیا۔ چنانچہ وہ اسعد بن زرارہ کے مکان پر گئے۔ ان کو ساتھ لے کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے ہیں۔ اور "اوسی" قبیلے کے لوگ دیکھتے ہیں کہ ان کے سردار نے اسعد بن زرارہ کو پناہ دی ہے۔ پھر اس کے بعد سے امن قائم ہوتا ہے۔ تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مدینہ میں حکومت کرنا کتنا مشکل تھا اور کن تدبیروں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آہستہ آہستہ ان مشکلوں کو دور کیا۔

۲۰۷۔ اس ابتدائی کام سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تجویز پیش کی کہ مدینہ میں ایک چھوٹی سی مملکت قائم کی جائے۔ لیکن ابتداء ہی میں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ بعاث کے بعد مدینے والوں نے یہ سوچا تھا کہ آئے دن کی جنگ ہم سب کے لیے نقصان کا باعث ہے' اس کو ختم کرنا چاہیے۔ لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ختم کریں؟ اگر کوئی بادشاہ بنایا جائے تو وہ کس قبیلے کا ہو جس کی اطاعت "خزرجیوں" اور "اوسیوں" میں سبھی کو قبول ہو۔ خزرجی قبیلے کا ایک سردار' عبداللہ بن ابی بن سلول بہت مالدار اور صاحب اقتدار تھا۔ خزرجیوں کو توقع تھی کہ "اوسی" بھی اس کی مخالفت نہ کریں گے' چنانچہ اس کے لیے تاج شہریاری تیار ہونے لگا۔ اس اثناء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اوسی اور خزرجی مسلمانوں کو اب عبداللہ بن ابی بن سلول سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اس کا نتیجہ بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی سلول کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت پیدا ہو گئی کہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غاصب ہیں' میرے اقتدار اور میری بادشاہت میں حارج ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یہ شخص ساری عمر منافق رہا اور آئے دن اسلام کے لیے دشواریاں پیدا کرتا رہا۔ "واقعہ افک" میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جو الزام لگایا گیا' وہ بھی انہی صاحب کی کارگزاری تھی۔ جنگ تبوک کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی ایک سازش ہوئی تھی' اس میں بھی اس کا دخل تھا۔ بہرحال ایک طرف عبداللہ بن ابی سلول کی وجہ سے مسلمانوں کو سیاسی نظم و نسق میں دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ علاوہ ازیں اوس قبیلے کے ایک عیسائی ابو عامر راہب نے دوسرا فتنہ کھڑا کیا۔ اس کو بائبل کے مطالعے سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا امکان ہے' چنانچہ اس نے سوچا کہ خود نبوت کا دعویٰ کرے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو وہ جا کر رسول اللہؐ سے جھگڑتا ہے' کہتا ہے کہ تم جھوٹے نبی ہو (نعوذ باللہ) نبی موعود تو میں ہوں۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کو شروع ہی سے بہت سی دشواریاں پیش آتی رہیں۔

۲۰۸۔ اب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا کی بجائے اس مقام پر رہنا پسند کیا جو "اوسیوں" کے نہیں "خزرجیوں" کے علاقے میں تھا۔ اس کی وجہ امام بخاری نے یہ بیان کی ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار تھے۔ عبدالمطلب کی ماں قبیلہ خزرج سے تھیں۔ چنانچہ قبا سے نکل کر' اس مقام پر قیام کیا جہاں بنو نجار کا قبیلہ رہتا تھا اور جلد ہی وہاں ایک

جلسہ طلب کیا گیا۔ شہر مدینہ کی آبادی کے جو مختلف عناصر تھے' ان سب کے نمائندوں کو بلایا اور ان کے سامنے حکومت قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز کو اکثریت نے قبول کیا۔ لکھا ہے کہ صرف چار "اوسی" کنبوں نے انکار کیا۔ اس طرح ایک مملکت قائم ہوتی ہے جو ایک شہر پر بھی نہیں بلکہ ایک شہر کے کچھ حصے پر مشتمل ہونے کے باوجود علمی اور تاریخی نقطہ نظر سے ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ یوں کہ ایک مملکت میں حکمران اور رعایا کے جو حقوق و فرائض ہوں گے' ان کو تحریری طور پر مرتب کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں اس مملکت کا دستور مرتب کر کے سب کے سامنے پیش کیا گیا اور سب کے مشورے سے اسے لکھا گیا۔ اس تاریخی دستاویز کی خاص قابل ذکر اہمیت یہ ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور "امی" شخص کے ہاتھوں وجود میں آتا ہے۔

۲۰۹۔ اس دستور کی ساری دفعات کی تشریح شروع کر دوں تو اس کے لیے کم از کم مجھے ایک پورا دن درکار ہو گا۔ مختصراً" یہ عرض کرنا ہے کہ اس طرف تو یہ اعلان کیا گیا ہے کہ یہ مملکت ایک مستقل اور خود مختار مملکت ہو گی اور یہ بھی صراحت ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے دین کی پوری آزادی ہو گی۔ چنانچہ ایک دفعہ کے الفاظ یہ ہیں کہ "للمسلمین دینھم و للیھود دینھم " یعنی مسلمانوں کے لیے مسلمانوں کا دین اور یہودیوں کے لیے ان کا دین ہے۔ یعنی وہاں جتنے بھی لوگ بستے تھے ان کو دینی' عدالتی اور قانونی آزادی کا اطمینان دلایا گیا تھا۔ اسی طرح دفاع کے سلسلے میں جو انتظام کیا گیا وہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن اس پہلو پر کچھ عرض کرنے سے پہلے میں یہ کہوں گا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حکومت کا صدر تسلیم کیا گیا۔ اگر خالص دنیوی نقطہ نظر سے ہم اس پر غور کریں تو وجہ یہ نظر آتی ہے کہ "اوسیوں" کا کوئی بادشاہ مقرر کیا جاتا تو "خزرجی" اس کو قبول نہ کرتے اور اگر "خزرجیوں" میں سے منتخب کرتے تو "اوسی" اس کو قبول نہ کرتے۔ چنانچہ سوائے اس کے کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ آپس میں لڑنے والے قبائل آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد رکھتے اور آپ کو نبی مانتے تھے۔ آپ کی غیر جانبداری' آپ کی عدل گستری' آپ کا تحمل و تدبر اور آپ کی فیاضی کا چند مہینوں کے عرصے میں سب لوگوں کو تجربہ ہو چکا تھا۔

۲۱۰ ۔ دفاع کے سلسلے میں' اس دستور میں جو' صراحتیں ہیں' ان میں سب سے پہلے یہ بات قابل ذکر ہے کہ امن اور جنگ ناقابل تقسیم چیز ہو گی' یعنی اگر امن ہو تو اس سلطنت کے سارے باشندوں کے لیے ہو گا اور جنگ ہو تو سارے باشندوں کے لیے۔ صلح و جنگ کی مرکزیت اور ان کا ناقابل تقسیم ہونا ایک اہم بات تھی۔ پھر اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ اگر جنگ کے لیے باہر

جانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہو گا کہ کون شخص فوج میں شریک رہے اور کون فوج میں نہ رہے۔ گویا آپ کو کمانڈر انچیف سے بھی زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ آپ کو اختیار تھا کہ اپنی فوج سے ان تمام لوگوں کو خارج کر دیں جو مشتبہ ہوں اور جو فوج کے اندر رہ کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہیں۔ گویا آپ نہ صرف جنگی انتظامات کے مالک تھے بلکہ جنگ کے سیاسی پہلوؤں پر بھی آپ ہی کا دخل تسلیم کیا گیا۔ البتہ یہ صراحت ہے کہ اگر باہر سے کوئی دشمن حملہ آور ہو تو ہر محلہ اپنے رقبے کی براہ راست مدافعت کرے گا اور لوگ ایک دوسرے کی مدد کریں گے' اور یہ بھی کہ فوج میں جو اخراجات ہوں وہ ہر محلہ یعنی ہر قبیلہ خود برداشت کرے گا۔ اس زمانے میں مرکزی حکومت کے پاس کوئی سرکاری خزانہ نہیں تھا۔ لہٰذا مجبوراً" یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ لوگ رضاکارانہ اور بلاتنخواہ فوج میں داخل ہوں۔ لیکن فوج کی باگ ڈور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور فوجی انتظامات خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی فرماتے ہیں۔ اسی طرح دستور میں عدل گستری کا بھی ذکر ہے کہ ابتدائی عدالت تو قبیلہ وار ہو گی یعنی قبیلے کے دو افراد میں جھگڑا ہو تو لوگ اپنے قبیلے کے سردار سے رجوع کریں گے۔ لیکن اگر فریقین دو مختلف قبیلوں کے ہوں تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ انھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنا پڑے گا۔ اگرچہ انھیں اختیار تھا کہ کسی اور شخص کو بھی اپنا حکم بنا لیں لیکن آخری حاکم عدالت یا بالفاظ دیگر عدالت اپیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہو گی۔ مسلمانوں کے لیے صراحت ہے کہ قانون سازی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے۔ دیگر تفصیلیں جو اس دستور میں آئی ہیں ان کے سلسلے میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ حکمران کو کیا اختیارات حاصل ہیں۔ اس دستور میں ایک چیز جو غیر معمولی اور غیر متوقع کہی جا سکتی ہے وہ بیمے کا انتظام ہے۔ اس کی تفصیل پہلے کسی جگہ آ چکی ہے۔ یہاں اشارۃً" ذکر کیا جاتا ہے کہ اگر فدیہ یا خون بہا کی گراں قدر رقم کوئی شخص ادا کرنے سے معذور ہو تو اس کے قبیلے کی انجمن یا ہمسایہ قبیلے کی انجمن ورنہ بالاخر مرکزی انجمن' اس رقم کی ادائیگی کا انتظام کرے گی۔ اسی طرح یہودیوں کے متعلق بھی تفصیل ہے کہ ان پر کیا واجبات و فرائض ہوں گے۔ اس کا بھی ذکر ہے کہ جو مشترکہ دشمن ہیں یعنی قریش مکہ وغیرہ ان کے ساتھ اس مملکت کے باشندوں کا کیا طرز عمل ہو گا۔

۲۱۱۔ یہ تھا وہ نظام جو عہد نبوی میں شروع ہوا' اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ مملکت ابتداء میں ایک شہری مملکت تو تھی لیکن کامل شہر میں نہیں تھی بلکہ شہر کے ایک حصے میں قائم کی گئی تھی' لیکن اس کی توسیع بڑی تیزی سے ہوتی ہے۔ اس توسیع کا آپ اس سے اندازہ لگایئے کہ صرف دس سال بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس وقت مدینہ ایک شہری مملکت نہیں بلکہ ایک وسیع مملکت کا دارالسلطنت تھا۔ اس وسیع سلطنت کا رقبہ' تاریخی شواہد کی رو سے تین ملین یعنی تیس لاکھ مربع کلو میٹر پر مشتمل تھا۔ دوسرے الفاظ میں دس سال تک اوسطاً" روزانہ کوئی آٹھ سو پنیتالیس مربع کلومیٹر علاقے کا ملک کے رقبے میں اضافہ ہوتا رہا۔ سلطنت کی یہ توسیع کچھ تو پر امن ذرائع سے ہوئی اور کچھ جنگوں کے نتیجے میں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و سرایا سے متعلق دیگر تفصیلات کے علاوہ مقتولین اور شہداء کے اعداد و شمار بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ تین ملین کلو میٹر رقبہ فتح کرنے کے لیے دشمن کے جتنے لوگ مرے ہیں' ان کی تعداد مہینے میں دو بھی نہیں تھی' دس سال میں ایک سو بیس مہینے ہوتے ہیں تو ایک سو بیس کے دو گنے دو سو چالیس آدمی بھی ان لڑائیوں میں نہیں مرے' دشمن کے مقتولین کی تعداد اس سے کم تھی' مسلمانوں کے شہداء کی تعداد دشمن کے مقتولوں سے بھی کم تھی۔ مسلمانوں کا سب سے زیادہ نقصان جنگ احد میں ہوا کہ ستر آدمی شہید ہوئے اور یہ نقصان بھی مسلمانوں کی اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہوا۔ بہرحال بحیثیت مجموعی میدان جنگ میں قتل ہونے والے دشمنوں کی تعداد مہینے میں دو سے بھی کم ہے' جس سے ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اسوہ حسنہ بن کر دنیا بھر کے حکمرانوں اور فاتحوں کو بتاتے ہیں کہ دشمن کا مقابلہ اور ان کو شکست دینے کی کوشش ضرور کرو لیکن بے جا خون نہ بہاؤ۔ مقصد یہ کہ دشمن جو آج غیر مسلم ہے ممکن ہے کل وہ مسلمان ہو جائے یا اس کے بیوی بچے اور اس کی آئندہ نسلیں مسلمان ہو جائیں لہٰذا اس امکان کو زائل کرنے میں اپنی طرف سے کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے پچھتانے کی ضرورت پیش آئے۔

۲۱۲۔ ہمارے موضوع کا ایک پہلو تو حکومت کے قیام اور سلطنت کی توسیع سے متعلق تھا' دوسرے پہلو کا تعلق حکومت کے نظم و نسق سے ہے۔ ہم یہاں یہ دیکھیں گے کہ نظم و نسق کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اقدامات کیے اور ان کے کیا نتائج نکلے۔ جیسا ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ میں کوئی مملکت پائی ہی نہیں جاتی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے پہلی مرتبہ قائم فرمائی۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پرانے انتظامات وراثت میں بالکل نہیں ملے۔ فوج، خزانہ و تعلیم، عدلیہ اور انتظامیہ کے اداروں میں سے کوئی چیز وہاں نہیں تھی۔ ہر چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود ہی نقطہ صفر سے پیدا کرنی اور ترقی دینی تھی۔ اس زمانے میں اتنے دفتر اور اتنے محکمے نہیں ملیں گے جو آج بیسویں صدی میں ہمیں اپنے آس پاس نظر آتے ہیں، مثلاً آج کل آپکو سڑکیں بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عرب میں کہیں سڑکیں نہ تھی۔ سڑکوں اور شاہراہوں کی جگہ عام خود رو گزر گاہیں تھی۔ سڑک کی تعمیر کی کوئی ضرورت نہیں تھیں۔ لہٰذا اس کے لیے نہ ناظم تھا، نہ محکمہ تعمیرات۔ البتہ اس کے باوجود کچھ ایسی چیزیں ملتی ہیں جو شہری منصوبہ بندی کے سلسلے میں کار آمد ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شہر کے اندر تم گلیوں کو اتنا چوڑا رکھو کہ دو لدے ہوئے اونٹ باسانی آمنے سامنے گزر سکیں، گویا آج کل کے الفاظ میں آسانی کے ساتھ دو لاریاں آ جا سکیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قانون سازی صرف دینی معاملات تک ہی محدود نہیں تھی اس میں دنیوی مسائل پر بھی توجہ دی گئی ہے حتی کہ اس میں مکانوں کے درمیان کا راستہ بھی شامل ہے۔ وقت کی کمی کے باعث میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ اہم ترین انتظامات میں سے چند کاتبوں پر مشتمل ایک دفتری نظام (سیکرٹریٹ کا) بھی تھا۔ چنانچہ مسعودی اور دیگر مؤلفوں نے بتایا ہے کہ ان کاتبوں کے فرائض مختلف تھے۔ کچھ لوگ نازل ہونے والی وحی کو لکھا کرتے تھے۔ کچھ لوگ زکوٰۃ کے اندراجات کرتے، یعنی رقم کس سے وصول ہوئی اور کس پر خرچ کی گئی۔ جنگوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا، اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ سب کو جمع کر کے، اس میں سے سارے فوجیوں کو برابر کا حصہ دیا جائے۔ نیز پانچواں حصہ حکومت کو ملے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ مال غنیمت کی جمع و تقسیم کا حساب رکھا جائے۔ اس کے لیے بھی خصوصی کاتب مقرر تھے۔ اسی طرح کوئی دس بارہ مدوں کی تفصیل دی گئی ہے کہ ان کے لیے الگ الگ کاتب مقرر کیے گئے تھے۔ ان میں محکمہ خارجہ بھی تھا کہ بیرونی حکمرانوں اور سرداروں سے تبلیغ وغیرہ کے لیے خط و کتاب ہوتی تھی۔

۲۱۳۔ ایک چیز اور جس کا تعلق فوجی نظام سے اور ساتھ ہی مالی نظام سے ہے، اس کا بھی میں ذکر کرتا چلوں۔ اس پر آپ کو حیرت بھی ہو گی۔ عام طور سے مشہور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں دیوان قائم ہوا اور دیوان کا منشا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سرکاری خزانے سے

جوان عمر لوگوں کو پنشن دی جاتی تھی' اس شرط پر کہ وہ چوبیس گھنٹے تیار رہیں کہ جب حکومت انھیں بلائے تو وہ اسی وقت گھربار اور کاروبار چھوڑ کر فوجی مہم پر روانہ ہو جائیں۔ یہ نظام حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب ہے اور اس کے لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو دیوان قائم کیا تھا اس کی بہت سی تفصیلیں ہمیں ملتی ہیں۔ لیکن ہمیں حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس کا آغاز بھی عہد نبوی میں ہوتا ہے۔ چنانچہ امام محمد کی "السیر الکبیر" میں آیا ہے کہ عہد نبوی میں ایک کاتب کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ان بالغ لوگوں کی فہرست مرتب کرے جو نہ صرف جنگ کے قابل ہیں بلکہ اس پر آمادہ ہیں کہ جب انھیں بلایا جائے' فوراً فوجی مہم پر روانہ ہو جائیں ایسے لوگوں کو بیت المال سے مستقل وظیفہ ملتا رہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام کو مزید ترقی دی۔ ان کے زمانے میں حکومت کی آمدنی میں بہت اضافہ ہو گیا تھا لہٰذا وظائف بھی زیادہ دیے جانے لگے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں غیر مسلموں کو بھی وظائف دیے جاتے تھے۔ غرض دیوان یا سیکرٹریٹ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا۔ بعض چیزوں کا انتظام حسب ضرورت رضاکارانہ ہوتا تھا' مثلاً شروع میں اذان نہیں ہوتی تھی۔ جب نماز کے لیے لوگوں کو ایک مؤذن کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ طے پایا کہ اذان دی جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کام کے لیے منتخب فرمایا' کیونکہ ان کی آواز سریلی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اذان کا طریقہ سکھایا اور یہ بھی بتایا کہ کس لفظ کو کھینچو' کس کو مختصر کرو' گویا موسیقی کی سریں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سکھائیں۔ اسی طرح ایک اور نائب یا مددگار مؤذن بھی مقرر کیا گیا تاکہ ہمیشہ ایک ہی آدمی پر اس کی ذمہ داری یا بار نہ رہے۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہمیں مذہبی نظام کے سلسلے میں ملتی ہیں۔ مسجد نبوی کے اندر صفائی کی ضرورت تھی۔ ایک حبشی مسلمان عورت نے رضاکارانہ اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ روزانہ مسجد میں جھاڑو دیتی تھی اور قندیل میں لگائے ہوئے چراغ جلاتی۔ اس طرح کے انتظامات کا بھی ہمیں پتا چلتا ہے جو بالکل ابتدائی حالت میں تھے' اور رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ ان انتظامات میں سے ایک نظام فوج کا بھی ہے۔ دفاع کے لیے فوج کی ضرورت تھی۔ شروع میں اسلامی حکومت کے پاس کافی مال نہ تھا۔ اس کا حل خدائے حکیم نے یوں کر دیا کہ جہاد کو مسلمانوں کا ایک فریضہ قرار دیا گیا۔ ہر شخص پر واجب تھا کہ اسلام کے دفاع کے لیے اپنی جان

اور اپنے مال کو قربان کرے۔ یہ نہیں کہ سو فی صد مسلمان ساری جنگوں میں حصہ لیں' بلکہ بوقت ضرورت ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو پیش کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطلوبہ تعداد میں لوگوں کو چن لیتے تھے' اور انھیں مہم پر روانہ کر دیتے تھے۔

۲۱۴۔ اس سلسلے میں "صفہ" کا بھی ذکر کرنا چاہیے جس کا تعلق تعلیم و تربیت کے علاوہ فوج سے بھی ہے۔ بعض اوقات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی اطلاع آئی کہ فلاں قبیلے کے خلاف تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے' یعنی دشمن کو سزا دی جائے یا اس کا تعاقب کیا جائے۔ مثلاً کسی نے مدینے کے ایک گھر پر چھاپا مارا تو ضرورت تھی کہ فوراً ہی اس کے تعاقب کے لیے فوج کا ایک دستہ روانہ کیا جائے۔ ایسی ہنگامی ضرورت کے لیے "صفہ" کار آمد ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ اعلان ہوتے ہی کہ ایک مہم کے لیے اتنے آدمیوں کی ضرورت ہے' فوراً صحاب صفہ کی ایک جماعت اس مہم پر روانہ ہو جاتی۔ ان کو دن یا رات میں کسی وقت بھی بلایا اور بھیجا جا سکتا تھا۔ لیکن اگر کوئی بڑی مہم بھیجنی ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے تیاریاں کرنی ہوتیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے خطبے میں یا کسی نماز کے بعد یا غیر معمولی اجتماع کر کے فرماتے کہ اتنے آدمیوں کی ضرورت ہے تو لوگ رضاکارانہ اپنے آپ کو پیش کر دیتے۔ اس سلسلے میں یہ دلچسپ چیز ہے کہ ان کے نام اور پتے نوٹ کیے جاتے تھے اور بعد میں اس کے مطابق انھیں اطلاع دی جاتی تھی کہ تم سب لوگ فلاں مقام پر فلاں وقت اپنے ہتھیار اور ضروری سامان کے ساتھ جمع ہو جاؤ صرف یہی نہیں' فوجی نظام کے سلسلہ میں اور بھی بے شمار باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہؐ ہمیشہ لوگوں کو ورزش کی ترغیب دیتے تھے' نشانہ بازی کی مشق کی بھی ہمیشہ تشویق دلاتے۔ خود بھی وہاں جاتے اور اپنے سامنے گھڑ دوڑ کراتے' اونٹوں کی دوڑ کراتے' آدمیوں کی دوڑ کراتے' کشتی کے مقابلے کرواتے اور لوگوں کو انعامات دیتے تھے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں آج بھی شمالی دروازے کے پاس ایک مسجد ہے' جس کا نام مسجد سبق ہے۔ سبق کے معنی مسابقت میں جیتنا ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام پر جو ایک پہاڑی کے دامن میں ہے' بلندی پر کھڑے ہوجاتے تھے۔ اور جب گھوڑے دوڑتے ہوئے آتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فیصلہ فرماتے کہ کونسا نمبرا ہے اور کون سا نمبر ۲ اور ۳ وغیرہ۔ مقریزی' نے بیان کیا ہے کہ پانچ اول آنے والے گھوڑوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انعام دیا کرتے تھے اور یہ انعام کبھی کھجور کی صورت میں ہوتے' کبھی کسی اور چیز کی صورت میں۔

۲۱۵۔ غرض ایک تو فوجی خدمت کا لازمی قرار دیا جانا' دوسرے فوج کی تربیت' یہ دو انتظامات تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے۔ ساتھ ہی ساتھ حکومت کے زیر اہتمام فوجی سامان کا ذخیرہ بھی جمع کرنا شروع کیا' مثلاً ہتھیار خریدنا' گھوڑے اور اونٹ خریدنا' ان کو سرکاری چراگاہ میں رکھنا' تاکہ بوقتِ ضرورت اگر سپاہیوں کے پاس ان کی ضرورتوں کی چیزیں ناکافی ہوں تو سرکاری طور پر بھی ان کو مدد دی جائے تاکہ فوج کے انتظامات ناکافی ہونے کی وجہ سے فوج کو نقصان اور تکلیف نہ ہو۔ ایک اور چیز جس کا نظام قائم کیا گیا اور جس کا تعلق سیکرٹریٹ سے ہے وہ ہے بیرونی قبائل اور حکمرانوں کو خطوط لکھنا اور معاہدات کو لکھنا۔ چنانچہ بیرونی حکمرانوں کو جو خطوط لکھے جاتے تھے' ان مکتوبات نبوی کا سب سے قدیم ذخیرہ یا مجموعہ' جو ایک صحابی حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب ہے اس کی روایت کر کے ابو جعفر دیبلی (ایک پاکستانی) نے ہم تک پہنچایا ہے۔ اس کے بعد اور لوگ بھی اس میں حصہ لیتے رہے اور انھوں نے بھی مکتوبات نبوی کو جمع کرنے کی سعادت حاصل کی۔ بیرونی حکمرانوں سے مراسلت ہی نہیں' بلکہ ان کے پاس سفیروں کو بھیجنا بھی ضروری تھا۔ اور ہمیں ایسے متعدد لوگوں کے نام ملتے ہیں جو سفیر بنے۔ اس سلسلے میں ایک چیز جو دلچسپ اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ بعض مرتبہ غیر مسلموں کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفیر بنا کر بھیجتے تھے۔ غالباً غیر مسلموں میں سے بعض قابل اعتماد شخصیتوں کو ان کی فطری صلاحیتوں کے پیش نظر سفیر بنایا گیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت عمرو بن امیہ الضمری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے مسلمان ہونے سے قبل حبشہ کے نجاشی کے پاس پیام دے کر بھیجا تھا۔ شاید وہ سابق میں بھی نجی طور پر حبشہ جا چکے تھے اور وہاں کے حالات سے واقف تھے بلکہ خود نجاشی سے شخصی تعارف تھا کیونکہ لکھا ہے کہ باپ کے مرنے پر یہ نجاشی کمسنی میں بادشاہ بنا اور چچا نائب السلطنت بنا جس نے چپکے سے بھتیجے کو غلام کے طور پر بعض عربوں کو فروخت کر دیا جو علاقہ بدر میں رہتے تھے (قبیلہ ضمرہ بھی وہیں رہتا تھا)۔

۲۱۶۔ سلطنت کے جو مختلف انتظامات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ان میں مالیے کے ذکر کی ضرورت ہے' تعلیم کے ذکر کی بھی ضرورت ہے اور عدل گستری کے انتظام کا ذکر بھی لازمی ہے اور بھی انتظامات تھے لیکن یہ تین چیزیں ایسی ہیں' جن پر کچھ کہے بغیر یہ تبصرہ بہت ہی نامکمل اور تشنہ رہے گا۔ جہاں تک مالیے یعنی حکومت کی آمدنی اور اس آمدنی کے خرچ کا تعلق ہے' یہ بہت ہی آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ زکوٰۃ جو اسلامی آمدنی کا سب سے بڑا وسیلہ

ہے' یہ ۹ھ میں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کوئی دو تین سال پہلے فرض کی گئی
اس سے پہلے کیا ہوتا رہا۔ اس کا جواب مشکل ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن مجید کی
مکی آیتوں میں بھی زکوٰۃ کا ذکر ہے' اس لیے تصور کیا جاسکتا ہے کہ شروع میں بھی مسلمان زکوٰۃ کا
ٹیکس ادا ضرور کرتے تھے لیکن نہ تو اس کی مقدار معین تھی' نہ وقت مقرر تھا۔ ہر شخص خوشدلی
کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حتی الامکان کچھ نہ کچھ رقم یا کچھ اور چیزیں
پیش کر دیا کرتا تھا۔ میں "بظاہر" کہتا ہوں' اس لیے کہ کوئی صراحت اس بارے میں ہمیں ابھی
تک نہیں ملی۔ اسی طرح آمدنی کا ایک وسیلہ اور بھی تھا' جو مستقل نہیں موقتی تھا' یعنی مال غنیمت
کا جو حصہ حکومت کو ملتا وہ حکومت کے خزانے میں محفوظ کیا جاتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
مملکت اور ملت کی ضرورتوں پر اس کو خرچ کرتے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ زمانہ
جاہلیت میں عرب میں یہ رواج تھا کہ مال غنیمت کو ہر جنگ میں حصہ لینے والا' سپاہی' جتنا وہ لوٹتا
اور حاصل کر سکتا تھا' خود لے لیتا تھا۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کو جمع کر کے سارے سپاہیوں میں
تقسیم کیا جائے۔ البتہ ایک پابندی تھی وہ یہ کہ سپہ سالار کو ہر سپاہی اپنے مال غنیمت کا چوتھائی
حصہ دینے پر مجبور تھا' جسے مرباع کا نام دیا گیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصلاح
فرمائی وہ سیاسی نقطہ نظر سے ایک غیر جانبدار ناظر کے لیے بھی دلچسپ ہے۔ آپؐ نے اولاً یہ فرمایا
کہ حکومت کو چوتھائی نہیں پانچواں حصہ ملے۔ اس میں ایک ذیلی فائدہ یہ تھا کہ اگر غیر مسلم
رضاکارانہ طور پر جنگ میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو اگر ہمارے دشمن کی فوج میں شریک ہوں تو
انہیں چوتھائی حصہ دشمن کے سردار کو دینا پڑے گا۔ وہی لوگ اگر اسلامی فوج میں آئیں تو چوتھائی
نہیں پانچواں حصہ دینا پڑے گا۔ اس طرح انہیں اسلامی فوج میں شریک ہونے کے لیے زیادہ
تشویق ہو گی۔ اس اصلاح کا دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ مال غنیمت انفرادی نہ سمجھا جائے بلکہ سارے
لوگوں کا جمع کیا ہوا مال غنیمت سارے لوگوں کے لیے ہو' حتی کہ ان لوگوں کے لیے بھی ہو جو کسی
نہ کسی وجہ سے جنگ میں عملی حصہ نہیں لے سکے' مثلاً جنگ کے وقت ہمارے کیمپ کی حفاظت
کی ضرورت ہے تاکہ دشمن وہاں کے مال و اسباب' جانوروں' بچوں اور عورتوں کو نقصان نہ
پہنچائیں اور اس پڑاؤ کی حفاظت کے لیے چند سپاہیوں کو متعین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو
جنگ میں عملی حصہ نہیں لیتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ مال غنیمت کو یکجا کیا
جائے اور پھر سارے لوگوں کو اس میں برابر کا حصہ دیا جائے۔ سپہ سالار اور معمولی سپاہی میں کوئی

فرق نہ ہونے پائے۔ چنانچہ سپہ سالار کو بھی اتنا ہی حصہ ملتا جتنا معمولی سپاہی کو۔ اگر فوج بڑی ہوتی تو اس کو ٹولیوں میں تقسیم کیا جاتا اور ہر ٹولی کے سردار نامزد ہوتے تھے لیکن ان کی حیثیت بھی مال غنیمت کی حد تک معمولی سپاہیوں سے زیادہ نہ تھی اور اگر فرق کیا جاتا تھا تو اس امر کا کہ جس کے پاس گھوڑا ہوتا' اس کو مال غنیمت میں سے پیدل سے دگنا حصہ ملتا تھا۔ آمدنی کے ایک تیسرے وسیلے کا بھی امکان ہے اور وہ یہ کہ ملک میں جو زراعت ہوتی تھی' اس کی پیداوار کا ایک حصہ زمانہ قدیم سے اہل عرب کسی نہ کسی کو دینے پر مجبور تھے' مثلاً مکہ میں بتوں کے اوپر چڑھاوے کے طور پر کچھ پیداوار دی جاتی تھی۔ غالباً مدینے میں بھی ایسا ہوا ہو گا کہ لوگ اپنی پیداوار کا کچھ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوں گے' تاکہ دینی خدمات کے لیے اس کو صرف کیا جائے۔ بعد میں زکوۃ بن گئی۔ یہ ابتدائی انتظامات تھے۔ ان انتظامات کے سلسلے میں ایک اور چیز کا بھی ذکر کروں گا۔ حکومت کی آمدنی کی نگہداشت کی بھی ضرورت تھی اور یہ کام حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد تھا جو مؤذن بھی تھے اور وزیر خزانہ بھی۔ لکھا ہے کہ مسجد نبوی کا ایک حجرہ اس کے لیے مخصوص تھا' جس میں تالا پڑا رہتا یہ کمرہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگرانی میں رہتا اور اس میں سرکاری رقم اور سرکاری ملکیت کی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ ہمارے مفسروں کے بیان کے مطابق ہجرت کے بہت عرصہ بعد سنہ ۹ھ میں زکوۃ کی آیتیں نازل ہوئیں کہ زکوۃ ایک واجبی چیز ہے اور زکوۃ ہر اس شخص کو دینا پڑے گی جو نصاب کا مالک ہو۔ یہ رقم مختلف قسم کی ہو سکتی ہے۔ مثلاً زراعتی ہو تو اس کے لیے پیداوار کا دسواں حصہ ادا کرنا ہو گا۔ اگر تاجر ہے تو اس کو اپنے سرمایہ تجارت پر ڈھائی فی صد رقم دینا ہو گی۔ کسی کے پاس لوہے' سونے' چاندی یا اس زمانے کے لحاظ سے کسی اور چیز کی کانیں ہیں' تو اس کی ایک مقدار حکومت کو دینی ہوتی تھی۔[*] اس سلسلے میں شہر مدینہ سے باہر ساری مملکت کے لوگوں سے زکوۃ وصول کرنے کی غرض سے تحصیل دار بھیجے جاتے تھے۔ بعد میں مقامی محصل متعین ہوئے۔ غرض یہ کہ حکومت کے مالیے کے سلسلہ میں ایک طرف تو آمدنیاں تھیں اور دوسری طرف خرچ۔ قرآن مجید میں آمدنی کے متعلق بہت کم اشارے ملتے ہیں لیکن خرچ کے متعلق ایک صریح حکم موجود ہے: انما

[*] سونے چاندی پر تو صراحت ہے کہ اس پر مال تجارت ہی کی طرح ڈھائی فیصد زکوۃ ہوگی۔ دیگر معدنیات میں ڈانبر یعنی خام پٹرول کا ذکر مشرقی عرب کے قبیلہ عبدالقیس میں آتا ہے لیکن نہ اس کی اور نہ لوہے کی زکوۃ کے متعلق مجھے کوئی صراحت حدیث میں ملی۔ غالباً ساری معدنیات کو مال تجارت میں شامل سمجھا جائے گا۔

الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیھا و المولفتہ قلوبھم وفی الرقاب و الغارمین و فی سبیل اللہ و ابن السبیل فریضة من اللہ (۹ : ۶۰) اس آیت کو ہم اسلامی بجٹ کے اخراجات کے قواعد کی اساس قرار دے سکتے ہیں۔ انشاء اللہ کسی آئندہ لیکچر میں اس آیت کے ہر ہر لفظ پر تفصیل سے گفتگو کروں گا۔ غرض یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکومت قائم کی تھی اس کے شعبہ مالیہ پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ علاوہ ان مستقل ذرائع آمدنی کے ایک اور چیز بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ کسی خاص موقع پر ایک بڑی رقم کی ضرورت ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیتے اور مسلمانوں کو شوق دلاتے کہ ملک کی فلاں ضرورت کے لیے دل کھول کر چندہ دیں۔ اس سے ایک بات یاد آئی جس کا ذکر کرتا چلوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ اس زمانے کے مسلمان کیسے تھے۔ جنگ تبوک کا ذکر ہے' دنیا کی سب سے بڑی سلطنتوں میں سے ایک یعنی بیزنطینی سلطنت سے جنگ چھڑ گئی ہے۔ عرب کے بے خانماں بدوی مسلمانوں کو دشمن سے مقابلے کے لیے ایک مہینے کی مسافت طے کر کے بیزنطینیوں کی سرحد تک پہنچنا ہے۔ شدید گرمی کا زمانہ ہے۔ وسائل نقل و حمل کی ضرورت ہے۔ وغیرہ وغیرہ تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ترغیب دلائی کہ اللہ کی راہ میں دل کھول کر حصہ لو' انھوں نے حصہ لیا اور جنگ کامیاب رہی۔ جن لوگوں نے چندہ دیا ان میں سے صرف تین مثالیں میں آپ کو دیتا ہوں۔ سب سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے۔ یہ بہت مال دار تاجر اور بہت ہی مخیر دین دار آدمی تھے۔ اسلام کی ہمیشہ دل کھول کر مالی خدمت کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے جہاں تک یاد ہے' اس وقت چالیس ہزار اشرفیاں پیش کیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی رقم تھی کہ آج بھی ہم اسے بڑی رقم کہہ سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اور علاوہ اور باتوں کے دعا دینے کے بعد فرمایا کہ آج سے تم جو چاہو کرو' خدا نے تمھیں معاف کر دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر انھیں کیا مسرت ہو سکتی تھی کہ اس تھوڑے سے مال کے عوض' جو ان کا سارا مال نہیں تھا بلکہ صرف ایک جزء تھا' یہ عظیم بشارت آپؐ سے حاصل کی۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے انھوں نے دس ہزار درہم پیش کیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سوال پر کہ اہل و عیال کے لیے بھی کچھ چھوڑا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ میری آدھی جائیداد ہے۔ آدھا حصہ اہل و عیال کے لیے چھوڑا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے ان کو بھی دعا دی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آتے ہیں

اور صرف پانچ سو درہم کی رقم پیش کرتے ہیں۔ زیادہ نہیں، نہ چالیس ہزار اشرفیاں جس کے معنی ہیں چار لاکھ درہم نہ دس ہزار درہم بلکہ صرف پانچ سو درہم۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سوال پر کہ گھر میں کیا چھوڑ آئے؟ انھوں نے کہا کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سوا کوئی چیز نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شخصیت کا دنیا کے کسی انسان کے ساتھ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ نبی کے بعد مرتبے کا کوئی شخص ہوتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے جو اللہ کی راہ پر اپنی ہر چیز قربان کر دیتا ہے۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے اسلام کو پھیلایا۔

۲۱۷۔ اس کے بعد میں آپ سے تعلیم کے متعلق ذکر کروں گا۔ ہمارے نبی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی، اس کا پہلا لفظ "اقراء" تھا یعنی پڑھو۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری عمر امت میں لکھنے پڑھنے اور دینی و اخلاقی تعلیم کو رائج کرنے کی سعی میں گزری۔ دو ایک مثالیں میں آپ کو دوں گا۔ مدینہ منورہ پہنچے تو سب سے پہلا کام مسجد کی تعمیر کا تھا اور اس مسجد کے اندر "صفہ" ایک حصہ تھا جو تعلیم کے لیے مخصوص تھا۔ "صفہ" چبوترے یا پلیٹ فارم کو کہتے ہیں۔ مسجد کے ایک حصے میں ڈائس کے طور پر ایک چبوترہ بنا دیا گیا تھا جو دن کے وقت تعلیم گاہ کا کام دیتا، اور رات کے وقت بے خانماں لوگوں کے لیے سونے کی جگہ بنتا۔ گستاخی معاف! گویا یہ پہلی اقامتی (Residential) یونیورسٹی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی۔ پہلے ہی دن سے شہر کے باشندے بھی وہاں آنے لگے۔ بے خانماں لوگ حصول تعلیم کے لیے وہیں رہتے تھے۔ مختلف لوگوں کی ضرورتوں کے پیش نظر مختلف قسم کی تعلیم دی جاتی۔ جو لوگ بالکل ہی ان پڑھ تھے ان کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا۔ اس کا بھی وہاں انتظام تھا کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا چاہتے تھے ان میں سے کسی کو قرآن مجید پڑھ کر اس کے معنی سمجھائے جاتے یعنی تفسیر کی تعلیم دی جاتی، کسی کو کچھ، کسی کو کچھ۔ بعض بڑی اثر انگیز مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ایک صاحب کو اس بات پر مامور کیا گیا کہ وہ لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں، کیونکہ وہ بہت خوش نویس تھے۔ ایک اور صاحب کو قرآن کی تعلیم پر مامور کیا گیا۔ ایک دن وہ آکر کہنے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے ایک شخص کو قرآن کی تعلیم دی اور اس نے اظہار تشکر کے طور پر مجھے ایک کمان دی ہے کہ اللہ کی راہ میں اس سے جہاد کروں۔ کیا میں اسے لے سکتا ہوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دوزخ کی آگ کی کمان ہے۔ چنانچہ وہ دوڑے ہوئے گئے، اسے شاگرد کو واپس کر دیا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے وضاحت کر

دی تھی کہ میرا شاگرد چاہتا ہے کہ میں اس سے جہاد فی سبیل اللہ کروں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں ایک شائبہ یہ ہے کہ تم تعلیم کا معاوضہ لینا چاہتے ہو۔ ابتداء میں ہر چیز رضاکارانہ طور پر تھی۔ ممکن ہے بعد کے زمانے میں جب حکومت کی طرف سے ' مدینے میں بھی اور مدینے سے باہر بھی' تعلیم دینے کے لیے اساتذہ مامور کیے گئے تو انھیں حکومت کی طرف سے تنخواہیں دی جاتی ہوں۔ لیکن تعلیم کے سلسلے میں شاگردوں سے کچھ لینے کی صریحاً" ممانعت کی گئی۔ تعلیم کے انتظام کے بارے میں ایک مثال دیتا ہوں۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن میں انسپکٹر جنرل آف ایجوکیشن کے طور پر بھیجا جاتا ہے۔ ان کا فریضہ حسب بیان طبری یہ تھا۔ کان یتنقل من عمالتہ عامل الی عمالتہ اخریٰ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں ایک کمشنری کے یا ایک عہدیدار کے علاقے کے بعد دوسرے عہدیدار کے علاقے میں جاتے تھے اور وہاں تعلیم کا بندوبست اور انتظام کرتے تھے۔ جب یمن کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ دوسرے صوبوں میں بھی ایسا ہی انتظام کیا گیا ہو۔ اور وہ اسی نہج پر ہوا ہو گا کہ مقامی مدرس بھی مامور کیے جائیں۔ صدر مدرس بھی اور مدرسوں کے ناظر وغیرہ بھی مامور کر دیے ہوں گے تاکہ حکومت کی نگرانی بھی تعلیم پر رہے اور اگر کوئی شکایت یا خرابی نظر آئے تو اس کی اصلاح اور سدباب بھی کیا جا سکے۔

۲۱۸۔ اب عدلیہ کے متعلق بھی کچھ عرض کروں گا۔ اس کی ضرورت تھی اور اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوبست بھی کیا۔ ابتداء میں مسلمانوں کی تقریباً ساری آبادی شہر مدینہ میں تھی ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ مسلمانوں میں تو لڑائی جھگڑے کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے لیکن انسانی فطرت کے تقاضے سے اگر کبھی کوئی جھگڑا یا اختلاف ہو جاتا تو لوگ یا تو اپنے قبیلے کے سردار سے رجوع کرتے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور فی الفور وہ مقدمہ طے پا جاتا اور فیصلہ نافذ کیا جاتا۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ اعلیٰ ترین افسر عدالت' حکمران ملک یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی شکایتیں پیش کرے اور فیصلہ پا لے۔ رفتہ رفتہ جب سلطنت کی توسیع ہوئی تو مختلف مقامات پر عدالتی انتظامات کی ضرورت پیش آئی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ چیز یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ جب یمن کے علاقے نجران کے عیسائی مدینہ منورہ آئے تو انھوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا' لیکن اسلامی مملکت کے ماتحت رہنے کو قبول کر لیا۔ کچھ شرطیں بھی طے کیں کہ ہمارا گرجا برقرار رہے۔ اپنے گرجاؤں کے سردار

کو ہم ہی متعین کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں انھوں نے مسلمان حاکم عدالت کی غیر جانبداری پر اعتماد کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ انھیں ایک مسلمان جج مہیا کیا جائے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ کرتے ہیں کہ وہ "امین ہذا الامتہ" یعنی مسلمانوں میں قابل اعتماد شخص ہیں۔ انھوں نے وہاں اپنے فرائض اس خوبی سے انجام دیئے کہ ملک میں جلد ہی اسلام پھیلنے لگا۔ بہت سے عیسائی مسلمان ہو گئے۔ مختلف مقامات کے قاضیوں کو مختلف ہدایات دی جاتی رہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ایک جگہ کا قاضی بنا کر بھیجا گیا۔ یہ بالکل نوجوان تھے۔ انھیں قاضی نامزد کیا گیا تو کہنے لگے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے تو کبھی یہ کام کیا ہی نہیں، یہ خدمت کیسے انجام دوں گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ ایک بنیادی اصول میں تمھیں بتاتا ہوں۔ جب کوئی شخص تمھارے پاس آئے اور کوئی شکایت پیش کرے تو صرف اسی کی بات سن کر فیصلہ نہ کرو، جب تک کہ مدعی علیہ یا فریق ثانی کو بھی بلا کر اس کا بیان نہ سن لو پھر دونوں کے بیانات کی روشنی میں تم اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کر سکتے ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں ساری عمر عدالتی فیصلے کرتا رہا ہوں مجھے کبھی جھجک نہیں ہوئی، کیونکہ بنیادی اصول یہ تھا کہ دونوں آدمیوں کی باتیں سنوں اور اس کی روشنی میں صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کروں۔

۲۱۹۔ یہ تمام امور تھے جن کی اساس پر اسلامی مملکت کے مختلف محکموں اور مختلف اداروں کا آغاز ہوا تھا۔ تعلیم کا بھی آغاز ہوا اور فوج کا بھی انتظام ہوا۔ مالیے کا بھی انتظام ہوا اور سرکاری سیکرٹریٹ کا بھی انتظام ہوا۔ غرض جن جن چیزوں کی اس وقت ضرورت تھی ان میں ہر ایک کا حسب ضرورت انتظام کیا گیا۔ بعد کے زمانے میں جو ترقی یافتہ انتظامی ادارے نظر آتے ہیں، ان سب کی بنیاد عہد نبوی ہی میں پڑ چکی تھی۔ میں نے اب تک یہاں تصور حکومت کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے عہد نبوی کی اس اسلامی مملکت کی ایک خصوصیت کی طرف اشارہ کیے بغیر اسے ختم نہ کروں گا۔ وہ یہ کہ مشرکین قریش کے زیر تسلط شہری مملکت مکہ کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور یہ تھا کہ وہ لوگ واقعے کی حد تک (Defacto) تو بیشک اس کے مالک ہیں، لیکن استحقاق کی حد تک (Dejure) وہ مسلمانوں اور رسول اکرمؐ کی چیز ہے۔ اس لیے جنگ بدر کے سلسلے میں ذکر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سنا کہ قریش کا جھنڈا خاندان

عبدالدار کے ایک مشرک کے ہاتھ میں ہے تو فرمایا کہ حق رسانی اسلام کا فریضہ ہے اور یہ کہہ کر اپنا جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر العبدری کے (جو اسی خاندان کے ایک مسلمان تھے) سپرد فرمایا۔ صلح حدیبیہ کے وقت مشرکین سے گفت و شنید کے لیے ایک شخص کو مکہ بھیجنے کی ضرورت تھی۔ اس پر حضرت عمرؓ کا انتخاب کیا گیا کہ وہ سابق میں مکہ میں موروثی وزیر خارجہ تھے حضرت خالد بن الولید کو اسلام لانے کے بعد اسلامی سوارہ فوج کا افسر بنا دیا گیا کہ مکہ میں وہی ان کا منصب تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں مفتی مقرر فرمایا۔ یہ مکہ میں بھی ان کا فریضہ رہا تھا۔ فتح مکہ پر حضور اکرمؐ کے چچا حضرت عباس نے چاہا کہ خانہ کعبہ کی چابی بھی انھیں دیدی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کیا اور قدیم موروثی کلید بردار کو جو مسلمان ہو گیا تھا' وہ چابی مکرر عطا فرمائی اور دیگر فرائض کے متعلق بھی موروثی لوگوں کی تلاش کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے میری ناقص رائے میں یہ استنباط کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہجرت کے بعد اولاً رسول اکرمؐ اپنے کو شہری مملکت مکہ کا بالا ستحقاق (De jure) حکمران سمجھتے رہے' چاہے مشرکین ہی واقعے کی حد تک (Defacto) اس پر مسلط رہیں۔ فتح مکہ کے بعد یہ دونوں امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آ گئے اور اسی کی طرف قرآن مجید (۸ : ۳۰ تا ۳۴) میں واضح ذکر ہے کہ واذ یمکر بک الذین کفرو الیثبتوک او یقتلوک او یخر جوک و یمکرون و یمکر اللہ . . . . . . وما لھم الا یعذبھم اللہ وھم یصدون عن المسجد الحرام وما کانوا اولیاوہ ان اولیاوہ الا المتقون ولکن اکثر ھم لا یعلمون ضمناً یہ بھی یاد دلا دوں کہ حکومت تو خدا کی ہے اور اسی نے زمین میں ہمیں اپنا نائب بنایا ہے۔ اس لیے اسی کے احکام نافذ کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

۲۲۰۔ کچھ سوالات آپ کی طرف سے آئے ہیں' اپنی بساط کے مطابق جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال ا۔ آپ نے کہا کہ بیت المعمور سے اگر ایک پتھر پھینکیں تو کعبہ کی چھت پر گرے گا۔ جدید علم کی روشنی میں زمین متحرک ہے اس لحاظ سے کعبہ کا مقام بیت المعمور کے لحاظ سے

(Relatively) تبدیل ہوتا رہے گا وضاحت فرمائیں۔

جواب۔ غالباً آپ نے میرے اشارے کے چند الفاظ پر توجہ نہیں دی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ ایک دوسرے عالم کی چیز ہونے کی وجہ سے ہماری دنیا کی چیزوں سے مختلف ہے۔ اسے ہم بطور رمز یا علامتی (Symbolic) انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ سمجھانے کا یہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا کہ اہل زمین کو زمینی چیزوں کے مطابق سمجھایا جا سکتا ہے۔ دوسرے عالم کی چیزوں کو زمینی اساس پر ہم معلوم نہیں کر سکتے۔

دوسری چیز' میں آپ سے مزاحاً" پوچھوں گا کہ اگر زمین متحرک ہے تو آپ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ آسمان متحرک نہیں۔ اگر آسمان بھی اسی طرح گردش کرتا ہے تو اس کی جگہ میں کبھی فرق نہیں آتا۔ بہرحال اس کے متعلق سوائے اس کے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اس کو اگر رمز کے طور پر (Symbolic) لیں تو ہم اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ آج کے علم میں ہم سوال کریں تو ہمیں کل کا علم کوئی اور چیز بیان کرے گا۔ اس لیے ہمیں اپنے اضافی (Relative) علوم کی اساس پر ان روحانی حقائق اور عالم بالا کی چیزوں کو نہیں جانچنا چاہیے۔

۲۲۱ سوال ۲۔ آپ نے ابھی اپنے لیکچر میں بتایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان سکھائی اور یہ بتایا کہ کن لفظوں کو کھینچ کر ادا کرنا چاہیے اور کن لفظوں کو اختصار سے' اس طرح موسیقی کے سر بتائے۔ اس بیان کی روشنی میں وضاحت کریں کہ موسیقی کی اسلام میں کس حد تک گنجائش ہے؟

جواب : یہی نہیں اور بہت سی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی کی اسلام میں ممانعت بالکل نہیں ہے اگر ممانعت ہے تو اس بات کی کہ مثلاً نماز کے وقت موسیقی کا شغل جاری رکھا جائے یا اس کا منشا ایسی تفریح ہو جو اخلاقی نقطہ نظر سے بری سمجھی جاتی ہے۔ میں آپ کو کچھ مثالیں دیتا ہوں جن سے یہ ظاہر ہو گا فی نفسہ موسیقی کی ممانعت نہیں ہے۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نکاح کی دعوت ولیمہ سے واپس آ کر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ اے عائشہ (رضی اللہ عنہا) آج میں تمھارے خاندان کے ایک فرد کی شادی میں گیا تھا۔ مگر وہاں کوئی موسیقی نہیں تھی۔ یہ کیسی بات ہے؟ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نکاح کے سلسلے میں موسیقی کی ضرورت ہے۔ ایک اور مثال دیتا ہوں' یہ حجتہ الوداع کے زمانے کا واقعہ

ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "منیٰ" میں مقیم تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ وہاں میرے خیمے کے اندر جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے تھے اور چہرے پر چادر ڈال کر آرام فرما رہے تھے' میرے پاس چند لڑکیاں دف بجا رہی تھیں۔ اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے آئے اور ان لڑکیوں کو ڈانٹا یہ کیا شیطانی کام ہے' جاؤ نکلو یہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو سوئے ہوئے نہیں تھے' سر اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) یہ عید کا دن ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایک اور عید کے سلسلے میں مدینہ منورہ کا واقعہ ہے غالباً ۲ یا ۳ ھ یعنی بہت ہی ابتدائی زمانے کا واقعہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے سامنے کچھ شور سننے میں آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے' دیکھا کہ کیا ہے؟ میں بھی اٹھی تاکہ اس تماشے کو دیکھوں۔ مدینہ منورہ میں حبشیوں کی ایک آبادی تھی۔ عید کے دن یہ لوگ خصوصاً نوجوان حبشی مدینے کی گلیوں میں سے گزرتے اور اپنے نیزہ بازی کے کرتب ہر مکان کے سامنے دکھاتے اور مکان والا یقیناً ان کو کچھ نہ کچھ دیتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حبشیوں کو روکا نہیں بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ مجھ کو دکھانے کے لیے وہاں بلا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پوچھا' عائشہ بس دیکھ چکیں میں نے کہا' نہیں ابھی اور دیکھوں گی' ٹھہر جائیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں' بالآخر جب میں خود ہی تھک گئی تو میں اندر چلی گئی۔ ان حبشی بچوں کے بارے میں ایک اور بات یاد آ گئی' عرض کیے دیتا ہوں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے' لوگ "قبا" میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے رہے۔ روایت یہ ہے کہ مدینے کی ساری آبادی' کیا مسلمان' کیا غیر مسلم' اپنی مہمان نوازی کے اظہار کے لیے استقبال میں شریک تھی۔ یہ حبشی لڑکے بھی دوڑے ہوئے آئے اور اپنی نیزہ بازی کے کرتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دکھانے لگے۔ اس سے ان کی فراخ دلی اور وسیع القلبی اور مہمان نوازی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان لوگوں کا تالیف قلبی کیا کرتے تھے اور ان سے محبت سے پیش آتے تھے اور غالباً ان کی مالی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ اسی طرح موسیقی کے سلسلے میں آپ ایک اور چیز کو بھی دیکھیے۔ قرآن مجید کی تلاوت بھی موسیقی ہی کی ایک شاخ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں کہ قرآن

کریم کو معمولی نثری عبارت کی طرح نہ پڑھو کہ ڈھول اڑانا سمجھا جائے بلکہ خوش الحانی سے پڑھو اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ نے کسی غنا' کسی گانے کی اجازت اتنی نہیں دی ہے جتنی قرآن کو اچھی آواز سے تلاوت کرنے کی اجازت دی۔ ایک دوسری حدیث یہ ہے کہ خدا کسی گانے کی آواز پر اتنا کان نہیں دھرتا جتنا قرآن مجید کی اچھی آواز کے ساتھ تلاوت کرنے پر اپنے کان لگاتا ہے۔ غرض یہ کہ موسیقی کی کوئی اصولی ممانعت نہیں ہے' بشرطیکہ موسیقی کا مقصد اچھا ہو اور اس سے ہماری مذہبی عبادت میں کوئی حرج واقع نہ ہوتا ہو۔ اگر مزید تفصیل درکار ہو تو امام غزالی کی کتاب "احیاء العلوم" کو دیکھیے اس میں ایک پورا ضخیم باب اس موضوع پر ہے۔ وہ تفصیل سے بتاتے ہیں کہ اسلام میں موسیقی اور گانے کی کیا حیثیت ہے۔

۲۲۲ سوال ۳۔ ، مرحوم کی قل خوانی اور چہلم کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟ کیا یہ شرعی حکم ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے حوالے سے اس رسم کا کوئی ذکر آیا ہے؟

جواب : میں عرض کروں گا کہ اگر کسی کی وفات کے تیسرے دن' دسویں دن' چالیسویں دن ہم کچھ کرنا چاہیں تو وہ کام یہ ہونا چاہیے کہ قرآن مجید کی تلاوت کریں اور اس کا ثواب متوفی شخص کو پہنچانے کی اللہ سے دعا کریں۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے چاہے ہر روز کریں' چاہے ہر سال' چاہے ابتداء" متعدد بار کریں' کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔ اور میرے مرنے کے بعد اگر آپ میرے لیے بھی دعا کریں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔

خطبہ ۸

عہد نبویؐ میں نظام دفاع اور غزوات

محترم صدر! محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ اور محترم بھائی بہنو!
السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ!

۲۲۳۔ الحمد اللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین و آلہ واصحابہ اجمعین

۲۲۴۔ عہد نبویؐ کے مختلف شعبوں کے متعلق میں مختلف چیزیں اب تک عرض کرچکا ہوں کچھ اور بھی عرض کرنی ہیں۔ ان میں سب سے مشکل غالباً دفاع کا پہلو ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فن کے الف' ب سے بھی میں واقف نہیں۔ کبھی فوجی زندگی گزارنے یا فوجی تعلیم حاصل کرنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ بہرحال مطالعے میں مجھے جو جو چیزیں دفاع اور فوج سے متعلق نظر آئیں وہی آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں گا۔

۲۲۵۔ کسی ملک کے دفاع کے لیے نہ صرف فوجی تیاری درکار ہوتی ہے بلکہ غیرفوجی انتظامات بھی ضروری ہوتے ہیں۔ اولاً میں غیرفوجی امور کے متعلق ایک چھوٹی سی بات عرض کروں گا' جس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ مسلمانوں کی سب سے پہلی' بہت ہی ننھی منی سلطنت جو مدینہ منورہ میں قائم ہوئی تھی' اس کو ابتداء میں مختلف قسم کی مشکلات سے بچانے کے لیے ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنی تدبیروں کا آغاز کیا تھا۔ میں نے بیان کیا تھا کہ مکہ معظمہ سے مسلمان ہجرت کر کے مدینے آنے پر مجبور ہوئے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں سے تشریف لائے' تو شاید عام حالات میں کسی سلطنت کے قیام کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن مشرکین نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ وطن سے نکالا' وطن میں ان کی جائیدادوں کو ضبط کیا اور انھیں سالہا سال تک ہر طرح کی اذیتیں دیتے رہے۔ جب مسلمان وہاں سے چلے گئے' تب بھی انھیں چین نہیں آیا اور مدینہ والوں کو لکھ بھیجا کہ ہمارے دشمن (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو یا تو جان سے مار ڈالو یا انھیں اپنے ملک سے نکال دو' ورنہ ہم کوئی مناسب تدبیر اختیار کریں گے۔ یہ فوجی حملے کی دھمکی ایسی تھی کہ کوئی شخص آسانی سے اس کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا'

خاص کر وہ نبی جو دنیا کے سارے لوگوں کے لیے اسوہ حسنہ تھا۔ بادشاہوں کے لیے بھی' فقیروں کے لیے بھی' عالموں کے لیے بھی اور جاہلوں کے لیے بھی۔ آپ نے آنے والے مسلمان حکمرانوں اور سپہ سالاروں کے لیے ایک سبق آموز نمونہ چھوڑا ہے۔

۲۲۶۔ اولین مسئلہ یہ تھا کہ مہاجرین کو کس طرح روزگار پر لگایا جائے اور کس طرح ان کی فوری ضرورتوں کو پورا کیا جائے؟ اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخات کا طریقہ اختیار فرمایا' جس نے طرفتہ العین میں ان کی ساری مشکلات کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد دوسری تدبیر یہ فرمائی کہ چونکہ شہر مدینہ میں کوئی سلطنت نہیں پائی جاتی تھی' وہاں صرف قبیلے ہی قبیلے تھے اور یہ قبیلے نسل ہا نسل سے خانہ جنگیوں میں مشغول تھے۔ ان میں باہمی نفرت' حسد' جلن اور دشمنی پائی جاتی تھی اور اگر ان قبیلوں میں سے کسی ایک پر ان کا دشمن حملہ کرتا تو دوسرے لوگ غیر جانب دار رہتے تھے۔ نتیجتاً اسے تنہا مقابلہ کرنا پڑتا۔ ان حالات میں انتہائی فراست سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مدینہ کے لوگوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اپنے مذہبی اختلافات اور قبائلی انفرادیت کے باوجود یہ مناسب ہو گا کہ تم سب مل کر ایک چھوٹی سی مملکت قائم کر لو۔ آپس میں ایک مرکزیت پیدا کر لو اور اپنے دشمن کے مقابلے کے لیے اپنی موجودہ قوت کو اس طرح مجتمع کر لو کہ اس کا کوئی جزء ضائع نہ ہونے پائے۔ اس تجویز کو قبول کر لیا گیا اور جیسا کہ کل بھی میں نے اشارتہ" عرض کیا تھا' ایک مملکت قائم ہوئی جو شہر مدینہ کے بڑے حصے پر مشتمل تھی اور اس میں مسلمانوں کے علاوہ یہودی بھی شریک تھے اور جو مشرک قبیلے اسلام نہیں لائے تھے' وہ بھی اس میں داخل ہوئے۔ ان سبھوں نے بالاتفاق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سردار تسلیم کیا جو اختیارات مرکز کے لیے موزوں تھے وہ مرکز کے سپرد کیے گئے اور دیگر معاملات میں ہر قبیلے کی داخلی خود مختاری قائم رہی۔ جو چیزیں مرکز کے سپرد کی گئیں' ان میں سب سے اہم فوجی دفاع کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ صراحت کے ساتھ اسے مملکت کے دستور میں تحریری طور پر لکھا گیا' اور یہ دستور ہم تک بھی پہنچا ہے' کہ جب کبھی دشمن سے مقابلہ ہو گا تو اس کا انتظام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے۔ اگر فوج باہر جا کر لڑنے پر مجبور ہو گی تو اس کا اختیار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو گا کہ کس کو فوج میں رہنے کی اجازت دیں اور کس کو فوج میں داخل ہونے سے روک دیں تاکہ دشمن کے جاسوس یا منافق اور غدار لوگ شریک ہو کر اندرونی طور پر نقصان نہ پہنچا سکیں۔ یہ ابتدائی انتظامات تھے۔

۲۲۷۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ دفاع کے انتظامات میں بعض غیر فوجی کام بھی کرنے پڑتے تھے۔ اس کی طرف میں توجہ دلاتا ہوں۔ جیسے ہی یہ ابتدائی انتظامات مکمل ہو گئے، یعنی بے گھر مہاجرین کا مسئلہ ختم ہو گیا اور مملکت یعنی شہر مدینہ کے سارے قبائل کی ایک تنظیم عمل میں آ گئی تو فوراً ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دورے کرنے کا آغاز فرمایا۔ پہلے شمال کی طرف گئے۔ مدینے سے شمال کی طرف تین چار دن کی مسافت پر قبیلہ جہینہ بستا تھا۔ اس کے معاہدہ کی جو تفصیلات موجود ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ مسلمان نہیں تھا، اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے ساتھ فوجی حلیفی پر تیار تھا۔ غالباً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی ہو گی کہ تم تنہا ہو، تمھارے دشمن موجود ہیں۔ اگر وہ تم پر حملہ کریں گے تو کوئی تمھیں مدد نہیں دے گا۔ کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ تم اور ہم آپس میں دوستی کر لیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم پر کوئی حملہ کرے گا۔ ہم تمھاری مدد کو دوڑے آئیں گے اور اگر ہم پر کوئی حملہ کرے اور ہم تمھیں بلائیں تو تم بھی مدد کو آنا۔ بات معقول تھی۔ اس قبیلے نے قبول کر لیا۔ چنانچہ معاہدے میں صراحت ہے کہ یہ صرف فوجی معاہدہ ہے اس کا دینی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۲۸۔ اس ابتدائی کامیابی کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے کے جنوب کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں کے قبائل سے بھی ایسی ہی مفاہمت کرتے ہیں۔ جنوب کے قبائل بھی مسلمان نہ ہونے کے باوجود جنگی حلیفی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر مشرق کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں کے قبائل سے بھی دوستی کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے پانچ سات معاہدے تاریخ میں اب تک محفوظ ہیں۔ ان پر غور کیجئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ مدینے کی بستی یا شہری ریاست کو محفوظ کرنے کی تدبیر اس انداز سے کی جا رہی ہے کہ مدینے کے اطراف کے علاقوں کو دوست بنا لیا جائے تاکہ اگر دشمن مدینے پر حملہ کرنا چاہے تو براہ راست مدینے تک نہ پہنچ سکے۔ بلکہ مدینے تک پہنچنے سے پہلے ہی درمیان کے علاقوں میں اس کو رکاوٹوں سے سابقہ پڑے ہمارے دوست وہاں ہوں گے۔ وہ ہمیں بروقت اطلاع دیں گے۔ ہم ان کی مدد کو جائیں گے اور اپنے دوست قبائل کی مدد سے اس دشمن کو روکنے کی کوشش کریں گے، گویا ایک "منڈل" حلقہ Cordon قائم ہو گیا۔ چنانچہ مدینے کی حفاظت کے لیے مدینے کے اطراف دوستوں کی بستیاں قائم کرتے ہیں اور ان دوستوں کی مدد سے جنگی نقطہ نظر سے مدینے کی حفاظت عمل میں آتی ہے۔ یہ ایک پہلو تھا۔

۲۲۹۔ اس قسم کی چیزیں ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ہر دور میں ملتی ہیں۔ مگر میں ان تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ صرف اشارۃً" مثال کے طور پر عرض کرنا ہے کہ فوجی حفاظت کے لیے غیر فوجی اور سیاسی طریقے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ایک نمونہ پیش کیا کہ کس طرح مسلمانوں کی اس ابھرنے والی' چھوٹی سی سلطنت کو' جس کے بہت سے دشمن تھے' ان دشمنوں سے محفوظ رکھنے اور بچانے کا انتظام کیا جائے۔ ابتدائی معاہدہ جو مدینے کے اطراف کے قبیلوں سے کیا گیا تھا' وہ مکے کے لوگوں کی دشمنی اور انتقام سے بچاؤ کی ایک صورت تھی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ مکے والوں نے مسلمانوں کو ستایا' کئی ایک کو قتل کیا اور جب مسلمان وہاں سے ہجرت کرکے مدینے آئے تو ان کی جائیدادیں بھی ضبط کرلیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو قانون فطرت کے تحت یہ حق حاصل تھا کہ ان مکہ والوں سے جانی اور مالی دونوں طرح سے انتقام لیں۔ ابھی مسلمانوں کے پاس اتنی فوجی قوت نہیں تھی کہ دشمن کو جانی نقصان پہنچائیں لیکن مسلمانوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایماء سے ان پر معاشی دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

۲۳۰۔ مکہ کے قریش اپنی گزر اوقات کے لیئے تجارت کے سوا اور کوئی وسیلہ نہیں رکھتے تھے۔ ان کے وہ کاروان تجارت جو مکہ کے جنوب میں یمن وغیرہ کی طرف جاتے تھے' ان کو مسلمانوں سے نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن جب ان کے کارواں شمال میں عراق' شام یا مصر کی طرف جاتے تو مدینے کے قریب سے گزرنا ناگزیر تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ تم ہمارے علاقے سے نہیں گزر سکتے۔ ہمارے علاقے سے مراد مدینہ کا شہر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے جو حلیف قبیلے تھے ان کے علاقے سے بھی ان کا گزرنا ممنوع کر دیا گیا۔ یہ قریش کے لیے سخت ناگوار بات تھی کہ ان کی تجارت میں رکاوٹ پڑے۔ انھوں نے نہ مانا بلکہ اصرار کیا کہ ہم ضرور گزریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں مسلمان مٹھی بھر تھے اور ایک ایسے ملک میں تھے جہاں سوائے خود رو گزر گاہوں کے کوئی سڑک نہیں پائی جاتی۔ ایک جگہ آپ روکیں تو بہت سے راستے اور موجود تھے' جہاں سے آدمی گزر سکتے ہیں۔ ان حالات میں قریشی کاروانوں کو روکنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے بارہا ان کو روکنے کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ چنانچہ جنگ بدر سے قبل تقریباً سات مرتبہ مسلمان فوجیں یہ اطلاع ملنے پر کہ قریشی قافلہ گزر رہا ہے' اس کو روکنے کے لیے گئیں لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا بلکہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلا۔ مگر کوششیں جاری

نقشہ غزوۂ بدر
۱ ۲ ۳ ۴ کیلومیٹر
بحر قلزم
اور قافلہ تم سے نیچے کی جانب تھا (والرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنکُمْ)
قافلہ ابی سفیان
شمال
شام کا راستہ
مدینہ کے قریب کا ناکہ
مدینہ کا راستہ
عسکر اسلامی
نچلا پہاڑ
مکہ کا راستہ
اشارات
۱۔ قلعہ ۲۔ بدر شہر ۳۔ نخلستان
۴۔ مسجد عریش ۵۔ بدوں کے کاٹ ۶۔ قبرستان
۷۔ مقابر شہداء بدر
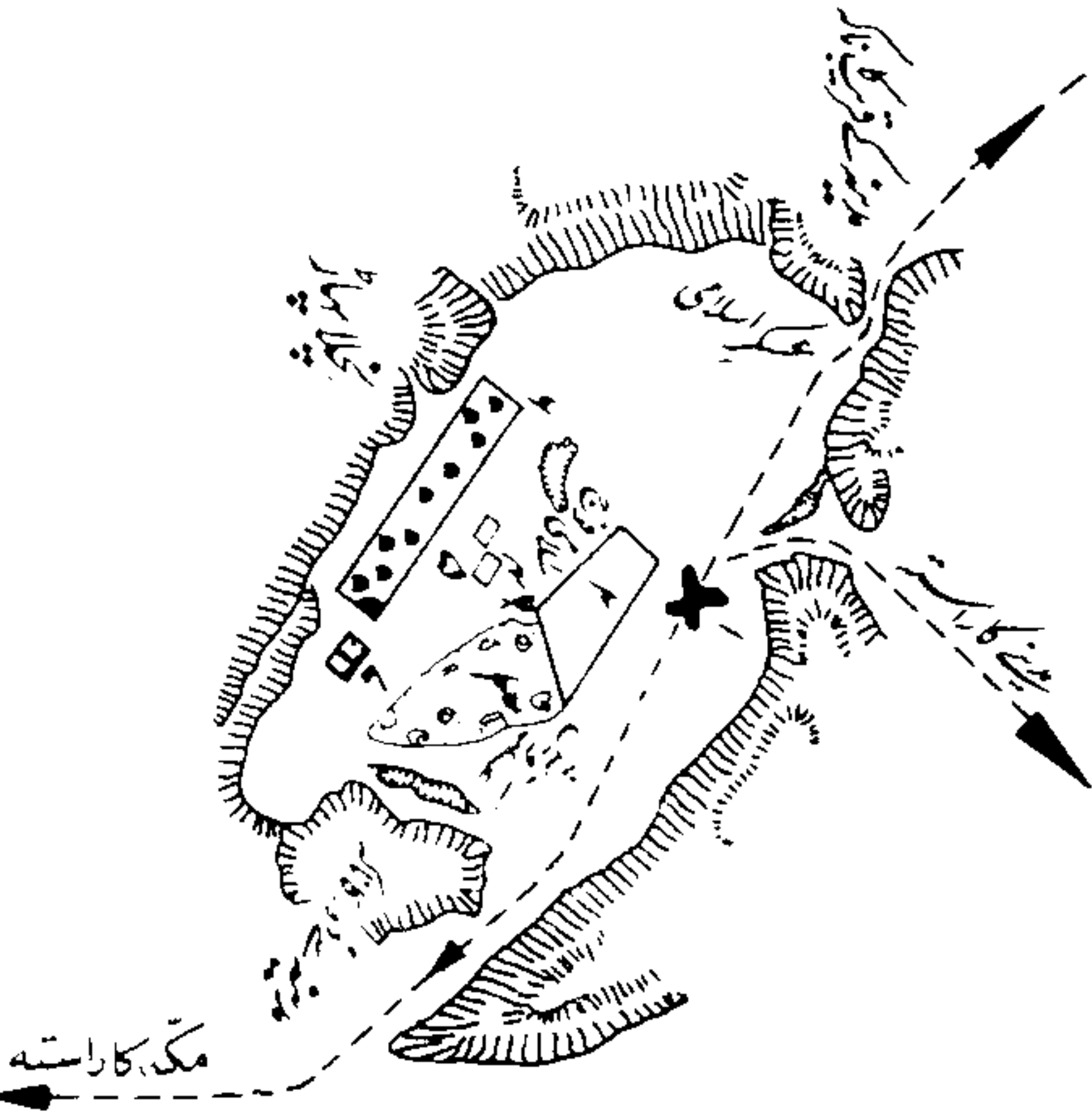
رہیں۔ معلومات حاصل کرنے کے وسائل کو ترقی دی جانے لگی۔ دوستوں کی تعداد بڑھائی جانے لگی۔ غرض جو تدبیریں ممکن تھیں وہ اختیار کی جاتی رہیں۔ اس کے بعد جب قریش نے دیکھ لیا کہ مسلمان ان کو آسانی سے گزرنے نہیں دیں گے تو انھوں نے زبردستی گزرنے کی ٹھان لی۔

۲۳۱۔ جنگ بدر سے عین قبل کا واقعہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ قریش شمال کی طرف گئے ہیں تو آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ دشمن کارواں اسی راستے سے واپس آئے گا' کسی اور راستے سے وہ نکل نہیں سکتا۔ لہٰذا دو جاسوس مقرر کیے کہ تم بھی شام کو جاؤ۔ اس کارواں کے قریب رہو۔ جیسے ہی وہ واپسی کا انتظام کرکے' واپسی کا ارادہ کرے' تیزی سے آکر ہمیں اطلاع دو کہ دشمن اب آنے والا ہے۔ تجارتی کارواں اور جاسوسوں کی رفتار تقریباً یکساں ہی تھی کیونکہ اونٹوں کے سوا اور کوئی تیز رو سواری میسر نہیں تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یہ دونوں جاسوس تیزی سے مدینے واپس آئے تو دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کارواں کی آمد کی اطلاع دیگر وسائل سے ہو چکی ہے۔ اور آپؐ مدینے سے روانہ بھی ہو چکے ہیں۔ اس سے یہ استنباط کرنا پڑتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف وسائل اختیار فرماتے تھے تاکہ دشمن کی خبریں مسلمانوں تک پہنچتی رہیں اور اس کی بھی کوشش کرتے کہ ہماری خبریں دشمن تک پہنچنے نہ پائیں۔ غرض رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے نکل چکے تھے اور فوجی فراست کی بدولت مدینے کے شمال کی طرف جانے کی بجائے مدینے کے جنوبی شہر مکہ کی طرف جاتے ہیں تاکہ دشمن سے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں جہاں دشمن کا روکنا ممکن ہو۔ اس کے لیے بدر کا مقام منتخب کیا گیا۔ مجھے وہاں جانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ یہ مقام ایسا ہے جو بلند پہاڑیوں کے درمیان تنگ وادیوں میں سے گزرتا ہے۔ اس لیے نسبتاً" آسانی کے ساتھ یہ ممکن تھا کہ مسلمان ایک ایسے مقام پر قیام کریں جہاں تنگ راستہ ہو۔ وہ پہاڑوں میں چھپے رہیں' دشمن بے خبری میں آئے اور وہ اس پر چھاپہ مار سکیں۔ مختصر یہ کہ مختلف مقامات پر دریافت کرتے ہوئے جاتے ہیں کہ دشمن کی کوئی اطلاع ہے۔ لکھا ہے کہ بعض اوقات مسلمانوں کی فوج کے کچھ لوگ نکلتے اور سکاؤٹنگ کرتے اور بعض اوقات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے ساتھ ایک دو صحابہ کو لے کر نکلتے اور راستے میں کوئی بدوی ملتا تو اس سے پوچھتے کہ تمھیں اطلاع ہے کہ قریش کا کارواں اس وقت کہاں ہو گا؟ اس سے بھی آپ کو کچھ معلومات حاصل ہوتیں۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے مقام پر پہنچے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک

دشمن کا کارواں وہاں سے نہیں گزرا۔ مشورہ ہوتا ہے کہ کہاں ٹھہرنا چاہیے۔ ایک مقام کا انتخاب کیا جاتا ہے جو بدر کے شمال میں ہے اور بہت ہی تنگ درہ ہے۔ مسلمان وہاں قیام کرتے ہیں۔ دو ایک دن بعد دشمن کا کارواں وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس سے پہلے دشمن کو تجربہ ہو چکا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا تعاقب کرتے ہیں۔ جاتے وقت بھی پیچھا کیا تھا حتی کہ لڑنا چاہا تھا۔ لہٰذا وہ اب چوکس اور چوکنے تھے قافلے کو بدر کے درے میں سے گزرنے سے پہلے ہی ایک مقام پر ٹھہرا دیا گیا اور قافلے کا سردار ابوسفیان تن تنہا بدر کے شہر میں آتا ہے جہاں سے وہ اکثر گزرا کرتا تھا۔ وہ وہاں کے لوگوں سے واقف تھا۔ اس لیے وہاں جا کر سب سے پہلے اس مقام پر پہنچتا ہے، جہاں لوگ مل سکتے ہیں۔ یہ مقام وہاں کا ایک طرح سے کلب تھا۔ وہاں لوگوں کے لیے ایک ہی کنواں تھا، کوئی نہ کوئی آدمی ہر وقت وہاں مل سکتا تھا یا تھوڑی ہی دیر میں کوئی نہ کوئی شخص آ جاتا تھا۔ ابوسفیان وہاں پہنچتا ہے اور بعض پانی بھرنے والے مردوں یا عورتوں سے معلوم کرتا ہے کہ قبیلے کا سردار اس وقت کہاں ہے۔ پھر اس سے جا کر ملتا ہے اور اس سے گفتگو کرتا ہے۔ وہ سردار ابوسفیان سے کہتا ہے کو کوئی ایسی چیز میرے دیکھنے، سننے میں نہیں آئی جس سے یہ گماں ہو کہ یہاں کوئی بڑی فوج تمھارے مقابلے کے لیے آئی ہوئی ہے۔ البتہ ابھی تھوڑی دیر پہلے دو بدوی یہاں سے اونٹوں پر گزرے۔ انھوں نے اتر کر کنویں سے پانی پیا اور پھر چلے گئے۔ اس کے سوا کوئی نئی چیز میرے علاقے میں نہیں گزری۔ ابوسفیان احتیاط سے آگے بڑھتا ہے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر کچھ اونٹوں کی تازہ لید پڑی دیکھتا ہے۔ ایک لید کا گولا اٹھاتا ہے اس کو چیر کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے اس کے اندر گھاس نہیں بلکہ کھجور کی گٹھلی ہے۔ وہ چلا اٹھتا ہے کہ یہ مقامی اونٹ سوار نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو مدینے کے اونٹ ہیں کیونکہ مدینے ہی میں کھجور کی گٹھلیاں مل سکتی ہیں۔ اس لید کے اندر چونکہ کھجور کی گٹھلی پائی جاتی ہے لہٰذا یہ مدینے سے آئے ہوئے مسلمان ہی ہوں گے۔ پھر وہ پوری تیزی سے بھاگتا ہوا اپنے کارواں میں پہنچتا ہے اور اس کو بدر سے باہر سمندر کے کنارے ہی کنارے ایک منزل کی جگہ دو منزل کرتا ہوا، تھکے ہوئے قافلے کو آرام کا موقعہ نہ دے کر، آگے بڑھ جاتا ہے اور بالآخر مسلمانوں کی دسترس سے بچ جاتا ہے۔ بچنے سے پہلے وہ ایک شخص کو اجرت دے کر یہ کہتا ہے کہ پوری تیزی کے ساتھ مکہ جاؤ اور مکے کے لوگوں کو اطلاع دو کہ دشمن (یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) ہم پر حملہ کر رہے ہیں۔ تمھارا مال تجارت لٹ جائے گا۔ لہٰذا ہماری مدد کو آؤ۔ وہ شخص مکہ پہنچتا ہے۔ اس احتیاطی تدبیر کے بعد جب ابوسفیان کا

کارواں دو منزل سفر کے بعد اطمینان محسوس کرتا ہے تو پھر ایک نیا پیام رساں اہل مکہ کو روانہ کرتا ہے کہ اب تمھارے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں بچ چکا ہوں۔ مگر جو فوج مکہ سے روانہ ہو چکی تھی اس کا سردار ابوجہل تھا' اس نے کہا کہ ایسے دشمن کا خاتمہ کر دینا چاہیے ورنہ آج نہیں کل' کل نہیں تو پرسوں ہمیں نقصان پہنچائے گا۔ ہم کافی جمعیت کے ساتھ نکلے ہیں اور ہم میں یہ قوت ہے کہ اس خطرے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چھپے ہوئے مقام پر ایک دن' دو دن' تین دن انتظار کرتے رہے مگر ابوسفیان کے کارواں کا کوئی پتہ نہ چلا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ گزر چکا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اب اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے ہیں کہ ہمیں کہاں ٹھہرنا چاہیے۔ کیا اسی مقام پر یا کسی اور مقام پر؟ صحابہ کے مشورے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر کا اندرونی حصہ منتخب کرتے ہیں جہاں کنواں تھا۔ اس میں مصلحت یہ سوچی کہ مکہ والے بدر آئیں گے تو انھیں بھی پانی کی ضرورت ہو گی اور پانی کا صرف یہی ایک کنواں ہے۔ اگر وہ ہمارے قبضے میں رہے گا تو دشمن پیاسا مرے گا اور اس طرح ہم دشمن پر جنگی نقطہ نظر سے فوقیت حاصل کریں گے۔ لہٰذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مٹھی بھر ساتھیوں (۳۱۲ آدمیوں) کے ساتھ اس شمالی درے سے نکل کر شہر کے بیچ میں آتے ہیں اور کنویں کے ایک طرف قیام کرتے ہیں۔ بعض صحابہ کے مشورے سے ایک بڑا گڑھا بھی کھودتے ہیں تاکہ اس کو پانی سے بھر دیں۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ جنگ کے دوران ہم میں سے اگر کسی کو پیاس لگے تو اس گہرے کنویں سے پانی نکالنے اور پینے میں وقت لگے گا' اور اس اثناء میں دشمن ہم پر حملہ کر کے مار بھی سکتا ہے۔ لہٰذا مناسب ہو گا کہ ایک گڑھا ہو جس میں پانی بھر دیا جائے اور ہمارے سپاہی وہاں پہنچ کر فوراً ہی چلو سے پانی پی لیں۔ دشمن اگر یہاں آئے اور پانی پینا چاہے تو اس کی نگرانی کے لیے کچھ لوگ یہاں متعین رہیں۔ یہ تدبیریں آج ہمیں معمولی محسوس ہوتی ہیں لیکن اس زمانے میں فوجی نقطہ نظر سے نہایت کارآمد ثابت ہوئیں۔ اسی اثناء میں دشمن کی مکہ سے آنے والی فوج ابوجہل کی سرداری میں وہاں پہنچ گئی۔ دشمن کی فوج کی تعداد معلوم کرنے کے لیے ایک نگران دستہ (پٹرول) بھیجا گیا۔ اس نے دو آدمیوں کو گرفتار کیا جو کنویں کی طرف پانی بھرنے کے لیے آ رہے تھے انھیں پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ سپاہیوں نے ان دونوں سے پوچھا' کہ تم کون ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ ہیں۔ انھوں نے انھیں مار پیٹ کر کہا کہ تم

حقیقت میں ابوسفیان کے کارواں کے آدمی ہو۔ تب انھوں نے کہا' ہاں ہم ابوسفیان کے لوگ ہیں۔ پھر ذرا ٹھہر کر دوبارہ پوچھا کہ تم کون ہو' تو وہ کہتے ہیں کہ مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ فرماتے ہیں۔ جب وہ سچ کہتے ہیں تو تم انھیں مارتے ہو اور جب جھوٹ کہتے ہیں تو انھیں چھوڑ دیتے ہو۔ پھر اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں سے سوال کرنے کے لیے متوجہ ہوتے ہیں۔ وہاں بھی ہمیں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جو فوجی نقطہ نظر سے دلچسپ ہیں۔ ان سے پوچھا' تم کون ہو؟ کہا "ہم مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ ہیں۔" بہت اچھا تم کتنے آدمی ہو؟ جواب دیا "ہمیں معلوم نہیں۔" واقعی ان کو معلوم نہیں تھا۔ پھر کیسے معلوم کریں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ روزانہ لوگوں کی غذا کے لیے کتنے اونٹ ذبح کرتے ہو؟ انھوں نے کہا "ایک دن نو' ایک دن دس۔" تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً استنباط کیا کہ ان کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے مابین ہو گی۔ کیونکہ ایک اونٹ ایک ایک سو افراد کی ایک دن کی غذا کے لیے کافی ہوتا ہے۔ حقیقتاً ان کی تعداد ۹۵۰ تھی۔ پھر ان سے پوچھا گیا کہ فوج میں کون کون لوگ بڑے موجود ہیں؟ فلاں فلاں سردار۔ غالباً اس سے اندازہ لگایا ہو گا کہ جنگ کے وقت فوج کی کمانداری کون کون کرے گا؟ میمنہ میں کون ہو گا؟ میسرہ میں کون ہو گا؟ مختلف مقامات پر کون کون مکہ والے ہوں گے؟ ان کے ناموں سے حضور اکرم اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقف تھے۔ کیونکہ وہ ہم وطن تھے۔ اس طرح کچھ معلومات ان قیدیوں سے حاصل کی گئیں۔ اس کے بعد صبح جنگ شروع ہونے والی تھی۔ رات کو جو طرز عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رہا وہ یہ بتاتا ہے کہ پہلے تو کچھ دیر آرام فرمایا۔ پھر بہت سویرے اپنی چھوٹی سے فوج کی جس میں تین سو بارہ آدمی تھے' تقسیم کی اور کہا کہ یہ فوج کا مقدمہ ہے' یہ سامنے رہے گا۔ یہ دائیں ہاتھ پر میمنہ' یہ بائیں ہاتھ پر میسرہ یہ قلب اور یہ ساقہ۔ گویا فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا۔ اس تقسیم کے بعد ہر ایک کے افسر مقرر کیے: اس کا سردار فلاں ہو گا' اس کا سردار فلاں ہو گا: یہ انصاری' یہ مہاجر وغیرہ۔ اس کے بعد کچھ تفصیلات اور ملتی ہیں جو فوجی نقطہ نظر سے آئندہ آنے والے سپہ سالاروں کے لیے نمونہ ہیں۔ نبی ہونے کے باوجود' خدا کی حفاظت کا یقین ہونے کے باوجود' انتظامی طور پر آپ یہ تدبیر اختیار کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی سے پہاڑی پر ایک جھونپڑا تعمیر کیا جاتا ہے تاکہ جنگ کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس جھونپڑے کے اندر رہ کر مشاہدہ کرتے رہیں اور

حسب ضرورت فوج کو آگے بڑھائیں یا پیچھے ہٹائیں تاکہ دشمن کے کمزور حصے کو دیکھ کر اس پر حملہ کیا جائے' جہاں مسلمانوں کی کمزوری ہو دیکھ کر کمک بھیجی جائے۔ یہ بھی خیال رکھا گیا کہ وہ مقام کھلا ہوا نہ ہو تاکہ دشمن کے تیر آپ کو نہ لگیں۔ ایک جھونپڑا سا تعمیر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے اندر دشمن کے تیروں سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے فوجی قیادت کے فرائض آپ خود انجام دے سکیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہاں دو تیز رفتار اونٹنیاں بھی مامور کی جاتی ہیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر خدانخواستہ جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہو تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر فوراً مدینہ منورہ چلے جائیں تاکہ (نعوذ باللہ) آپ کی شہادت کی نوبت نہ آئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس قدر فراست سے آپ' جنگ کا انتظام فرماتے تھے۔ مسلمانوں کے تین سو بارہ اور دشمن کے نو سو پچاس آدمی تھے۔ مسلمانوں کی پوری فوج میں شاید دو گھوڑے تھے اور دشمن کے پاس ایک سو سے زائد گھوڑے تھے۔ مسلمانوں کے پاس دس بارہ بکتر ہوں گے' دشمن کے پاس دو سو بکتر تھے۔ گویا ہر لحاظ سے دشمن مسلمان فوج سے طاقتور اور قوی تھا۔ اس انتظام کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس جھونپڑی ہی میں جو آپ کے لیے تعمیر کی گئی تھی خدا کے سامنے سجدے میں گر پڑے اور دعا کی۔ وہ دعا بھی نہایت اثر انگیز تھی۔ دعا یہ تھی کہ اللہ! اگر تو چاہتا ہے کہ دنیا میں آئندہ کوئی تیری عبادت نہ کرے' تو اس چھوٹے سے دستے کو شکست دیدے۔ اس کے برخلاف اگر تو چاہتا ہے کہ تیری عبادت ہوتی رہے تو اس چھوٹے سے دستے کو بڑے دستے پر غلبہ عطا کر۔ اس کے بعد آپ باہر نکلتے ہیں۔ فوج سے مخاطب ہوتے ہیں کہ تم اس وقت ساری دنیا میں خدا کی خدائی کے واحد ذمہ دار ہو اس سے یہ ولولہ انگیز جذبہ ان کے دلوں میں پیدا ہوا ہو گا کہ ہم ہی وہ واحد جماعت ہیں جو اس وقت خدا کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ باقی سب خدا کے دشمن ہیں۔ اس جوش و ولولہ کے باعث ایک ایک آدمی کو ہزار ہزار آدمی کی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ اب وہ جان پر کھیل جائے گا۔ آج کل کی فوجوں کی طرح نہیں جنھیں شراب پلا کر لڑائی کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس جذبے کے ذریعے سے ان میں جوش بھر دیا جاتا ہے کہ تم جس مقصد کے لیے جنگ کر رہے ہو' وہ دنیا کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ جنگ ہوتی ہے۔ نتیجے سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ مٹھی بھر انسانوں نے کثیر دشمن کو شکست دی اور دشمن کے ستر آدمی قتل ہوئے ستر یا اس سے زیادہ آدمیوں کو گرفتار بھی کیا گیا۔

۲۳۲۔ میں اب ایک دوسرے پہلو کو لیتا ہوں۔ جنگ کے سلسلے میں دشمن سے چھینے ہوئے مال

غنیمت کے بارے میں کیا قانون ہونا چاہیے۔ اور دشمن کے آدمیوں سے ہمارا کیا برتاؤ ہونا چاہیے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مشورہ یہ تھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمارے ازلی و ابدی دشمن ہیں۔ انھوں نے بلاوجہ گزشتہ پندرہ ایک سال سے ہر وقت ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی قطعاً" کوئی توقع نہیں کہ اب وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ وہ ہمیں جانی نقصان پہنچا چکے ہیں' مالی نقصان بھی پہنچا چکے ہیں۔ میری رائے میں ان سب کا سر قلم کر دینا چاہیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھ کر فرماتے ہیں کہ میری رائے میں یا رسول اللہؐ ان کو قتل کرنے کی بجائے فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اسلام نہ لائیں لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں مسلمان ہو جائیں۔ اس لیے ان کو نیست و نابود کرنے کی بجائے رہا کر دیا جائے۔ ہمیں مالی ضرورت بھی بہت ہے۔ کیوں نہ ہم ان سے فدیہ لیں۔ جس سے ہماری مالی تقویت ہو گی اور دشمن کی مالی حالت خراب ہو گی۔ اس طرح ہم اس جنگ سے فائدہ اٹھائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قبول فرماتے ہیں' لیکن یہ ایک ایسی چیز تھی' جس پر مومنین کو عتاب کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے: لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم (۸ : ۶۸) (اگر خدا نے پہلے ہی سے فیصلہ نہ کر رکھا ہوتا تو جو چیز تم لوگوں نے لی ہے اس بنا پر تم لوگوں کو سخت عذاب دیا جاتا) کیوں؟ اس عذاب کی وجہ جو میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب تک پرانی شریعتوں میں ترمیم یا تنسیخ کی کوئی وحی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ آئے' وہ ان پر عمل کرنے پر مامور تھے۔ اب تک مسلمانوں کی کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی' اس لیے قانون جنگ کے متعلق کوئی احکام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچے تھے۔ لہٰذا اس سے پہلے کے نبیوں کے احکام مثلاً توریت پر عمل کرنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ تھا۔ تورات میں صراحت سے ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے کہ اگر کوئی دشمن تمھارا مقابلہ کرے' تم سے جنگ کرے اور تمھیں اس پر غلبہ حاصل ہو تو دشمن کے مردوں' عورتوں' بچوں' بوڑھوں' جانوروں غرض ہر متنفس کو قتل کر ڈالو۔ ان کا جو مال ہے وہ بھی تم لے لو اور مال کے سلسلے میں کئی مقامات پر مذکور ہے کہ وہ خدا کی چیز ہے لہٰذا اس کو جلا دو۔ اس سے تم استفادہ نہ کرو۔ اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فطری رافت و رحمت کے باعث بظاہر اس حکم پر عمل نہیں کیا لور خود اللہ نے بھی اپنے رسول کو "رحمتہ اللعالمین" کے لقب سے پکارا ہے۔ لیکن خدا کے نزدیک یہ بات نامناسب تھی کہ جب تک قانون

میں تبدیلی نہ ہو اس کا بندہ اس کے احکام کی خلاف وزری کرے۔ لہٰذا تنبیہ کی جاتی ہے۔ لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم لیکن خدا نے سزا نہیں دی۔ چونکہ خدا ہی کہتا ہے "میں پہلے ہی سے فیصلہ کر چکا تھا کہ پرانے قانون کو بدل دوں گا۔" چنانچہ مسلمانوں نے اس جنگ سے فائدہ اٹھایا وہ یہ تھا کہ لاکھوں روپے مسلمانوں کو ملے۔ دشمن کے لاکھوں روپے خرچ ہو گئے۔ کیونکہ فدیہ اس زمانے میں بہت گراں چیز تھی، یعنی ایک سو اونٹ۔ ایک اونٹ کی قیمت ہم چالیس درہم ہی قرار دیں تو جو انتہائی کم قیمت تھی اور ہر شخص کے عوض ایک سو اونٹ فدیہ میں لیے گئے، اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ کس قدر رقم ان ستر قیدیوں سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی ہوگی۔ بعض لوگوں کے پاس روپیہ تھا، انھوں نے روپے دے دیے۔ بعض لوگ تاجر تھے مثلاً ایک شخص اسلحہ بیچنے والا تھا، اس نے کہا کہ میں اس رقم کے برابر اسلحہ تمھیں دیتا ہوں، اسے قبول کیا گیا۔ بعض لوگ خود غریب تھے لیکن ان کے دوستوں نے ان کی مدد کی اور چندہ کر کے ان کی رہائی کا انتظام کیا۔ بالاخر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو بالکل غریب تھے ان کے دوست احباب بھی مالدار نہیں تھے کہ مدد کریں۔ لیکن ان میں ایک خاص خوبی یہ تھی کہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان کو آپ حکم دیتے ہیں کہ ایک ایک سو اونٹ دینے کی بجائے تم دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاؤ۔ یہی تمھارے لیے فدیہ ہو گا۔ تم کو مفت رہا کر دیا جائے گا۔ اس بات سے علم کی ترقی کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمناؤں اور کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں نہ لکھنا پڑھنا آتا تھا، نہ مال دار تھے اور نہ ہی ان کے مالدار دوست تھے۔ بالاخر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طے فرماتے ہیں کہ ان سے صرف وعدہ لیا جائے کہ آئندہ مسلمانوں سے جنگ نہ کریں گے اور اس وعدے پر ہی اعتماد کر کے انھیں مفت رہا کر دیا گیا۔ ایسی بھی صورتیں پیش آئیں کہ کچھ مسلمان کسی قبیلے میں قیدی تھے۔ ان کو رہائی دلانے کے لیے اس قبیلے کے آدمیوں کو رہا کیا گیا۔ غرض قانون جنگ کی بے شمار مثالیں اس پہلی جنگ کے دوران ہمیں نظر آتی ہیں۔ اس پر مسلمانوں کا بین الممالک قانون International Law مبنی ہو جاتا ہے۔ میں اس پر جنگ بدر کا بیان ختم کرتا ہوں۔

۲۳۳۔ مکہ والوں کو شکست ہوئی تھی۔ وہ مکہ واپس آ گئے لیکن مطمئن نہیں ہوئے۔ انھوں نے خیال کیا کہ ہمیں اتفاقاً شکست ہوئی۔ لہٰذا ہمیں انتقام لینے کی تیاری کرنی چاہیے۔ اس لیے تقریباً ایک سال تک، وہ مزید کئی لاکھ روپیہ خرچ کر کے ایسے سپاہیوں کو فراہم کرتے ہیں جو اجرت

شمال
لشکر اسلامی
رسول اللہ نے پناہ لی
رسول اللہ نے آرام فرمایا
مدفن دندان نبوی
فوج قریش
مزارات شہدائے احد
چشمہ
چشمہ
مزارات شہدائے احد
حضرت حمزہ کا موجودہ مزار و مسجد
سابقہ نخلستان
سطح مرتفع
وادئ قناۃ
جبل عینین
حضرت حمزہ کی شہادت گاہ
تیراندازوں کا دستہ
نخلستان
نقشہ غزوۂ احد
۰ ۲۵ ۵۰ ۷۵ ۱۰۰ میٹر
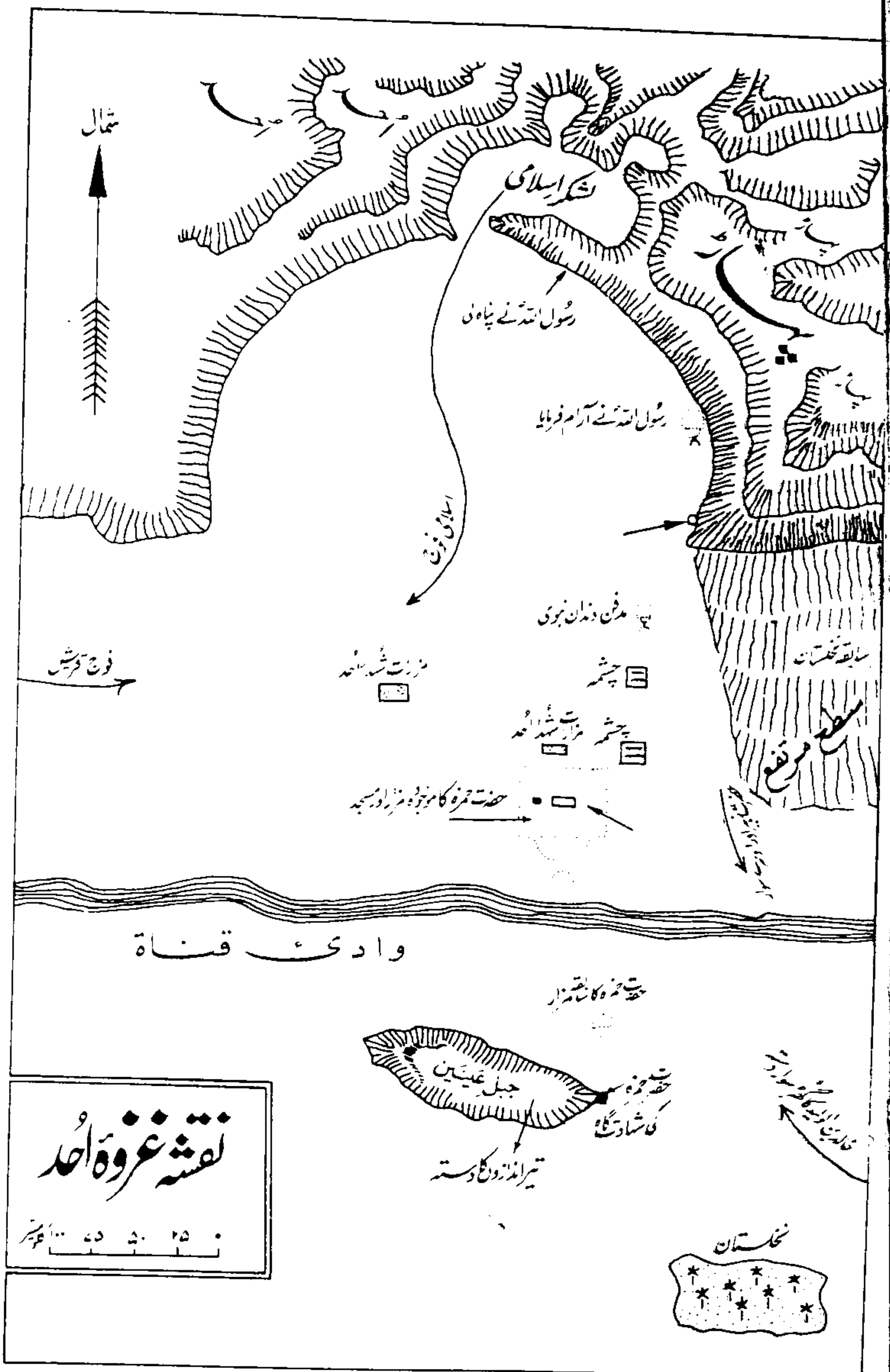
پر لڑتے ہیں۔ اس غرض سے وہ مختلف قبائل میں گئے اور کہا کہ ہر شخص کو اتنی رقم دی جائے گی' جو ہماری فوج میں بھرتی ہو اور جنگ کرے۔ اسے مال غنیمت بھی ملے گا۔ سال بھر کی تیاری کے بعد کفار کی فوج مکہ سے مدینہ کی طرف آتی ہے۔ اس وقت ان کی تعداد پہلے سے تگنی ہے۔ پہلی جنگ میں اگر ۹۵۰ آدمی تھے تو اب تین ہزار آدمی ان کی فوج میں پائے گئے۔ مسلمانوں کے پاس ایسے لوگ جو ہتھیار اٹھا سکتے تھے زیادہ سے زیادہ ایک ہزار تھے۔ اور ان میں سے تین سو آدمی آخری وقت میں دغا دے کر میدان چھوڑ گئے۔ مدینہ منورہ میں اسلام سے پہلے ایک شخص عبداللہ بن ابی بن سلول تھا جس کو مدینہ والے بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ کم از کم ایک قبیلہ کے لوگ اس کے لیے سناروں سے تاج شہریاری تیار کرنے کے لیے فرمائش بھی کر چکے تھے۔ اتنے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے آتے ہیں اور اس کی بادشاہی کا مسئلہ داخل دفتر کر کے ختم کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اسے دکھ ہوا ہو گا۔ وہ خوشدلی اور اخلاص کے ساتھ ہرگز مسلمان نہیں ہو سکا ہو گا۔ چنانچہ اس شخص نے جنگ احد کے موقع پر' جس کا میں اب ذکر کر رہا ہوں' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مدینے کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا چاہیے' مدینے سے باہر جا کر کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی رائے تھی۔ آپ نے اپنے صحابہ سے مشورہ کیا۔ بالآخر اکثریت کی رائے سے اور نوجوانوں کے اصرار پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طے فرمایا کہ ہم باہر نکل کر ہی مقابلہ کریں گے۔ اس وقت عبداللہ بن ابی بن سلول کہتا ہے کہ یہ شخص بچوں کی بات تو مانتا ہے لیکن مجھ جیسے عقل مند اور پرانے تجربہ کار کی بات نہیں مانتا۔ اس کا ساتھ دینا ہمارے لیے مصیبت کا باعث بنے گا۔ لہٰذا وہ اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر مدینے واپس ہو جاتا ہے۔

۲۳۴۔ غرض سات سو آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے ہیں اور دشمن کی فوج تین ہزار ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ عین موقعے پر جو مختلف حل طلب مسئلے پیدا ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کی فوج کہاں ہو' کس پہاڑی کو' کس چشمے کو کس کس طرح استعمال کیا جائے' سب کی تفصیل بیان کروں۔ اس میں وقت لگے گا۔ میں مختصراً" یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس مقام پر مسلمان مقیم ہوئے' وہ ایک محفوظ مقام تھا' یعنی جبل احد نامی پہاڑی کے دامن میں۔ یہ پہاڑ ایک کمان کی طرح ہے جس کے اندر دو دائرے سے بھی ہیں اور بہت ہی تنگ راستے سے گزر کر اندرونی دائرے کے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ اس اندرونی وسیع میدان میں مسلمان قیام اور

جنگ کے لیے بیرونی دائرے کے اندر اور اس سے بھی نیچے کھلے میدان میں آتے ہیں۔ دشمن ایک اور مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ مسلمان جس مقام پر لڑنے کے لیے صف بندی کرتے ہیں وہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کو جبل الرماۃ کہتے ہیں یعنی تیر اندازوں کی پہاڑی۔ فوجی نقطہ نظر سے وہ اہم سمجھی گئی' کہ اس پر ہمارے آدمی مامور ہوں تاکہ دشمن ہمارے پیچھے سے حملہ نہ کرے۔ اس کے لیے پچاس تیر انداز مامور کیے گئے۔ صرف دو سوار مسلمانوں کی فوج میں تھے۔ ایک حضرت ابو ہریرہ اور دوسرے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ ان کو مامور کیا گیا کہ تم یہیں جبل الرماۃ کے پاس رہو کہ اگر دشمن کی سوار فوج اس طرف سے آئے تو سب مل کر اس کا مقابلہ کرنا۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازے کے مطابق واقعی دشمن نے اپنی پیدل فوج کو احد کے سامنے کے میدان میں آگے بڑھایا اور اپنے سواروں کو خالد بن ولید اور ان کے قریبی رشتہ دار عکرمہ بن ابی جہل کی سرداری میں جبل احد کے پیچھے سے تقریباً دس بارہ میل کا چکر کاٹ کر مسلمانوں کو پیچھے آکر ان پر حملہ کرنے کے لیے مامور کیا۔ جنگ شروع ہو گئی۔ پہلے دھاوے میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ دشمن بھاگنے لگا اور ان کی عورتیں بھی بھاگنے لگیں۔ عین اس وقت دشمن کی سوار فوج پیچھے سے پہنچ گئی۔ اس نے حملہ کیا اور تیر اندازوں اور مسلمانوں کی فوج کے دونوں سواروں نے ان کا مقابلہ کیا اور انھیں پسپا بھی کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک تنگ مقام تھا۔ خالد بن ولید پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر حملہ کرتے ہیں۔ دوسری مرتبہ پسپا ہوتے ہیں اور اس اثنا میں جیسا کہ ابھی میں نے کہا' دشمن کو شکست ہو چکی تھی۔ وہ بھاگ رہا تھا اور مسلمان سپاہی دشمن کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ اس وقت اس پہاڑی پر متعین تیر انداز سوچنے لگے کہ ہمیں اس وقت یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ دشمن کو شکست ہو چکی ہے۔ اب کوئی ضرورت نہیں کہ ہم یہاں رہیں۔ لہٰذا ہم بھی جائیں اور لوٹنے میں مصروف ہوں۔ حالانکہ ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی صریح اور سخت الفاظ میں تاکید کی تھی کہ اگر تم ہماری لاشوں پر گدھوں کو بھی منڈلاتے ہوئے دیکھو تب بھی اس مقام سے نہ ہٹنا۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ ان کے سردار نے تو انھیں روکا مگر بہت سے سپاہی نافرمانی کر کے پہاڑی سے چلے گئے۔ پہاڑی خالی دیکھ کر خالد بن ولید کے سوار سہ بارہ حملہ کرتے ہیں۔ مسلمان تیر اندازوں کا سردار اور اس کے ساتھ باقی رہنے والے آٹھ دس آدمی شہید ہو جاتے ہیں اور دشمن سوار اس چھوٹے سے تنگ مقام سے گزر کر مسلمانوں پر ان کے پیچھے سے حملہ کر دیتے ہیں۔ جب مسلمان لوٹ رہے

تھے تو سامنے دشمن کی فوج بھاگ رہی تھی۔ دشمن کو حیرت ہوئی کہ کیا بات ہے کہ ہمارا تعاقب کرنے کی بجائے وہ مڑ کر پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اب وہ بھگوڑے دشمن بھی مڑ کر حملہ کرتے ہیں اور مسلمان دو طرف سے دشمن فوج میں گھر جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ستر مسلمان شہید ہوتے ہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہو جاتے ہیں۔ بہت سے مسلمان بھاگتے ہیں۔ کوئی تو تین تین دن کے فاصلے پر جا رکتا ہے۔ کچھ لوگ پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کو صاف الفاظ میں شکست ہو گئی۔ اس وقت کچھ خدائی تقدیر سے سابقہ پڑتا ہے۔ قریش کی فوج کے لیے فتح کے بعد مناسب یہ تھا کہ وہ فوراً مدینہ جاتی۔ وہاں کوئی حفاظتی فوج تو تھی نہیں۔ وہ شہر مدینہ کو لوٹ لیتے اور عورتوں بچوں کو گرفتار کر لیتے۔ اس طرح اپنی اس فتح کو مکمل کرتے مگر انھوں نے یہ نہیں کیا۔ شاید یہی خدا کی مشیت تھی۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ دشمن فوج کا سردار یعنی ابوسفیان انتہائی فراست مند تھا۔ جس نے بدر کی جنگ میں محض اونٹ کی لید سے معلوم کر لیا تھا کہ مدینے کے مسلمان آئے ہیں۔ وہ احد میں میدان جنگ کا دورہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کی لاشوں کو بھی دیکھتا ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا بھی شہید ہو گئے تھے ان کا سینہ چیر کر ان کے کلیجے یا جگر کو ابوسفیان کی بیوی نے چبا ڈالا تھا' اس کو بھی وہ دیکھتا ہے۔ کہتا ہے میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا' گو دل میں خوش ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا بہادر شخص اب ختم ہو چکا ہے۔ پھر وہ ایک مقام پر' جہاں دو چار مسلمان ایک پہاڑی کی چوٹی پر موجود ہیں' یہ آواز دے کر چلاتا ہے "تعریف ہو ہبل بت کی جسے فتح ہوئی اور تمھیں شکست ہوئی۔" اس طرح وہ شیخی کے نعرے لگاتا ہے۔ شروع میں جب یہ آواز آئی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا جواب مت دو۔ ابوسفیان چلایا۔ کیا ابوبکر زندہ ہے؟ کیا عمر زندہ ہے؟ جب کوئی جواب نہیں ملا تو کہا۔ الحمدللہ سب مر چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر کہتا ہے: تعریف ہو ہبل کی۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہ رہا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر جواب دیتے ہیں۔ "اے اللہ کے دشمن ہم سب زندہ ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ ہیں' ابوبکر بھی زندہ ہیں عمر بھی زندہ ہیں۔ اس وقت ابوسفیان کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ اس پہاڑی کے چھوٹے سے دستے کو جس میں مشکل سے آٹھ دس آدمی ہوں گے' اوپر چڑھ کر قتل کر دینا چاہیے تھا کیونکہ ابوسفیان کے ساتھ فوج بھی' لیکن وہ کچھ نہیں کرتا۔

صرف یہ کہتا ہے کہ جنگ ایک ایسی چیز ہے کہ کل تم کو' آج ہم کو فتح ہوئی ہے۔ مجھے جو بدر میں شکست ہوئی تھی' آج میں نے اس کا بدلہ لے لیا۔ میرا بیٹا حنظلہ مارا گیا تھا' آج دوسرے حنظلہ جو بہت بڑے مسلمان مجاہد تھے' ابو عامر راہب کے بیٹے تھے۔ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھے' شہید ہو گئے۔ میں حنظلہ کے بدلے حنظلہ کو قتل کر چکا ہوں۔ آئندہ سال پھر تم سے اسی زمانے میں جنگ ہو گی۔ غرض یہ کہ ابوسفیان نے نہ جانے کس بنا پر فتح سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہا' سوائے اس کے کہ اس کی عقل ماری گئی ہو۔ اس نے کچھ نہیں کیا اور واپس ہو گیا۔ جب واپس ہونے لگا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عسکری فراست سے سوچتے ہیں کہ شاید مدینہ کو لوٹنے جا رہے ہیں۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ کس طرح شہر کی حفاظت کی جائے؟ اولاً ایک دو سپاہیوں کو معلوم کرنے کے لیے بھیجتے ہیں کہ یہ مکہ جا رہے ہیں یا مدینہ جا رہے ہیں۔ یہ تمھیں کس طرح معلوم ہو گا؟ یہ دیکھو کہ وہ گھوڑوں پر سوار ہیں یا گھوڑوں کو کوتل میں لے کر اونٹوں پر سوار ہیں۔ گھوڑوں پر سوار ہوں' تو معلوم ہو گا کہ کسی قریبی مسافت پر جا رہے ہیں اور اگر اونٹوں پر سوار ہوں' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی دور دراز مقام کو جا رہے ہیں۔ ان سپاہیوں نے واپس آ کر بتایا کہ وہ اونٹوں پر جا رہے ہیں اور گھوڑے کوتل میں ساتھ ہیں' تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان ہوا۔ پھر شہیدوں کو دفن کرنے' زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد آپ مدینہ تشریف لاتے ہیں۔ لیکن عسکری فراست سے آپ پھر سوچتے ہیں کہ شاید دشمن آگے جا کر پشیمان ہو اور پلٹ آئے۔ اس کے دفاع کے لیے انتظام کرنا ضروری ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلان فرماتے ہیں کہ جو لوگ احد کی جنگ میں شریک تھے' صرف وہی شہر سے نکلیں۔ کسی اور شخص کو فوج میں داخلے کی اجازت نہیں۔ یہ حکم کس بنا پر دیا گیا' ہمارے فوجی تجربہ کار افسر بیان کریں گے۔ شاید اس بناء پر کہ انہی لوگوں کو انتقام کا جذبہ زیادہ ہو گا۔ بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سپاہیوں کو لے کر جن میں سے بہت سے زخمی بھی تھے' مدینہ کے جنوب میں تقریباً تین دن کی مسافت تک دشمن کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں' پھر قیام کرتے ہیں۔ ابوسفیان نے اب سوچا کہ ہم نے غلطی کی کہ اپنی فتح سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم مدینے کی طرف واپس جائیں۔ واپس آنے لگا تو اسے بھی پتا چل گیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے نئی فوج لے کر ہمارے مقابلے کے لیے آ چکے ہیں۔ اسے ڈر ہوا کہ پہلے بھی لڑائی میں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے تو اب کیا کریں گے۔ لہٰذا ابوسفیان کو ہمت نہیں ہوئی کہ دوبارہ مدینے کی

طرف آئے۔ وہ مکہ واپس جاتا ہے۔ یہ دوسری لڑائی تھی۔ اس لڑائی میں دشمن کو نہ فتح ہوئی نہ شکست۔ لیکن دو پہلو قابل ذکر ہیں۔ پہلا پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو شکست ہوئی تھی۔ اس کو بہتر بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فکر تھی کہ مسلمانوں کی فوج پست ہمت ہو چکی ہے' اس میں دوبارہ خود اعتمادی کیسے پیدا کی جائے اور کیسے مسلمانوں کی حالت کو سدھارا اور بہتر بنایا جائے۔ دوسری طرف دشمن کی اس واپسی سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان پر غور کر کے مناسب انتظامات کیے جائیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے میں ان تفصیلات میں نہیں جاتا۔ صرف یہ عرض کروں گا' کہ کوئی دو سال کے بعد مکہ والے دوبارہ مسلمانوں سے جنگ کی کوشش کرتے ہیں۔

۲۳۵۔ ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کی وجہ سے انھیں ہمت ہوئی کہ مدینے پر حملہ کریں۔ وہ یہ کہ مکہ والوں کی بدر سے واپسی کے بعد مدینہ کے اندر مسلمانوں کی ایک یہودی قبیلے سے' اور احد کی جنگ کے بعد ایک اور یہودی قبیلے سے جنگیں ہوئیں۔ ان میں سے پہلے بنو قینقاع اور دوسرے بنو النضیر تھے۔ بنو النضیر والے بہت مالدار تھے۔ جب انھیں مدینہ سے نکلنا پڑا تو خیبر جا کر بسے یہ مدینہ کے شمال میں کوئی پانچ دن کی مسافت پر تھا۔ اپنی دولت کے بل بوتے پر انھوں نے مسلمانوں سے انتقام لینا چاہا۔ خود مقابلہ کرنے کی بجائے کرائے کے ٹٹو جمع کر لیے۔ چنانچہ یہودیوں نے مکہ والوں سے کہا کہ تم اگر مدینہ پر حملہ کرو تو ہم تمھیں پوری مدد دیں گے۔ اسی طرح مکہ کے حلیف قبائل کو کہا کہ اگر تم آئندہ جنگ میں بھی مکہ والوں کا ساتھ دے کر جنگ کے لیے نکلو تو ہم بھی تمھاری مالی مدد کریں گے۔ آس پاس یہودیوں کے جو حلیف قبائل تھے ان کو بھی دولت کا لالچ دیا اور کہا کہ خیبر کی کھجوروں کی جو پیداوار ہو گی وہ پوری تمھیں دے دی جائے گی۔ بشرطیکہ تم مدینے پر حملے کرنے میں مکہ والوں کا ساتھ دو۔ غرض یہ کہ بارہ ہزار کی فوج مدینے پر حملے کے لیے نکلتی ہے۔ مختلف وسائل سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہو گئی۔ میں پوری تفصیلات میں جا نہیں سکتا۔ بہرحال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اب شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا طے فرماتے ہیں۔ مدینے والے بھی اس بار اصرار نہیں کرتے کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ لیکن روزانہ سخت سے سخت اور خطرناک سے خطرناک خبریں آ رہی تھیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فلاں فلاں دشمن قبائل بھی جنگ کے لیے آ رہے ہیں۔ بارہ ہزار کے مقابلے میں مسلمانوں کی فوج کی تعداد اس وقت پندرہ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ دشمن کے پاس کثیر فوج کے

علاوہ مالی وسائل بھی تھے۔ ان کی پشت پر خیبر کا بہت مالدار علاقہ بھی تھا۔ اس وقت مشورۃ" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معلوم کیا' اور یہ کہتے ہیں کہ سلمان فارسی کا مشورہ تھا' کہ جب دشمن طاقتور ہو تو ایران والے اپنے پڑاؤ کے اطرف خندق کھود لیتے ہیں تاکہ غفلت کی حالت میں دشمن اس کو عبور کر کے دن یا رات یا کسی وقت بھی ان پر چھاپہ نہ مارے۔ کہاں خندق کھودنی چاہیے۔ واقدی وغیرہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں۔ مدینے کے دو چار لوگوں کو ساتھ لیتے ہیں اور شہر کے اطراف کا چکر لگاتے ہیں۔ معلوم کیا کہ کس مقام پر شہر کا دفاع کمزور ہے۔ کس مقام پر ان کو قدرتی سہولتیں حاصل ہیں اور طے کیا کہ کس مقام سے کس مقام تک خندق کھودنی چاہیے اور پھر پوری تندہی سے سارے مسلمان سپاہی اس کام میں لگ جاتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انجینئر بن کر بتاتے ہیں کہ کس جگہ خندق کھودنی چاہیے۔ اور واقعہ" اتنی بہتر جگہ ہے کہ آج بھی کوئی بڑے سے بڑا جنرل مدینے میں اس مقام سے بہتر کسی جگہ کا انتخاب نہیں کر سکے گا۔ وقت بہت کم ملا' اس کے باوجود دشمن کے آنے تک خندق کھود لی گئی۔ یہ خندق کیسی تھی۔ کچھ تفصیلیں مجھے ملی ہیں۔ لکھا ہے کہ اتنی چوڑی تھی کہ تیزی سے دوڑنے والا گھوڑا بھی اس کو پھلانگ کر عبور نہ کر سکے اور گہرائی اس قدر تھی کہ اندر کوئی آدمی ہو تو اپنے آپ باہر نہ آ سکے۔ یعنی تین چار گز گہرائی ہوگی۔ اس انتظام سے فارغ ہوئے تھے کہ دشمن آ پہنچا۔ اس کے لیے یہ نئی چیز تھی۔ مکہ والوں اور ان کے ہمراہی بدوؤں کو کبھی خندق کی جنگ کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اب وہ اس مقابلے کے لیے مجبور ہوئے تھے تو اس کے سوا کہ دور سے تیر چلائیں' ان کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہ خندق جس مقام پر تھی وہاں درمیان میں کچھ پہاڑوں کی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں بھی ہیں جو خندق تک آتی ہیں۔ پھر تھوڑا سا حصہ خالی رہ جاتا ہے۔ پھر دوبارہ خندق شروع ہوتی ہے۔ اس طرح دو مقامات پر ایسا نظر آیا ہے اور وہاں خندق نہیں کھودی گئی ان کی چوٹیوں پر مسلمان سپاہی متعین رہتے تھے۔ وہ دشمنوں کو دیکھتے تھے۔ ایک دن دشمن کا ایک شہسوار بڑی تیزی سے آیا اور خندق کو عبور کر کے مسلمانوں کے کیمپ میں آ گیا۔ غالباً وہ کوئی ایسا ہی مقام ہو گا جہاں پہاڑ کی چوٹی اور خندق کے درمیان کا حصہ خالی تھا۔ اس کا گھوڑا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتا ہوا چھلانگ مار کر اندر آ گیا۔ مگر وہ تن تنہا تھا۔ مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا اور اس کو بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ اس نے کوشش کی کہ اس کا گھوڑا پھلانگ کر عبور کرے مگر کامیاب نہیں ہوا۔ گھوڑا بھی اور وہ بھی خندق

نقشہ اُحد اور خندق
جبل ثور
جبل اُحد
وادیٔ قناۃ
شمال
خندق
مسجد نبوی
دیار بنی حارثہ
دیار بنی ظفر
وادی بطحان
وادی مہزور
مسجد قبا
جبل عیر
ذوالحلیفہ

میں گر گئے۔ مسلمانوں نے اسے خندق میں ہی مار ڈالا۔ اس وقت ہمیں قانون جنگ کی ایک شق' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانیت پروری کی ایک نئی مثال ملتی ہے وہ مقتول دشمن کی فوج کا بہت ہی ممتاز افسر تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیام آیا کہ اس کی لاش ہمیں واپس دے دو تو ہم تم کو خون بہا ایک سو اونٹ دینے کے لے تیار ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' مفت لے جاؤ مجھے اس مال کی ضرورت نہیں۔ یقیناً اس سے دشمن کے دل پر اچھا اثر پڑا ہو گا اور ہم دیکھیں گے کہ بعد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دشمن کو نیست و نابود کرنے کی بجائے ایسی ہی تدبیروں سے اس کو مسلمان ہونے پر آمادہ کرتے رہے۔ غرض یہ کہ خندق کی جنگ کا سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا۔ قریش کے پاس زاد راہ ختم ہو گیا۔ انھوں نے خیبر سے کچھ چیزیں منگوائیں جو ان تک پہنچیں۔ مسلمان کے دستے ہر وقت چوکس رہتے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ اس آنے والی مدد کو روک کر چھین لیا اور قریش کو اس آخری مدد سے' جو مل رہی تھی۔ محروم کر دیا۔ قریش دل برداشتہ ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس لڑائی کو ختم کر کے واپس چلے جائیں۔

۲۳۶۔ ہمارے مؤرخ عام طور پر اس واپسی کی وجہ موسم کی خرابی بیان کرتے ہیں' کیونکہ بہت شدید سردی ہو گئی تھی اور ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ قریشی فوج کے ڈیرے گر پڑے تھے۔ ان حالات میں ابوسفیان نے طے کیا کہ واپس ہونا چاہیے۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ واپسی محض موسم کی خرابی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ایک اور وجہ سے بھی تھی۔ یہ جنگ شوال میں ہوئی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ عرب میں اسلام سے پہلے حرام مہینوں (اشہر حرم) کا تصور تھا جن میں وہ جنگ کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ان میں پہلا مہینہ ہے ذی قعدہ' دوسری ذی الحجہ' تیسرا محرم اور چوتھا رجب۔ اب حرام مہینوں کا آغاز ہو رہا تھا۔ شوال کی آخری تاریخ تھی۔ اب اگر ابوسفیان اور اس کی فوج وہیں رکتی تو حج کے زمانے میں مکہ آنے والے مسافروں سے جو منفعت مقامی لوگوں کو حاصل ہوتی تھی (جو آج بھی ہوتی ہے) وہ لوگ اس سے محروم ہو جاتے دوسرے یہ توہمات (Superstitions) بھی تھے کہ حرام مہینوں میں جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ موسم کی خرابی کے علاوہ یہ دونوں وجوہ زیادہ موثر رہے ہوں گے' بہرحال آخری دنوں میں قریشیوں نے ایک تدبیر اور سوچی اور اس کا غالباً انھیں خیبر کے یہودیوں سے مشورہ ملا۔ جب خیبر کے یہودیوں کو معلوم ہوا کہ بارہ ہزار کی فوج کے باوجود ایک مہینے میں قریش کامیاب نہیں ہو رہے ہیں تو ان کا سردار

مدینہ آیا، چھپ کر صورتحال معلوم کی اور دیکھا کہ ایک صورت مسلمانوں کو شکست دینے کی ممکن ہے، وہ یہ کہ مدینے کے اندر ابھی یہودیوں کا ایک قبیلہ بنو قریظہ رہتا تھا اور مسلمان ان کی طرف سے مطمئن ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کریں اور عین اس وقت ایسا ہو کہ سامنے سے قریش اور ان کے ساتھی جنگ کر رہے ہوں۔ اس طرح مسلمان دو دشمنوں میں گھر جائیں گے اور انھیں شکست ہو جائے گی۔ بنو نضیر کا یہ سردار بنو قریظہ کے پاس جا کر ان کو آمادہ کرتا ہے کہ تم جنگ کرو۔ اس کی اطلاع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو گئی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عسکری ذہانت اور سیاسی فراست سے اس سازش کو توڑنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک شخص کا انتخاب کیا گیا، جو اب تک غیر مسلم جانا جاتا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ وہ مشرکین عرب میں سے ہے۔ وہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا اور ابھی اس کے ایمان لانے کی خبر نہیں پھیلی تھی۔ اس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیاسی مشن پر مامور کیا، چنانچہ وہ پہلے بنو قریظہ کے ہاں جاتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اگر قریش کے لوگ تم سے مطالبہ کریں کہ تم بھی حملہ کرو تو اس کا اطمینان کر لو کہ اس لڑائی کے بعد قریش تمھیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ کیونکہ اگر مکہ والے واپس ہو گئے تو تم تن تنہا رہ جاؤ گے۔ پھر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تنہا رہ کر مقابلہ نہیں کر سکتے اور یہ اطمینان حاصل کرنے کے لیے کہ قریش نہیں جائیں گے تم ان سے کچھ یرغمال کا مطالبہ کرو: کہ چند آدمی اپنے سرداروں میں سے ہمارے سپرد کر دیں تاکہ ہمیں اطمینان رہے کہ تم آخری وقت ہمیں دغا دے کر نہیں چلے جاؤ گے۔ انھوں نے کہا: بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر وہ شخص قریش کے کیمپ میں جاتا ہے اور کہتا ہے تمھیں معلوم ہے کہ میں تمھارا دوست ہوں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ بنو قریظہ کے یہودیوں میں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ساز باز ہو گئی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ قریش کے چند سرداروں کو اپنے قبضے میں لائیں اور پھر ان کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سپرد کر دیں۔ ایک شخص دوڑتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا ہے کہ فلاں شخص یہ کہہ رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی ذو معنی انداز میں جواب دیا۔ "لعلنا امرنا ہم بذالک" شاید ہم ہی نے انھیں ایسا حکم دیا ہو۔ دشمن کا وہاں ایک جاسوس موجود تھا، وہ دوڑا ہوا جاتا ہے اور ابوسفیان کو اطلاع دیتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابھی ابھی کہا کہ شاید ہم ہی نے بنو قریظہ کو ایسا حکم دیا ہو۔ جب قریش کا وفد بنو قریظہ کے پاس پہنچا تو اس نے دو مطالبے کیے ایک تو یہ کہ اپنے یرغمال ہمیں دو، دوسرا مطالبہ یہ کہ سنیچر کے دن جنگ

نہ ہو' کیونکہ سنیچر کے دن یہودی مذہب میں جنگ کرنا حرام ہے۔ غرض یہ کہ قریش اور بنی قریظہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور اس طرح سیاسی ذرائع سے اس حملے کا سدباب کر لیا گیا جو مسلمانوں پر آخری دن مدینہ کے جنوب سے بھی اور شمال سے بھی ہونے والا تھا۔ اس طرح قریش کی فوج اور ان کے ساتھی ناکام ہو کر مدینے سے واپس جاتے ہیں۔ اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ قریش کی آخری کوشش تھی۔ اب آئندہ ابتداء Initiative ہمارے ہاتھ میں رہے گی ہم ہی فیصلہ کیا کریں گے کہ کب جنگ شروع اور کس سے ہو۔؟

۲۳۷۔ مکہ والے ابتدائی دو شکستوں کے بعد یہودیوں اور دیگر لوگوں کی ترغیب پر تیسری بار مدینے پر حملہ آور ہوئے تھے۔ جنگ خندق میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی وہ محاصرہ اٹھا کر واپس آ گئے۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش بنی فرمائی جیسا کہ حدیث میں صراحت سے ذکر ہے کہ اب دشمن ابتداء Initiative نہیں لے گا بلکہ Initiative ہم لیں گے۔ اس کے کیا معنی تھے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ اب مکہ والوں کو جرات نہیں ہو گی کہ پھر مدینے پر حملہ آور ہوں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس وقت جو سکون کا وقفہ ملا ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس وقت وہ تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں' جن کا تعلق براہ راست فوج اور جنگ سے نہیں ہے لیکن ان کا اثر فوجی کارروائیوں پر پڑتا ہے۔ اسی زمانے میں ایک قحط عرب میں نمودار ہوا جس سے مکہ والے بے انتہا متاثر ہوئے۔ مکہ میں چونکہ زراعت نہیں ہوتی' انھیں غلہ باہر سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ جن مقامات سے غلہ درآمد ہوتا تھا' وہاں بھی قحط کے آثار نمایاں تھے اور وہ بھی ان کو غلہ مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ اس زمانے میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا' جس کا اثر فوجی نقطہ نظر سے پڑتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں نجد ایک واحد علاقہ تھا جہاں کی پیداوار قحط سالی سے بچ گئی تھی' اور وہاں سے غلہ مکے کو برآمد ہو سکتا تھا۔ ایک دن مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ کسی مقام پر تھا۔ اس نے ایک شخص کو مشتبہ حالت میں دیکھ کر گرفتار کر لیا اور اسے مدینہ لے آئے۔ اس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شخصاً" پہچانتے تھے۔ وہ نجد کا ایک بہت بڑا سردار ثمامہ بن اثال تھا اور ایک مرتبہ ہجرت سے پہلے مکہ بھی آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب عادت اس کو بھی تبلیغ اسلام کی تھی' تو اس نے دھمکی دی تھی کہ اے محمدؐ! چپ رہ' ورنہ میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔ اب وہی شخص گرفتار ہو کر مدینہ لایا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کہتے ہیں کہ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تو اپنی بے دینی اور

بت پرستی چھوڑ کر' اپنے بنانے والے اللہ کی عبادت کرے۔ اس نے کہا: "اے محمد: اگر تجھے فدیہ کے مال کی ضرورت ہے تو جتنا مال کہو' میں دینے کو تیار ہوں۔ میں مالدار ہوں۔ اگر تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو میں ذو دم ہوں (یہ ایک عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں خون والا) بظاہر اس کے معنی یہی معلوم ہوتے ہیں کہ میں قتل کیے جانے کا مستحق ہوں۔ میں خون بہا چکا ہوں۔ غالبا اس نے کسی مسلمان کو قتل کیا تھا۔ بہرحال اس کا جواب یہی تھا کہ جتنا فدیہ مانگتے ہو میں دینے کو تیار ہوں۔ اس پر گفتگو ختم ہو جاتی ہے' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کو مسجد میں ایک ستون کے ساتھ باندھ دو تاکہ یہ دن بھر ہماری عام زندگی کو دیکھے اور ہماری نمازوں کا مشاہدہ کرے۔ اسے کھلایا پلایا بھی جاتا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ وہ ایک آدمی دس آدمیوں کے برابر خوراک کھاتا تھا اور اسے پورا کھانا دیا جاتا تھا۔ اسے انسانی ضرورتوں کے لیے یقیناً کھولا جاتا ہو گا۔ پھر واپس لا کر اسے باندھ دیتے ہوں گے۔ پھر ہر نماز کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس سے گزرتے اور اس سے کہتے کہ اسلام لاؤ وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا۔ اگر فدیہ مانگتے ہو تو مانگو۔ جتنا کہو میں دینے کو تیار ہوں۔ مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو میں خون والا شخص ہوں' کئی دن اسی طرح گزر گئے آخر اس طرح کے جواب کو بیسیوں بار سن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فرماتے ہیں۔ "جاؤ میں تمہیں مفت چھوڑ دیتا ہوں۔" یہ اس کے لیے غیر متوقع چیز تھی۔ اس لطف اور مہربانی سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ مسجد سے نکلتا ہے' قریب ہی ایک کنویں پر جا کے غسل کرتا ہے اور واپس مسجد میں آکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہتا ہے۔ اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا" رسول الله اور اس جملے کا بھی اضافہ کرتا ہے کہ اب سے چند منٹ پہلے تک دنیا کا وہ شخص' جس سے میں سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا' تم تھے۔ لیکن اب دنیا کا وہ شخص جس سے میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کے بعد اس نے فوجی نقطہ نظر سے جو خاص بات کہی' وہ یہ تھی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ملک سے مکہ والوں کو غلہ برآمد کیا جاتا ہے۔ خدا کی قسم اب جب تک آپ مجھے اس کا حکم نہیں دیں گے۔ اس وقت تک ایک دانہ بھی غلے کا نجد سے مکہ نہیں بھیجا جائے گا۔ نجد کے غلے کی بندش سے مکہ کی غذائی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ آخر مکہ والے مجبور ہو گئے۔ ذلت کا احساس لیے ادب کے ساتھ مدینہ کو ایک وفد بھیجتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ اے محمدؐ تم ہمیشہ نیکی' مہربانی اور محبت کی تعلیم دیتے رہے ہو۔ اب اپنے ہم شہریوں اور ہم وطنوں پر رحم

کرو۔ ہم بھوک سے مرے جا رہے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فوراً ثمامہ بن اثال کو ایک خط بھجواتے ہیں کہ غلہ بھیجنے کی بندش اٹھا لی جائے۔ اس کا مکہ والوں کے دل پر اثر ہونا چاہیے تھا اور یہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد تھا' کہ ان کو اسلام کی طرف مائل کریں۔ اس کے بعد صرف اس پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ مدینہ سے پانچ سو اشرفیاں جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی مکے کے فقراء غرباء کی امداد کے لیے بھیجتے ہیں۔ قحط کے زمانے میں ہر شے کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ غریب لوگوں کے بس میں نہیں ہوتا کہ کسی چیز کو خرید سکیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانچ سو اشرفیاں مکہ کے سردار ابوسفیان کو بھیجتے ہیں کہ یہ غرباء کی امداد کے لیے بھیج رہا ہوں۔ وہ بھناتا ہے۔ اس کے الفاظ جو تاریخ میں مرقوم ہیں یہ ہیں "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو ورغلائے۔" بہرحال اس کو حالات اجازت نہیں دیتے تھے کہ رقم کو واپس کرے۔ اس کے بعد اور بھی ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کا مجموعی اثر مکہ والوں پر پڑا کہ وہ اسلام کے پیغمبر اور اسلام کو دشمن سمجھنے کی بجائے دل ہی دل میں اس پر فخر کرنے لگے کہ ان کے ہی شہر کا آدمی اب بادشاہ بن رہا ہے اور طاقت ور ہوتا جا رہا ہے مگر اس کے اظہار کی ان میں جرات نہیں تھی۔ لیکن یہ اسلام کی طرف میلان کی فطری اور اندرونی کیفیت تھی۔ اس طرح اب اگر مکہ والوں پر مسلمان حملہ کریں تو بھرپور مقابلے کا کوئی امکان نہ تھا۔ مکہ والے کیوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کریں' جب کہ وہ مصیبت کے وقت ان کی مدد کر رہا ہے؟ ان حالات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عادت کے برخلاف کہ جب کبھی کسی مقام پر جنگ کے لیے جاتے تو اسے مخفی رکھتے کہ دشمن کو پتا نہ چلے' لیکن اب کھلم کھلا اعلان فرماتے ہیں اور اس کی اطلاع بھجواتے ہیں کہ میں مکہ جا رہا ہوں البتہ حج کو نہیں عمرے کے لیے کہ حج سے ایک مہینہ پہلے اشہر حرم میں وہاں جاؤں گا' تاکہ کوئی اور دشواریاں وہاں پیدا نہ ہوں۔ راستے میں اطلاع ملی کہ قریش کا ایک حلیف قبیلہ احابیش جنگ کی تیاری کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ مکے جا کر مکے والوں کا ساتھ دے اور اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکے پر حملہ کریں تو وہ اپنے حلیفوں کی مدد کرے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فوجی مشاورتی مجلس طلب فرماتے ہیں کہ اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم پہلے اس قبیلے پر حملہ کریں' اسے لوٹیں اور اسے شکست دے کر نیست و نابود کر دیں تاکہ دشمن اس کی مدد حاصل نہ کر سکے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہم حج کا اعلان کر چکے ہیں لہٰذا ہمیں چاہیے کہ جنگ

نہ کریں۔ خدا ہماری مدد کرے گا۔ اس رائے کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرماتے ہیں اور مکہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ مکہ کی جغرافیائی صورتحال یہ ہے کہ جدہ سے تھوڑی دور تک کھلے میدان ہیں اس کے بعد آگے مکہ تک بلند پہاڑ' تنگ درے اور پہاڑوں کے درمیان راستے پائے جاتے ہیں۔ جس مقام پر اہم قدرتی دشواریاں شروع ہو رہی تھیں' اس مقام کا نام حدیبیہ ہے۔ اسے آج کل "شمیسی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسلمان حدیبیہ پہنچتے ہیں۔ ایک چھوٹی سے چیز یاد آئی جو فوجی نقطہ نظر سے دلچسپ ہے۔ جب مدینہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تو عمرہ کرنے کا مقصد واضح تھا' سپاہیوں سے کہا کہ ساتھ ہتھیار نہ لیں سوائے اس ہتھیار کے جسے حالت امن میں ہر شخص اپنے ساتھ رکھتا ہے' یعنی ایک تلوار۔ وہ جنگ کے لیے نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف حفاظتی تدبیر کے طور پر رکھی جاتی ہے۔ لیکن تھوڑی دور پہنچنے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا کہ ہم دشمن کے ملک میں جا رہے ہیں۔ ہم جنگ کا آغاز نہیں کریں گے لیکن اگر دشمن آغاز کرے تو کیا ہو گا؟ آخر مشورے کے بعد طے پایا کہ مدینے سے فوجی سازوسامان کا ذخیرہ منگوا لیا جائے جو بند فوج کے ہمراہ رہے۔ ضرورت پر اس سے کام لیا جائے گا۔ ورنہ وہ بند رہے گا۔ بہر حال حدیبیہ پہنچتے ہیں اور اپنا ایک سفیر مکہ بھیجتے ہیں تاکہ مکہ والوں کو اطمینان دلائے کہ ہم جنگ کرنے نہیں آئے بلکہ صرف عمرہ کے لیے' تمہاری عبادت گاہ کی زیارت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس وقت تک کعبہ پر مسلمانوں کا قبضہ نہیں تھا۔ بلکہ بت پرستی کا مرکز تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مقصد کے لیے بھیجے گئے ایک چھوٹی سی چیز اور عرض کروں کہ اولاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجنا چاہا۔ جیسا کہ میں نے اس سے پہلے کے لیکچر میں کہا تھا کہ مکہ کی شہری مملکت کا دستور تھا کہ ہر کام کے لیے یا ایک وزیر یا عہدیدار تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ میں سفارت کے کام انجام دینے والے یعنی وزیر خارجہ تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال تھا کہ مکہ کے جو وزیر مسلمان ہو چکے ہیں ان کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھا جائے۔ اس لحاظ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلامی حکومت کے وزیر خارجہ تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ وزیر خارجہ کو بطور سفیر کے مکہ سے گفت و شنید کے لیے بھیجا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرض کرتے ہیں کہ مکہ والے میری جان کے دشمن ہیں اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ میرے جاتے ہی وہ مجھے جان سے مار دیں۔ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں ان کا سب سے سخت

دشمن رہا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا جائے کیونکہ بنی امیہ کے لوگ اب تک مکہ ہی میں ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنی امیہ کے آدمی ہیں۔ غالباً ان کے ساتھ وہ نسبتاً نرم سلوک کریں گے۔ یہ رائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند آتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجتے ہیں لیکن انھیں وہاں قید کر دیا جاتا ہے۔ اور خبر پھیلتی ہے کہ انھیں قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ اطلاع مسلمانوں کے کیمپ میں آتی ہے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مجبور ہو کر جنگ کا انتظام فرماتے ہیں اور سارے مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ آئے تو ہم عمرہ کرنے کے لیے تھے، لیکن دشمن نے ہمارے سفیر کو قتل کر دیا ہے۔ اس کا انتقام لینے کے لیے ہمیں جنگ کرنی پڑے گی۔ لہٰذا بیعت کرو کہ جان کے نکلنے اور آخری قطرہ خون جسم میں رہنے تک ہم دشمن سے جنگ کریں گے۔ یہ "بیعت رضوان" ہے۔ جس درخت کے نیچے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب لوگوں سے بیعت لی تھی، وہ درخت اتنا مقدس ہو گیا کہ قرآن میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ اذیبا یعونک تحت الشجرہ.... (۴۸ : ۱۸) یہاں ایک بات ضمناً عرض کرتا ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں میں وہ درخت بے حد مقدس بن گیا۔ لوگ بیمار ہوتے تو اکثر وہاں جاتے، اس درخت کے سائے میں بیٹھتے اور تندرست ہو جاتے، کم از کم مشہور یہی ہوا۔ نتیجہ یہ تھا کہ بے شمار لوگ اس درخت کی تقریباً پوجا کرنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آتا ہے تو وہ درخت کٹوا کر غائب کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے۔ نہ کہ اس کی بنائی ہوئی مخلوق، ایک درخت سے، چاہے وہ کتنا ہی مقدس کیوں نہ ہو۔ یہ تھی اسلامی توحید پرستی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار مبارکہ سے بھی اگر اسلام کے اس بنیادی عقیدے کی خلاف ورزی ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے تو اسے دور کر دیا جاتا ہے۔ بہرحال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سارے مسلمانوں سے، جو فوج میں تھے بیعت لیتے ہیں کہ ہم دشمن سے جنگ کریں گے۔ اس کی اطلاع اہل مکہ کو ہوتی ہے تو وہ گھبراتے ہیں۔ پہلے ایک شخص کو بھیجتے ہیں جو مکہ کا نہیں تھا بلکہ اس قبیلے کا آدمی تھا جو مکہ والوں کا حلیف تھا۔ وہ مکہ والوں کی طرف سے بطور سفیر کے مسلمانوں کے کیمپ میں آیا۔ ایک اجڈ بدوی ہونے کے باوجود وہ عقل مند تھا۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوج کے لوگوں کو حکم دیا کہ اس شخص کو وہ جانور دکھاؤ جو ہم قربانی کے لیے ساتھ لائے ہیں تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ ہم جنگ کے لیے نہیں آئے بلکہ ایک پر امن مقصد یعنی عمرہ ادا کرنے کے لیے

آئے ہیں شاید آپ کو معلوم ہو گا کہ اس زمانے میں قربانی کے جانوروں کو مختلف ذرائع سے نمایاں کیا جاتا تھا۔ مثلاً ان کے گلے میں جوتیوں وغیرہ کا ہار ڈالتے تھے۔ ان کے کانوں کو کچھ زخمی کر دیتے تھے۔ جس سے خون بہتا۔ اس وقت تک یہ رواج مسلمانوں میں بھی تھا۔ ایسے جانور جب اس سفیر نے دیکھے تو بغیر کسی مزید گفتگو کے واپس جاتا ہے اور مکہ والوں سے کہتا ہے کہ مسلمانوں سے جنگ نہ کرو' ورنہ میں تمھیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا' کیونکہ وہ صرف عمرہ کے لیے آئے ہیں۔ اس دھمکی کا بھی اثر پڑا۔ بالاخر مکہ والے ایک اور شخص کو روانہ کرتے ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بردار نسبتی ہے: یہ سہیل بن عمرو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا چچا زاد بھائی تھا' وہ ایک عقلمند اور سنجیدہ شخص تھا' وہ گفت و شنید کرتا ہے۔ بالاخر صلح کی شرطیں طے ہو جاتی ہیں۔ وہ شرطیں مسلمانوں کے بظاہر خلاف تھیں مثلاً یہ کہا گیا تھا کہ آئندہ دس سال تک صلح کی حالت رہے گی۔ لیکن اس اثناء میں اگر کوئی مدینے کا مسلمان اپنا شہر چھوڑ کر مکہ آئے تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی مکی شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے اور ہم مطالبہ کریں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اسے واپس کریں۔ اس طرح کی کچھ شرائط تھیں جو بظاہر مسلمانوں کے لیے توہین آمیز اور ان کی کمزوری دکھانے والی تھیں۔ اس کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں قبول کرتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں فرمایا تھا کہ میں اس وقت صلح کی غرض سے آیا ہوں' اس لیے مکہ والے مجھ سے جو بھی مانگیں گے وہ دینے کے لیے تیار ہوں۔ ہمارے مشہور فقیہ شمس الائمہ سرخسی اپنی دو کتابوں میں ایک اہم چیز کا ذکر کرتے ہیں جو میں نے سیرت النبی کی کتابوں میں بھی نہیں پڑھی تھی' وہ لکھتے ہیں کہ جغرافیہ پر نظر ڈالو خیبر مدینے کے شمال میں ہے' مکہ مدینے کے جنوب میں' مدینہ دو دشمنوں کے درمیان ہے۔ خیبر سے بھی مسلمانوں کی جنگ ہے۔ مکہ سے بھی مسلمانوں کی جنگ ہے' اور خیبر و مکہ میں معاہدہ ہے کہ اگر مسلمان ایک فریق کی طرف بڑھیں تو دوسرا فریق مدینہ پر حملہ کرے۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کو جاتے ہیں تو اہل مکہ مدینے پر چڑھ دوڑیں اور اسے لوٹ لیں گے۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف جاتے ہیں تو خیبر والے مدینے کو کھلا پا کر اس پر حملہ کریں گے' ان حالات میں ایک ذہین سیاستدان اور ایک صاحب فراست کمانڈر کی حیثیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طے فرمایا کہ دونوں میں سے ایک فریق سے صلح کر لی جائے اور اس کو اپنے ساتھی سے الگ کر دیا جائے۔ جب

سد اور حجاز ریلوے جانیوالی سڑک
سطح مرتفع لابہ
وادی خیبر
قصر مرحب
جدید شہر
باغات اور بے شمار نخلستان
سطح مرتفع لابہ
یہودی آبادی کے کھنڈرات
مدینہ اور سد العید اور باقی دوسرے شہروں
کی طرف جانے کا کچا راستہ
نقشہ خیبر
یہ نقشہ مصنف کے لیے جناب کے ایس ٹوچیل نے ۱۹۵۰ء
میں تیار کیا تھا ان کا تعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کنیکٹی
کٹ سے ہے اس نقشے کے بارے میں ان کا کہنا تھا یہ
نقشہ انتہائی تخمینی نوعیت کا ہے۔ دراصل یہ اس سفر کی
یادداشت پر مبنی ہے جو میں نے ۱۹۴۰ء میں اس علاقے میں کیا تھا

ایک فریق تنہا ہو جائے گا تو زیادہ آسانی سے اس سے ہم نپٹ سکیں گے' ان حالات میں آپ یہ طے کر کے تشریف لاتے ہیں کہ فریق مخالف جو شرائط بھی کہتا ہے ہم منظور کریں گے۔ یہاں انتخاب کا سوال ہے۔ کیا خیبر والوں سے صلح کریں یا مکہ والوں سے؟ خیبر والوں سے صلح کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بنی النضیر کے یہودیوں کو مدینے سے نکالا گیا تھا۔ ان کی اولین شرط یہ ہوتی کہ انھیں واپس مدینے آنے دیا جائے۔ وہ مالدار تھے۔ انھیں کچھ رقم پیش کی جاتی تو ان کے لیے اس میں کوئی کشش نہیں تھی۔ اس کے برخلاف مکہ والے' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کے قریبی رشتہ دار تھے۔ کوئی کسی کا بھائی کوئی بھتیجا' کوئی چچا' غرضیکہ سب ان کے رشتہ دار تھے۔ لہٰذا ان رشتہ داروں کو بچانا زیادہ مناسب تھا' بہ نسبت اس کے کہ یہود کو بچا کر مکہ والوں پر حملہ کریں اور انھیں ختم کریں۔ علاوہ ازیں مکہ والے پہلے کی تین جنگوں بدر' احد اور خندق میں شکست کھا کر مجبور ہو چکے تھے۔ ان کی مالی حالت خراب ہو چکی تھی۔ تجارت کی کساد بازاری تھی۔ لہٰذا وہ زیادہ آسانی کے ساتھ مسلمانوں سے صلح کرنے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔ میں ان کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ بہرحال مختلف وجوہ سے مکہ والے مسلمانوں سے صلح کرنے کے لیے دل سے آمادہ تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بھی کوشش رہی تھی کہ قحط کے زمانے میں مکے والوں کا دل موہ لیا جائے۔ ان سب وجوہ سے انھوں نے ایک شرط تو اپنی بڑائی دکھانے کے لیے لگائی تاکہ دنیا سے کہہ سکیں کہ ہم نے دب کر صلح نہیں کی' باقی سب شرطیں قبول کر لیں۔ ان شرائط کا مطالعہ کریں تو ان میں ایک شرط نظر آتی ہے جو آدھی سطر میں لا اسلال ولا اغلال اس کے کیا معنی ہیں۔ لفظی معنی یہ ہیں کہ نہ ہتھیار کو اس کے میان سے نکالا جائے گا' نہ دھوکا بازی کی جائے گی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اہل مکہ اور مسلمان اب وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے پر حملہ اور جنگ نہیں کریں گے اور چھپ کر بھی دغا بازی سے اس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں مکہ والوں کا یہ وعدہ تھا کہ اگر مسلمانوں کی جنگ کسی تیسرے فریق سے ہو تو وہ غیر جانبدار رہیں گے۔ مسلمانوں کے خلاف غداری اور دغا بازی نہیں کریں گے۔ اپنی اس واحد شرط پر رسول اللہؐ دشمن کی ساری شرائط کو قبول کرتے ہیں' یہ بھی کہ دس سال تک ان میں صلح رہے گی' یہ بھی کہ مکہ کے تجارتی قافلے مدینے سے گزر سکیں گے۔ ان کی ساری شرائط قبول کی جاتی ہیں' صرف اس شرط پر کہ وہ آئندہ مسلمانوں کی جنگ میں غیر جانبدار رہیں گے۔ یہ شرطیں طے ہو گئیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے مکہ

جانے کے دل شکستہ مسلمانوں کو حکم دیا کہ ہم حدیبیہ میں ہی اپنا عمرہ کر لیں۔ وہ روئے دھوئے مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔ بہرحال وہ اس کو انجام دیتے ہیں اور پھر مدینہ واپس ہو جاتے ہیں۔ مدینہ پہنچنے کے دو ہفتے بعد خیبر پر حملہ کیا جاتا ہے اور خیبر پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ گویا دو دشمنوں میں سے ایک مغلوب ہو جاتا ہے۔ فتح خیبر کے سلسلے میں وقت کی کمی کی وجہ سے زیادہ تفصیلات نہیں بتا سکوں گا۔ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی فوج میں چودہ سو سپاہی تھے اور ہمارے مؤرخوں کے بیان کے مطابق خیبر میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے۔ چودہ سو نے بیس ہزار سے مقابلہ کیا اور ان کے علاقے پر دو چار دن میں قبضہ کر لیا۔ اس طرح اس خطرے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ مکہ والوں سے حدیبیہ میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ ان دو فریقوں کے علاوہ جو قبیلہ چاہے معاہدے میں ذیلی طور پر شریک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جس احابیش نامی قبیلے کا ابھی تھوڑی دیر پہلے ذکر کیا گیا کہ وہ مکہ والوں کا حلیف تھا' اس نے کہا کہ ہم مکہ والوں کی طرف سے انہی شرائط پر اس معاہدے میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک اور قبیلہ خزاعہ تھا' اس نے کہا ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس معاہدہ صلح میں شریک ہوتے ہیں۔ ان دونوں قبیلوں کی آپس میں لڑائی تھی۔ شروع میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ لیکن ایک دن کہتے ہیں کہ قبیلہ خزاعہ اور احابیش یعنی بنو کنانہ میں ایک بات پر جھگڑا ہو گیا۔ کسی شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی اسے قبیلہ خزاعہ کے لوگ برداشت نہ کر سکے اور اس شخص کو قتل کر دیا۔ اس قتل کے جواب میں ان لوگوں پر حملہ کیا گیا اور ان کے دو چار آدمی قتل ہو گئے۔ یہ واقعہ مقامی واقعہ بن کر رہ جاتا' اگر ایک دوسرا واقعہ پیش نہ آتا: مکہ والوں کو اطلاع ملی کہ بنو کنانہ جو ان کے حلیف ہیں' ان میں اور خزاعہ میں' جو مسلمانوں کے حلیف ہیں جنگ چھڑ گئی ہے' تو وہ چھپ کر' بھیس بدل کر اور نقاب ڈال کر آتے ہیں' اور خزاعہ والوں پر حملہ کر کے قتل و غارت گری کرتے ہیں۔ اس کی جو اطلاع خزاعہ والے مدینہ پہنچاتے ہیں اس کا ایک لفظ دلچسپ ہے کہ "جس وقت ہم سجدہ اور رکوع کی حالت میں تھے ان لوگوں نے ہم پر حملہ کیا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خزاعہ میں بہت سارے مسلمان تھے۔ مسلمانوں کا ہاتھ کھل گیا تھا۔ اب وہ مکہ والوں پر حملہ کر سکتے تھے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں چاہتے تھے کہ پھر جنگ کریں۔ خزاعہ کے وفد سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: دیکھو یہ سامنے بادل جا رہا ہے اس کی گڑگڑاہٹ تم نے ابھی سنی۔ وہ تمہاری فتح کی خبر سنا رہا ہے۔ ایک بہت ہی خاص انداز میں ان کی دل جوئی بھی کرتے ہیں کہ

تمھیں فتح ہو گی اور کوئی چیز نہیں بتاتے کہ کیا ہو گا۔ وفد خوش اور مطمئن ہو کر واپس جاتا ہے۔ وہ توقع کرتے ہیں کہ جلد ہی مسلمان مکہ والوں پر حملہ کریں گے۔ مدینہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سارے مقامات پر جو گویا شہر کے دروازے تھے' جہاں سے لوگ گزرتے تھے وہاں ناکہ بندی کے لیے چوکیاں قائم کرتے ہیں تاکہ کوئی شخص باہر کا نہ اندر آئے اور نہ اندر کا باہر جائے۔ ورنہ ان سے یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ مدینہ کی تیاریوں کی اطلاع مکہ والوں تک نہ پہنچا دیں۔ دوسری چیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں یہ کی کہ لوگوں سے کہا کہ ایک بڑی مہم درپیش ہے' اس کے لیے تیاریاں کرو۔ کسی کو نہیں بتایا کہ کہاں کا ارادہ تھا۔ اس راز داری کی حد یہ ہے کہ ایک دن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آتے ہیں اور اپنی بیٹی حضرت عائشہ سے پوچھتے ہیں کہ بیٹی' تیاری تو بڑی جنگ کی ہو رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں جانے والے ہیں؟ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں۔ کہتی ہیں : ابا جان مجھے معلوم نہیں۔ ممکن ہے شام کو جا رہے ہوں۔ ممکن ہے کہیں اور جا رہے ہوں' کچھ معلوم نہیں مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعتماد تھا۔ اتنے میں آپ تشریف لاتے ہیں اور گفتگو کے الفاظ سن کر کہتے ہیں مکہ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن اسے راز میں رکھنا اس کے بعد ایک تدبیر اختیار کرتے ہیں' جس کے بارے میں فوجی ماہرین ہی بتائیں گے کہ وہ کتنی مؤثر اور کتنی اہم تدبیر تھی۔

۲۳۸۔ مسلمانوں کے بہت سے حلیف تھے۔ جنگ کے موقع پر ہر حلیف ایک جماعت جو رضاکاروں پر مشتمل ہوتی تھی' بھیجتا تھا۔ عام طور پر وہ لوگ مدینے آتے اور مدینے سے ساری اسلامی فوج' مدینے کے سپاہی بھی اور باہر سے آئے ہوئے قبائل کے سپاہی بھی' منزل مقصود کو روانہ ہوتے تھے۔ اس دفعہ یہ نہیں کیا گیا۔ راز داری سے حلیف قبائل کو ایک اطلاع بھیجی گئی کہ تمھارا سردار مدینے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ آتے ہیں۔ ہر ایک سے فرداً" فرداً" علیحدہ راز داری سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ انھیں یہ نہیں بتاتے کہ کہاں کے لیے تیار ہونا ہے۔ بس اس طرح تیار رہنے کا حکم دیتے ہیں کہ ایک منٹ کے نوٹس پر تم ہمارے ساتھ چل پڑو۔ مدینہ نہ آنا۔ ہم تمھارے علاقے سے گزریں گے تو تمھاری فوج کو اپنے ساتھ لے لیں گے۔

۲۳۹۔ بہت سے لوگ تیار ہوئے تھے مگر کسی کو کچھ پتا نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کہاں جا رہے ہیں۔ ایک بہت بڑے صحابی شاید حذیفہ بن یمان ہیں۔ ان کی حدیث بخاری میں ہے' کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے نکلتے ہیں۔ تو مکہ جو جنوب میں ہے' اس طرف نہیں جاتے بلکہ شمال کی طرف جاتے ہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ شاید بیز نطینیوں سے جنگ کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ وہاں کے قبیلے کے لوگوں کو لے کر شمال مشرق کو جاتے ہیں۔ پھر جنوب مشرق کو۔ اس طرح Zig Zag رخ بدل بدل کر سفر کرتے ہیں کہ کسی کو پتا نہیں چلتا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ صحابی کہتے ہیں کہ مکہ کی پہاڑیوں کے دامن میں جو آخری قیام تھا وہاں پہنچنے تک ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

۲۴۰۔ مسلمانوں کی دس ہزار فوج اس زمانے کے لحاظ سے ایک عظیم الشان تعداد تھی جو چھپ کر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اس کی اطلاع مکہ والوں کو نہیں ہوتی۔ جب عام طور پر مسلمان سفر کرتے تو کئی کئی سپاہی مشترکہ طور پر پکوان کرتے۔ مگر اس دن حکم دیا جاتا ہے کہ مشترکہ چولھے نہ جلائیں۔ چار چار پانچ پانچ سپاہی مل کر غذا تیار کرنے کی بجائے ہر شخص الگ الگ آگ جلائے : اس طرح دس ہزار فوج میں دو ہزار چولھوں کی بجائے دس ہزار چولھے جلتے ہیں۔ ابوسفیان مکہ کا سردار ہے۔ وہ توقع کر رہا ہے کہ مسلمان حملہ کریں گے۔ اس کے دل میں چور ہے کیونکہ وہ عہد شکنی کر چکا ہے۔ وہ روزانہ رات کو شہر مکہ کی پہاڑی پر چڑھ کر ادھر ادھر نگاہ ڈالتا ہے کہ دشمن اگر آ رہا ہو تو دور ہی سے اس کی اطلاع ہو جائے۔ اس نے دیکھا کہ دس ہزار چولھے جل رہے ہیں یعنی لگ بھگ پچاس ہزار فوج آئی ہوئی ہے۔ وہ پہاڑی سے کیمپ کی طرف اترتا ہے۔ چوری سے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا ہے' تاکہ "اتفاقاً" کوئی شخص مل جائے تو پتہ چلے کہ یہ کون ہیں؟ مسلمانوں کی فوج کا قاعدہ تھا کہ قیام کرنے کے بعد کچھ سپاہی گشت کرتے تھے کہ اگر کوئی دشمن چھپ کر حملہ کر رہا ہو تو اس کا سدباب کیا جا سکے۔ ایسے ایک دستے کے ہاتھ ابوسفیان گرفتار ہوتا ہے وہ شہر مکہ کا بادشاہ اور سپہ سالار ہے۔ مکہ والوں کو کوئی اطلاع نہیں ہے کہ دشمن آیا ہے۔ اسے گرفتار کر کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لاتے ہیں۔ تفصیلات میں گئے بغیر میں یہ کہوں گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ اس کو بہت اچھے برتاؤ کے ساتھ اپنے پاس رکھو۔ لیکن جانے نہ دو۔ بلکہ اس کی حفاظت کرو۔ صبح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے ہیں کہ فوج شہر میں داخل ہو جائے۔ آپ خیال فرمائیں کہ شہر مکہ کو مسلمانوں کے حملے کی اطلاع نہیں' شہر مکہ کا سردار بھی موجود نہیں۔ سردار اگر ہوتا تو وہی حکم دے سکتا کہ مکہ والے

فوری طور پر کیا انتظامات کریں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فوج کے ایک سپاہی کو حکم دیتے ہیں کہ ابوسفیان کو فلاں مقام پر اپنے سامنے لیے کھڑے رہو' تاکہ وہ دیکھے کہ مسلمانوں کی فوج کتنی بڑی ہے۔ دس ہزار کی فوج گزرتی ہے۔ ہر گروہ کے گزرنے پر اسے بتایا جاتا ہے کہ یہ فلاں قبیلہ ہے۔ بالاخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی سواری وہاں پہنچتی ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے' اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ کہتا ہے' تیرا بھتیجا تو واقعی بادشاہ بن گیا۔ اس کی اتنی بڑی قوت ہے کہ قیصر روم بھی اس سے ڈرنے لگا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب گزرتے ہیں تو حکم دیتے ہیں کہ ابوسفیان کو چھوڑ دو۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب بات تھی۔ ابوسفیان ان حالات میں فیصلہ کرتا ہے کہ جنگ بے کار ہے کیونکہ مسلمانوں کی فوج شہر میں داخل ہو چکی ہے۔ اگر میں حکم بھی دوں کہ مسلمانوں سے جنگ کی جائے تو اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اور پھر جو فوج شہر میں داخل ہو رہی تھی اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلا چلا کر گلی گلی میں یہ کہنا شروع کیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے وہ امن میں رہے گا۔ جو اپنے گھر کے اندر رہے' گلیوں میں نہ آئے' امن میں رہے گا۔ جو شخص خانہ کعبہ کے صحن میں چلا جائے گا۔ وہ امن میں رہے گا' اور جو شخص ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے گا' وہ بھی امن میں رہے گا۔ اس سے لوگوں کو خیال ہوا ہو گا کہ شاید ابوسفیان بھی مسلمان ہو گیا ہے۔ ان حالات میں ابوسفیان اپنے مکان میں آتا ہے۔ اس کی بیوی جو رات بھر اس کے انتظار میں رہی تھی' اس کو وہ بتاتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دس ہزار فوج کے ساتھ آیا ہے' ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ اس کی داڑھی پکڑ کر طمانچہ مارتی ہے کہ یہ تیری بزدلی ہے۔ کچھ اس طرح کے واقعات وہاں پیش آئے۔ شہر میں داخلے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کو ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے بھیجتے ہیں' وہ اعلان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مکہ والوں کو چاہیے کہ خانہ کعبہ کے صحن کے اندر جمع ہو جائیں۔ لوگ آئے۔ دلوں میں دہشت تھی کہ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ غالباً ظہر کی نماز کا وقت تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال کو حکم دیتے ہیں کہ اذان دو۔ اس دن وہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان شروع کرتے ہیں اور کڑک کر اشھد ان محمدا" رسول اللہ" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ حاضرین میں بہت سے مکہ کے غیر مسلم مشرکین موجود ہیں۔ ایک شخص جس کا نام عتاب بن اسید ہے اور جو بڑا سخت اسلام دشمن ہے وہاں موجود ہے۔ یہ آواز سن

کر اپنے دوست سے جو پاس بیٹھا ہوا ہے کانا پھوسی کر کے کہتا ہے: "شکر ہے کہ میرا باپ مر چکا ہے، ورنہ وہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک کالا گدھا خانہ کعبہ پر چڑھ کر اللہ تعالیٰ کے گھر پر ہینگے۔" اذان کے بعد نماز ہوتی ہے۔ نماز کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ والوں سے مخاطب ہو کر پوچھتے ہیں کہ تم مجھ سے کیا توقع کرتے ہو؟ انھیں بیس سالہ ظلم، فتنہ انگیزی اور فساد یاد آتے ہیں اور وہ شرم سے سر جھکا لیتے ہیں اور سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آپ شریف ہیں، شریف زادہ ہیں۔ اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کو تاریخ عالم میں لافانی و لاثانی کہنا چاہیے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: "تم پر اب کوئی مواخذہ کوئی ذمہ داری نہیں، جاؤ تم سب کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔" قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس کے فوری اثرات بتا دوں۔ ایک چھوٹی سی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہوں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو حکم دے سکتے تھے کہ سارے مکہ والوں کا قتل عام کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کے وسائل موجود تھے۔ شہر پر قبضہ ہو چکا تھا۔ فوج موجود تھی۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی جاسکتی تھی اور یہ لوگ اس کے مستحق بھی تھے۔ یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بجا طور پر کر سکتے تھے کہ سب کو غلام بنا لینے کا حکم دیتے یا کم از کم یہ حکم دیتے کہ ان کا سارا مال لوٹ لیا جائے۔ کہا تو یہ کہا کہ جاؤ! تم پر کوئی ذمہ داری نہیں، تم سب آزاد ہو۔ عتاب بن اسید ابھی دو منٹ پہلے کہہ رہا تھا کہ کالا گدھا خانہ کعبہ پر ہینگ رہا ہے وہ خود کو تحمل کرنے کے قابل نہیں پاتا یکایک اچھل پڑتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر کہتا ہے "میں عتاب بن اسید ہوں۔" اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھدان محمدا" رسول اللہ عتاب کے اسلام کو سنتے ہی رسول اکرم نے فرمایا: اے عتاب میں تمھیں مکہ کا گورنر مقرر کرتا ہوں۔ ایک منٹ پہلے کے جانی دشمن کو مختار کل گورنر بناتے ہیں اور نو مفتوحہ مکہ میں ایک مدنی سپاہی بھی چھوڑے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس ہو جاتے ہیں اور اس پر پچھتانا نہیں پڑتا۔ یہ واحد مثال نہیں تھی۔ راتوں رات شہر مکہ کی کایا پلٹ جاتی ہے اور سارا مکہ مسلمان ہو جاتا ہے، اور مسلمان بھی ایسا راسخ العقیدہ کہ دو سال بعد جب ملک کے بعض قبائل میں ارتداد کی کیفیت ہوئی تو سب سے مستحکم ایمان رکھنے والے لوگوں میں مکے والے بھی تھے۔

۲۴۱۔ ایک چھوٹی سی چیز پر اس قصے کو ختم کرتا ہوں اور وہ مکہ کی فتح کے بعد ابوسفیان کی بیوی کا ایمان لانا ہے۔ اس کا نام ہند تھا۔ ہند وہ عورت تھی جس کا بیٹا، بھائی اور چچا جنگ بدر میں

مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے چنانچہ جنگ احد میں اس نے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پیٹ چیر کر، کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔ جب مسلمانوں کا مکہ پر قبضہ ہو گیا تو اس کے گھر میں ایک عجیب سین نظر آتا ہے۔ وہ ایک لٹھ لے کر گھر میں جو مختلف بت تھے ان کو مار مار کر پاش پاش کرنے لگتی ہے۔ اور کہنے لگی کہ اب تک تم ہمیں دھوکہ دیتے رہے، اب معلوم ہوا کہ تمہارے پاس کوئی قوت نہیں۔ چنانچہ سارے بت اس نے توڑ دیے اس کے بعد اسے خوف تھا کہ شاید حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاش کی بے حرمتی کرنے کی وجہ سے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھیں گے تو مجھے سزا دیں گے۔ اس لیے چہرے پر نقاب ڈال کر، چھپ کر، عورتوں کے ایک گروہ کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پہنچتی ہے اور وہاں اپنے اسلام لانے کا اعلان کرتی ہے جس طرح اور عورتیں کر رہی تھیں، عورتوں سے اجتماعی طور پر جو بیعت کی گئی اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ وعدہ کرو کہ تم ایک اللہ کو مانو گی، بت پرستی اور شرک نہیں کرو گی۔ ہند نے باآواز بلند کہا ہم اب تک دھوکے میں تھے۔ اب ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ ان بتوں میں کوئی طاقت و قوت نہیں ہے۔ ہم ایک اللہ کو مانتے ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے کہا کہ عورتوں کو چاہیے کہ بدکاری نہ کریں۔ وہ بڑے فخر و غرور کے ساتھ کہتی ہیں کہ کیا کوئی شریف عورت ایسا کر بھی سکتی ہے؟ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان عورتوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم آئندہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو زندہ دفن کر کے قتل نہ کرو گی۔ اس وقت ہند کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ دلچسپ ہیں اس نے کہا "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جن بچوں کو ہم نے پرورش کر کے بڑھایا جوان کیا آپ ہی نے ان کو قتل کر دیا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے ہیں۔ پوچھتے ہیں، کون عورت ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ہند ہے۔ اس طرح یہ سین ختم ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات کو سمجھ کر صحیح وقت پر ضرب لگانے میں جو فائدہ ہوتا ہے، وہ بے وقت نرمی یا سختی دکھانے سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں شہر مکہ کی فتح عمل میں آئی اور ہم نے دیکھا کہ فوج کو دشمن کے ملک کی طرف اس طرح بڑھایا گیا کہ اس کی خبر دشمن کو آخری لمحے تک نہ ہو سکی اور ایک بڑے شہر پر اس طرح قبضہ کیا کہ ایک قطرہ خون بھی نہ بہا۔

۲۴۲۔ ایک اور پہلو پر مجھے کچھ روشنی ڈالنی چاہیے۔ فوجی تیاریوں کے سلسلے میں کیا انتظامات

ہوتے ہیں اور جنگ میں کس طرح سے مختلف کام انجام پاتے ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جنگ میں نرسنگ کے لیے۔ کھانا پکانے کے لیے' قبریں کھود کر مردوں کو دفن کرنے کے لیے' غرض ایسے بہت سے کاموں کے لیے ابتدا ہی سے مسلمانوں کی فوج میں عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات نو عمر لڑکیاں اور نابالغ لڑکیاں بھی اس میں حصہ لیتی ہیں۔ تفصیلات کا وقت نہیں۔ دو ایک چیزیں آپ سے بیان کروں گا' وہ یہ کہ مسلمانوں کو ایک مستقل فوج (Standing Army) رکھنے کا شروع میں کوئی خیال نہیں تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ جہاد کرنا مسلمانوں کا فریضہ ہے' جس طرح نماز پڑھنا ایک فریضہ ہے' اسی طرح جنگ میں حصہ لینا مسلمانوں کا ایک فریضہ ہے۔ جو لوگ مسلمان تھے وہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ سارا ملک اور ملک کے سارے بالغ مرد Potential Army تھے۔ جس وقت' جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو' ان میں سے لے لیتے۔ اس طرح مسلمانوں کو ایک مستقل فوج تیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بہرحال لوگوں کو فوجی تربیت کے لیے مختلف انتظامات کیے جاتے تھے۔ تفصیلات میں جا نہیں سکتا۔ صرف یہ عرض کروں گا کہ فوج کو حالت امن میں جنگی کاموں کے لیے تیار کیا جاتا۔ گھڑ دوڑ کرائی جاتی' اونٹوں کی دوڑ ہوتی تھی' گدھوں کی دوڑ ہوتی تھی' آدمیوں کی دوڑ ہوتی تھی' کشتیوں کے مقابلے کرائے جاتے تھے۔ اسی طرح تیر اندازی کی بہت ترغیب دی جاتی۔ اس پر انعامات دیے جاتے۔ گھڑ دوڑ میں جیتنے والوں کو انعام دیا جاتا۔ غرض فوج حالت امن میں بھی تن دھن قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مسلمانوں کی فوجی تیاریاں ان کے جذبہ ایمانی پر مبنی تھیں۔ اس لیے مٹھی بھر آدمی ہمیشہ تگنے' چوگنے' دس گنے دشمن سے بھی مقابلہ کرتے تھے اور کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ دشمن کی اتنی تعداد ہے' ہم کیا کریں گے۔ وہ جان پر کھیل جاتے تھے اور خدا انھیں فتح دیتا تھا۔

۲۴۳۔ ایک آخری چیز پر اسے ختم کرتا ہوں جو میرے ذہن میں آئی ہے۔ جنگ کے دوران سپہ سالار کو مختلف صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹا سا واقعہ لکھا ہے۔ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مقام پر حملہ کرتے اور علی الصبح طلوع آفتاب کے وقت جنگ کا آغاز ہوتا تو اس کا ہمیشہ لحاظ رکھتے کہ آفتاب ہماری آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ دشمن تمازت آفتاب سے متاثر ہو اور آفتاب ہمارے پیچھے ہو تاکہ جنگ کے وقت آفتاب کی روشنی سے چندھیا کر دشمن سے مقابلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ ایک دوسری چیز یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "موسمیات" (Meteorology) سے بھی دلچسپی تھی۔ ہواؤں کے رخ کا خاص لحاظ فرماتے کہ دشمن سے جنگ ہو تو ایسے مقام پر ہو کہ ہوا ہمارے پیچھے سے چل رہی ہو' نہ کہ ہمارے سامنے سے آئے اور ہماری رفتار میں رکاوٹ پیدا کرے۔ اس طرح کی بے شمار چیزیں حدیث و سیرت کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اس سے انداز ہوتا ہے کہ وہ حدیث جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انا نبی الرحمنه وانا نبی الملحمنه یعنی میں رحمت کا بھی نبی ہوں اور جنگ کا بھی نبی ہوں۔ جس کا بعد میں دنیا کے بہترین سپہ سالار کی حیثیت سے مظاہرہ بھی ہوتا ہے اور اس طرح بہترین سیاستدان اور بہترین مدبر کی حیثیت سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقصد کا حصول چاہتے تھے۔ آدمی کا خون بہانا یا دشمن کا خاتمہ کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر نہیں تھا۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

۲۴۴۔ کچھ سوالات جو آپ کی طرف سے آئے ہیں' ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال ا۔ موجودہ دور کے ترقی پسند مسلمانوں کے نقطہ نظر سے جس موسیقی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے' کیا یہ موسیقی اسلام میں جائز ہے؟

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس لیکچر میں وضاحت کر دی تھی کہ جس موسیقی سے فحش کاری کی طرف میلان نہیں ہوتا' جس موسیقی سے ہمارے مذہبی فرائض میں خلل پیدا نہیں ہوتا' اس سے منع نہیں کیا جائے گا۔ موسیقی بطور موسیقی کے ایک علم ہے' اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کی جنگ میں بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان حالتوں میں اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۲۴۵۔ سوال ۲۔ محقق اور مفتی کا کیا مقام ہے؟

جواب : معلوم نہیں آپ کا کیا منشا ہے؟ محقق کے معنی ہیں جو شخص علمی تحقیق کرے اور مختلف مقاموں پر تلاش کر کے معلومات جمع کرے۔ مفتی کے معنی ہیں کسی سائل کو یہ بتائے کہ اس کے دریافت کردہ امر میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ ایسا شرعی حکم معلوم کرنا بھی بعض وقت تلاش کا محتاج ہوتا ہے' چنانچہ اگر قرآن و حدیث میں وضاحت نہ ہو تو پرانے ائمہ کی آراء میں دیکھنا ہوتا ہے'

اور بدرجہ اخیر خود یہ مفتی قیاس اور اجتہاد سے استنباط کرتا ہے۔ اگر آپ مفتی سے پوچھیں کہ اسلام میں بادشاہت اور جمہوریت کا کیا حکم ہے تو دیکھے گا کہ دونوں جائز ہیں بشرطیکہ شرعی قانون کا نفاذ ہو لیکن اگر آپ پوچھیں کہ ان دونوں میں سے کون سا طرز حکومت بہتر ہے تو وہ کوئی شرعی حکم بتا نہ سکے گا اور جو بھی بیان کرے گا وہ اس کی انفرادی رائے ہو گی اور ملک کے ارباب حل و عقد اس کے پابند نہ ہوں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کیا دریافت کر رہے ہیں وہ واضح نہیں ہے کہ مطلوبہ جواب دے سکوں۔

۲۴۶ سوال ۳۔ "مارمیت اذ رمیت" کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے موقع پر کفار کی طرف مٹی کی مٹھی پھینکی تھی؟

جواب: جہاں تک مجھے یاد ہے یہ واقعہ جنگ بدر میں پیش آیا تھا۔

۲۴۷ سوال ۴۔ آپ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی لڑائی میں ایک پہاڑی پر جھونپڑی قائم کی اور دو تیز رفتار اونٹنیاں رکھی تھیں تاکہ شکست کی صورت میں مدینہ بھاگ جائیں۔

جواب: یہ لفظ میں نے استعمال نہیں کیا تھا۔ بہرحال لکھا ہے کہ صحابہ نے عرض کیا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سپہ سالار کی حیثیت سے اپنی جان بچانے کی ضرورت ہے۔ باقی غزوات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اقدام کبھی نہیں کیا۔ یہ بات کہ اگر شکست ہو بھی جاتی تو اس صورت میں زخمی صحابہ کو چھوڑ کر مدینہ کو کیوں بھاگ جاتے؟ اس کا جواب میں نے شروع ہی میں دیا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اسوہ حسنہ قائم کرنا تھا۔ اور یہ بتانا چاہتے تھے کہ بعد میں آنے والے بادشاہ اور کمانڈر کس طرح اپنے متعلق انتظامات کریں۔ اگر فوج میں موجود بادشاہ یا کمانڈر انچیف مرجائے تو صرف فوج کے باقی رہنے سے ہمارا کام نہیں بنے گا۔ اس لیے کہ اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بادشاہ اور کمانڈر کی جان بچائی جائے۔ غرض یہ کہ یہ انتظام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے مشورے سے کیا تھا۔ اس کا منشا یہ دکھانا تھا کہ آئندہ مسلمان حکمراں کس طرح اس صورتحال میں کام انجام دیں۔ یہ سوال کہ بعد کے غزوات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اقدام کیوں نہیں کیا تو میں سمجھتا ہوں کہ جس مقام پر جنگ ہوئی اس کے لحاظ سے ایسا کیا گیا۔ لیکن جب مسلمان مکہ جاتے ہیں تو جیسا کہ ابھی آپ نے دیکھا کہ بغیر لڑائی کے قبضہ ہو گیا۔ ان حالات میں وہاں جھونپڑی بنا کر دور سے دیکھنے کا سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا۔ غرض یہ ایک ٹیکنیکل چیز تھی کہ کس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنا کام سرانجام دیا۔ اس پر میں اسے ختم کرتا ہوں۔

آپ کا شکریہ۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

خطبہ ۹

عہد نبوی ﷺ میں نظام تعلیم

محترم صدر! محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ! خواتین و حضرات!

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ!

۲۴۸۔ آج کا موضوع یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نظام تعلیم اور علوم کی سرپرستی یہ بہت اہم موضوع ہے۔ مسلمانوں نے بعد کے زمانے میں جو علمی ترقیاں کیں اور جس کے باعث وہ ساری دنیا کے معلم بنے اور ساری دنیا کے لوگ عربی کتب کو پڑھ کر جدید ترین تحقیقات سے آگاہ ہوئے' اس کی اساس' ظاہر ہے عہد نبوی کی تیار کردہ بنیاد ہی ہو سکتی تھی۔

۲۴۹۔ مواد بہت ہے' اس کی ترتیب و تدوین کا کام بھی آسان نہیں اور مجھے دعویٰ نہیں کہ مجھے ان ساری چیزوں کا علم ہو چکا ہے۔ایک چیز سے میں ہمیشہ متاثر ہوا ہوں اور یہ ایک نہایت ولولہ انگیز چیز ہے۔ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے جو خدائی حکم ملتا ہے وہ یہ کہ اقرا باسم ربک الذی خلق ○ خلق الانسان من علق ○ اقرا و ربک الاکرم ○ الذی علم بالقلم ○ علم الانسان مالم یعلم ○ ....." (۹۶ : ۱' ۵) اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پہلے جملے میں اللہ کی طرف سے ایک حکم آتا ہے اور پھر پڑھنے کی اہمیت بھی اس وحی میں بیان کر دی جاتی ہے یعنی یہ کہ قلم ہی وہ واسطہ ہے جو انسانی تہذیب و تمدن کا ضامن و محافظ ہے۔ اسی ذریعہ سے انسان وہ چیزیں سیکھتا ہے۔ جو اسے معلوم نہیں ہوتیں۔ انسانی علوم اور دیگر مخلوقات خاص کر جانوروں کے علم میں سب سے نمایاں فرق یہی ہے کہ حیوانات کا علم محض جبلی علم ہوتا ہے اسی لیے اس میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف انسانی علم صرف جبلی ہی نہیں ہوتا بلکہ کسبی بھی' اور اس میں روزانہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے آباء واجداد کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے ذاتی تجربوں سے بھی اپنے علم میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اور یہ سارا علم اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کر دیتے ہیں۔

۲۵۰۔ پہلی ہی وحی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کے بارے میں حکم دینا ایسی بات ہے' جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے نبی امی کو کیوں پہلے ہی حکم میں اس کی طرف متوجہ کیا گیا

اور اس کے بعد جو تیئس سالہ عرصہ گزرا' اس میں کچھ نہیں تو بیسیوں آیتیں ایسی ملتی ہیں جن میں علم کی تعریف اور علم کی اہمیت سمجھائی گئی ہے اور اس میں عجیب و غریب چیزیں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف یہ کہا جائے گا۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (۱۷: ۸۵) (اور تمہیں علم نہ دیا گیا ہے مگر تھوڑا) دوسری طرف یہ بھی کہا گیا۔ "قل رب زدنی علما" (۲۰: ۱۱۴) (اور عرض کرو کہ اے میرے رب مجھے علم میں بڑھا) / اسی طرح کی شاید ایک ضرب المثل بھی مشہور ہے۔ اطلبوا العلم من المھد الی اللحد (گہوارے سے قبر تک یعنی پیدا ہونے سے موت آنے تک علم سیکھتے رہو) ایک اور چیز ہے جس کی صحت کے متعلق ہمارے محدثین ٹیکنیکل نقطۂ نظر سے اعتراض کریں گے' لیکن بہرحال وہ بھی اثر انگیز چیز ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ "علم سیکھو چاہے وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو" عقلی اور تاریخی نقطۂ نظر سے مجھے اس پر اعتراض کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ بہرحال اس سلسلے میں پہلا سوال ہو گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چین کا علم کیسے ہوا؟ جب کہ عرب' ایشیا کے انتہائی مغرب میں ہے اور چین' ایشیا کے انتہائی مشرق میں ہے اور ان دونوں ممالک میں کسی طرح کا کوئی ربط یا تعلق نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے علم ہوا کہ چین میں علوم و فنون پائے جاتے ہیں؟ سوال معقول ہے لیکن اگر ہمارا مطالعہ ذرا وسیع ہو اور ہمیں اپنی علمی میراث سے ذرا زیادہ واقفیت ہو تو پھر یہ سوال باقی نہیں رہتا بلکہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ مثلاً "مسعودی" کی کتاب "مروج الذھب" کے نام سے ہمارا ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اسلام سے پہلے چینی تاجر عمان تک آتے تھے بلکہ عمان سے آگے' ابلہ یعنی بصرہ تک بھی پہنچتے تھے اور یوں یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں عربوں کے لیے چین اور چینی اجنبی نہیں تھے۔ اس سے بھی زیادہ قابل غور واقعہ ایک اور ہے کہ محمد بن حبیب البغدادی نے' جو ابن قتیبہ کا بھی استاد ہے' اپنی کتاب المحبر میں لکھا ہے کہ ہر سال فلاں مہینے میں "دبا" نامی مقام پر ایک میلہ لگتا تھا' جس میں شرکت کے لیے سمندر پار سے بھی لوگ آیا کرتے تھے ان لوگوں میں ایرانی بھی ہوتے تھے' چینی بھی ہوتے تھے' ہندی اور سندھی بھی ہوتے تھے' مشرقی لوگ بھی ہوتے تھے' مغربی لوگ بھی ہوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ دبا کی اہمیت کے سلسلے میں ایک چھوٹا سا واقعہ آپ کو یاد دلاؤں۔ جب عمان کا علاقہ اسلام قبول کرتا ہے تو عمان میں ایک گورنر ہوتا ہے' اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک اور گورنر کا تقرر صرف بندرگاہ دبا کے امور کے لیے فرماتے ہیں۔ اس سے اس مقام کی اہمیت کا پتہ چلتا

ہے۔ غالباً اس انٹرنیشنل میلے کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہوں گے' تجارتی جھگڑے' کاروباری معاملات وغیرہ' اس لیے عہد نبوی میں خصوصی افسر کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ان دو واقعات کے بعد مسند احمد بن حنبل پر نظر ڈالیے۔ جس کے بعد ہمیں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان چینیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ مسعودی کے بیان کے مطابق چینی تاجر اپنے جہازوں میں سمندری راستے سے عمان کے علاوہ ابلہ یعنی بصرہ تک جاتے تھے اس دوسری روایت میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ دبا نامی بندرگاہ میں' جو جزیرہ نمائے عرب کی دو سب سے بڑی بندرگاہوں میں سے ایک بندرگاہ تھی' ہر سال میلہ لگتا تھا' وہاں ہر سال چینی لوگ آتے تھے۔ ان دو چیزوں کو ذہن میں رکھ کر مسند احمد بن حنبل کو پڑھیں۔ اس میں لکھا ہے کہ قبیلہ عبدالقیس کے لوگ' جو عمان و بحرین میں رہتے تھے' مدینہ آئے اور اسلام قبول کیا۔ ایک چھوٹی سی چیز پر آپ کی توجہ منعطف کراتا ہوں وہ یہ کہ اس میں بحرین کا جو لفظ آیا ہے' اس روایت میں اس سے مراد وہ جزیرہ نہیں ہے جسے ہم آج کل بحرین کہتے ہیں اور جو جزیرہ نمائے عرب میں خلیج فارس کے اندر واقع ہے۔ اس زمانے میں اس جزیرہ کا نام "اوال" تھا اور بحرین کا لفظ اس علاقے کو ظاہر کرتا تھا جسے آج کل ہم الاحساء اور القطیف کا نام دیتے ہیں۔ بہرحال اس میں لکھا ہے کہ بحرین کے لوگ جن کا نام قبیلہ عبدالقیس ہے' اسلام لانے کے لیے مدینہ آتے ہیں۔ اس روایت میں اس بات کی بھی تفصیل ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے کچھ سوالات کیے۔ مثلاً فلاں شخص ابھی زندہ ہے؟ یا کیا فلاں سردار زندہ ہے؟ فلاں مقام کا کیا حال ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سوالات کو سن کر وہ لوگ حیرت سے پوچھتے ہیں۔ یارسول اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہم سے بھی زیادہ ہمارے ملک کے شہروں اور باشندوں سے واقف ہیں۔ یہ کیسے ہوا؟ ان لوگوں کے اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ "میرے پاؤں تمہارے ملک کو بہت عرصے تک روندتے رہے ہیں۔" دوسرے لفظوں میں میں وہاں بہت دنوں تک مقیم رہا ہوں۔ اس صراحت کے بعد ہمیں شبہ نہیں رہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غالباً شادی کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مال تجارت لے کر نہ صرف شام جاتے ہیں' جس کی صراحتیں موجود ہیں بلکہ مشرق عرب کو بھی جاتے ہیں تاکہ دبا کے میلے میں شرکت کر سکیں اور کوئی تعجب نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں پر چینی تاجروں کو بھی دیکھا ہو اور ممکن ہے ان سے کچھ گفتگو بھی کی ہو۔ کیونکہ اگر چینی وہاں آیا کرتے تھے تو انھیں کچھ ٹوٹی پھوٹی عربی آ

جانی چاہیے۔ اس کے علاوہ وہاں پر یقیناً ایسے مترجم ہوتے ہوں گے جو چینی اور عربی دونوں زبانیں جانتے ہوں۔ بہرحال اس کا امکان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چینیوں سے ملاقات کی اور میرا گمان ہے کہ ان کے ریشمی سامان پر خاص کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ہوئی ہو گی' کیونکہ چین کا ریشم نہایت ہی مشہور چیز تھی' ممکن ہے کہ ان کی صنعت و حرفت کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی اچھا تاثر لیا ہو اور ان سے پوچھا ہو کہ تمھارے ملک سے یہاں تک آنے میں کتنے دن لگتے ہیں۔ اور مثلاً انھوں نے کہا ہو کہ چھ مہینے لگتے ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک اندازہ قائم کرنے کے لیے یہ کافی تھا اور اس روشنی میں اب اس حدیث کو پڑھیے "علم سیکھو چاہے چین ہی جانا پڑے" (جو تمھارے لیے دنیا کا بعید ترین ملک ہے) کیونکہ علم کا سیکھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔" غرض ان ابتدائی چیزوں کے عرض کرنے کا منشا یہ تھا کہ قرآن مجید و حدیث شریف میں علم حاصل کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے کیونکہ یہ انسانوں کے لیے نہایت مفید چیز ہے اور اسلام سے زیادہ فطری مذہب کون سا ہو سکتا ہے جو انسانوں کو ان کے فائدے کی چیز بتائے۔

۲۵۱۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ مکہ معظمہ میں ہجرت سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کے متعلق کیا کام کیا؟ کوئی مدرسہ قائم کیا یا مدرس مامور کیے؟ اس کا پتا چلنا آسان نہیں ہے۔ غالباً ایسا ہوا بھی نہیں بجز قرآن کو مستند استاد سے پڑھنے کے۔ لیکن ایک چیز قابل ذکر ہے وہ یہ کہ ہمارے مؤرخین کے مطابق عربی زبان طویل عرصے تک صرف بولی جانے والی زبان رہی تھی' تحریری زبان نہیں تھی۔ لکھنے کا رواج مکہ معظمہ میں' حرب کے زمانے میں ہوا۔ یہ ابوسفیان کا باپ تھا۔ یعنی یہ دور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نوجوانی کا دور ہے۔ جو لوگ آپ سے معمر تر تھے' شہر مکہ میں ان کے زمانے میں پہلی مرتبہ عربی زبان کی تحریر و کتابت ہونے لگی۔ اس کی وجہ بھی یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک شخص عراق کے علاقے حیرہ سے وہاں آیا تھا۔ اس نے مکہ معظمہ میں حرب کی بیٹی سے شادی کی اور اظہار شکر گزاری کے لیے حرب کو یہ راز بتلایا کہ ایسی کام کی باتیں' جنھیں تم بھول جاتے ہوں اور جنھیں یاد رکھنے کی ضرورت ہے' انھیں لکھ لیا کرو۔ یہ روایت ہمیں مختلف کتابوں میں ملتی ہے' مثلاً قدامہ بن جعفر کی کتاب الخراج اور اس کے استاد بلاذری کی فتوح البلدان وغیرہ میں۔ دوسرے الفاظ میں مکہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج عہد نبوی سے کچھ ہی پہلے شروع ہوا تھا اور بلاذری کو تو اصرار ہے کہ عہد نبوی کے آغاز پر وہاں سترہ سے زیادہ آدمی

لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ ممکن ہے کہ مبالغہ ہو یا کسی خاص عہد کا ذکر ہو اور بعد میں اس صورت حال میں ترقی ہوئی ہو اور زیادہ لوگ لکھنا پڑھنا جان گئے ہوں لیکن اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ البتہ یہ امر ضرور قابل ذکر ہے کہ قبل از اسلام مکے میں عورتیں بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں چنانچہ شفاد بنت عبداللہ کو جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رشتہ دار تھی، لکھنا پڑھنا آتا تھا اور اسی واقفیت کے سبب سے بعد میں، جب وہ ہجرت کر کے مدینہ آئیں، تو ابن حجر کے بیان کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ کے ایک بازار میں ایک عہدہ پر مامور کیا۔ چونکہ انھیں لکھنا پڑھنا آتا تھا، اس لیے کوئی ایسا ہی کام ان کے سپرد کیا گیا ہو گا جس کا تعلق لکھنے پڑھنے سے ہو۔ ایک امکان میرے ذہن میں آتا ہے کہ اس بازار میں عورتیں بھی سامان تجارت لاتی ہوں گی لہٰذا ان کی نگرانی، ان کی مدد اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کسی عورت ہی کو مامور کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال لکھنے پڑھنے کا رواج عہد نبوی کے آغاز کے زمانے میں ایک بالکل نئی چیز تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے ابھی زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیائے عرب کی سب سے پہلی تحریر میں لائی ہوئی کتاب قرآن مجید ہے۔ اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ صرف چند ایک چیزیں مثلاً سبعہ معلقات، جن کو لکھ کر کہتے ہیں کہ بطور اعزاز و احترام کعبہ میں لٹکا دیا گیا تھا۔ اسی طرح بعض معاہدے بھی لکھے گئے ہوں گے۔ "الفہرست" میں ابن ندیم نے لکھا ہے کہ خلیفہ مامون کے خزانے میں ایک مخطوطہ یا ایک کاغذ کا پرچہ تھا جس میں ذرا بھدے خط کی کچھ عبارت تھی۔ لکھا ہے کہ عورتوں کے خط سے مشابہ تھا اور کہا ہے کہ وہ عبدالمطلب کا خط تھا وغیرہ۔

۲۵۲۔ ان چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کا آغاز ہو رہا تھا اور ابھی زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو۔ کہ حیرہ سے آنے والا شخص وہی خط سکھائے گا جو حیرہ میں رائج ہے۔ وہاں کی زبان میں کل چوبیس حرف ہیں جب کہ عربی میں حروف کی تعداد اٹھائیس ہے۔ ظاہر ہے کہ حیرہ میں رائج خط اس زبان کے لیے ناکافی ہو گا۔ اسی لیے حیرہ میں رائج خط کی مدد سے عربی زبان کے خصوصی حروف میں امتیاز کرنا بھی دشوار تھا۔ عربی زبان کے حروف میں امتیاز قائم کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ مختلف حروف کے سلسلہ میں ایک نقطہ نیچے لگا کر "ب" بنائیں اور اسی حرف پر ایک نقطہ اوپر لگا کر "ن" بنائیں وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں خطیب البغدادی وغیرہ متعدد لوگوں کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ غالباً اس کوتاہی کو دور کرنے کا

کام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرمایا تھا۔ روایت ہے کہ ایک دن خلیفہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عبید غسانی نامی کاتب کو بلایا اور فرمایا کہ "میں تمھیں کچھ لکھواتا ہوں' اسے لکھو اور رقش کرو۔" غسان کہتا ہے کہ "رقش" کیا چیز ہے؟ وہ تبسم کر کے کہتے ہیں کہ میں ایک دن مدینہ منورہ میں تھا' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب کی حیثیت سے مجھے یاد فرمایا اور حکم دیا لکھو اور رقش کرو میں نے بھی پوچھا تھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رقش کیا چیز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ تھے کہ "حروف پر جہاں ضرورت ہو' نقطے لگاؤ" اس چھوٹی سی روایت سے' جو ہمیں کئی کتابوں میں ملتی ہے' گمان ہوتا ہے کہ نقطے لگا کر حروف میں امتیاز پیدا کرنا بہت بعد کی چیز نہیں ہے بلکہ عہد نبوی میں اس کا آغاز ہو گیا تھا لیکن کتب رسم المصاحف (یعنی قرآنی املاء) کے مؤلفوں یا خط عربی کے عام مورخوں کے ہاں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا البتہ اس کی تائید میں اب کچھ اور چیزیں بھی ہمیں مل گئی ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ طائف کے مضافات میں ایک کتبہ ملا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں انھیں کے حکم سے طائف کے گورنر نے ایک تالاب تعمیر کرایا تھا' اس پر ایک کتبہ لگایا گیا۔ اس کتبے کے کئی حروف پر نقطے ہیں۔ یہ سنہ ۵۰ ھ کا واقعہ ہے۔ ظاہر ہے' بعد کی جعل سازی نہیں ہو سکتی۔ اس کتبے کے سب حروف پر نقطے نہیں ہیں بلکہ صرف چند حروف پر ہیں۔ یہ ذرا پرانی دریافت تھی' اب ایک اور نئی چیز ہمارے سامنے آئی ہے۔ جو اس سے بھی زیادہ مؤثر ہے۔ مصر میں کچھ جھلیاں (پارچمنٹ) دریافت ہوئی ہیں جن پر کچھ تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بائیس ہجری کے زمانے کے دو خطوط ہیں۔ ان میں بھی نقطوں کا اہتمام نظر آتا ہے۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی ایک حد تک نقطے لگانے کا رواج تھا۔ اسے حجاج بن یوسف یا اس کے بھی بعد کی چیز قرار دینا درست نہیں۔

۲۵۳۔ بہرحال خط کے سلسلے میں ایک طرف تو یہ بنیادی اصلاح ملتی ہے کہ حروف پر نقطے لگا کر ان میں امتیاز پیدا کرو۔ دوسری طرف کچھ اور حدیثیں بھی ملتی ہیں جو اگرچہ مسلم و بخاری جیسی کتب حدیث میں تو نہیں آئیں لیکن لائق توجہ ہیں مثلاً ایک حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہے' جس میں آیا ہے کہ جب تم کوئی خط لکھو تو اسے فوراً تہہ نہ کرو بلکہ اس پر ریگ ڈال کر پہلے اسے خشک کیا کرو۔ اس کے بعد اس کو بند کرو۔ یہ ایک عقل مندی کی بات ہے' جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے کی دلیل ہے۔ کیونکہ بعض وقت جلدی میں خط

بند کر دیتے ہیں اور روشنائی گیلی رہتی ہے، جس کے باعث تحریر پر نشان پڑ جاتے ہیں اور وہ پڑھنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس سے بھی زیادہ ایک اور چیز دلچسپ ہے جو ابن اثیر نے لکھی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم لکھو تو "س" کو ایک لمبے خط کی طرح نہ لکھو بلکہ اس میں شوشہ کا اہتمام کرو، ورنہ شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ یہ لفظ "بم، ب" اور "م" کا مجموعہ ہے یا "ب، س" اور "م" کا؟ خط کے سلسلے میں یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ ایک ترکی فاضل نے تحریر کے متعلق ایک چہل حدیث ہی لکھ ڈالی ہے۔ ایک آخری بات پر اس بحث کو ختم کرتا ہوں کہ جب ہجرت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لاتے ہیں تو "صفہ" کا مدرسہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ وہاں کے اور مدرسوں میں ایک مدرس لکھنا پڑھنا سکھانے پر مامور ہوئے تھے۔ ان کا کام طالب علموں کو خطاطی کی مشق کرانا تھا۔

۲۵۴۔ ہجرت سے پہلے مکے میں قیام کے دوران میں لکھنے پڑھنے کی دو تین اور مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ ایک تو وہ مشہور صحیفہ ہے جس کے مطابق مکہ والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان والوں کا بائیکاٹ کیا تھا کہ کوئی شخص نہ اپنی بیٹی نکاح کے لیے دے اور نہ کوئی ان سے ان کی بیٹی لے، نہ ان کے ہاتھ کچھ بیچے اور نہ اسے خریدے حتیٰ کہ ان سے بات چیت تک نہ کرے۔ اس معاہدے کو لکھ کر کعبہ کے اندر لٹکایا گیا تھا تاکہ اس پر ایک مقدس فریضے کے طور پر سنجیدگی اور کامل طور سے عمل کیا جائے۔ مزید صراحت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس معاہدے میں جو صرف مکے والوں نے کیا تھا، ایک مزید حصہ دار کے طور پر بنو کنانہ کے لوگ بھی شامل ہوئے تھے۔ اس معاہدے کی طرف اشارہ کرنے والی، بخاری وغیرہ میں ایک حدیث بھی ملتی ہے، غزوہ حنین کے وقت (جو فتح مکہ کے زمانے ہی میں ہوا تھا) رسول اللہؐ نے فرمایا کہ کل ہم ایک ایسے مقام سے گزریں گے جہاں ایک زمانے میں ظلم کی اعانت کی گئی تھی۔ اس سے مراد یہی تھا کہ بنو کنانہ کے لوگ اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے خلاف کیے جانے والے معاہدے میں اہل مکہ کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ آپ اس سے واقف ہیں کہ کس طرح، اس تحریر کے باوجود، دیمک چاٹنے کی وجہ سے یہ معاہدہ بعد میں منسوخ ہو گیا تھا۔ ایک دوسرا واقعہ حضرت تمیم الداری کے متعلق ہے۔ وہ ایک فلسطینی تھے اور ہجرت سے پہلے مکہ آ کر مسلمان ہوئے اور اپنی بہت سے داستانیں بھی سنائیں جن کا صحیح مسلم میں ذکر ہے، جن میں جہاز رانی وغیرہ کی کہانیوں کا ذکر ہے، انھوں نے آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں نے سیاحت کے دوران میں فلاں فلاں مقامات اور چیزیں وغیرہ دیکھی ہیں۔ بہرحال انھوں نے مسلمان ہوتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ملک شام سے آ رہا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ جب مسلم سپاہ شام فتح کر لیں' اس وقت شام کے فلاں فلاں گاؤں جاگیر کے طور پر مجھے دیئے جائیں اور اس کے لیے آپ مجھے ابھی سے ایک پروانہ دے دیجئے۔ اس پر آنحضرت صلی للہ علیہ وسلم کا وہ خط ہمیں ملتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر بیت مرطوم' حبرون' اور فلاں فلاں مقام فتح ہوں تو وہ تمیم الداری کو دے دیے جائیں۔ یہ خط اصل ہے یا بعد میں تمیم الداری کی اولاد کی جعل سازی کا نتیجہ ہے' اس سلسلے میں کچھ کہنا آسان نہیں۔ کیونکہ ماخذوں میں پروانہ مبارک کی عبارت کے دو بالکل مختلف متن ملتے ہیں۔ بہرحال امام ابویوسف کی "کتاب الخراج" میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے' اور یوں یہ تحریر و کتابت کی دوسری قدیم ترین مثال ہمارے سامنے آتی ہے۔

۲۵۵۔ ایک اور چیز کا ذکر کر کے میں اس بحث کو ختم کروں گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرت کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو سراقہ بن مالک کا واقعہ پیش آتا ہے' جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے اہل مکہ کے سپرد کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بعض معجزات پیش آئے جن کے باعث سراقہ بن مالک (☆) نے معافی مانگی۔ معافی ملی تو اپنے علاقے سے گزر سکنے کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو احسان مندانہ کچھ سہولتوں کی پیشکش کے بعد سراقہ بن مالک نے کہا کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے ایک پروانہ امن دے دیجئے" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہیوں میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیتے ہیں کہ ایک پروانہ امن لکھو۔ گویا سفر میں آپ کے ہمراہ اور چیزوں کے علاوہ قلم' دوات اور کاغذ بھی موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج ترقی کرنے لگا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اہمیت سے خاص کر واقف تھے۔ مدینہ آنے کے بعد آپ نے سب سے پہلا کام عبادت گاہ کی تعمیر کے سلسلے میں کیا۔ چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ' اوس کے علاقہ "قباء" میں پہنچے تو یہاں پر ایک مسجد بنائی گئی۔ جب قباء سے نکل کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بنی خزرج کی شاخ بنو نجار کے علاقے میں آئے تو وہاں کی پرانی مسجد کی توسیع کر کے مسجد نبوی کی تعمیر ہونے لگی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہائش گاہ کے کمرے بھی تھے۔ اس بڑی مسجد کی تعمیر میں کچھ

☆ یہ بعد میں مسلمان ہو گئے

عرصہ لگا۔ لیکن یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مسجد کا ایک حصہ تعلیم گاہ کے طور پر مخصوص کر دیا گیا۔ اسی مقام کو ہم "صفہ" کا نام دیتے ہیں۔ صفہ پلیٹ فارم' ڈائس یا بلند مقام کو کہتے ہیں۔ یہ مقام اس غرض کے لیے مخصوص کیا گیا کہ دن کو درسگاہ کا کام دے اور رات کو ان لوگوں کے لیے جن کا کوئی گھر نہیں ہے' سونے کا کام دے۔ ایک زمانے میں سیرت النبی کی تالیف کے سلسلے میں مجھے تمنا ہوئی کہ عہد نبوی میں مسجد نبوی جیسی تھی' اس کا نقشہ بناؤں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس امر میں ایک الجھن ہے وہ یہ کہ جب مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی تو قبلہ بیت المقدس کی طرف تھا جو مدینے کے شمال میں ہے اور کچھ عرصہ شاید ۱۷ ماہ بعد جیسا کہ تاریخ میں ذکر آتا ہے' قبلہ کعبتہ اللہ قرار پایا جو مدینے کے جنوب میں ہے۔ اس کے لیے مسجد میں تبدیلی ضروری تھی۔ یوں اگر آج مسجد نبوی میں صفہ کا مقام قبلہ کے جنوب میں نظر آتا ہے تو عہد نبوی یعنی ہجرت کے ابتدائی ایام میں شمال میں ہونا چاہیے اور جب قبلہ کا رخ بدلا تو صفہ جو مسجد کے پچھلے حصے میں تھا' سامنے کے حصے میں آ گیا۔ اس لیے اسے ختم کر دیا گیا اور وہاں نماز پڑھی جانے لگی' جب کہ وہ حصہ جہاں پہلے نماز ہوتی تھی وہ پچھلے حصے میں آ گیا اور وہاں نئے سرے سے "صفہ" بنایا گیا۔ بہرحال مسجد نبوی اور مسکن نبوی کا یہ نقشہ ماہنامہ الرشاد' اعظم گڑھ میں اگست ۱۹۸۱ء میں بھی چھپا ہے۔

۲۵۶۔ یہ "صفہ" جیسا کہ میں نے گزشتہ لیکچروں میں اشارہ کیا' وہ مقام ہے' جسے موجودہ زبان میں رہائشی جامعہ "Residential University" کہتے ہیں یعنی طلباء کے رہنے کا بھی انتظام ہے اور تعلیم کا بھی۔ رہنے کے سلسلے میں ہمیں کئی اور وضاحتیں بھی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ کہ اہل مدینہ اپنی انتہائی فیاضی کے باعث یہ کرتے کہ جب انصار کی کھجوروں کی فصل تیار ہوتی تو ہر شخص کھجوروں کا ایک ایک خوشہ تحفے کے طور پر لاتا اور اسے مسجد نبوی کے اندر "صفہ" میں لٹکا دیتا۔ جب کوئی کھجور پک کر گرتی تو صفہ میں رہنے والے غریب مسلمان اسے کھاتے۔ ان خوشوں کی حفاظت کے لیے بھی ایک شخص مقرر کیا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب اپنی انتہائی فیاضی کے سبب مقروض ہو گئے اور قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں انھیں اپنا مکان تک فروخت کر دینا پڑا' تو انھیں بھی رہنے کے لیے "صفہ" میں جگہ دی گئی اور علاوہ اور چیزوں کے ان پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ ان خوشوں کی نگرانی کریں۔ بہرحال آپ رہائشی جامعہ (Residential University) کا بھاری بھرکم لفظ قبول کریں یا نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ صفہ میں تعلیم پانے والے طالب علم دو قسم کے تھے کچھ تو وہ تھے جو شہر میں رہتے

تھے لور پڑھ کر چلے جاتے تھے' لیکن کچھ ایسے تھے جن کا کوئی گھر نہیں تھا اور وہ رات بھی وہیں گزارتے تھے۔ ان کی تعداد ظاہر ہے گھٹتی بڑھتی رہی ہو گی۔ ان طالب علموں میں ہمیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نظر آتے ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے "صفہ" میں کیوں رہتے تھے؟ معلوم ایسا ہوتا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مواخاتی بھائی کے ہاں قیام کیا ہو گا اور ان کے ہاں اتنی جگہ نہ ہو گی کہ ان مواخاتی بھائی اور ان کے خاندان کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی بیوی کے علاوہ اپنے جوان اور بالغ بیٹے کو بھی جگہ دلا سکیں۔ اس کی ایک دوسری توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود علم کے شوق کے باعث نہیں چاہتے تھے کہ قباء میں رہیں جو مدینہ سے کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ آنے جانے میں کافی وقت لگتا ہے۔ سارا وقت وہ مدینے میں گزارنا چاہتے ہوں گے تاکہ ہروقت رسول اللہ ﷺ کے مواعظ سے استفادہ کر سکیں۔ بہر حال وہاں کچھ لوگ ایسے تھے جو صرف دن کو تعلیم پاتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو تعلیم بھی پاتے تھے اور رات کو رہتے بھی تھے۔۔۔۔ اس سلسلے میں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کچھ تو ان چیزوں پر بسر اوقات کرتے تھے' جو انھیں بطور تحفہ دی جاتی تھیں' کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان سے' کبھی مختلف صحابہ کی فیاضیوں کے باعث۔ مثلاً ایک بار کا ذکر ہے کہ اہل صفہ کے اسی (۸۰) آدمیوں کو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ اس سے دو چیزیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو وہ تعداد جو کم و بیش صفہ میں موجود ہوتی تھی' دوسرے یہ کہ ان کے گزر بسر کا کیا انتظام تھا اور وہ کس طرح کھاتے پیتے تھے۔ ان دو باتوں کے علاوہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے سرکاری خزانے سے امداد* فرماتے اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فیاضی کے جب ان کو مختلف اشیاء ملتیں' ایک اور چیز کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ دوسروں پر بوجھ بننے کی بجائے خود محنت کرتے تھے۔ یہ محنت اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ پیسے جمع کر سکیں یا مالدار بنیں بلکہ صرف اس لیے کہ اپنا سد رمق حاصل کریں لور باقی پورا وقت علم کے حصول میں صرف کریں۔ ایک واقعہ کا ذکر ملتا ہے اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ صفہ میں رہنے والے ایک طالب علم کی وفات ہوئی۔ جب اسے غسل دیا گیا تو پتہ چلا کہ اس کے پاس دو دینار ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بہت ناراض ہوئے کہ ایسے شخص کو' جس کے پاس دو دینار جیسی خطیر رقم تھی' خیرات پر پرورش

پانے کا کوئی حق نہ تھا۔ بہرحال انسانی فطرت کی ایسی مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔

۲۵۷۔ صفہ میں جو تعلیم ہوتی تھی وہ اسلام کی ابتدائی تعلیم تھی، جس کے لیے میں پرائمری کا لفظ استعمال کر سکتا ہوں۔ مدرسہ میں جن چیزوں کی تعلیم ہوتی تھی، اس میں متعدد شعبے، متعدد لوگوں کے سپرد تھے۔ کسی کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا سکھائے، کسی کے سپرد یہ کام تھا کہ جو لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں، انھیں اس وقت تک کی نازل شدہ قرآنی سورتیں سکھائیں۔ شاید کسی شخص کا یہ کام بھی ہو کہ وہ فقہی احکام، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نماز عبادات وغیرہ کا درس دے۔ یہ اہتمام خاص طور پر ان نو مسلم لوگوں کے لیے کیا جاتا ہو گا جو وقتاً" فوقتاً" کچھ عرصے کے لیے مدینے آتے ہوں گے تاکہ اپنے نئے دین کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک حدیث کا ذکر کیا جو عبدالقیس کے لوگوں کی مدینہ آمد سے متعلق تھی۔ جب یہ لوگ مدینہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں انصار کے سپرد کر دیا کہ تم ان لوگوں کی مہمان نوازی کرو۔ صبح کو ان لوگوں سے پوچھا کہ تمھارے ساتھ تمھارے میزبانوں نے کیسا سلوک کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ ان لوگوں نے ہمیں کھانے کے لیے نرم روٹی اور سونے کے لیے نرم بستر دیے اور صبح کو انھوں نے عبادت کے طریقے، قرآن شریف کی سورتیں اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق چیزیں سکھائیں یہ اسی کی بنا پر تھا جو میں نے آپ سے عرض کیا کہ صفہ میں تعلیم کے مختلف شعبے تھے۔ ایک چیز کا امکان ہے اور یقیناً ایسا ہی ہوا گا کہ وقتاً" فوقتاً" خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو درس دیتے ہوں گے۔ اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی فرصت ملتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں درس دیا کرتے تھے اور بہت سے لوگ جنھیں فرصت ہوتی، اس درس میں شریک ہو جاتے۔ ایک دلچسپ حدیث ہے کہ ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ مبارک سے نکل کر مسجد کے اندر آئے اور دیکھا کہ وہاں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تسبیح پڑھنے اور ذکر اذکار کرنے میں مشغول تھا۔ دوسرا گروہ علم حاصل کر رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگرچہ دونوں گروہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ لیکن وہ گرہ بہتر ہے، جو تعلیم کا کام کر رہا ہے۔ پھر آپ بھی اس گروہ میں شامل ہو گئے۔ اس طرح یہ بھی روایت ملتی ہے کہ صفہ کے بعد جلد ہی اور مدرسے قائم ہوئے۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ مدینے میں عہد نبوی میں نو مساجد تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ اپنے محلے کی مسجد

میں اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کرو۔ سب کے سب مرکزی مسجد میں نہ آیا کریں کیونکہ اس طرح طالب علموں کی تعداد بڑھ جانے کا اندیشہ تھا' جس سے سب کی تعلیم متاثر ہوتی اور ناکافی اساتذہ کے باعث بچوں کے تعلیم پانے کا موقع نہ مل سکتا شاید مسافت اور حمل و نقل کا بھی مسئلہ تھا' اسی طرح ہمیں اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ تعلیم دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو باہر بھی بھیجا کرتے تھے۔ غالبًا ایسا ان علاقوں کے لیے ہوتا ہو گا جہاں کے باشندے رفتہ رفتہ مسلمان ہوتے گئے اور مسلمان ہونے کے بعد مطالبہ کرتے کہ ہماری تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ غالبًا کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ ایسا ہی ایک واقعہ ہجرت سے قبل بھی پیش آیا تھا' جب خود مدینہ والوں نے بیعت عقبہ میں اسلام قبول کیا تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ ہمیں ایک معلم دیا جائے تو مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا گیا اور وہ اہل مدینہ کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کراتے رہے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی بات مجھے یاد آتی ہے۔ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت عقبہ میں مسلمان ہونے والے اہل مدینہ کو اس وقت تک نازل شدہ قرآن شریف کا ایک تحریری نسخہ بھی دیا تھا جسے وہ اپنے محلے کی مسجد میں باواز بلند پڑھا کرتے تھے۔ ہمارے مؤرخ اس میں یہ اضافہ بھی کرتے ہیں کہ مسجد میں باواز بلند قرآن مجید کی تلاوت کرنے کا آغاز پہلی مرتبہ مدینہ منورہ میں بنی زریق کے ان انصار سے ہوا تھا۔

۲۵۸۔ غرض ایک طرف ہمیں ایسی چیزیں ملتی ہیں جن میں علم کی اہمیت بتانے کے ساتھ ساتھ اس کو حاصل کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف ایسے انتظامات بھی نظر آتے ہیں جن کے باعث علم کا حصول آسان تر ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹے سے واقعہ کی جانب آپ کی توجہ منعطف کراؤں گا جس کا میں نے گزشتہ روز بھی ذکر کیا تھا۔ جنگ بدر میں بہت سے کافر قید ہوئے۔ ان قیدیوں میں سے جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مالی فدیہ طلب کرنے کی بجائے' یہ فرمایا کہ ان میں سے ہر شخص دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ تعلیم کے انتظامات کے سلسلے میں یہ واقعہ ولولہ انگیز ہے۔ اسی طرح ایک اور بات پر غور کرنے اور اس سے نتائج استنباط کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ طبری کے بیان کے مطابق جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو ان کا فریضہ یہ تھا کہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں اور ایک کمشنری سے دوسری

کمشنری میں جائیں اور وہاں تعلیم کا انتظام کریں۔ اس کے علاوہ یمن کے گورنر عمرو بن حزم کی تقرری کے وقت، ان کو جو ہدایت نامہ دیا گیا، اسے بھی تاریخ نے محفوظ کر لیا۔ اس میں ہمیں ٹیکس، انتظامی معاملات اور عدل و انصاف وغیرہ کے متعلق ہدایات کے علاوہ یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کرو۔ گویا گورنر کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ اپنے دائرہ عمل (Jurisdiction) کے اندر رہنے والے لوگوں کی تعلیم کا انتظام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم اسلامی تعلیم ہی ہو گی اور اس کا انتظام صرف مسلمانوں کے لیے کیا جاتا ہو گا، کیوں کہ غیر مسلموں کی تعلیم کی بوجوہ ضرورت ہی نہیں تھی۔ قرآن مجید کے احکام کے مطابق تمام مذہبی گروہوں کو کامل داخلی خود مختاری عطا کی گئی تھی۔ جس طرح غیر مسلم اس خود مختاری کی بنا پر اپنے دیگر معاملات میں آزاد تھے اسی طرح تعلیم کی صورت بھی رہی ہوگی۔ ان حالات میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ غیر مسلموں کی تعلیم کا انتظام اسلامی حکومت کرتی تھی یا نہیں۔ اگر وہ کرتی ہو اس میں کوئی امر مانع بھی نہیں تھا لیکن چونکہ عہد نبوی میں ایک خصوصی نظام کے تحت ہر اقلیت کو کامل داخلی خود مختاری عطا کی گئی تھی، اس لیے انھیں اپنی تعلیم کی بھی آزادی تھی اور وہ خود اسے بہتر طور سے انجام بھی دے سکتے تھے۔ مثلاً ایک عیسائی بچے کو اسلامی مدرسہ میں قرآن کی تعلیم دینے والا عالم تو مل جائے گا لیکن انجیل پڑھانے والا استاد میسر نہیں آ سکے گا۔ اس لیے ان کے حق میں یہی بات زیادہ سودمند تھی کہ ان کا مدرسہ ہی الگ ہو اور وہ اپنے مذہب کی تعلیم اپنے ہی اساتذہ کی مدد سے حاصل کریں۔

۲۵۹۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ کبھی کبھی یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کسی علمی مسئلے کے سلسلے میں جھگڑا بھی کرتے۔ اس سے جو بعض نہایت کار آمد نتائج نکلتے میں ان کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً ایک مرتبہ یہودی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نوجوان جوڑے کو لائے اور کہا کہ ہم نے ان لوگوں کو بدکاری کرتے پایا ہے، آپ کے پاس لائے ہیں تاکہ آپ انھیں سزا دیں۔ اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، بجائے اپنی صوابدید سے فیصلہ کرنے کے یا اسلامی قانون نافذ کرنے کے خود ان سے پوچھتے ہیں کہ تمھاری دینی کتاب توریت میں اس کے متعلق کیا احکام ہیں؟ انھوں نے جھوٹ بات بیان کی اور کہا کہ توریت کا حکم یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا منہ کالا کر کے انھیں اس طرح گدھے پر بٹھایا جائے کہ ان کے منہ گدھے کی دم کی طرف ہوں، پھر سارے شہر میں ان کی تشہیر کرائی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ایسا نہیں ہے۔ توریت کا حکم اس سے مختلف ہے۔ توریت لاؤ۔ چنانچہ توریت لائی گئی۔ اس میں رجم کی سزا نکلی اور اس کے مطابق مجرموں کو رجم کرایا گیا۔ اس کے متعلق مزید لکھا ہے کہ توریت کو پہلے ایک یہودی نے پڑھا اور اس آیت کو چھوڑ دیا جس میں رجم کا ذکر تھا۔ اس پر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے، جو ایک نو مسلم یہودی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اس امر پر منعطف کرائی کہ یہاں کچھ اور آیات بھی ہیں جنھیں یہ چھپا رہا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاص کاتب وحی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ تم عبرانی رسم الخط سیکھو کیونکہ مجھے آئے دن یہودیوں سے خط و کتابت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر ایسی تحریروں کو میں یہودیوں سے پڑھوا کر سنوں تو مجھے ان پر اعتبار نہیں، اس لیے تم خود سیکھ لو۔ دوسرے لفظوں میں اجنبی زبانوں کو سیکھنے اور سکھانے کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ فرمائی۔ دوسری زبانوں کے سیکھنے سے سیاسی فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور علمی فوائد بھی۔ علمی فائدے کے متعلق ایک واقعہ ذہن میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو اپنے باپ سے بھی پہلے مسلمان ہوئے، نہایت ذہین، دیندار اور متقی نوجوان تھے۔ ساری ساری رات نفل نمازیں پڑھتے۔ انھوں نے روزانہ روزہ رکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ یہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنی دو انگلیاں چوس رہا ہوں۔ ایک پر شہد اور دوسری پر گھی لگا ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن مجید اور توریت دونوں سے استفادہ کر سکو گے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ بعد کے زمانے میں انھوں سریانی زبان کی بھی تعلیم پائی اور بائبل کا ترجمہ سریانی زبان میں پڑھتے۔ اسی طرح ایک دن وہ قرآن کی تلاوت کیا کرتے اور دوسرے دن توریت کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ غرض اجنبی زبانیں سیکھنے کا کچھ نہ کچھ انتظام ہو چلا تھا۔ لکھا ہے کہ زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چار پانچ زبانیں آتی تھیں۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی ہی، اس کے علاوہ انھیں عبرانی، قبطی اور فارسی زبانیں آتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ جملہ لکھا ہے کہ انھوں نے فارسی زبان بہت جلد اس وقت سیکھ لی، جب ایک ایرانی وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یمن سے آیا۔ یہ وفد کچھ دن مدینہ میں مقیم رہا۔ ان لوگوں سے قریبی روابط کے باعث زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اتنی فارسی سیکھ لی کہ اس زبان میں روزمرہ کی گفتگو کر سکیں، ان کی ضرورتیں معلوم کر سکیں اور ان کے مختلف سوالوں کے

جواب دے سکیں۔ بہرحال تعلیم کے متعلق ایک طرف ان انتظامات کا پتہ چلتا ہے جو دارالسلطنت مدینہ منورہ میں کیے گئے' دوسرے وہ انتظامات ہیں جو ان علاقوں کے لوگوں کو دین سے واقف کرانے کے لیے کیے گئے جو بہت تیزی سے اسلامی سلطنت میں شامل ہو رہے تھے۔

۲۶۰۔ تعلیم کے متعلق ایک اور پہلو کی جانب آپ کی توجہ منعطف کراؤں گا۔ ویسے یہ میرا استنباط ہے' اس کے لیے میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ امر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف علوم کی اہمیت سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان ان علوم کو سیکھیں۔ ان کے لیے الگ الگ درسی کتابوں کی بجائے ایک ہی درسی کتاب دینا پسند فرماتے اور چاہتے ہیں کہ ہر شخص اس درسی کتاب کو ہمیشہ پڑھتا رہے' چاہے اس فن کی چیزوں سے اس کو دلچسپی ہو یا نہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کو بار بار پڑھے تو وہ اپنے فن کی چیزوں کو بھی پڑھے گا اور مجبور ہو گا کہ غیر فن کی چیزوں کو بھی' خواہ سرسری نظر ہی سے سہی' پڑھے اور سمجھنے کی کوشش کرے اور اس کے لیے ایسی معلومات' جو اگرچہ اس کے اپنے اختصاصی فن سے متعلق نہیں ہیں' کسی بھی وقت سودمند ثابت ہو سکتی ہیں۔ قرآن مجید پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلے گا کہ اس میں بے شمار علوم کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں صرف دین و عقائد' عبادات اور متعلقہ اخلاقی چیزوں ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں بہ کثرت اور علوم بھی نظر آتے ہیں۔ اگر میں توریت کو بنی اسرائیل کی تاریخ کہوں تو اس میں پہلے تمہیدی باب کے بعد' جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں' باقی سب چیزیں صرف بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اسی طرح آپ انجیل کو پڑھیں تو وہ ایک ہی شخص یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری ہے۔ اس کے برخلاف قرآن مجید نہ تو عرب کی تاریخ ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری' بلکہ سارے بنی آدم کی تاریخ ہے۔ قرآن مجید میں بے شمار بادشاہوں' نبیوں اور قوموں کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ ان گزشتہ لوگوں کے اچھے یا برے انجام کو سامنے رکھ کر ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں۔ ایک مرتبہ میں نے کوشش کی کہ میں ان مقامات کا شمار کروں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس میں مصر' بابل اور یمن وغیرہ کے علاوہ بہت سے ملکوں کا ذکر ہے۔ اس میں ایک ایسے پیغمبر کا بھی ذکر آیا ہے جسے ہم ہندوستان سے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ یہ پیغمبر حضرت ذوالکفل ہیں۔ ان کے متعلق قرآن و حدیث میں تفصیلی صراحت موجود نہیں ہے بعض محدثین و مفسرین نے اس

سلسلے میں اگرچہ لکھا ہے' لیکن وہ قابل اعتماد نہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے استاد مولانا مناظر احسن گیلانی کہتے تھے کہ غالباً اس سے مراد گوتم بدھ ہے۔اس کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ ذوالکفل کے لفظی معنی کفل والے کے ہیں۔ اور کفل "کپل و ستو" کی معرب شکل ہے۔ یہ بنارس کے قریب ایک شہر ہے جس میں گوتم بدھ پیدا ہوئے تھے اس کی مزید تائید کے لیے وہ سورہ "والتین" (۹۵ : ۱ تا ۳) کی طرف اشارہ فرماتے تھے کہ والتين والزيتون وطور سينين وهذا البلد الامين میں تمام مفسرین کے خیال میں چار پیغمبروں کا ذکر آیا ہے۔ زیتون سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جن کو جبل زیتون سے بہت قریبی تعلق رہا ہے اور سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جہاں خدا نے انھیں توریت عطا کی۔ " هذا البلد الامین" یعنی محفوظ شہر سے مراد مکہ معظمہ ہے۔ لیکن پہلا لفظ "والتین" کیا ہے؟ اس میں مفسرین خیال آرائی کرتے رہے۔ بعض لوگوں نے کہا' اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ بعض نے اس سے کسی اور نبی کی جانب اشارہ مراد لیا۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے نبیوں کی زندگیوں میں انجیر کو کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی۔ جب کہ مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے تھے کہ گوتم بدھ کے ماننے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ گوتم بدھ کو جنگلی انجیر کے نیچے نروان حاصل ہوا تھا۔ اس سے وہ استنباط کرتے تھے کہ قرآن مجید میں جہاں دنیا کے تمام بڑے مذاہب کا ذکر ہے۔ وہاں بدھ مت کا بھی ذکر ایک بہت لطیف انداز میں کر دیا گیا ہے۔ گوتم بدھ کے حالات چونکہ عربوں کو تفصیل سے معلوم نہیں تھے لہٰذا اس پر زور نہیں دیا گیا۔

۲٦۱۔ بہرحال ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ قرآن مجید میں مختلف علوم ہیں۔ اس میں تاریخ کا بھی ذکر ہے۔ اس میں ان علوم کا بھی ذکر ملتا ہے جنھیں ہم سائنس کا نام دیتے ہیں' مثلاً علم نباتات' علم حیوانات' علم حجر' علم بحر' علم ہیئت یہاں تک کہ علم جنین کا بھی ذکر ملتا ہے۔ قرآن شریف میں علم جنین کی اتنی مفصل تشریحات آئی ہیں کہ ان کا اس جدید ترین دور تک بھی اثر ہو رہا ہے۔ میں نے کسی وقت آپ سے بیان کیا تھا کہ دو سال قبل پیرس میں ایک کتاب "Bible 'Quran and Science" چھپی ہے جو ایک مشہور سرجن بوکائی کی تصنیف ہے۔ بوکائی کو بچوں کی ولادت کے علم سے دلچسپی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ علم جنین کے متعلق جو تفصیلات قرآن مجید نے دی ہیں' ان کا علم نہ یونان کے مشہور قدیم اطباء کو تھا اور نہ زمانہ حال کے یورپی لوگوں کو ہے' جنھوں نے سالہا سال تک اس موضوع پر ریسرچ کی۔ لیکن اب سے چودہ سو سال قبل' ایک

بدوی صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ذکر کرتا ہے تو یقیناً یہ انسان کا کلام نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن کی اسی بات سے متاثر ہو کر اب سے کوئی دو ماہ پہلے بوکائی نے اپنے مسلمان ہونے کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہمیں سمندری طوفان کا ذکر بھی ملتا ہے جہاز رانی' موتی اور مرجان کا بھی خاصا ذکر ملتا ہے۔

۲۶۲۔ غرض میرا گمان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ ہر مسلمان کو کچھ تو تعلیم بنیادی دی جائے جو لازمی ہو اور دیگر علوم کے بارے میں بھی اس کے پاس کچھ نہ کچھ معلومات ہوں جو کسی بھی وقت اس کے کام آ سکتی ہیں۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ قرآن مجید کو پڑھو' کیونکہ اس میں تقریباً تمام علوم کا ذکر کیا گیا ہے۔ مجھے اپنے اس لیکچر کو اب یہیں روکنا پڑے گا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر معلومات عہد نبوی کے تعلیمی انتظامات کے متعلق کافی ہیں۔ اب صرف ایک چھوٹا سا جز باقی ہے اور وہ عہد نبوی میں علوم کی سرپرستی سے متعلق ہے' جس کے بارے میں میں کچھ زیادہ آپ سے عرض نہیں کر سکوں گا' صرف چند باتوں پر اکتفا کروں گا۔ اس کے بعد آپ کے سوالات ہوں گے تو ان کے ذریعہ اپنے بیان کی کوتاہیوں کی تلافی کی کوشش کروں گا۔

۲۶۳۔ عہد نبوی میں علوم و فنون زیادہ نہیں تھے لیکن جو فنون تھے' ترقی پذیر تھے اور ان کی ضرورت بھی تھی۔ ان میں سے ایک چیز طبابت ہے۔ اس کے متعلق ہمیں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ عہد نبوی میں طبیبوں کی حالت اور جراحی کرنے والے سرجنوں کے حالات پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی بیمار ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تمہارے محلے یا قبیلے میں کوئی طبیب ہے؟ جواب میں دو نام بتائے جاتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ان میں سے جو ماہر تر ہو اسے بلاؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ علم میں تخصص Specialisation پیدا کریں اور ماہروں سے علاج کرائیں۔ اس سے لوگوں کو ماہر بننے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ اسی طرح اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طبابت سے ناواقف شخص کو اس کی اجازت دینا نہیں چاہتے کہ وہ طبیب بن جائے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ جس شخص کو علم طب سے کوئی واقفیت نہیں' اگر وہ علاج کرے تو اسے سزا دی جائے گی' کیونکہ اس کے اناڑی پن سے لوگوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس طرح کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں

جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں علم طب کی کافی اہمیت سمجھی جاتی تھی اور علاج سادہ مفردات کے ذریعے ہوتا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بے شمار نسخے منسوب ہیں۔ لوگ آ کر آپ سے کہتے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے یہ تکلیف ہے تو آپ اس کے لیے تجویز فرماتے کے فلاں چیز استعمال کرو وغیرہ۔ اب طب نبوی کا پورے کا پورا نظام اس طرح کی احادیث پر مشتمل ہو کر بن چکا ہے۔ زیادہ نہیں تو اس موضوع پر پندرہ بیس پرانی کتابیں میں دیکھ چکا ہوں۔

۲۶۴۔ دوسرا علم جس کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی اور جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی تفصیل سے ہے' وہ علم ہیئت ہے۔ اس کے فوائد خود قرآن حکیم میں بھی بتائے گئے ہیں۔ اس علم کے ذریعے رات کے وقت مسافر اپنا راستہ معلوم کر سکتا ہے۔ اس کے ذریعے سے اوقات کا اور حج کے زمانے کا تعین ہو گا۔ علم ہیئت کی طرف بڑی توجہ کی جاتی تھی اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑی اچھی واقفیت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد جب مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی یا مسجد قباء تعمیر کی گئی تو قبلہ کے رخ کے تعین کا سوال تھا۔ محض اندازے کی بنا پر قبلے کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علم ہیئت سے واقفیت کی بنا پر کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس سے کئی بار گزر چکے تھے۔ تجارت کے لیے جب آپ بصریٰ (دمشق) تشریف لے گئے تو بیت المقدس سے بھی آگے تک گئے تھے۔ یہ سارا سفر اونٹوں پر ہوتا تھا۔ اور زیادہ تر رات کے وقت ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اپنے تجربات کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ بیت المقدس کی طرف جانے والوں کو کس ستارے کی مدد سے آگے بڑھنا چاہیے۔ اور اسی طرح آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ کس ستارے کی مدد سے رات کے وقت بیت المقدس سے مکے اور مدینے جانے والوں کو اپنا سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس علم کی بنا پر آپ نے بغیر کسی خاص دشواری کے قبلہ کے رخ کا تعین فرما لیا۔ اس طرح کی اور چیزیں بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو علم ہیئت سیکھنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ اس کا احادیث میں بھی ذکر ملتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں کو اپنے انساب سیکھنے چاہئیں یعنی اپنے شجرہائے نسب معلوم کرنے چاہئیں۔ ان کی ایک عملی اہمیت یہ بھی ہے کہ کوئی محرم سے نکاح نہ کرے۔ عرب کے قبائلی نظام میں جس میں فلاں بن فلاں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا' اس بات کی خاص اہمیت تھی۔ اس طرح کی چیزیں صرف تاریخی

معلومات ہی کے لیے نہیں بلکہ دیگر امور کے لیے بھی کار آمد ہو سکتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نبوی میں کچھ علوم پائے جاتے تھے جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرپرستی فرماتے تھے اور کچھ چیزیں مثلاً عسکریات وغیرہ کے سلسلے میں لوگوں کو ترغیب و تشویق دلاتے تھے۔ اسی پر میں آج کا موضوع ختم کرتا ہوں۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

۲۶۵۔ آج بہت سے سوالات آئے ہیں، میں کوشش کروں گا کہ ہر سوال کا مختصراً" جواب دوں لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی تقریر کا کچھ حصہ مکمل کر لوں۔ دو نکتوں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو ممکن ہے، آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں۔ اولاً میں نے آپ سے جو قصہ بیان کیا کہ جنگ بدر کے قیدیوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا کام لیا تھا۔ اس واقعے کو ایک محدث نے اس عنوان کے تحت درج کیا ہے کہ کسی مشرک کو مسلمانوں کی تعلیم کے لیے استاد بنانے کا جواز (جواز المعلم المشرک) کیونکہ مکہ والے مشرک اور کافر تھے، اور مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں سے بھی علم سیکھنا جائز ہے اور اس میں شرعاً" کوئی امر مانع نہیں ہے۔

۲۶۶۔ دوسرا نکتہ معمولی ہے، میں آپ سے ذکر کر رہا تھا کہ قرآن مجید میں بہت سے علوم ہیں۔ اگر قرآن کو اس کی تفسیر کے ساتھ پڑھیں تو انسان کو بہت سے علوم میں شد بد حاصل ہو جاتی ہے مثلاً قرآن مجید میں مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں بہت سے مذاہب کے عقائد کا ذکر آیا ہے خواہ یہ ذکر ان کی تردید کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو لہٰذا قرآن مجید کو پڑھنے والے کا فریضہ یہ بھی ہوگا کہ تفسیر یا دوسرے وسائل کے ذریعہ سے ان مختلف ادیان کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرے ایسی معلومات اس کے لیے تبلیغ دین کے سلسلے میں بھی کار آمد ہو سکتی ہیں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مناظرے کے وقت بھی۔ مثلاً دوسرے مذاہب کے لوگ سوال یا اعتراض کریں تو ان کے مذاہب سے واقفیت بعض اوقات بڑی کار آمد ثابت ہوتی ہے۔ لطیفے کے طور پر آپ سے ذکر کروں گا کہ ایک مرتبہ ایک فرانسیسی نن نے جو الحمدللہ اب حاجی طاہرہ کے نام سے مسلمان ہو چکی ہے، تعدد ازدواج کے متعلق اعتراض کیا میں نے اسے جواب دیا

کہ "اگر اور لوگ مجھ پر یہ اعتراض کریں تو قبول' لیکن مجھے تم سے اس اعتراض کی توقع نہیں تھی کیونکہ تمھارے اپنے عیسائی مذہب کے مطابق نن خدا کی بیوی کہلاتی ہے' اس طرح تمھارے شوہر کی تو لاکھوں بیویاں ہیں جب کہ تم صرف چار بیویوں کے باعث مجھ پر معترض ہو۔" اس بات کا اس کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ دو سال کی خط و کتابت کے بعد اس نے اپنا کانونٹ چھوڑ دیا اور مسلمان ہوگئی۔ بہرحال دوسرے مذاہب سے واقفیت کے باعث بعض اوقات بہت فائدہ ہوتا ہے۔
اب میں آپ کی جانب سے کیے ہوئے سوالات کا جواب دوں گا

۲۶۷ سوال ۱ : حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو توریت پڑھتے دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ متغیر ہوگیا تھا لیکن عبداللہ بن عمرو بن العاص کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس کی اجازت دی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب : اس سے پہلے کہ میں سوال سے متعلق اپنے خیالات ظاہر کروں' میں اس میں کچھ اضافہ کروں گا کہ اور بھی لوگوں کو توریت پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام کو' جو پہلے یہودی تھے' پھر مسلمان ہوئے۔ ان کے متعلق صراحت سے مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اجازت دی کہ ایک دن توریت پڑھو اور ایک دن قرآن مجید تو پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیوں روکا یہ بتانا قدرے مشکل ہے۔ اس سلسلے میں دو باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ توریت پڑھنے کی اجازت خصوصی ہوسکتی ہے جو صرف ان لوگوں کو دی جاسکتی ہے جن کی معلومات اسلام کے متعلق کافی ہوں' جن کا ایمان راسخ ہو۔ اور جن کو غیر مذاہب کی کتابیں پڑھنے سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو ان حالات میں آپ پوچھیں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیوں منع کیا گیا۔ اس سلسلے میں عرض کروں گا کہ ایک تو ممانعت کا یہ واقعہ اسلام کے ابتدائے زمانے سے تعلق رکھتا ہے' جبکہ عبداللہ بن عمرو کو اجازت دی گئی ہے وہ ذرا بعد کی چیز ہے۔ ان کے زمانے تک قرآن کا بڑا حصہ نازل ہوچکا تھا وہ بڑے قابل نوجوان تھے۔ ان کے متعلق یہ اطمینان تھا کہ وہ اسلام پر مستحکم ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے توریت پڑھنے پر اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے تو باقی لوگ اسے اپنے لیے جواز بنا لیتے اور لوگ اسے اپنے لیے اجازت تصور کرتے حالانکہ یہ اجازت سب لوگوں کو نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس سوال کے سلسلے میں ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عہد نبوی میں بعض ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چیز سے منع فرماتے ہیں لیکن

کچھ عرصہ بعد اس کی اجازت دے دیتے ہیں۔ مثلاً ایک مشہور حدیث ہے کہ "میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا' اب تم زیارت کے لیے جاسکتے ہو۔" اس کے سوا میں کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ ممکن ہے کوئی وجہ آپ کے ذہن میں آئی ہو۔

۲۶۸ سوال ۲ : بیعت عقبہ میں دیا جانے والا قرآن مجید کا نسخہ مدینے کی مسجد میں رکھا گیا تھا' کیا مدینے میں مسجد نبوی کے علاوہ بھی مساجد تھیں؟

جواب : جی ہاں' مسجدیں تھیں اور بہت سی تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیعت عقبہ میں کوئی بارہ قبائل کے لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ جن میں سے تین شاید اوس کے اور نو خزرج کے تھے چونکہ اوس اور خزرج میں جھگڑے تھے اس لیے کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ ان کی مسجد ایک ہی ہو شہر بڑا تھا اور اس کا پتا بھی چلتا ہے کہ بہت سی مساجد تھیں لیکن ان کی صحیح تعداد بتانا دشوار ہے۔ ہمیں مسعودی کی تاریخ مدینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مقام پر مسجد نبوی بنائی گئی تو وہاں دراصل ایک نئی مسجد بنانے کی بجائے حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی پرانی مسجد ہی میں توسیع کی گئی تھی اور اس پرانی مسجد میں صرف قبیلہ بنو نجار کے مسلمان نماز پڑھتے تھے[1] ممکن ہے ان کی تعداد پندرہ بیس رہی ہو لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اس قبیلے کے علاوہ اور لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے آنے لگے تو وہ چھوٹی مسجد ناکافی ہوگئی' چنانچہ اس کی توسیع کی گئی۔ یہی مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہے۔ بیعت عقبہ کے وقت کا قرآن مجید مسجد بنی زریق میں رہا۔

۲۶۹ سوال ۳ : پچھلے سال کسی لیکچر میں آپ نے موسیقی کے بارے میں فرمایا کہ اسلام میں اس کی اجازت ہے۔ کیا ساز کی بھی اجازت ہے' جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں آلات مزامیر کو توڑنے کے لیے آیا ہوں۔

جواب : آپ مجھے اس حدیث کا حوالہ دیں اگر حدیث صحیح ہوئی تو میں قبول کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ ہوں۔ باقی رہے ساز' تو میری موسیقی دانی کا یہ عالم ہے کہ مجھے علم نہیں کہ ساز کسے کہتے ہیں؟

۲۷۰ سوال ۴ : دوسرے علوم کی طرح علم نجوم بھی ایک علم ہے اس علم کے بارے میں اسلامی

[1] (ممکن ہے کہ یہ کوئی عمارت نہیں محض ایک احاطہ ہو۔ خود مسجد نبوی میں شروع میں چھت نہ تھی۔ جب جمعہ اور ظہر کے وقت نمازیوں کو دھوپ سے تکلیف ہونے لگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھت ڈلوائی۔)

نقطہ نظر واضح کریں۔ فال نکالنے اور ہاتھ دکھانے وغیرہ کو بھی مدنظر رکھیں؟

جواب : جس علم نجوم کا حدیث میں ذکر ہے اسے ہم Astronomy کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ نہیں ہے جسے Astrology کہتے ہیں۔ اس کے متعلق صراحت کے ساتھ بعض حد۔ثوں میں ذکر آتا ہے جو لوگ علم نجوم کی اساس پر کچھ بیان کرتے ہیں وہ ایک سچی بات اور ہزار جھوٹی باتیں کرتے ہیں۔ اس کی توجیہ یوں کی جاتی ہے کہ بعض جن آکر انھیں معلومات فراہم کرتے ہیں لیکن یہ "جن" خود کس طرح علم حاصل کرتے ہیں؟ وہ آسمان کی طرف جاتے ہیں اور وہاں سے کبھی کبھی آسمان کی کوئی چیز ان کے کان میں پڑ جاتی ہے اور وہ زمین پر آکر اپنے معتقدین کو ایک سچ میں ہزار جھوٹ ملا کر بیان کرتے ہیں۔ غرض وجہ جو بھی ہو اس بیان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم نجوم کو Astrology کے معنی میں اسلام میں کوئی مقبولیت حاصل نہیں ہے۔ فال نکال کر حوصلہ افزائی کرنا بارہا خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خاص کر قبائل کے ناموں کی اساس پر یعنی دو راستے ہوں' ایک پر پڑنے والے قبیلے کا نام اچھے معنی رکھتا تو ادھر جاتے' برا ہو تو اسے ترک فرما دیتے ہاتھ دکھانے (Chiromancy Palmistry) میں ہتھیلی کی لکیروں کی اساس پر رائے زنی کی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی دو آدمیوں کی ہتھیلیوں کی لکیریں یکساں نہیں ہوتیں۔ انگوٹھے کے نشان کا بھی یہی حال ہے اور اسے مغربی ممالک میں تو شناخت کے لیے قانونی قبولیت بھی حاصل ہے۔ ہاتھ بتانا دل بہلائی کی حد تک ہو تو میری دانست میں اس کی کوئی شرعی ممانعت نہ ہوگی' ایک لطیفہ عرض کرتا چلوں۔ ایک مرتبہ پیرس میں میرا ہاتھ دیکھ کر کسی نے کہا تمہاری دو بیویاں ہونی چاہئیں۔ دوسرے نے کہا تم وزیراعظم بنو گے۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی اب تک تحقق پذیر نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس علم پر اعتقاد نہیں۔ یہ کم و بیش خواب کی تعبیروں کی طرح کی چیز ہے۔

۲۷۱ سوال ۵ : کیا وجہ ہے کہ دور نبوی اور اس کے بعد کے مدارس زیادہ تر دنیوی تعلیم کے لیے وقف تھے؟

جواب : مجھے اس کا ثبوت چاہیے۔ میں نہیں جانتا کہ ایسا ہی تھا۔ اس کے برخلاف جتنے بھی مدارس تھے ان میں دینی تعلیم ہی ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر بغداد کا مدرسہ نظامیہ جس کی غزالی نے بھی صدارت کی تھی' وہاں دنیوی تعلیم و علوم کا کوئی ذکر نہیں ملتا' دینی علوم ہی ملتے ہیں۔ دنیوی علوم کو چھوڑ دیا گیا تھا مثلاً میں نانبائی ہوں یا لوہار اور سنار وغیرہ ہوں تو میں ہی اپنے بچے کو

اس فن کی تعلیم دے دیتا ہوں۔ آج بھی رواج ہے کہ اگر کوئی اجنبی میرے پاس آئے تو میں اپنے فن کی ساری باتیں شاید اسے نہیں بتاؤں گا' لیکن اپنے بچے سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ اسی لیے پرانے زمانے میں حکومت نے اس میں دلچسپی لینے کی ضرورت نہیں سمجھی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسا کرنے کی کوئی ممانعت تھی۔ اگر آج کوئی اسلامی حکومت پیشہ ورانہ تعلیم کے مدارس اپنی نگرانی میں قائم کرنا چاہے تو اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے' بلکہ ایک لحاظ سے بہتر ہے کہ یہ تعلیم بھی بغیر کسی دشواری کے سارے بچوں کو حاصل ہوگی اور طالب علموں کو ایسے نامعقول اساتذہ سے نجات ملے گی جو کام کی باتیں اجنبی طالب علموں سے چھپاتے ہیں۔ ایسے اساتذہ کے بارے میں مجھے ایک حدیث یاد آ رہی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص علم کو چھپائے' قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی' لیکن ظاہر ہے کہ آخرت کے خیال کو بعض لوگ طاق میں رکھنے کے قابل سمجھتے ہیں' عمل کرنے کے قابل نہیں۔

۲۷۲ سوال ٦ : آپ نے ابھی فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مریض آتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حالات سن کر مرض کے مطابق کوئی دوا یا غذا علاج کے طور پر تجویز فرما دیتے ایسی دوائیں یا غذائیں چند صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی نوٹ کیں؟

جواب : یہ آخری جز میں نے نہیں کہا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس کی روایت کی تاکہ اس کے ذریعے سے حدیث کی کتابوں میں اس کا ذکر آئے۔ لیکن صحابہ نے اس پر کتابیں نہیں لکھیں البتہ بعد کے زمانے میں بعض لوگوں نے طب نبوی کے نام سے حدیث سے حاصل ہونے والی ایسی معلومات کو جمع کرکے کتابی صورت دیدی۔ ان کتابوں کے نام آپ کو "کشف الظنون" میں مل جائیں گے اور ایسے مؤلفوں کی تعداد دس بارہ تک ہے لیکن چونکہ یہ میرے فن کی چیز نہیں اس لیے میں نے یہ نام یاد نہیں رکھے۔ ایک مرتبہ جمع کیے' اور پھر بھول گیا۔ معذرت چاہتا ہوں۔

۲۷۳ سوال ۷ : کیا اسلام میں مخلوط تعلیم کی اجازت ہے اور اگر ہے تو اسلام کہاں تک اس کی اجازت دیتا ہے؟

جواب : اسلام کے ابتدائی زمانے میں مسجد نبوی میں مرد بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی۔ ممکن ہے ان کے بیٹھنے کی جگہ الگ الگ ہو لیکن اس مقام پر' جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریر فرماتے' دونوں کے لیے بیک وقت استفادہ کرنے کا امکان تھا۔ اس سے استنباط کیا جا سکتا ہے

کہ سکول و کالج میں اس طرح کا انتظام کیا جا سکے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی نشستیں جدا جدا ہوں تو میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ خاص طور پر اگر کسی فن کا ماہر صرف ایک عورت یا صرف ایک مرد ہو تو اس سے دونوں کو استفادہ کرنا چاہیے' لڑکوں کو بھی لڑکیوں کو بھی۔ اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ دونوں کی تعلیم کا بیک وقت انتظام ہو سکے۔ مثلاً غور کیجئے کہ "کتاب الاموال" علم فینانس جیز ٹیکنیکل چیز کی ایک پرانی کتاب ابو عبید قاسم کی ہے۔ اس کی روایت کرنے والوں کی فہرست میں سب سے نمایاں نام ایک عورت کا ہے۔ وہ اپنے گھر میں اس کا درس دیا کرتی اور درس کو سننے کے لیے مرد بھی آیا کرتے تھے۔ اس کا انتظام کہ مرد اور عورتیں اکٹھے درس میں شریک ہوں' کیسے ہوتا تھا مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی استاد سے مرد اور عورت دونوں استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید (۳۳ : ۵۳) کا یہ فرمان کہ جب تم ازواج مطہرات سے کوئی چیز پوچھنا چاہو تو پردے کے پیچھے سے پوچھو۔ ظاہر ہے کہ پردے کے پیچھے سے سوال کرنے کی ضرورت صرف مردوں کو پیش آ سکتی تھی' خواتین کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ ان مختلف پہلوؤں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضرورت اور حالات پر منحصر ہے کہ اگر دونوں کے لیے الگ الگ مدرسے اور کالج بن سکتے ہیں تو بہت بہتر' ورنہ پھر تعلیم کا انتظام ایک ہی جگہ بھی ہو سکتا ہے۔

۲۷۴ سوال ۸۔ ہمارے ملکی وسائل کے مطابق عورتوں کی اتنی یونیورسٹیاں قائم نہیں کی جا سکتیں جتنی مردوں کی ہیں۔ حدیث نبویؐ ہے کہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے علم کا حصول فرض ہے ان حالات میں اسلامی نقطہ نظر سے ان مسائل کا کیا حل ہو گا؟

جواب : میرا تاثر یہ ہے کہ لڑکیوں کی بڑی اکثریت اس قدر تعلیم پانے کی خواہشمند نہیں ہوتی جس طرح لڑکا تعلیم حاصل کرنا چاہے گا۔ اس لیے لڑکیوں کو عام طور پر مڈل سکول یا ہائی سکول تک تعلیم' ان کی ضرورت کے مطابق دی جائے کیونکہ اس کے بعد ان کی شادی ہو جاتی ہے اور انھیں اپنے گھریلو کام کاج میں مشغول ہو جانا پڑتا ہے جن لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم پانے کی ضرورت ہے' تو میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ انتظام کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ اور خالص زنانہ یونیورسٹیاں نہ بھی بن سکیں تو بھی ان کی تعلیم کا ایسا بندوبست کیا جا سکتا ہے کہ وہ قباحتیں پیدا نہ ہوں جو اب پیش آتی رہتی ہیں۔

۲۷۵ سوال ۹۔ علم فلکیات والے کہتے ہیں کہ ستاروں کا اثر انسان کی عملی زندگی پر بہت گہرا

ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مسلمان ہوتے ہوئے ہمیں نجومیوں کی باتوں پر کہاں تک یقین کرنا چاہیے؟ اور اس طرح ہاتھوں اور زیورات میں استعمال ہونے والے پتھروں کے بارے میں بھی مہربانی فرما کر وضاحت کریں۔

جواب : فلکیات کے دو پہلو ابھی ایک دوسرے سوال کے سلسلے میں عرض کر چکا ہوں اسٹرانومی اور اسٹرالوجی میں فرق کیجئے۔ اسٹرانومی بہت اچھی چیز ہے۔ اس کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور اسٹرالوجی کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اعتماد کرنے کی چیز نہیں ہے کبھی کبھی اسٹرالوجی کے ماہر سچی بات ضرور کہہ دیتے ہیں لیکن وہ عام طور پر ایک من گھڑت چیز ہوتی ہے۔ خیال فرمایئے کہ یہ نجومی مجھ سے میری مستقبل کی زندگی ضرور بیان کرتے ہیں لیکن خود اپنی زندگی کے متعلق کبھی نہیں سوچتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بیچارے تمام عمر مفلس ہی رہتے ہیں اور بھیک کی طرح لوگوں سے کچھ پیسے مانگتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے ایک سبق ہے کہ ان کی ان باتوں پر یقین نہ کریں۔ جو ہمارے سامنے ہمارے متعلق بیان کرتے ہیں' یہ بات کہ ستاروں کا اثر انسانی زندگی پر ہوتا ہے' ممکن ہے ایسا ہوتا ہو کیونکہ ہمیں بعض اوقات مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ ایسی نظر نہ آئے والی چیزوں پر ایمان لائیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب سمجھ میں نہ آنے والی باتیں ستاروں کے اثرات ہوتے ہیں بلکہ یہ کہ بعض اوقات غیر مرئی اشیا کو ماننے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ ایک مثال دیتا ہوں کہ میرا منشا واضح ہو۔ چند مہینے کی بات ہے کہ ایک عیسائی انجمن نے پیرس میں مجھے ایک جلسے میں شرکت کی دعوت دی اور وہاں پر ایک فرانسیسی عیسائی عورت نے مجھ سے سوال کیا کہ آج کل مسلمانوں کے ہاں دینی عبادات کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا کہ کچھ عرصہ پہلے پیرس کے مسلمان نماز روزے پر کم توجہ دیتے تھے اب ان میں روز افزوں شوق نظر آتا ہے۔ اس نے کہا ہمارے ہاں بھی یہی حال ہے۔ پہلے گرجے خالی رہتے تھے' اب گرجے میں جگہ نہیں ملتی۔ اس کی کیا توجیہ کریں گے؟ اسے سوائے ستاروں کی گردش کے اثر کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔؟ اس کے سوا اور کوئی جواب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہاں اسے اللہ کا فضل قرار دیا جا سکتا ہے اور اگر ہم اپنے فرائض و واجبات سے غافل ہوں تو اسے اللہ کا غضب کہا جا سکتا ہے۔

ستاروں کے اثرات کے سلسلے میں بچہ بچہ جانتا دیکھتا ہے کہ سورج کی گردش کے مطابق گرمی' سردی' بارش' خزاں' بہار کے موسم آتے ہیں : چاند کی گردش سے سمندر میں مدوجذر (جوار بھاٹا) آتا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ بعض بیماریوں جنون وغیرہ کے جوش میں اس سے شدت یا

خفت بھی مشاہدے میں آتی ہے۔ دیگر کروڑوں ستاروں کے مجموعی اثرات اور ان ستاروں کے قران یعنی اجتماع کے مخلوط اثرات کیا پڑتے ہیں' اس بارے میں ابھی ہماری معلومات صفر سے بھی کم ہیں۔ لیکن جیسا کہ حدیث شریف میں صراحت ہے "جو کہے گا کہ فلاں ستارے نے اپنے طلوع (نوء) کے باعث یہ اثر ڈالا ہے تو وہ کفر ہے' کہنا یہ چاہیے کہ اللہ نے اس میں یہ تاثیر پیدا کی ہے۔" ہیرے جواہرات کے متعلق اسلام میں کوئی ممانعت نہیں' اور ان "پتھروں" پر زکات بھی نہیں ہے' ممکن ہے کہ ان "پتھروں" کے پہننے والے (یا والی) پر بھی ان پتھروں کے اثرات ہوتے ہوں۔

۲۷۶ سوال ۱۰۔ آپ نے پہلے بھی فرمایا تھا اور آج بھی ذکر کیا ہے کہ مہاتما بدھ غالباً نبی تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ نبی بھیجے ہیں۔ یہی سوال سری کرشن کے بارے میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں نے انھیں جس رنگ میں پیش کیا وہ ایک الگ بات ہے۔ مگر درحقیقت سری کرشن ایک اوتار تھے اور وحدانیت پر یقین رکھتے تھے۔ کسی جگہ پڑھا ہے کہ کورو پانڈوؤں کی لڑائی سے پہلے سری کرشن نے خدا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واسطہ دے کر پانڈوؤں کے لیے دعا مانگی تھی۔ بعد میں پانڈو کو فتح بھی ہوئی۔ ایسی دعا جس میں بہت بعد کے نبی اور ان کے صحابی کا ذکر موجود ہو کوئی نبی ہی مانگ سکتا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب : میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واسطہ دے کر سری کرشن جی نے دعا کی ہو۔ ویسے یہ بات میرے علم میں ہو بھی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ میں نے گوتم بدھ کے نبی ہونے سے متعلق کچھ اشارے کیے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کسی اور کی نبوت سے انکار کرتا ہوں۔ سری کرشن جی بھی نبی ہو سکتے ہیں۔ زردشت بھی نبی ہو سکتے ہیں' اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ لیکن ایسی تمام صورتوں میں جب تک قرآن و حدیث میں ان کا نام نہ آیا ہو تو ہم یقین نہیں کر سکتے۔

۲۷۷ سوال ۱۱۔ جب تک عقائد صحیح نہ ہوں احکام شریعت سے آگاہی فائدہ مند نہیں۔ جب تک یہ دونوں نہ ہوں تب تک قلب کی صفائی ممکن نہیں ہے۔ ہمارا اللہ ایک' رسول ایک' قرآن ایک اور دین ایک۔ مگر ہمارے علمائے کرام نے متعدد فرقے بنائے ہوئے ہیں مثلاً بریلوی' دیو بندی وغیرہ۔ ہر عالم ہم ان پڑھوں کو واعتصموا بحبل اللہ جمعیا ولا تفرقوا (قرآن ۳ : ۱۰۳) کی ترغیب و تبلیغ بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ فرقے بھی خود عالموں نے بنائے ہیں۔ کیا اس

آیت کا ان علماء پر اطلاق نہیں ہوتا؟ میرا ایک دوست ان فرقوں سے تنگ آ کر طنزیہ کہا کرتا ہے کہ میں عیسائی بننا چاہتا ہوں کیونکہ عیسائیت میں کوئی فرقہ نہیں آپ یہ فرمائیں کہ فرقہ پرستی کا یہ مرض علمائے کرام کے اندر کیوں پھیل رہا ہے؟

جواب : سوال کے دوسرے جز کا میں پہلے جواب دوں گا کہ عیسائیت میں کوئی فرقہ نہیں ہے۔ میں نے جرمن زبان میں لکھی گئی ایک کتاب دیکھی ہے جس میں بارہ سو عیسائی فرقوں کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے یہ دوست عیسائی بن کر مایوس ہی ہوں گے کہ اسلام ہی بہتر تھا کہ وہاں شاید صرف بارہ ہی فرقے ہیں' ویسے فرقہ بندی کا حل میرے نزدیک ایک ہی ہے کہ آپ دوسروں پر نہ جائیں اور اپنے پر توجہ دیں۔ آپ خود فرقہ پرستی کے مرض میں مبتلا نہ ہوں' اپنے آپ کو صد فی صد درست اور دوسروں کو بالکل غلط نہ کہیں۔ دوسروں کو ان کے خدا کے سپرد کیجئے' وہ اپنے اعمال اور عقائد کے بارے میں براہ راست خود جواب دے لیں گے۔ فرقہ بندی اسی طرح ختم ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں کو لکھنا پڑھنا آتا ہے ان کے لیے اپنے فرائض معلوم کرنے کے لیے آج بہت آسانی سے وسائل مہیا ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی بنیادی چیزوں کے متعلق بے شمار کتابیں ہیں۔ قرآن مجید کے تراجم موجود ہیں۔ حدیثوں کے مجموعے موجود ہیں۔ میرے خیال میں یہ کام اب تو بہت آسانی سے ہو سکتا ہے کہ ہم فرقہ بندی میں مبتلا نہ ہوں اور آپس کی لڑائی سے محفوظ رہیں۔

۲۷۸ سوال ۱۲۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کسی انسان کی نجات کلمہ طیبہ پڑھے بغیر ممکن ہے؟ اگر کوئی شخص لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ بھلائی کے ساتھ پیش آنے والا ہو تو کیا حکم ہے؟

جواب : اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی (۴ : ۱۵۰) ایک آیت ہے' جس میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسول میں تفریق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ایک پر ایمان لاتے ہیں' دوسرے پر نہیں لاتے تو وہ مسلمان نہیں کافر ہیں۔ ان حالات میں ہم آپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ جو شخص صرف اخلاق حسنہ پر عامل ہے اس کی نجات ہو جائے۔ اس کے برخلاف' اللہ کا' جو نجات عطا کرنے والا ہے' حکم ہے کہ تم میرے بھیجے ہوئے نبی پر ایمان لاؤ۔ اس حکم کی تعمیل ضروری ہے ایک آدھ استثناء کی صورت موجود ہے۔ مثلاً کسی شخص کو نبی کی بعثت کی اطلاع نہ ہوئی ہو۔ اس کا امکان آج بھی ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی اطلاع قطب شمالی و جنوبی کے لوگوں تک ہمارے مبلغین کی کوشش کے باوجود

نہیں پہنچی۔ ایسے لوگوں کی حد تک یہ کہنا کہ ان پر اسلام لانا واجب ہے یا نہیں؟ یہ سوال حل طلب ہو جاتا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ اگر وہ ایسی باتوں پر یقین رکھتا ہے جنھیں عقل بھی تسلیم کرتی ہے مثلاً اللہ کا ایک ماننا وغیرہ تو شاید خدا جو رحیم و کریم اور غفار ہے ایسے لوگوں کو معاف کر دے اور انھیں دوزخ میں نہ بھیجے لیکن جن لوگوں تک اسلام کی تعلیم پہنچ چکی ہے اور وہ ضد یا کسی اور وجہ سے اسے قبول نہیں کرنا چاہتے تو محض اخلاق حسنہ کے باعث' خدا ہی کے فرمان کے مطابق' ان کی نجات ناممکن ہے۔ ایسے لوگوں کا معاملہ ہمیں خدا پر ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر بخش دے گا تو اس سے ہمیں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

۲۷۹ سوال ۱۳۔ نماز پڑھتے وقت سر پر کپڑا لینا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر نماز سر ڈھانپے بغیر پڑھی جائے' جب کہ کپڑا موجود ہو تو کیا حکم ہے؟ دلیل دیں۔

جواب : اس سوال کے دو جواب ہیں' ایک عورتوں کے متعلق اور دوسرا مردوں کے متعلق ہے۔ عورتوں کے لیے صراحت سے حکم ملتا ہے کہ وہ اپنے سر کو ڈھانپیں اور بالوں کو بھی چھپائیں۔ لہٰذا ان کی حد تک ننگے سر نماز پڑھنا عام حالات میں مناسب نہیں ہو گا۔ بجز اس کے کہ کوئی خاص حالت پیش آئے' مثلاً عورت کے پاس کپڑے نہیں اور وہ تنہا ہے تو یہ اس کی مجبوری ہے خدا اسے معاف کرے گا۔ مرد کے متعلق سر ڈھانپنا ضروری نہیں ہے۔ میں ضروری نہیں کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ ٹوپی پگڑی پہنے تو بہت اچھا ہے' نہ پہنے تو کسی کو کافر کہنے کا حق نہیں۔ چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ صحیح بخاری کی کتاب الصلوۃ میں آیا ہے۔ ایک صحابی تھے حضرت جابر۔ ان کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت بعد' خلافت کے زمانے میں ایک دن ان کو کچھ لوگوں نے بہت ادب سے اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے بعد لوگوں نے درخواست کی کہ آپ ہی نماز پڑھایئے ہم آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً اس سے کچھ پہلے آپ کے سوال ہی کی قسم کی گفتگو ہوئی تھی۔ بہرحال ان صحابی نے نماز پڑھانا قبول کیا۔ نماز سے قبل انھوں نے سجادہ کی طرف جاتے ہوئے پہلے عمامہ اتارا پھر جبہ اتار پھینکا اور پھر قمیض اتار دی۔ صرف تہمد (لنگی) کے ساتھ آگے آئے اور آگے بڑھ کر نماز شروع کی۔ لوگ حیران ہوئے۔ اس پر انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ بخاری میں ان الفاظ میں آیا ہے' کہ "تم جیسے جاہلوں کو بتانے کے لیے میں نے عمداً" ایسا کیا ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تمھارے خیال میں ہمارے پاس دو دو کپڑے ہوتے تھے؟ اس وقت ہم ننگے سر ہی نماز

پڑھتے تھے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کا ڈھانپنا بے شک اچھا ہے' ادب کا تقاضا ہے' اور اس آیت شریف (۷ : ۳۱) کے مطابق ہے کہ جب نماز کے لیے جاؤ تو زینت کے ساتھ جاؤ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ واجب ہے۔ اگر بغیر سر ڈھانپے نماز پڑھنا چاہیں تو اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ اصل چیز دل کا خشوع و خضوع نہ کہ ظاہری ہیئت۔

۲۸۰ سوال ۱۴۔ آپ نے فرمایا کہ مسجد نبوی کے لیے پہلے والی مسجد کی توسیع ہوئی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت تعین قبلہ کا مسئلہ پیدا ہوا۔ جب مسجد موجود تھی تو قبلہ کا تعین بھی پہلے سے موجود ہونا چاہیے؟

جواب : قبلہ کا تعین پہلے سے موجود ہو گا اور مدینے والوں نے بھی قبلہ (بیت المقدس) کی جہت اسی طریقے سے معین کی ہو گی جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ پرانی مسجد کا رخ سو فی صد اتنا ہی درست تھا جس قدر آج کل کی مسجد کا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ آج کل مسجد جو عہد نبوی کے قبلہ دوم یعنی کعبۃ اللہ کی سمت میں بنائی گئی ہے وہ اتنا صحیح ہے کہ قطب نما اور جدید ترین آلات کے ذریعہ سے بنائے جانے والے رخ سے بھی زیادہ صحیح ہے یہ بات میں مذاق کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ امر واقعہ ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے ترکوں نے حجاز ریلوے کے نام سے ایک ریل بنائی جو شام اور اردن سے گزرتے ہوئے مدینے تک آ چکی تھی۔ مدینہ کا سٹیشن اب تک موجود ہے۔ اس کے سامنے ایک مسجد بھی ہے جو ریلوے کے نمازیوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس مسجد کے رخ کا تعین جرمن انجینئر نے کیا تھا۔ اس کے اندر آپ جا کر دیکھئے' چونکہ قبلہ کا رخ غلط ہے اس لیے جائے نمازوں کو ترچھا کر کے بچھایا جاتا ہے۔

۲۸۱ سوال ۱۵۔ کیا اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لیے اسلامی تعلیمات کا عام ہونا لازمی ہے؟

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں دو جواب نہیں ہو سکتے' ایک ہی جواب ہو گا کہ اسلامی تعلیمات کے بغیر کوئی معاشرہ مسلمان نہیں کہلا سکتا۔

۲۸۲ سوال ۱۶۔ کیا تغیر شدہ معاشرہ میں اسلام کو سمجھنے کے لیے مادری زبان کا عام ہونا ضروری ہے؟

جواب : اگر اس کے بغیر آپ کوئی تعلیم پا سکتے ہیں تو اس میں کوئی امر مانع نہیں زبان مقصد نہیں بلکہ محض ایک وسیلہ ہے۔ ہم اسلامی معلومات جس ذریعہ سے بھی حاصل کر سکیں' ہمیں

حاصل کرنی چاہئیں۔ اس کے لیے زبانوں کی قید نہ صرف بے معنی ہے بلکہ ضرر رساں بھی۔
میں آپ کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خاص طور پر محترم صدر کا جنھوں نے مہربانی فرما کر دیر تک اپنا وقت دیا اور یہاں موجود رہے۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

خطبہ ۱۰

عہد نبویؐ میں نظام تشریع و عدلیہ

محترم صدر! محترم وائس چانسلر صاحب! محترم سامعین!

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ!

۲۸۳ ۔ الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین والہ واصحابہ اجمعین!

۲۸۴ ۔ آج کا مضمون دو ایسے موضوعوں سے متعلق ہے' جن میں بے شمار باتیں تشریح طلب ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب پر ایک مختصر تقریر میں جیسی روشنی چاہیے' نہیں ڈالی جا سکتی۔ آج کے لیکچر میں دو مسئلوں پر خصوصی بحث کرنی ہے۔ ایک "قانون سازی" اور دوسرے "عدلیہ" جس کی غرض کے لیے قانون سازی ہوتی ہے۔ جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے' دو تمہیدی باتیں ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اول یہ کہ قانون دو طرح سے بنتا ہے۔ ایک یہ کہ نامعلوم زمانے سے رسم و رواج کی صورت میں کوئی قاعدہ چلا آ رہا ہو' اور ہمیں بالکل معلوم نہ ہو کہ اس کا بنانے والا کون تھا؟ وہ کتنے عرصے سے چلا آ رہا ہے؟ اور اس کی تاریخ کیا رہی ہے؟ دوسری قسم قانون کی وہ ہوتی ہے' جسے معلوم المصنف کہہ لیں۔ یعنی اس کے بنانے والے کا ہمیں پتا ہوتا ہے' مثلاً کوئی بادشاہ' کوئی حکمران جو ایک قاعدہ اپنے ماتحت لوگوں کے لیے مقرر کرتا ہے اور وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ کبھی اسے ایک معلوم انسان ہی پیش کرتا ہے' لیکن یہ کہتے ہوئے کہ یہ میرا بنایا ہوا قانون نہیں بلکہ خدا کے احکام ہیں۔ مگر ان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ رسم و رواج کے متعلق ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ قانون کیسے بنا؟ ممکن ہے اس کا کوئی جزء تو ایسا ہو' جو خدائی احکام کے طور پر' کسی پیغمبر کے ذریعے ہم تک پہنچا ہو جسے ہم فراموش کر گئے ہوں اور وہ عمل ہماری عادت بن گیا ہو اور بطور نتیجہ اس عمل کو ہم نے جاری رکھا ہو۔ قانون اصل میں دو طرح کے ہیں۔ ایک خالص انسانی قانون اور دوسرا خدائی قانون۔ ایک تمہیدی مگر اہم بات یہ کہ قانون بن

جانے کے بعد اس کو ایک مماثل درجے کا اقتدار رکھنے والی مماثل درجے کی شخصیت ہی بدل سکتی ہے اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اپنی جماعت کے اندر ایک حکم دے تو کوئی طالب علم یا دفتر کا کوئی ادنیٰ ملازم اس کو بدل نہیں سکتا۔ البتہ وائس چانسلر اسے بدل سکتا ہے یا وائس چانسلر سے بھی بڑی شخصیت وزیر تعلیم یا ملک کا حکمران اسے بدل سکتا ہے۔ لیکن بنانے والے سے کمتر مرتبے کا شخص نہیں بدل سکتا۔ اس قاعدے اور اصول کے اثرات بہت دور رس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی قانون اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہو تو اس کو بدلنے والا اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ خدا سے کم تر رتبے کا کوئی فرد اس کو بدلنے کا اختیار نہیں رکھتا اور اگر بدلے تو وہ ملحد ہوگا اللہ کو نہ ماننا ہوگا۔ اللہ کے بعد پیغمبر اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی قانون بنا سکتا ہے جبکہ اسے وحی نہ آئی ہو اور وہ اپنی صوابدید اور ملکہ استدلال سے حکم دیتا ہے تو اب اس قانون کو کوئی پیغمبر ہی بدل سکتا ہے۔ پیغمبر سے کمتر درجے کی کوئی شخصیت مثلاً کوئی بادشاہ کوئی مجتہد کوئی فقیہ اس کو بدلنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ البتہ اللہ کی ذات پیغمبر کے حکم کو بدل یا منسوخ کر سکتی ہے۔ یعنی قانون بدلنے کا بھی ایک معیار ہے مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اگر توریت میں کوئی حکم ہو تو انجیل یا قرآن مجید سے اسے بدل سکتے ہیں کیونکہ وہ بھی اللہ کے احکام کا مجموعہ ہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے بدل سکتے ہیں۔ غرض پیغمبروں کے احکام کو یا تو اللہ کی ذات بدلے گی یا کوئی اور پیغمبر ہی وحی کے ذریعے سے بدل سکے گا۔

۲۸۵ ۔ اس پس منظر میں اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلامی قانون کس طرح بنتا ہے؟ جہاں تک اسلام کی تاریخ کا تعلق ہے تو ہم جانتے ہیں کہ عہد نبوی غار حرا میں پہلی وحی کی تاریخ سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تیئیس سال کے عرصے پر مشتمل رہا اور یہ کہ اسلام کا اساسی ماخذ قانون یعنی قرآن مجید ایک دم نازل نہیں ہوا۔ وہ کتابی صورت میں یا تختیوں پر لکھے ہوئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قانون کی طرح ہم تک نہیں پہنچا بلکہ تیئیس (۲۳) سال کے عرصے میں وقتاً فوقتاً نازل ہونے والی آیات کی صورت میں امت تک پہنچایا گیا۔ ان حالات میں بہت ہی سادہ اور بدیہی بات ہے کہ غار حرا میں جس وقت پہلی وحی یعنی سورۃ اقراء (۹۶:۱-۵) کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئیں، اس وقت اسلامی قانون موجود نہیں تھا۔ قرآن مجید یا حدیث میں جو احکام آئے وہ رفتہ رفتہ بعد میں آئے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کی ابتداء میں اسلامی قانون کیا تھا؟

قرآنی اشارات کی بنا پر اور تاریخ عہد نبوت کی روشنی میں ہم پورے ادب کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں، کہ شہر مکہ کے جو بھی رسم و رواج تھے، وحی کی غیر موجودگی میں وہی مسلمانوں کا قانون تھا اور وہ اس پر عمل کرتے رہے۔ مثلاً شراب کی ممانعت ہجرت کے کئی سال بعد نازل ہوئی۔ ان آیات کا شان نزول یہ ہے کہ ایک دن ایک صحابی نے شراب پی لی تھی۔ وہ نشے کی حالت میں تھے کہ نماز پڑھائی تو سورہ "قل یایھا الکفرون" کی آیات اس طرح پڑھ ڈالیں، جس سے معنی الٹ گئے اور جو چیز ناگفتنی تھی وہ ان کی زبان سے نکل گئی۔ تو اس سلسلے میں قرآن مجید کی وہ آیات نازل ہوئیں، جن میں شراب پینے کو حرام قرار دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ حکم آنے تک شراب کا پینا واجب تو نہیں جائز تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو کبھی شراب نہیں پی، لیکن کچھ صحابہ اس سے ضرور دل بہلائی کرتے رہے۔ یہی حال اور سارے احکام کا ہے۔ پہلی وحی میں اگرچہ بت پرستی کی ممانعت کی گئی تھی لیکن اور احکام و ممانعت کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ممنوعات کی عقل بھی متقاضی ہے۔ مثلاً چوری نہیں کرنی چاہیے! کسی بے قصور کو جان سے نہیں مارنا چاہیے، کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے۔ انسانی فطرت اور انسانی عقل بھی ان کو نامناسب سمجھتی ہے۔ ان کی ممانعت تو جاری رہ سکتی ہے، لیکن جن چیزوں کے متعلق انسانی رائے میں اختلاف ہو سکتا ہے، مثلاً شراب کا پینا، سور کا گوشت کھانا، ان پر اگر اہل مکہ عمل کرتے رہے ہوں اور اس کی ممانعت ابھی تک نہ آئی ہو تو مسلمانوں کے لیے اس پر عمل کرنا، جائز قرار دیا جائے گا۔ وہ اسلامی قانون ہی ہوگا، اگرچہ عارضی اور قابل تبدیلی قانون ہو، لیکن بہر حال اسلامی قانون ہی ہو گا۔ وحی اور قرآن کی بحث کے ضمن میں ایک اور چیز کا ذکر کرنا ناگزیر ہے جسے اصول فقہ کی کتابوں میں "شرائع من قبلنا" کا نام دیا گیا ہے، یعنی اسلام سے قبل کے صحف سماوی۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے۔ سب سے اہم صراحت سورہ انعام (۶:۸۳ تا ۹۰) میں ہے جہاں کوئی بیس پیغمبروں کے نام لینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے۔ "اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ" (یعنی مذکورہ بالا لوگ وہ ہیں جن کو خدا ہی نے صحیح راستہ بتایا ہے اس لیے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تو ابھی انھیں کے راستے کی اقتداء کر) نتیجہ یہ ہے کہ اگر پرانی خدائی کتاب ہم تک پہنچے، اور اس کی صحت کا اطمینان ہو، اور اس کتاب کے احکام کو قرآن نے یعنی خدا نے بعد میں منسوخ بھی نہ کیا ہو تو وہ پرانے نبی کی وحی مسلمانوں پر بھی واجب التعمیل رہے گی، کیونکہ وہ خدا ہی کے حکم پر مشتمل تھی۔ اور خدا کا حکم

اگر خدا ہی نہ بدلے تو وہ برقرار رہے گا۔ ہمارے فقہاء نے ایسی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ چند کا ذکر کرتا ہوں جن سے مفہوم آپ پر واضح ہو جائے گا۔ چنانچہ سورہ مائدہ (۴۵:۵) میں خدا فرماتا ہے: "ہم نے یہودیوں کے لیے توریت میں حکم دیا ہے کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ...." صراحت سے یہ توریت کا اور یہودیوں سے مختص قانون ہونے کے باوجود اسلامی قانون کا جزء بن جاتا ہے۔ ایک دوسری مثال سورہ نور (۲:۲۴) ہے جہاں غیر شادی شدہ زنا کار مرد اور عورت کو ایک سو درے یا کوڑے مارنے کا حکم ہے، لیکن شادی شدہ لوگوں کی زنا کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے (شادی شدہ) لوگوں کی زنا کاری پر توریت اور انجیل دونوں میں رجم کرنے کا حکم موجود ہے (اور صحیح بخاری وغیرہ کے مطابق رسول اکرم نے اس کی صحت کی توثیق بھی فرمائی ہے)۔ لہٰذا جس توریتی اور انجیلی حکم سے قرآن نے سکوت کیا وہ برقرار رہے گا۔ چنانچہ اسلام میں بھی رجم کے حکم کو رسول اکرم اور بعد کے سارے خلفاء اور فقہاء نے برقرار سمجھا اور نافذ کیا۔ غرض "شرائع من قبلنا" بھی اسلامی قانون کا ایک ماخذ ہیں بشرطیکہ ان کی صحت کا ثبوت ملے اور قرآن و حدیث نے ان کو بدلنے کا حکم نہ دیا ہو۔

۲۸۶ ۔ اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ حدیث و سنت ہیں اور وہ قیامت تک برقرار تو رہتے ہیں لیکن ان کا بننا اور بدل سکنا ایک محدود زمانے یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں وقوع میں آتا ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے بننے اور بدلنے کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ہمارے پاس محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے بعد، ان میں تبدیلی غیر ممکن ہو جاتی ہے۔ اس مختصر صحبت میں یہ تو ممکن نہیں کہ تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ قرآن و سنت میں کون سا قانون پہلے آیا، پھر تیئس سال کے عرصے میں اس میں کیا تبدیلی اور اضافے ہوئے۔ لیکن مجموعی طور پر ہم یہ پیش نظر رکھیں گے کہ قرآن مجید کے ذریعے سے جو احکام آئے، وہ خدائی حکم کے طور پر ہمارے پاس آئے، اور اس میں تبدیلی اور تو اور خود پیغمبر بھی اپنی ذاتی رائے سے نہیں کر سکتا۔ اس طرح سنت کے ذریعے سے جو احکام ہم تک پہنچتے رہے، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم یہ ہے کہ وحی و الہام کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے ہیں اور اس شرط یا اس صراحت کے ساتھ کہ انھیں قرآن میں داخل نہ کیا جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے "وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحیٰ" (۵۳:۳، ۴) (پیغمبر جو چیز بھی بیان کرتا ہے۔ وہ اپنی ذاتی خواہش کی وجہ سے نہیں ہوتا

ہے بلکہ خدا ہی کی وحی ہوتی ہے۔ جو اس تک پہنچائی جاتی ہے)۔ تو اگر پیغمبر کی بیان کردہ چیزیں قرآن میں داخل نہ کی گئی ہوں' تو مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہوتا ہے کہ وہ الہام کے ذریعے پیغمبر تک پہنچی ہیں اور پیغمبر نے پوری دیانت سے ہم تک پہنچائی ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مسئلے میں احکام کی ضرورت ہو' قرآن میں وہ احکام ہمیں نہ ملتے ہوں' اور وحی کا انتظار ہو' مگر وحی آتی نہیں تو ان حالات میں اگر معاملہ ایسا ہے کہ جس میں انتظار کیا جا سکتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتظار کرتے ہیں۔ لیکن معاملہ فوری ہو تو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اجتہاد و استنباط کر کے' استدلال کر کے' اپنی صوابدید سے کوئی حکم دیں۔ ایسے حکم کی دو صورتیں ہوں گی یا تو خدا اس کی توثیق کر دے گا یا خدا اس کو نامناسب سمجھے تو تبدیلی کا حکم دے گا۔ اس بارے میں ایک معقول تصور یہ بھی ہے کہ اگر خدا کو رسول کا استنباط نامناسب نہ معلوم ہو تو توثیق سکوت کے ذریعے سے بھی ہو سکتی ہے' اور وحی کے ذریعے سے صراحت کے ساتھ بھی۔ یہ فوری بھی ہو سکتا ہے اور اس میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ اگر خدا کی طرف سے ترمیم کا کوئی حکم نہ آئے تو چاہے کتنی ہی مدت گزر جائے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے مجاز ہوں گے کہ اس پر عمل کرتے رہیں کیونکہ اس کی تبدیلی کا خدا نے حکم نہیں دیا۔ پیغمبر کے استدلال و استنباط میں تبدیلی کے لیے خدا کا حکم آنا ضروری ہے۔ چنانچہ ایسی مثالیں قرآن مجید میں ملتی ہیں مثلاً جنگ بدر کے قیدیوں سے کیا برتاؤ کرنا چاہیے' اس بارے میں کوئی صریحی حکم اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ لے کر ان کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا تو فوراً ہی خدا کی طرف سے وہ مشہور آیت تنبیہہ نازل ہوئی: "لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم" (۶۸:۸) (اگر اللہ اس سے پہلے ہی فیصلے نہ کر چکا ہوتا تو اس چیز کی بنا پر جو تم نے حاصل کی ہے (یعنی مال فدیہ) تمھیں سخت عذاب دیا جاتا' یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ یہ بھی وضاحت کر دیتا ہے کہ رسول کا انسانی حیثیت میں استنباط اسے پسند نہیں آیا' البتہ اس خاص صورت میں' جو میں بیان کر رہا ہوں' اس کے متعلق خدا یہ وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ "میں پہلے ہی سے طے کر چکا تھا کہ اپنے پرانے (توریت کے) قانون کو امت محمدیہ کے لیے بدل دوں۔ لہٰذا اب میں محمد رسول اللہ کے فیصلے کو قبول کرتا اور اس کی توثیق کرتا ہوں' تم اس پر عمل کر سکتے ہو۔" اس کے برعکس رسول کریم کے استنباط کردہ حکم کی قرآن کے ذریعے سے یا وحی کے ذریعے سے فوراً تنسیخ ہو گئی تو ایسی تنسیخ کی بنا پر رسول اللہ کے حکم کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔ غرض جہاں تک اسلامی

قانون کے بنیادی اساسی ماخذوں کا تعلق ہے' پہلی چیز ملک کا رسم و رواج ہے۔ جو معقولیت کے منافی نہ ہو اور جس میں اس وقت تک قرآن و سنت کے ذریعے سے تبدیلی نہ کی گئی ہو۔ دوسرا ماخذ قانون' وضع کردہ قانون یعنی صراحت کے ساتھ کسی قاعدے کا مقرر کرنا ہے' اور یہ قرآن کے ذریعے سے بھی ہو سکتا ہے' سنت کے ذریعے سے بھی۔ ان دونوں میں ایک اساسی فرق یہ ہے کہ قرآن اللہ کا حکم سمجھا جائے گا اور سنت کے سلسلے میں مختلف وجوہ سے ہم کوئی حکم سنیں تو اس کا درجہ قرآن کے بالکل برابر ہو گا۔ مثلاً اگر عہد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص یہ کہتا کہ یہ قرآن ہے' اللہ تعالیٰ کا حکم' میں اس کی تعمیل کرتا ہوں' اور یہ آپ کا انسانی حکم ہے' میں اس کی تعمیل نہیں کرتا۔ ظاہر ہے ایسے شخص کو فوراً ہی ملت سے خارج کر دیا جائے گا۔ جس وجہ سے حدیث کی حیثیت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ قران کی تدوین و تحفظ اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا انتظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں کرایا۔ اور اس کے ایک ایک حرف کو اپنے حکم کے ذریعے سے امت تک پہنچایا۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے' اس کا زیادہ حصہ ایسا ہے جو صحابہ نے اپنی ذاتی صوابدید سے لکھا' یہ بھی ممکن ہے کہ صحابہ کی انفرادی قابلیتوں کے اختلاف کے باعث ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور دوسرا صحابی کسی نہ کسی وجہ سے' مثلاً یہ کہ وہ عالم و فاضل نہیں ہے یا یہ کہ وہ ان پڑھ ہے بدوی ہے یا عین اس وقت کسی کے چھینک لینے سے اس نے کوئی لفظ نہیں سنا' اور کسی ایک بنیادی اہم لفظ کے نہ سننے سے اس حدیث کے صحیح مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اگر بعد میں وہ کوئی روایت کرتا ہے تو وہ حدیث کی صحیح روایت نہ ہو گی۔ چنانچہ قرآن جس کی تدوین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں کرائی' اور حدیث' جو صحابہ نے ذاتی صلاحیتوں کے مطابق انفرادی طور پر مرتب کی' دونوں میں فرق ہو گا۔ اس لیے بعد کے زمانے میں کسی حدیث پر عمل کرنے کے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ آیا یہ ابتدائی حکم ہے یا آخر تک یہی قانون رہا۔ شروع میں ایک حکم دینے کے بعد اسے منسوخ تو نہیں کر دیا؟ آیا یہ حکم کسی مخصوص شخص کے لیے تھا یا وہ سارے لوگوں کے لیے ہے؟ اس حدیث کو صحابی نے صحیح طور پر سنا اور صحیح طور پر لکھا یا ان کی انفرادی صلاحیتوں کی وجہ سے اس میں کچھ فرق بھی پیدا ہو گیا ہے؟ صحابہ کے بعد تابعین کی روایات سے مختلف زمانوں میں صحت حدیث پر کوئی اثر تو نہیں پڑا؟ انہی وجوہ سے حدیث کا درجہ قرآن کریم سے کم تر ضرور ہے لیکن اس کا جو اصل اصول ہے

وہ میں آپ سے بیان کر چکا ہوں' کہ رسول کے حکم کو صرف رسول ہی بدل سکتا ہے۔ رسول سے کمتر درجے کی شخصیت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کوئی تبدیلی کرے۔ ضمناً" میں یہ بھی عرض کر دوں کہ حدیثوں کی صحت معلوم کرنے کے لیے بہت سے وسائل ہیں۔ ہمارے اسلاف نے بہت سے اصول مدون و مرتب کر کے' ہمیں حدیثوں کے جانچنے کا معیار دیا ہے کہ کون سی حدیث قابل اعتماد ہے؟ اگر دو حدیثوں میں اختلاف ہے تو کس کو ترجیح دی جائے؟ واضح رہے کہ میرا یہ منشاء ہرگز نہیں کہ حدیثوں پر اعتماد نہ کیا جائے۔ کیونکہ "صحاح ستہ" جیسی حدیث کی کتابوں کے متعلق ہمیں یہ اطمینان ہے کہ ان کی تدوین' انسانی حد تک' صحت کے تمام اصول و شرائط کے مطابق ہوئی ہے۔ لہٰذا حدیث کی کم ترین درجے کی کتاب کو بھی میں پورے اعتماد کے ساتھ دوسری قوموں کی مستند ترین کتابوں پر ترجیح دوں گا۔ مثال کے طور پر انجیل کو لیجئے۔ انجیل جو آج کل چار انجیلوں کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ اس کے متعلق خود عیسائی مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے تین سو سال بعد پہلی مرتبہ اس کا ذکر ملتا ہے۔ ان تین صدیوں میں نسلاً" بعد نسل اس کو کس طرح نقل کیا گیا اور ایک نسل سے دوسری نسل تک کس طرح پہنچایا گیا؟ اس کا قطعاً" ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ اس کے برخلاف حدیث کی ادنیٰ ترین کتاب میں ایک ایک سطر والی حدیث کے متعلق بھی پوری تفصیل سے حوالے (References) ملتے ہیں: فلاں نے فلاں سے سنا' اس نے فلاں سے' اس نے فلاں سے' اس طرح حوالوں کا یہ سلسلہ بالاخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لہٰذا اتنے حوالوں کی موجودگی میں حدیث کی ادنیٰ ترین کتاب بھی دوسری قوموں کی اعلیٰ ترین کتابوں کے مقابلے میں زیادہ بلند درجہ رکھتی ہے۔

۲۸۷۔ احکام کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ سارے احکام یکساں درجے کا حکم نہیں رکھتے۔ بعض کی حیثیت فرض یا واجب کی ہو گی بعض کا حکم سفارش اور مستحب کا ہو گا۔ بعض کی صورت حرام کی ہو گی' یعنی ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ بعض کی ممانعت ایسی ہو گی کہ نہ کرو تو بہتر ہے' وہ مکروہ سمجھے جائیں گے۔ اور بہت سی چیزوں کے متعلق یہ حیثیت ہو گی کہ وہ ہماری صوابدید پر چھوڑی گئی ہیں یعنی مباح ہیں' چاہے تو کریں' چاہے نہ کریں۔ مگر یہ تصور کسی قدر دیر سے پیدا ہوا کہ علمی نقطہ نظر سے احکام کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا جائے اور یہ تقسیم اخلاقی اساس پر ہو گی۔ جو چیز خیر ہے' اچھی ہے' بہتر ہے' اسے ضرور کرنا چاہیے۔ جو چیز شر ہے' بری ہے' اسے

ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ جس چیز میں خیر غالب ہے لیکن اس میں شر کا بھی ایک عنصر پایا جاتا ہے اس کا کرنا بہتر ہے لیکن واجب نہیں ہو گا اس کے برخلاف جس میں شر کا غلبہ ہے اگرچہ خیر کا بھی کچھ عنصر پایا جاتا ہے اس کا نہ کرنا بہتر ہے اسے مکروہ کہا جائے گا اور جن چیزوں میں یہ صورت نہیں ہے' اور نہ خیر ہے نہ شر ہے یا اس میں دونوں برابر ہیں' اس کو ہم مباح قرار دیں گے۔ یہ پنج گانہ تقسیم غالباً دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی اور جیسا کہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے' یہ معتزلہ اصول فقہ کی کتابوں میں ہمیں پہلی مرتبہ ملتی ہے۔ اس سلسلے میں قطع کلام کے طور پر ایک چھوٹی سی بات عرض کروں گا کہ بھلائی اور برائی کے لیے قرآن میں دو اصطلاحیں آئی ہیں' جو دلچسپ ہیں اور شاید ضرورت ہے کہ اس کی تھوڑی سی تحلیل بھی کی جائے۔ اچھی چیز کو قرآن "معروف" کہتا ہے اور بری چیز کو "منکر" کہتا ہے' "امر بالمعروف' نہی عن المنکر"۔ کہیں کہیں "خیر" اور "شر" کا لفظ بھی آیا ہے۔ لیکن عام طور پر خیر کی جگہ "معروف" کا لفظ اور "شر" کی جگہ منکر کا لفظ مستعمل ہے۔ "معروف" کے لفظی معنی ہیں وہ چیز جو سب لوگ جانتے ہوں اور "منکر" "وہ چیز جو بالکل نہیں جانی جاتی"۔ بہت دنوں تک میں سوچتا رہا کہ یہ اصطلاح اس معنی کے لیے استعمال ہوئی؟۔ ہر وہ چیز جو معقول ہے۔ جسے عقل انسانی قبول کرتی ہے اور ہر شخص اس کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ اچھی ہے' اسی کا حکم دیا جائے گا' اور جس چیز کو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بری ہے' اسے ممنوع قرار دیا جائے گا۔ یہ ان دونوں اصطلاحوں (معروف و منکر) کی وجہ تسمیہ ہے۔ ویسے ہمارا خالق و مالک جو حکم چاہے دے سکتا ہے۔ البتہ وہ حکیم ہے' بری چیز کا کبھی حکم نہیں دیتا۔ اس کا ہر حکم حکیمانہ اور اچھا ہی ہو گا چاہے انسان کسی حکم کی حکمت کو سمجھے یا نہ سمجھے۔

۲۸۸۔ عہد نبویؐ میں کچھ اور بھی ماخذ قانون ملتے ہیں' ان کا ذکر کرنے سے پہلے میں عرض کروں گا کہ قرآن اور حدیث' ابدی ماخذ قانون ہیں۔ چونکہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسالت و نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا آپ کا لایا ہوا قانون یعنی قرآنی قانون قیامت تک نافذ رہے گا۔ اسی طرح پیغمبر کے حکم کو منسوخ کرنے کے لیے ایک نئے پیغمبر کی ضرورت ہو گی اس کے نہ آسکنے کی بنا پر حدیث و سنت بھی ابدی بن جائیں گے اور قیامت تک ان پر عمل کرنا ہمارے لیے واجب ہو جائے گا۔ کتاب و سنت میں بعض چیزیں مستحب ہیں' بعض حرام ہیں اور بعض مکروہ ہیں۔ محض امر کا صیغہ استعمال کرنے سے وہ ایک درجہ میں نہیں پہنچ جاتیں۔ مثلاً

قرآن مجید میں زکوٰۃ دینے کا حکم ہے' جو فرض ہے۔ اور قرآن میں اسی صیغے کے ذریعے حکم آئے گا کہ خیرات کرو' ظاہر ہے کہ یہ فرض نہیں بلکہ اس کی ترغیب دلائی جاتی ہے۔

۲۸۹۔ عہد نبوی میں بعض اور ماخذ ہائے قوانین بھی ہمیں ملتے ہیں جو مؤقتی یا عارضی ہیں۔ ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو ہم "معاہدہ" کا نام دیتے ہیں۔ اور مسلمان اگر کسی معاہدے میں کچھ شرطیں قبول کرتے ہیں' تو وہ شرطیں مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل ہوں گی لیکن اس وقت تک جب تک کہ وہ معاہدہ برقرار ہے۔ جیسے ہی وہ معاہدہ ختم ہو جائے یا وہ منسوخ کر دیا جائے تو وہ شرطیں بھی جو ہمارے قانون کا جزو بن چکی تھیں منسوخ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح معاہدے کے ذریعے قبول کی ہوئی شرطوں کو اسلامی قانون کا عارضی اور موقتی جزء سمجھا جائے گا۔ اگرچہ اس کی تعمیل اتنی ہی ضروری ہے جتنی ان احکام کی' جو ابدی طور پر قیامت تک کے لیے قرآن و حدیث میں دیے گئے ہیں۔ اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ صلح حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط منظور فرمائی تھی کہ اگر کوئی مسلمان مشرکین مکہ کے ہاں پناہ گزیں ہو جائے تو اس کا مسلمانوں کے سپرد یا تحویل کیا جانا مشرکین مکہ کے لیے ضروری نہیں ہو گا۔ اس کے برخلاف اگر مشرکین کا کوئی شخص مسلمان ہو کر بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پناہ کے لیے آتا ہے تو اس معاہدے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ قرار دے دیا گیا تھا کہ اس شخص کو مکے والوں کے مطالبے پر واپس کر دیں۔ اگرچہ یہ ایک یک طرفہ کارروائی تھی لیکن جب تک وہ معاہدہ برقرار رہا۔ وہ قاعدہ اسلامی قانون کا جزو رہا۔ جیسے ہی وہ معاہدہ دو سال بعد ختم ہوا' ان حالات میں وہ قانون بھی' وہ شرطیں بھی خود بخود ختم ہو گئیں۔

۲۹۰۔ ایک اور ماخذ قانون یہ ہے کہ بعض وقت نیا قانون بنانے کی جگہ اسلامی حکومت اس چیز کو قبول کر لیتی ہے جو کسی اجنبی ملک میں رائج ہو۔ اس ضمن میں جو مثال اس وقت میرے ذہن میں ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلافت کے زمانے کی ہے' یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بمشکل تین چار سال بعد کا واقعہ ہے۔ شام کی شمالی سرحد پر منبج نامی ایک مقام تھا۔ وہاں کے مسلمان والی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھ بھیجا کہ سرحد پار کے لوگ ہمارے یہاں تجارت کے لیے آنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ چنگی کے متعلق کیا برتاؤ کیا جائے؟ کس شرح اور کس مقدار سے ان سے چنگی لی جائے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب بھیجا کہ "ان تاجروں سے اسی شرح سے چنگی لو' جس شرح سے ان کے ملک میں مسلمان تاجروں

سے لی جاتی ہے"۔ اس قاعدے کی مزید تشریح و توضیح کرتے ہوئے امام محمد شیبانیؒ جو امام ابوحنیفہ کے شاگرد رشید تھے، اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس قاعدے کا اطلاق مختلف طور پر ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی اجنبی ملک میں اگر مسلمان تاجروں سے کوئی چنگی نہیں لی جاتی تو ہم بھی اس ملک کے تاجروں سے کوئی چنگی نہیں لیں گے۔ مماثلت Reciprocity کا یہ قاعدہ اس وقت تک اپنی جگہ برقرار رہے گا، جب تک ہماری حکومت اس کے خلاف فیصلہ صادر نہ کرے۔

۲۹۱۔ ان ماخذ ہائے قانون کے بعد قابل ذکر چیز وہ ہے جس کے باعث اسلامی قانون ساز کو ایک ایسا وسیلہ حاصل ہو گیا جس سے اسلامی قانون قیامت تک زندہ رہ سکے ہر آنے والی نئی ضرورت سے عہدہ برآ ہو سکے۔ یہ اجتہاد ہے۔ ہمارے فقہاء جو چار اصول بیان کرتے ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس، ان میں اجماع عہد نبوی میں نہیں پایا جاتا تھا۔ قیاس جس کو ہم یہاں اجتہاد کا نام دے رہے ہیں، وہ عہد نبوی میں ہی وجود میں آ چکا تھا، اور یہ عہد نبوی کے آخری زمانے کا واقعہ ہے۔ ۹ ہجری یعنی وفات سے ڈیڑھ سال پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حکم دیا تھا اور جن حالات میں وہ حکم دیا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے علاقے میں ایک صحابی کو قاضی بنا کر روانہ کیا۔ ان کا نام معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ اس زمانے کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی عہدے پر مامور کیا جاتا تو جانے سے پہلے وہ آخری باریابی، آخری ملاقات کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتا اور حضور اسے ہدایات دیتے تھے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا "بم تحکم؟" (تم حکم کس اساس پر دیا کرو گے) ان کا جواب تھا "بکتاب اللّٰہ" (اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مطابق)۔ قرآن میں جو احکام ہوں گے، ان کا نفاذ کروں گا، ان کی تعمیل کراؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فان لم تجد؟" (اگر اس میں نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟) تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوراً کہا "فبسنة رسول اللّٰہ یعنی رسول اللہ کی سنت کے مطابق، اس جواب کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا، لیکن پھر فرماتے ہیں کہ اگر تمھیں سنت میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو کیا کرو گے؟ تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ تھے "اجتهد برای ولا آلو جهدا" میں اپنی رائے کے ذریعے سے (حل تلاش کرنے کی) کوشش کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ دوسرے الفاظ میں اپنی صوابدید سے غور کر کے، استدلال کر کے، استنباط کر کے، قیاس کر کے حکم دوں گا، اور ایسی چیز

معلوم کرنے کی کوشش کروں گا' جو میری دانست میں اللہ کو پسند ہو' معقول ہو اور عدل و انصاف کے مطابق ہو۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر خوش ہوئے کہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتے ہیں: "اے اللہ تو نے اپنے رسول کے رسول کو جس چیز کی توفیق دی ہے' اس پر تیرا رسول خوش ہے"۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں سکوت کی صورت میں یا اس میں قانون نہ ملنے کی صورت میں ہمیں اجتہاد کی اجازت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختیار بہت ہی محدود ہے۔ اگر قرآن و حدیث میں صراحت موجود ہے تو اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اسی وقت اجتہاد کر سکیں گے جب کہ قرآن و حدیث میں باوجود تلاش کے کوئی قاعدہ' کوئی حکم پیش نظر مسئلے سے متعلق نہ ملتا ہو۔

۲۹۲۔ اجتہاد کے ذریعے سے قانون دریافت کرنے کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ خاص اس چیز کے لیے تو حکم نہیں ہے لیکن ایک مماثل چیز کے لیے حکم ملتا ہے فرض کیجئے کہ چوری کا قانون موجود ہے لیکن کفن چوری کا ذکر قرآن میں نہیں ہے کہ کیا کریں؟ اب ہمارا مجتہد قیاس کرے گا چونکہ ایک قسم کی چوری کے لیے حکم ہے تو ایک دوسری قسم کی چوری میں بھی ہم اس قسم کا استدلال کر سکتے ہیں یا اس میں کسی قدر ترمیم کے ساتھ حکم دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اور مسائل کے متعلق بھی بعض وقت مماثلتیں ڈھونڈی جاتی ہیں۔ ایک دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بظاہر تو منطقی استدلال کے ذریعے ہم ایک چیز کا حکم دے سکتے ہیں لیکن اگر ذرا غور کریں تو فوری طور پر ذہن میں آنے والا طریقہ مناسب نہیں ہوتا بلکہ ایک عمیق تر وجہ سے کوئی دوسرا ہی قانون مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کو استحسان کہتے ہیں کیونکہ ایک عمیق تر وجہ کے باعث ہم ایک دوسرے طریقے یا قانون کو بہتر اور مستحسن سمجھتے ہیں۔ کبھی ایک اور اصول پیش نظر ہوتا ہے: وہ یہ کہ امت کا فائدہ اس میں ہے۔ بہت ہی سخت قسم کی منطق سے تو یہ قاعدہ ہونا چاہیے لیکن امت کی فلاح' امت کی بہبودی' اور آسانی کے لیے یہ دوسرا قاعدہ بہتر معلوم ہوتا ہے اس لیے اسے استصلاح کا نام دیتے ہیں۔ اس طرح کے مختلف لطیف فروق کے ساتھ اجتہاد کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اس کا رواج ہمیں عہد نبوی سے ملنے لگتا ہے۔ اس قاعدے کے اطلاق کے باعث' خاص طور پر قاضیوں کے فیصلوں کے سلسلے میں ہمیں ایک نئی چیز سے سابقہ پڑتا ہے' جو قانون سازی کا ایک جزء ہے۔ فرض کیجئے کہ قرآن و حدیث میں کوئی قاعدہ نہیں ملتا اور قاضی اجتہاد کر کے ایک حکم دیتا ہے۔ چونکہ وہ قاضی ہے' اس لیے وہ اپنے فیصلے کا نفاذ بھی کرا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن ممکن ہے کہ نفاذ سے پہلے خود قاضی کو شبہ ہو۔ وہ مرکز سے دریافت کرے گا۔ مرکز سے جواب دیا جائے گا جو سنت ہونے کے باعث قانون کی صورت اختیار کرے گا۔ اس کا تعلق اجتہاد سے نہیں رہے گا۔ ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قاضی نے فیصلہ کر دیا اور اس سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن اس فیصلے کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچی یا یہ کہ فریق مقدمہ نے اپیل کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نامہ نگاروں کے ذریعے سے اطلاع پائی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس فیصلے کو نامناسب سمجھتے ہیں تو نظم و نسق کے افسر اعلیٰ یا حکمران کی حیثیت سے نہیں بلکہ قانون ساز کی حیثیت سے: فوراً اس گورنر یا قاضی کو ہدایت دیں گے کہ یوں نہیں یوں کرو۔ ایسی مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف گورنروں کو ایسی ہدایتیں بھیجیں۔ ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تھا۔ قتل خطا کے طور پر تھا اور اس کا خون بہا دلایا گیا۔ پرانے رواج کے مطابق خون بہا متوفی کے سب وارثوں کو نہیں بلکہ صرف مرد وارثوں کو دلایا گیا اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ ہدایت بھیجتے ہیں کہ فلاں شخص کے خون بہا میں سے اس کی بیوہ کو بھی حصہ دلایا جائے۔ خون بہا کو وراثت کا جزء قرار دیا گیا۔ وراثت کی صورت میں بیوی کے، بیٹے کے، بیٹی کے، ماں، باپ وغیرہ ہر ایک وارث کے قرآن میں حصے مقرر کیے جا چکے ہیں۔ اسی لیے خون بہا میں بھی اسی قاعدے کا لحاظ رکھنا ہو گا۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ قانون سازی کس طرح اس زمانے میں عمل میں آیا کرتی تھی۔

۲۹۳ ـ اجماع کا قاعدہ عہد نبوی میں ناممکن تھا' وہ بعد کی چیز ہے۔ اجماع کے معنی ہوتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں اگر ہمیں کسی مسئلے کا حل نہیں ملتا تو ہم اس بارے میں قیاس و اجتہاد سے کام لیتے ہیں اور اس اجتہاد پر اس زمانے کے سارے ہی علماء متفق ہو جاتے ہیں۔ ایسے قانون کو جس پر سب علماء متفق ہو جائیں' لازماً زیادہ قابل قبول قرار دینا پڑتا ہے۔ اجماع کو ہم ایک خاص اہمیت ضرور دیتے ہیں لیکن کم از کم حنفی فقہاء کے نزدیک اجماع اٹل اور ناقابل تبدیل نہیں ہے' بلکہ ایک جدید تر اجماع کے ذریعے ایک قدیم تر اجماع کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح ایک نبی کے احکام کو دوسرا نبی منسوخ کر سکتا ہے۔ اسی طرح ایک فقیہ کی رائے کو دوسرا فقیہ رد کر کے اپنی علیحدہ رائے دے سکتا ہے۔ بنابریں اگر ایک قدیم اجماع کے بعد اس کی برعکس بات پر دوسرا

جدید اجماع قائم ہو جائے تو وہ پہلے اجماع ہی کی طرح واجب التعمیل ہو جائے گا اور پرانا اجماع باقی نہیں رہے گا۔ یہ رائے ممتاز حنفی امام ابوالیسر البزدوی کی ہے۔ اصول فقہ پر ان کی مشہور کتاب میں ان کے الفاظ یہی ہیں کہ جدید تر اجماع کے ذریعے سے قدیم تر اجماع منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ امام رازی کی بھی یہی رائے ہے۔ یہ اسلامی قانون کی ایک بہت بڑی خدمت تھی۔ چونکہ اجماع سے بنا ہوا قانون خدا اور رسول کی طرف سے آیا ہوا اٹل قانون نہیں' بلکہ انسانی رائے پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس کے ہمیشہ کے لیے پابند نہ ہو جائیں' بدلنے والے حالات کے تحت' بدلنے والی ضرورتوں کے تحت' ہم ایک انسان کے قانون کو دوسرے انسان کے قانون کے ذریعے بدل سکیں۔ ظاہر ہے کہ عام طور پر ہم یہی کہیں گے کہ اجماع کے خلاف زبان کھولنے کی جرات نہیں کی جا سکتی لیکن اس قاعدے کے تحت جو امام بزدوی نے بیان کیا ہے اولاً" کسی نہ کسی کو پرانے اجماع کے خلاف زبان کھولنی اور پرانی رائے پر اعتراض کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ پھر بعد میں معاصر فقہا اس کی رائے کو قبول کرتے جائیں گے۔ جب سارے لوگ اس پر متفق ہو جائیں گے تو پرانا اجماع ختم ہو جائے گا۔

۲۹۴۔ اب اپنے موضوع کے دوسرے جزء پر توجہ کرتا ہوں جو عدل گستری کے متعلق ہے۔ عہد نبوی کی عدل گستری کی اہمیت اور اس زمانے کی اصلاحات کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عدل گستری کا کیا نظام تھا؟ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ عہد نبوی میں کیا انقلاب آیا' کیا کایا پلٹ ہو گئی اور اس کی کتنی بڑی اہمیت ہے؟ زمانہ جاہلیت میں عرب کے بدوی قبائل میں کوئی حکمران' کوئی حکومت نہ تھی۔ کوئی عدالت بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا کسی شخص کو انصاف حاصل کرنے کے لیے کسی کے پاس جا کر شکایت کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مظلوم کیا کرے' "دست خود دہان خود" ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اپنے ظالم سے بدلہ لے گا۔ اگر ظالم کمزور ہو تو بدلہ آسان تھا لیکن اگر ظالم قوی تر ہو تو کمزور کے لیے کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ انصاف حاصل کر سکے۔ اس صورت حال میں کہیں کہیں ہمیں بہت ہی مدھم روشنی بھی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ظالم منظور کرے تو کوئی خاطر مدار شخص ان دو آدمیوں کے جھگڑے کو چکائے گا۔ ایسی صورت میں اس پنچ یا ثالث کو ایک طرح کا عارضی حاکم عدالت بنا لیا جاتا تھا۔ اور اس کے فیصلے پر فریقین عمل کرتے۔ اس کی کچھ مثالیں زمانہ جاہلیت میں ہمیں ملتی ہیں۔ طائف کے قریب عکاظ میں ایک میلہ لگا کرتا تھا' جس میں بیرونی ممالک سے بھی لوگ آیا

کرتے تھے۔ اس میلے کے لیے ایسے حکم مقرر کیے جاتے تھے جو دو تین دن کے لیے عارضی طور پر ہوتے تھے۔ جب تک میلہ لگا رہتا۔ اس وقت تک ان کی حیثیت حکم کی ہوتی۔ میلے میں جتنے تجارتی جھگڑے پیش آتے' ان کی طرف رجوع کیے جاتے اور وہ فیصلے دیتے تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ کون حکم ہے اس لیے لوگ اگر آپس میں طے کر چکے ہوں کہ اپنے مقدمے کا فیصلہ حکم سے کرائیں گے تو وہ میلے کا انتظار کرتے۔ میلے کے حکم کے پاس جاتے' اس کو اپنا قصہ سنا کر فیصلہ کراتے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عرب میں' اس اندھیر نگری کے اندر بھی کہیں کہیں کچھ روشنی کی مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں تک مکے کا تعلق ہے تو ہمیں وہاں شہر کے باشندوں کے جھگڑوں کو چکانے کے لیے تین چیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک دیوانی عدالت جس کے حاکم عدالت خود حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ دوسری فوجداری عدالت' ان دونوں کے علاوہ ایک اور ادارہ وہاں پایا جاتا تھا جسے حلف الفضول کا نام دیا گیا ہے Order of Chivalry کی صورت تھی۔ مکے والوں نے ایک زمانے میں یہ محسوس کیا تھا کہ ہمارے شہر میں بعض وقت اجنبیوں پر بے وجہ ظلم ہوتا ہے' جس سے شہر بھر کی بدنامی ہوتی ہے۔ چنانچہ واقعہ" ابو جہل کی وجہ سے ایک شخص نے ایک نظم کہی جس میں مکہ والوں کی ہجو کی۔ ابو جہل نے تو کوئی پرواہ نہ کی لیکن دوسرے اہل مکہ کو چوٹ لگی۔ ان حالات میں انھوں نے آپس میں جمع ہو کر معاہدہ کیا کہ ہم میں سے کم از کم چند لوگوں کو چاہیے کہ رضا کارانہ طور پر اس بات کا اقرار کریں کہ جب بھی ہمارے شہر کے اندر کسی اہل مکہ یا کسی اجنبی پر اگر کوئی ظلم ہو تو ہم مظلوم کی مدد کریں گے اور اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک کہ اسے اس کا حق نہ دلایا جائے۔

۲۹۵ ۔ جہاں تک مدینہ کا تعلق ہے تو وہاں سوائے اس کے کوئی امکان نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مدد آپ کرے۔ ان حالات میں رسول اللہ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد جب شہری مملکت قائم ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا دستور مدون فرمایا اور دنیا کا یہ پہلا دستور تحریری طور پر منضبط کر کے نافذ بھی کیا۔ اس میں ایک عجیب و غریب حکم دیا گیا جسے انقلابی نوعیت کا کہا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ انصاف بجائے انفرادی کے مرکزی شئے ہو گی۔ یعنی اگر کسی کو نقصان پہنچا ہے تو وہ براہ راست مجرم کو سزا نہیں دے گا بلکہ مرکزی عدالت سے رجوع کرے گا۔ حاکم عدالت حالات سن کر بغیر رعایت کے پوری غیر جانبداری کے ساتھ مقدمے کا فیصلہ کرے گا۔ اور ظالم کو سزا دے کر مظلوم کو اس کا حق دلائے گا۔ اس کے بارے میں کچھ دفعات اور بھی ہیں۔ وہ یہ کہ

کسی شخص کو ظالم کی حمایت کرنے کا حق نہیں ہو گا۔ چاہے اس کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ میرے بیٹے نے کسی کو قتل کر دیا ہو تو باوجود باپ ہونے کے مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اپنے بیٹے کی حمایت کروں' اور پولیس کی طرف سے اس کی گرفتاری کے وقت مدافعت کروں۔ اس کے برخلاف یہ کہا گیا ہے کہ انصاف ایک خدائی حکم ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ انصاف کے لیے پورا تعاون کرے۔ اور کسی ظالم کو نہ بچائے' چاہے وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۲۹۶۔ ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ مدینے کی حد تک ایک انقلابی حکم دیا گیا' اور انصاف جو وہاں انفرادی کام تھا اس کو ایک مرکزی اور حکومتی چیز قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں مدینے میں دو نئے ادارے "انسٹی ٹیوشن" قائم ہوتے اور ترقی کرتے نظر آتے ہیں' جو بعد میں سارے ملک میں پھیل جاتے ہیں۔ ایک مفتی کا انسٹی ٹیوشن ہے اور دوسرا قاضی کا۔ مفتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ فتویٰ دے یعنی ہم اس سے قانون معلوم کریں۔ قانون کے نفاذ کی ذمہ داری اس کے فرائض میں داخل نہیں۔ دوسرا ادارہ قاضی کا ہے۔ عہد نبوی میں ہمیں قاضی بہت سے ملیں گے۔ لیکن شہر مدینہ میں مستقل قاضی کا پتا کم از کم مجھے نہیں ملتا۔ البتہ مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ عارضی طور پر کسی ایک مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کو نامزد کرتے اور کہتے کہ فریقین کے بیانات کو سن کر یا برسر موقع جا کر' حالات کو دیکھ کر فیصلہ کرو۔ گویا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیصلہ ہوتا تھا' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے اور مقرر کردہ نائب نے وہ فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ جو خاص اہمیت کا حامل ہے وہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے' جو مہاجرین میں بہت ذہین تھے اور قانونی نقطہ نظر سے ان کی مہارت بے انتہا تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ فلاں مقدمے میں تم فیصلہ کرو۔ وہ پوچھتے ہیں: "لیکن کس اساس پر"؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مفہوم کو سمجھ کر جواب دیتے ہیں کہ اگر تم صحیح نتیجے پر پہنچو گے تو تمھیں انصاف رسانی اور حق و عدل کی بنا پر دو ثواب ملیں گے۔ اس کے برخلاف اگر تم صحیح نتیجے پر نہ پہنچو تو اگر ناانصافی ارادۃً نہیں بلکہ اتفاقاً" ہوئی ہو تو تمھاری حسن نیت کی وجہ سے' تم کو ایک ثواب ضرور ملے گا کہ تم نے انصاف کرنا چاہا تھا' ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ قاضیوں کی آراء میں اختلاف ہوتا تھا۔ اس کا آغاز عہد نبوی ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور بعد کے زمانے میں بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ نے اپنے زمانے میں اسلامی قانون کو مدون کرنے کی جو کوشش کی تھی اور چالیس ممبروں

کی ایک اکیڈمی بنائی تھی، جس نے اسلامی قانون کو مدون کیا' اس کی وجہ اور اس کا باعث یہی تھا کہ مختلف قاضیوں کے فیصلے میں تضاد ہوتا تھا۔ ایک ہی قسم کا مقدمہ ہو تو ایک قاضی "الف" فیصلہ کرتا ہے اور دوسرا قاضی اس کے بالکل برعکس "ب" فیصلہ کرتا ہے۔ چنانچہ ایک کتاب جس کا نام "رسالۃ الصحابہ" ہے' اور یہ ابن المقفع کا ایک خط ہے جو اس نے اپنے ہم عصر خلیفہ منصور کے نام لکھا تھا اور اس میں وہ تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ امیر المومنین ہمارے زمانے میں قاضیوں کے فیصلوں میں اختلاف کے باعث بے انتہا دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک ہی مسئلے پر دو قاضی مختلف فیصلہ کرتے ہیں۔ ایک قاضی کے مطابق سزائے موت دینی چاہیے دوسرے کے مطابق اس قسم کے مقدمے میں سزائے موت نہیں دینی چاہیے۔ اسی طرح ایک اور مقدمے میں' ایک قاضی کی رائے کے مطابق ایک خاص صورت میں طلاق پڑ چکی ہے۔ دوسرا قاضی کہتا ہے کہ طلاق نہیں ہوئی۔ غرض ہماری عزت و آبرو غیر محفوظ ہو چکی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حق کیا ہے؟ ایسی مثالیں دے کر وہ ایک تجویز پیش کرتا ہے' جو میری دانست میں نامناسب تھی اور خلیفہ منصور نے بھی اسے رد کر دیا۔ اگرچہ بظاہر وہ معقول نظر آئے گی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ امیر المومنین سارے قاضیوں کے پاس احکام بھیجیں کہ اپنے فیصلوں کی نقلیں خلیفہ کے پاس اپنی اپنی دلیلوں کے ساتھ روانہ کیا کریں۔ اگر امیر المومنین کو اس میں کوئی نامناسب چیز نظر آئے تو وہ خود حکم دیں اور خلیفہ کا حکم بعد میں سارے قاضیوں کے لیے واجب التعمیل ہو جائے گا' اور ہمیں اختلافی نظائر سے نجات مل جائے گی۔ اور کسی مسئلے میں اختلاف رائے ہو یا دو مختلف نظریے موجود ہوں اور قاضی کو معلوم نہ ہو سکے کہ کیا کرنا چاہیے' تو صرف اپنی صوابدید کی بجائے امیر المومنین کے احکام کی تعمیل کر سکے گا۔ اور اس طرح سارے ملک میں قانون ہر وقت یکساں رہے گا۔ لیکن خلیفہ نے نہ صرف اس تجویز کو رد کر دیا بلکہ معلوم نہیں اس بنا پر یا کسی اور وجہ سے ابن المقفع کے قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اور اسے سزائے موت دے دی گئی۔ بہر حال میں نے آپ سے ایک قیاس ظاہر کیا تھا کہ اسلام میں ایک طرز' روش (Tradition) یہ رہی ہے کہ عہد نبوی سے لے کر آج تک عدالت کی طرح قانون سازی بھی حکومت اور سیاست کے تحت نہیں رہی۔ اگر خلیفہ منصور اس تجویز کو قبول کر لیتا تو اس کے بعد قانون سازی سیاست اور خلیفہ کے احکام کے تابع ہو جاتی۔ خلیفہ اچھے بھی آتے ہیں اور برے بھی۔ اس طرح آئے دن قانون بدلتے رہتے۔ ایک پرانے قانون کو نیا خلیفہ منسوخ کر دیتا۔ لیکن اگر اسلامی قانون حکومت اور

سیاست کے عمل دخل سے آزاد رہے تو تمام فقہا مساوی درجہ رکھنے کے باعث ایک دوسرے پر اعتراض کر سکیں گے۔ اور اس طرح قانون صحیح تر بھی رہے گا اور ترقی پذیر بھی۔

۲۹۷ ۔ یہ تھیں وہ چند باتیں، جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں قانون سازی کا کیا طریقہ، اور عدل گستری کا کیا قاعدہ تھا؟ عہد نبوی میں صوبجات و اضلاع مثلاً یمن میں قاضی بھیجے جاتے اور ان کے متعلق بعض تفصیلیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ابو موسیٰ الاشعری کو جب قاضی بنایا گیا تھا تو ان کا تقرر نامہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ میں تمہیں فلاں غرض کے لیے مامور کرتا ہوں۔ تم اس طرح سے اپنے فرائض انجام دیا کرنا۔ اسی طرح بعض اور قاضیوں کے متعلق بھی احکامات ملتے ہیں۔ یوں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں صفر سے شروع ہو کر اسلامی محکمہ قانون سازی اور اسلامی محکمہ عدل گستری کس طرح وجود میں آتے ہیں اور کس طرح بعد کی ضرورتوں کو وہ پورا کرتے ہیں جب کہ اسلامی مملکت ایک شہر کے ایک جز میں پائی جانے والی مملکت مدینہ پر ہی نہیں بلکہ تین براعظموں میں پھیل جاتی ہے۔

سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ!

۲۹۸ ۔ متعدد سوالات آپ کی طرف سے آئے ہیں، اپنی بساط کے مطابق جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال ۱ ۔ اگر قانون سازی ایک نجی مسئلہ ہے تو پھر اسلامی مملکت میں قانون سازی کا کیا طریقہ کار ہو، وضاحت فرمایئے، اور قانون سازی کون لوگ کریں گے؟ اور اجماع کے بعد اس کے نفاذ کا کیا طریقہ ہو گا؟

جواب ۔ ہماری روایت یہ رہی ہے کہ قانون سازی سرکاری مسئلہ نہ ہو، حکومت یا پارلیمنٹ کا مسئلہ نہ ہو، بلکہ ہر فقیہ کو کسی مسئلے کے متعلق اپنی رائے پیش کرنے کی آزادی رہے۔ حکمران سے یہ حق سلب کرنے کے باوجود کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بہت ہی نادر صورتوں میں ہمارے خلفاء نے بعض احکام دیے۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احکام صادر کیے کہ مفتوحہ ممالک کو صرف فاتح فوج کے لیے معمولی مال غنیمت نہ سمجھا جائے بلکہ پوری ملت کے لیے

اور ہمیشہ کے لیے وقف قرار دیا جائے۔ اس طرح کے شاذ و نادر احکام حکومت کی طرف سے بے شک صادر و نافذ ہوتے رہے۔ لیکن عام قانون سازی کا کام ہمارے فقہا انفرادی طور پر کرتے رہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ مساوی رتبے کا کوئی فرد رائے دیتا ہے تو میرے لیے یہ جسارت اور جرات کرنا ممکن ہے' کہ اس پر تنقید کروں اور اس کے خلاف رائے دوں۔ اس کے برخلاف اگر حکومت کا فیصلہ ہو تو ظاہر ہے کہ مجھے تذبذب ہو گا اور بعض اوقات یہ مشکل ہو گا کہ کسی جابر حاکم کے زمانے میں اس کے فیصلے کے خلاف زبان کھولوں۔ طریقہ کیا ہو؟ وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ ہر فقیہ اپنی رائے بتاتا ہے۔ ابتدائی زمانے میں ہمارے قاضیوں کو آزادی ہوتی تھی کہ قرآن و حدیث کے مطابق جو چاہیں فیصلہ کریں۔ اگر قرآن و حدیث میں کوئی چیز نہ ملے تو فقہا کی رائے میں سے کسی رائے کا انتخاب کریں۔ اگر ان کے سامنے ایسی کوئی چیز نہ ہو تو بطور خود اجتہاد کریں اور فیصلے صادر کریں۔ اس طرح عملاً" کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ قانون کے نفاذ کا کیا طریقہ ہو گا؟ ہمارے حکام عدالت اپنی صوابدید پر فیصلہ کیا کرتے اور پولیس کی مدد سے اس کی تعمیل کرایا کرتے تھے۔ آیا اب بھی یہ مناسب ہے یا نامناسب؟ اس کے بارے میں میں صرف یہ کہوں گا کہ ہمارا قانون اس زمانے کے مقابلے میں' جب امام ابوحنیفہ نے ایک اکیڈمی بنا کر اسلامی قانون کو مدون کرنے کی کوشش کی تھی' فقہی مذاہب کے ذریعے بہت زیادہ مفصل اور معین ہو چکا ہے۔ اور کم ہی ضرورت ہو گی کہ نئی قانون سازی کی جائے (قواعد کو دفعہ وار مدون البتہ کرائیں) مثلاً حنفی قانون کیا ہے؟ "ہدایہ" "قدوری" "مبسوط" نامی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے مذہبوں میں کہیں کہیں جزئی طور پر اختلاف ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اور اس کی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ جس ملک کا حاکم جس مذہب کا ہو' حنفی' شافعی یا مالکی' وہ اس کے مطابق حکم دے سکتا ہے کہ اس ملک کے سارے قاضی مثلاً حنفی قانون کے مطابق عمل کریں گے' چاہے ان کا اپنا مذہب کوئی دوسرا ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ابو یوسف کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے عباسی خلافت کے قاضیوں کے پاس یہ احکام بھیجے تھے کہ وہ حنفی مذہب کے مطابق فیصلے کیا کریں۔ اور یاقوت لکھتا ہے کہ بعض قاضی جو معتزلی یا غیر حنفی تھے' وہ بھی مذہب سلطانی یعنی حنفی فقہ کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے۔

۲۹۹ سوال ۲ ۔ اسلامی ملک میں غیر مسلم شخص پر اسلامی قانون نافذ ہوتا ہے تو کیا ایک غیر اسلامی مملکت میں' غیر اسلامی قانون کی پابندی ایک مسلمان پر لازم ہے؟

جواب۔ سوال کا پہلا جزء غلط ہے کیونکہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں پر اسلامی قانون نافذ نہیں کیا جاتا۔ عہد نبوی میں قرآن مجید کے احکام کے تحت ہر مذہبی جماعت کو (عیسائیوں' یہودیوں وغیرہ) کو داخلی خود مختاری حاصل تھی' عقائد اور عبادات ہی کے متعلق نہیں بلکہ قانون و عدلیہ کے متعلق بھی۔ غیر اسلامی ممالک میں ایک مسلمان پر ایک غیر اسلامی قانون نافذ ہو گا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے لیکن چونکہ غیر اسلامی ممالک اس رواداری اور فراخ دلی کا اب تک مظاہرہ نہیں کر سکے جو اسلام میں ہے کہ ہر قوم کو داخلی خود مختاری دی جائے' لہٰذا اگر ہم غیر مسلم علاقے میں رہنا چاہتے ہیں تو یہ سوچ اور سمجھ کر' معلومات حاصل کر کے رہیں' کہ ہم پر وہاں یہ پابندیاں عاید ہوں گی۔ لیکن ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مثلاً ایک فرانسیسی' ایک جرمن آج مسلمان ہو جائے تو کیا کرے؟ ظاہر ہے کہ اگر اسے آپ ہجرت کرا کے اپنے ملک میں بلانا چاہیں تو دنیا کے کتنے ملک ہیں جو آج اس پر آمادہ ہوں کہ غیر ملک کے لوگ جب بھی چاہیں' یہاں پر بس جائیں۔ ان دشواریوں کا سوائے اس کے کیا جواب دیا جائے۔ "لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔۔۔" (۲۸۶:۲) (اللہ کسی شخص کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا جو اس کی استطاعت سے باہر ہو) جس حد تک ممکن ہو وہ اسلام پر عمل کرے اور جس حد تک ممکن نہیں ہے اس پر اللہ اسے معاف کرے گا۔ لیکن یہ کوشش کرتا رہے کہ جہاں تک ہو سکے اسلامی قانون پر عمل کرے۔ مثلاً ایک فرانسیسی کے لیے' فرانس کے قانون وراثت پر عمل کرنا لازم ہے جو حکومت کا معین کردہ ہے۔ جو نہ انجیل کا پابند ہے نہ توریت کا قانون ہے' نہ قرآن کا قانون' بلکہ انسانوں کا بنایا ہوا قانون ہے اور کوئی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چاہے عیسائی ہو یا بے دین کیمونسٹ' یہودی ہو یا مسلمان' جو شخص بھی فرانسیسی قومیت اختیار کرتا ہے یا پیدائشی طور پر فرانسیسی ہوتا ہے' اس کے لیے قانون کی پابندی لازمی ہے۔ اس کا حل مل سکتا ہے۔ مثلاً فرانس میں وصیت اور ہبہ کی اجازت ہے۔ اگر میں یہ معلوم کر لوں کہ میرے جو قریبی رشتہ دار ہیں' بیوی' بیٹا' بھائی وغیرہ' قرآن نے ان کے کیا احکام معین کیے ہیں اور اس کے مطابق میں وصیت یا ہبہ کر دوں تو ان کے ذریعے میں اسلامی قانون پر عمل کر سکتا ہوں' اگر عمل کرنا چاہوں۔

۳۰۰ سوال ۳۔ آپ نے مماثلت کے ضمن میں چنگی کا ذکر فرمایا ہے۔ براہ کرم وضاحت کیجئے کہ کیا اسلامی مملکت میں مسلمانوں سے چنگی وصول کرنا درست ہے جب کہ اکثر علماء اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں؟

جواب ۔ اس بارے میں مجھے زیادہ واقفیت نہیں کہ کس بنا پر اسے ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ میرا موضوع خصوصی انٹرنیشنل لا رہا ہے۔ چنگی کے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ اسلام میں ممنوع ہے۔ اس بارے میں ممکن ہے صدر محترم آپ کی تشفی کر سکیں۔ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ چنگی عہد نبوی میں بھی تھی' خلافت حضرت عمر میں بھی تھی۔ یہ یاد رہے کہ اور ذرائع سے مسلمانوں سے رقم حاصل کرنا' ضرورت کے وقت جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً اگر ضرورت زمانہ سے زکوٰۃ کی آمدنی ہمارے لیے کافی نہ ہو' تو ہمیں اور بھی وسائل اختیار کرنے ہوں گے' اور ہماری رعیت کو ان حالات میں اپنی طرف سے کچھ زائد ٹیکس دینے پڑیں گے۔ آج کل ایک ایک ہوائی جہاز کی قیمت کروڑوں روپے ہونے لگی ہے۔ اب اگر ہم ہوائی جہاز خریدنے کے لیے رقم نہ فراہم کریں' کیونکہ زکوٰۃ کی رقم ناکافی ہے' تو ہماری زندگی ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لہٰذا ہم خوش دلی کے ساتھ' اپنی مدد اور حفاظت کے لیے کچھ زائد ٹیکس دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ ان حالات میں میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی عملی دشواری نہیں رہتی۔

۳۰۱ سوال ۴ ۔ وکیل کی اسلامی نقطہ نظر سے وضاحت کیجئے۔

جواب ۔ عہد نبوی میں آج کل کی طرح پیشہ ور وکیل نہیں پائے جاتے تھے لیکن مجھے قرآن مجید (۱۰۹:۴) میں اس کی طرف کچھ اشارہ ملتا ہے۔ ایک آیت ہے کہ "قیامت کے دن کافروں کی طرف سے اللہ سے کون جھگڑا کرے گا"؟ تو آج کل کے وکیل کو میں اصولاً" اور ابساسا" ممنوع نہیں قرار دیتا۔ کیونکہ عام کلیہ و قاعدہ ہے جس کا ذیل آیت میں اشارہ ہے۔ احل لکم ما وراء ذالکم۔" (۲۴:۴) یعنی پہلے چند چیزیں بتائی گئی ہیں کہ یہ حرام ہیں۔ پھر اس کے بعد ہے' "اس کے علاوہ جتنی چیزیں ہین' وہ تمھارے لیے حلال ہیں" فرض کیجئے کہ وکیل کی ممانعت نہ ہو تو ہمارے لیے جائز ہو جائے گا' چاہے وہ عہد نبوی میں غیر موجود ہو۔

۳۰۲ سوال ۵ ۔ زکوٰۃ اور عشر کی موجودگی میں دیگر درجنوں ٹیکسوں کو بالخصوص دیہی علاقوں میں تھوپ دینا' کہاں تک اور کیوں کر جائز ہے؟ مفصل وضاحت کریں؟

جواب ۔ اگر ملک کی ضرورتیں زکوٰۃ اور عشر سے پوری نہیں ہوتیں تو اپنی مدد آپ کے تحت' دین کی حفاظت کے لیے زاید رقم دینا پڑے گی۔ ورنہ وہ خودکشی ہوگی۔ اور اللہ فرماتا ہے "ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ" (۱۹۷:۲) (اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔ اس کا شان نزول ہمارے مفسر مالی بجٹ ہی بیان کرتے ہیں۔

۳۰۳ سوال ۶ ۔ عدلیہ میں وکیل کا کردار فوجداری اور دیوانی کہاں تک درست، اور مفید ہے؟

جواب ۔ اس کا بھی ابھی اشارۃً جواب دے چکا ہوں۔ وکیل کا منشاء اصل میں یہ نہیں ہوتا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کی مدد کرے۔ اس کے فرائض کی اساس یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو خصوصی تعلق ہے، یعنی ملکی قوانین سے واقفیت' اس واقفیت سے وہ اپنے مؤکل (Client) کو مدد پہنچائے اور اسے بتائے کہ قانون کی روشنی میں وہ کس حد تک اور کیا حق رکھتا ہے۔ قانونی نقطہ نظر' قانون کی ٹیکنیکل باتوں کو عدالت کے سامنے واضح کرنے کے لیے وکیل کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کا کردار یہی ہونا چاہیے کہ حق کی تائید کرے۔ یہ نہیں کہ حق کو چھپائے اور عمداً ظالموں اور مجرموں کی مدد کرے۔

۳۰۴ سوال ۷ ۔ کیا اسلام میں موجودہ دور کے الیکشن یعنی جمہوریت کا تصور موجود ہے جس میں انسانوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے؟

جواب ۔ اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ جس چیز کی ممانعت نہ ہو' وہ عام طور پر حلال اور جائز ہوتی ہے۔ عہد نبوی میں لوگوں کو گنا نہیں جاتا تھا۔ یہ صحیح ہے لیکن اگر ہم گنیں تو اس کی ممانعت بھی عہد نبوی میں نہیں ملتی۔ اچھے لوگوں کا انتخاب کرنا آپ کے بس میں ہے۔ محض لفاظی کرنے والے ایسے شخص کو' جس کا کردار ٹھیک نہیں ہے' اگر آپ پارلیمنٹ کا ممبر بنائیں تو اس شخص کا اتنا قصور نہیں ہو گا جتنا کہ آپ کا اپنا قصور ہو گا۔ لہٰذا آپ اپنے فرائض پر غور کریں اور ایسے لوگوں کو ووٹ دیں' جو آپ کی رائے میں اچھے کردار کے مالک ہوں۔ ملک کی صحیح خدمت کر سکتے ہوں۔ اور آپ کے جذبات کی بھی اچھی ترجمانی کر سکتے ہوں۔

۳۰۵ سوال ۸ ۔ اسلامی ممالک میں' جہاں اسلامی قوانین نافذ ہیں' کیا ان ممالک کے سربراہ خلیفہ یا امیر المؤمنین کہلا سکتے ہیں؟ کیا ان کی اطاعت اس صورت میں بھی ضروری ہے' اگر ان میں مسلمان حکمرانوں کے اوصاف نہ پائے جاتے ہوں؟

جواب ۔ میرے خیال میں زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ ہم اپنی ذاتی چیزوں پر توجہ کریں۔ اور غیروں کے معاملات میں دخل نہ دیں' جب کہ وہ ہمارے امکان اور ہماری دسترس سے بھی باہر ہیں۔ اگر فلاں ملک کا حکمران فلاں کام کرتا ہے تو ہم اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں؟ اس لیے ہمیں اپنے فرائض پر توجہ کرنا زیادہ مناسب ہو گا۔ رہا یہ سوال کہ ان کو خلیفہ یا امیر المؤمنین کہہ سکتے ہیں یا

نہیں؟ اس کا حکم قرآن و حدیث میں نہیں ہے کہ کس کو خلیفہ کہنا چاہیے' کس کو امیر المؤمنین کہنا چاہیے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ ساری مسلم قوم و ملت کا جو مشترکہ اور مسلمہ سردار ہوتا ہے اسی کو ہم خلیفہ اور امیر المؤمنین کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو علاقہ دار صدر ہوتے ہیں مثلاً شام' مصر' فلسطین' عراق وغیرہ چھوٹے چھوٹے علاقے خود مختار رہنا چاہتے ہیں تو روایت کے تحت ہم ان کو خلیفہ یعنی امیر المومنین نہیں کہتے لیکن اگر وہ کہلوانا چاہیں تو ممانعت بھی نہیں ہے۔ اور یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے بہت سے مدعی پائے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً ابھی دس ایک سال پہلے کی بات ہے جب یمن میں جمہوریت قائم نہیں ہوئی تھی تو وہاں کا حکمران "امام" کے نام سے موسوم ہوتا تھا اور اہل ملک اسے امیر المومنین اور خلیفہ کہا کرتے تھے۔ اسی طرح مراکش کے حکمرانوں کو آج بھی خلیفہ یا امیر المؤمنین کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ دعوے ان کی اپنی سلطنت کے حدود کے باہر تسلیم نہیں کیے جاتے۔

۳۰۶ سوال ۹ ۔ کیا موجودہ دور کی جمہوریت اسلامی تقاضوں کو پورا کرتی ہے؟ اگر یہ جمہوریت اسلامی تصور کے عین مطابق نہیں تو اسلامی ممالک میں اس کے نفاذ سے کیا تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ حالانکہ اسلام نے ایک جاہل آدمی اور صائب الرائے کو برابر قرار نہیں دیا؟

جواب ۔ اسلام میں کوئی معین طرز حکومت نہیں پایا جاتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری دانست میں عملاً اس بارے میں کوئی صراحت نہیں کی کہ میرے بعد کون جانشین ہو گا۔ اس کا منشاء یہ تھا کہ ہر اسلامی جماعت' ہر اسلامی گروہ اور اسلامی مملکت' اپنے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے خود کوئی حکم دے' اس طرح وہ حکم ابدی نہیں ہو گا۔ جب تک ہم چاہیں گے' وہ طریق حکومت رائج رہے گا اور جب ہم اسے مضر پائیں گے' اسے تبدیل بھی کر سکیں گے۔ اس کے برخلاف اگر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی معین فرما دیتے کہ بادشاہت ہونی چاہیے یا جمہوریت یا کوئی اور نظام حکومت' اس طرح ہمارے ہاتھ بندھ جاتے اور قیامت تک ہم اس کی خلاف ورزی نہ کر سکتے۔ غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی بہتری اسی میں پائی کہ اس بارے میں ان پر پابندی عاید نہ کی جائے ان حالات میں جمہوریت بھی ہمارے لیے کارآمد ہو سکتی ہے اور بادشاہت بھی۔ کوئی تیسرا طریق حکومت بھی کارآمد ہو سکتا ہے۔ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ افسران حکومت اللہ سے ڈریں۔ یہ فریضہ صرف انہی کا نہیں ہے' ہمارا اپنا بھی ہے۔ ایک مرتبہ خلیفہ مامون سے ایک شخص نے اعتراض کے طور پر کہا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ایسا ہوتا تھا' تم ایسا کرتے ہو۔ اس نے ایک میٹھا سا جواب دیا کہ اگر مجھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کے عوام مل جائیں تو میں بھی ویسا ہی کروں۔

۳۰۷ سوال ۱۰ ۔ کیا اسلامی نظام عدل میں اپیل کی گنجائش رکھی گئی ہے؟ مثالیں دے کر وضاحت فرمائیں۔

جواب ۔ عہد نبوی میں خاص صراحت کے ساتھ کوئی مثال نہیں ملتی لیکن بعد کے زمانے میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ قاضی کے حکم کے خلاف یا والی کے حکم کے خلاف لوگ امیر المومنین یا خلیفہ کے پاس شکایت لے کر جاتے تھے اور بعض اوقات خلیفہ ان کی شکایت سن کر والی کے احکام یا قاضی کے احکام کو بدلا بھی کرتا تھا۔ خلیفہ کے پاس آتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں یا امیر المومنین ہمارا گورنر یا والی بہت ظالم ہے۔ خلیفہ ظاہرداری کے طور پر خفا ہوتا ہے کہ کیسے؟ میں اس سے "شخصا" واقف ہوں وہ عدل مجسم ہے تم کیسے اس کی شکایت کر سکتے ہو؟ اس پر ایک بوڑھا کسان ادب کے ساتھ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھ کر خلیفہ کے پاس جاتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا ہے کہ اگر وہ عدل مجسم ہے تو اس سے صرف ہمیں مستفید نہیں ہونا چاہیے' ضرورت ہے کہ سارا ملک مستفید ہو۔ لہٰذا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہر علاقے میں ایک ایک ٹکڑا بھیج دیں۔ خلیفہ ہنس پڑا اور اسے معزول کر دیا۔

۳۰۸ سوال ۱۱ ۔ اجماع امت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ جدید اجماع' قدیم اجماع کو ختم کر سکتا ہے' اور کوئی معین نظیر اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔ غالباً یہ بہت ہی زیادہ احتیاط کا مقام ہے۔ اجماع کا ٹوٹنا بہت سے نئے مسائل کو پیدا کر سکتا ہے۔ بتائیے جو لوگ اجماع کی تنسیخ کو نہیں مانتے کیا وہ درست ہیں؟

جواب ۔ ممکن ہے آپ کی رائے صحیح ہو۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ایسا کیجئے۔ میں نے کہا کہ ہمارے ایک نہایت مستند' ایک نہایت ہی قدیم فقیہ نے جن کا حنفی مذہب میں بہت بڑا درجہ ہے' ایک اصولی قاعدہ بتایا ہے کہ اجماع بھی بدل سکتا ہے۔ قرآن و حدیث میں حکم نہ ملنے کے زمانے میں لوگوں نے اپنے اجتہاد سے' اپنی رائے سے ایک نئی بات معلوم کی پھر دوسرے لوگ اس سے متفق ہو گئے تو وہ حکم واجب التعمیل ہو گیا۔ لیکن یہ انسانی قانون ہے۔ خدائی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قانون نہیں ہے۔ لہٰذا بعد کے زمانے میں مساوی درجے کے انسانوں ہی کو حق ہو گا' کہ سوچیں اور بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر کوئی نئی رائے دیں۔ اس رائے پر سب لوگ

متفق ہو جائیں تو یہ بھی اجماع ہی ہوگا۔ پرانے اجماع کی خلاف ورزی نہیں ہو گی۔ بلکہ نیا اجماع ہو گا' جس پر سب لوگ عمل کریں گے۔ اس سے کچھ دشواریاں پیش آئیں گی یا نہیں آئیں گی یہ کہنا میرے لیے مشکل ہے۔ میری رائے میں اگر کوئی قانون سابقہ اجماع کی بناء پر بنا تھا اور وہ ناقابل عمل ہے تو اس کو نہ بدلنا میرے خیال میں زیادہ دشواریاں پیدا کر دے گا سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس قانون کو بدلیں' ایک نیا قانون بنائیں اور وہ بھی اجماع ہی کے ذریعے سے بنائیں۔ یہ بھی نہ بھلایئے کہ اجماع ہونے کا محض دعویٰ کافی نہیں' ثبوت بھی چاہیے اور وہ آسان نہیں۔

۳۰۹ سوال ۱۲۔ معاذ بن جبلؓ کا حضور کی زندگی میں قیاس کرنا جب کہ قرآن بھی نامکمل تھا اور دین بھی' کیا ایسا ہی اس زمانے میں بعد از تکمیل قرآن و دین' جائز ہے؟

جواب۔ چاہے قرآن مجید ۹ ہجری میں جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا واقعہ پیش آیا۔ سو فی صد مکمل نہ ہو چکا ہو بلکہ ۹۰ فی صد یا ۸۰ فی صد' اسی طرح حدیث کا ۱۰۰ فی صد نہیں بلکہ ۸۰ فی صد' ۹۰ فی صد' قرآن و حدیث کا جو کچھ حصہ مکمل ہو چکا تھا' دونوں میں کچھ نہ ہو تو اجتہاد کی اجازت تھی۔ اس کا اطلاق اس وقت بھی ہو گا جب قرآن کا سو فی صد حصہ اور حدیث کا سو فی صد مکمل ہو چکا ہو' اور اس میں کسی قاضی' کسی مفتی اور کسی عالم فقہ کو کوئی حکم نہ ملے تو اس کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا ہے کہ اگر کوئی چیز قرآن و حدیث میں نہ ملے اور مشورہ کرنے کے بعد تمہارے فاضل دوست بھی نہ بتا سکیں کہ اللہ و رسول کا کیا حکم ہے تو ان حالات میں اجتہاد کرنا چاہیے۔ اور اجتہاد کے ذریعے سے جو حکم دیا جائے اور وہ اللہ کی عنایت سے ہمارے ذہنوں میں آئے' تو اسے ہم اللہ کی مرضی کے مطابق ہی سمجھیں گے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ اے اللہ تیرے رسول کے رسول نے جو جواب دیا ہے اس سے تیرا رسول خوش ہے تو ہم اس اجازت کو رد نہ کریں بلکہ ہمیں اس پر خوش ہونا چاہیے کہ خدا نے ہمیں یہ سہولت اپنے رسولؐ کے ذریعے عطا فرمائی۔ ظاہر ہے کہ قرآن یا حدیث میں کوئی حکم مل جائے تو پھر اجتہاد کی اجازت نہیں رہتی لیکن مفسروں کی فہم کے اختلاف کے باعث معنی مختلف لیے جا سکتے ہیں۔ اسی لیے حضرت عمرو بن العاص کے سوال پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مجتہد سے ناخواستہ و نادانستہ خطا ہو تو بھی اللہ اس کو اجر دیتا ہے۔

۳۱۰ سوال ۱۳۔ کیا اسلامی قانون کو موجودہ حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش ہو رہی ہے یا

نہیں؟ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو آخر ملت اسلامیہ کس وقت کا انتظار کر رہی ہے؟ اور آپ جیسے قابل لوگ حکومتوں کو اس قسم کے مشورے دے کر' قانون کو موجودہ حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے' جب کہ قوم یا ملت کے ہزاروں نوجوان اس وجہ سے اسلام سے دور جا رہے ہیں۔

جواب ۔ غالباً آپ کو علم ہو گا کہ دنیا میں کہیں بھی اجنبیوں کو کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ میں بطور مسلمان آپ کا بھائی ضرور ہوں لیکن آپ کی حکومت کی رعیت نہیں ہوں۔ مجھ سے آپ کوئی چیز بطور طالب علم کے پوچھیں حکومت بطور ایک مشیر پوچھے' میں اپنی رائے دوں گا۔ اس سے زیادہ نہ میرے فرائض ہیں نہ میرے امکانات۔ باقی یہ کہنا کہ آج کل اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش نہیں ہو رہی' میری رائے میں درست نہیں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں' کوشش ہو رہی ہے۔ کچھ چیزیں ہو چکی ہیں اور کچھ زیر تکمیل ہیں۔ اور بہت خوشی کی بات ہے کہ یہاں رعیت بھی وہی چیز چاہتی ہے جو حکمران چاہتا ہے۔ اور ممالک میں آپ دیکھیں گے کہ رعیت تو چاہتی ہے مگر حکمران نہیں چاہتا۔ ان کے مقابلے میں آپ کو شکر ادا کرنا چاہیے کہ آپ کو ایسا حکمران ملا ہے جس کی یہ تمنا ہے کہ اسلامی قانون نافذ کرے۔ دوسرے ممالک میں تو لوگ علی الاعلان کہتے ہیں کہ اسلامی قانون ایک پرانا قانون ہے۔ ہمیں جدید زمانے میں' جدید چیزوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے چودہ سو سال پہلے کے قانون پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے مقابلے میں' میری رائے کے مطابق' آپ خوش قسمت ہیں۔

۳۱۱ سوال ۱۴ ۔ آپ نے فرمایا کہ قانون سازی کو پرائیویٹ رہنا چاہیے۔ اس صورت میں شوریٰ کے قانون کی کیا حیثیت ہو گی۔ جب کہ شوریٰ نظام مملکت چلا رہی ہو۔ نیز اس صورت میں قوانین کے عوامی اختلاف کا کیا حل ہو سکتا ہے؟

جواب ۔ میں صورت حال آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس کی دو نوعیتیں ہیں۔ حکومت (حکمران ملک) وزیر یا کوئی قاضی بھی کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہو اور خواہشمند ہو کہ اور لوگ بھی اسے مدد دیں تو وہ لوگوں سے مشورہ کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قاضیوں کو مشورہ دیا ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے اہل علم سے مشورہ کرو۔ میں سمجھ نہ سکا کہ شوریٰ کے کس معنی کے متعلق آپ مجھ سے سوال کر رہے ہیں؟ اور ان دونوں میں مجھے کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ حکومت بھی مشورہ کرے گی مثلاً اپنے وزیروں سے اپنے پارلیمنٹ سے' اسی طرح حاکم عدالت بھی مشورہ

کرے گا۔ اسی طرح ہم آپ اپنے پرائیویٹ معاملات میں بھی مشورہ کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ خود رسول خدا بھی ایسا کیا کرتے تھے۔

۳۱۲ سوال ۱۵۔ ایسی صورت میں قانون دانوں کی آراء میں اختلاف کا کیا حل ہو سکتا ہے؟

جواب۔ میں آپ پر واضح کر چکا ہوں کہ ان دشواریوں کا اسلام کے ابتدائی زمانے میں کوئی حل نہ تھا۔ لیکن جب سے حنفی، شافعی، مالکی قانون وغیرہ پیدا ہو گئے یعنی معین ہو گئے تو اب نئے قوانین بننے کا امکان بہت کم رہ گیا ہے مثلاً قانون شہادت کے سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف دعوے کی اساس پر حاکم عدالت کو فیصلہ کر دینا چاہیے۔ اس بارے میں حدیث، مفتیوں اور مجتہدوں کی رائے کی بنا پر یہ کہہ دیا گیا کہ مدعی کو ثبوت پیش کرنا ہو گا۔ اور مدعا علیہ اس سے انکار کر سکتا ہے، جب تک اس کے خلاف دعویٰ ثابت نہ ہو جائے۔ اس کے بعد آپ نیا قاعدہ کیا بنائیں گے؟ "البینة علی المدعی" کا قاعدہ ہمارے پاس مثلاً امام ابوحنیفہ نے یا امام شافعی نے دیا اور وہ موجود ہے تو ہم اس موضوع پر کوئی نیا اجتہاد کر ہی نہیں سکتے۔ اگر کریں تو ہم بھی وہی رائے دیں گے۔ کسی فقیہ کی رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی ممانعت نہیں۔ قابل قبول دلیل کے ساتھ نئی رائے دیجئے تو خود پرانا فقیہ بھی، اگر وہ زندہ ہو تو، اسے خوشی سے قبول کر لے گا۔ فرضی بحث سے فائدہ نہیں۔

۳۱۳ سوال ۱۶۔ سورۃ فاتحہ امام کے پیچھے جائز ہے یا نہیں؟ وضاحت سے بیان فرمایئے۔

جواب۔ غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ اس بارے میں ائمہ کی رائے میں اختلاف ہے، مثلاً امام شافعی کہتے ہیں کہ اس کو پڑھنا ضروری ہے۔ بعض دیگر امام مثلاً امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اور دونوں کے پاس دلیلیں ہیں۔ ایک چھوٹی سی چیز آپ میں سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ میں اس وقت جماعت میں شریک ہوتا ہوں جب کہ امام رکوع میں جا رہا ہو، اور میں بھی رکوع میں فوراً چلا جاتا ہوں۔ میری نماز پوری ہو جاتی ہے تو ان حالات میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہ ہو گا۔ اگر میں انفرادی طور سے نماز پڑھوں تو بے شک واجب ہے لیکن جماعت کی نماز میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ پڑھیں تو بہتر ہے، نہ پڑھیں تو بھی جائز ہے۔ حدیث میں آتا ہے: "لا صلوة الا بفاتحة الکتاب" کوئی نماز درست نہیں ہو گی جب تک اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے۔ مگر اس کے معنی امام ابوحنیفہ یہ فرمائیں گے کہ اگر آدمی تنہا نہ پڑھ رہا ہو اور اس کا امام پڑھ لے تو وہ سب کی طرف سے پڑھنا ہو گا۔ چنانچہ ایسے واقعات

پیش بھی آئے۔ بہت سے لوگ امام ابوحنیفہ کے مکان پر ہجوم کرتے اور ان کو مارنا چاہتے ہیں کہ تم اس حدیث کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ امام ابوحنیفہ نے ان شورشیوں سے کہا کہ تم اپنا ایک نمائندہ منتخب کر لو تا کہ اس سے بات کر سکوں سارے لوگوں سے گفتگو ممکن نہیں۔ بے سوچے سمجھے انھوں نے منظور کر لیا۔ اور ایک شخص کو نمائندہ بنا کر بھیج دیا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا کہ تمھیں اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ جس طرح تم اپنی پوری جماعت کے نمائندے ہو' اسی طرح امام بھی سب مقتدیوں کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس طرح سے وہ لوگ جو خارجی مذہب کے تھے' چپکے سے چلے گئے اور انھوں نے کوئی فساد نہیں کیا۔ بہر حال میں دہراتا ہوں کہ اس بارے میں فقہی مذاہب میں اختلاف ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق ہی عمل کرنا چاہیے تا کہ اسے اچھا مسلمان سمجھا جا سکے۔ آپس میں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔

۳۱۴ سوال ۱۷۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے یا نہیں؟

جواب ۔ مجھے شخصی طور پر تو اس کا علم نہیں لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ غیب کی جس چیز سے اللہ پیغمبر کو واقف کراتا ہے' وہ جانتے تھے۔ جو غیب کی چیز اللہ اپنے لیے مخصوص رکھتا ہے' اس کا جاننا پیغمبر کے لیے بھی ناممکن ہوتا ہے۔

۳۱۵ سوال ۱۸۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے یا بشر؟

جواب ۔ اس کا جواب آسان ہے خود قرآن میں ذکر آیا ہے "انما انا بشر مثلکم" (۱۸:۱۱۰) تو قرآن پاک کی صراحت کی موجودگی میں کوئی اور جواب نہیں دیا جا سکتا۔

۳۱۶ سوال ۱۹۔ انگوٹھا چومنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ۔ غالباً یہ سوال اس سلسلے میں کیا گیا ہے کہ جب اذان ہو رہی ہو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ مؤذن دہراتا ہے تو بعض لوگ اپنے انگوٹھے کا ناخن چوم کر آنکھوں پر ملتے ہیں۔ اس بارے میں شخصی طور پر ابھی مجھے کسی تلاش کا موقع ملا نہیں لیکن میرے اپنے ایک استاد نے جو بہت فاضل شخص تھے' ایک بار ہم سے کہا تھا کہ اس بارے میں حدیثیں ملتی ہیں' تو میں نے اس پر اکتفا کیا۔ اور اس میں مجھے کوئی حرج نظر نہیں آتا کیونکہ آدمی کو کسی سے عشق ہو تو اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہوتا' وہ ایک انفرادی قانون ہوتا ہے۔ کوئی شخص اپنی محبت کا اظہار کسی کے سر کو چومنے سے کرتا ہے' کوئی اس کے ہاتھ کو چومنے سے اور کوئی قدموں کو چومنے سے کرتا ہے۔ یہ ہر شخص کی انفرادی چیز ہے' اور میری رائے میں ان انفرادی معاملات میں ہمیں دخل نہیں

دینا چاہیے۔ ہاں ممنوع چیزیں مثلاً غیر اللہ کو سجدہ کریں' ایسا نہ ہونا چاہیے۔

۳۱۷ سوال ۲۰۔ رفع الیدین جائز ہے یا نہیں؟

جواب۔ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اس بارے میں ائمہ میں اختلاف رائے ہے' جس کی اساس یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یوں فرمایا اور کبھی یوں فرمایا' لہٰذا دونوں سنت نبوی ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' اپنے بچپن کا ایک واقعہ' کہ میں چھ سات برس کا تھا' صدر مدرس ہماری کلاس میں آئے اور یہ معلوم کیا کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان' شیعہ ہے یا سنی' حنفی ہے یا شافعی وغیرہ پھر وہ ہم مسلمان طلبہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے' بچو! مذہب کے فرق کی بنا پر آپس میں کبھی نہ جھگڑو۔ ہر مذہب کا شخص اپنے امام کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق عمل کرتا ہے اور انھوں نے ایک جملہ کہا جو میں باوجود ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے اب تک نہیں بھول سکا۔ وہ جملہ یہ تھا کہ اللہ کو اپنے حبیب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت تھی کہ ان کے ہر عمل' ان کی ہر حرکت کو قیامت تک باقی رکھوانا چاہتا تھا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک حرکت پر سب مسلمان عمل کریں تو اسی رسول کی ایک دوسری حرکت غائب ہو جائے گی۔ لہٰذا خدا نے اپنے حبیب کی ہر ہر حرکت کو محفوظ رکھنے کے لیے مختلف ائمہ' مختلف مذاہب کے ذریعے اس کی بقا کا انتظام کیا۔ کبھی یہ نہ سمجھنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے خلاف ہے۔ وہ بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے اور یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔

عہد نبویؐ میں نظام مالیہ و تقویم

محترم صدر! محترم ڈین! محترم اساتذہ کرام! محترم مہمانان گرامی!
السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ!

۳۱۸ - الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین و آلہ واصحابہ اجمعین!

۳۱۹ - آج کا موضوع مالیات کے متعلق ہے۔ یہ اس بناء پر ایک اہم موضوع ہے کہ قرآن مجید میں مال کو انسانیت کی بقاء اور انسانیت کے قیام کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ "واموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما" (۵:۴) اس لحاظ سے قرآن میں ہی اس چیز کا اب سے چودہ سو سال پہلے ذکر آ چکا ہے کہ مال کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر زمانہ حال میں لوگوں کو یہ کہا جاتا ہے کہ مال کی بڑی اہمیت ہے اور دین اس سے غفلت برتتا ہے۔ لہٰذا کمیونسٹ بننا چاہیے تو میں کہوں گا کہ اب سے چودہ سو سال پہلے مسلمانوں کو ان کے دین نے یہ بتا دیا تھا کہ زندگی ایک دن بھی مال کے بغیر نہیں گزر سکتی۔ البتہ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ پرانے ادیان کی پالیسی اور اسلام کی پالیسی میں کیا فرق پایا جاتا ہے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ آیا اسلامی احکام بہتر ہیں یا نہیں' اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی چیز کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا اور وہ ایک طرح سے معذرت ہو گی۔ اسلامی مالیات پر ہمارے فقہا نے نہایت قدیم زمانے سے ہی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً امام ابو یوسف کی کتاب "الخراج" یحیٰی ابن آدم القریشی کی کتاب "الخراج" ابو عبید قاسم بن سلام کی کتاب "الا موال" اور اسی طرح کی اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ کئی ایک چھپ بھی چکی ہیں۔ میں ان ساری کتابوں کے مؤلفوں کا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے عرض کروں گا کہ ان میں ایک کوتاہی نظر آتی ہے' وہ یہ کہ انھوں نے تاریخی نقطہ نظر کو ملحوظ نہیں رکھا۔ یعنی یہ کبھی نہیں بتایا کہ عہد نبوی میں مالیات کے متعلق ابتدائی صورت یا ہجرت سے پہلے مکہ میں کیا صورت تھی' مدینہ آنے کے بعد ابتداء کیا تھی' رفتہ رفتہ کیا تبدیلی ہوئی اور بالآخر اس نے کیا صورت اختیار کی؟ ان باتوں کا وہ کہیں بھی ذکر نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہمارے دلوں میں

خلش رہ جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے مؤرخ اور ہمارے فقہا' بھی کہتے ہیں کہ زکوٰۃ ۹ ہجری میں فرض ہوئی "آمنا و صدقنا" لیکن آپ قرآن مجید کی مکی سورتوں میں بھی لفظ زکوٰۃ کا استعمال پاتے ہیں تو مسئلہ الجھ جاتا ہے۔ میں اسی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کروں گا کہ عہد نبوی میں مالیہ کا کس طرح آغاز ہوا۔ باقی تفصیلات پر ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اگر یہ سب تفصیلات بیان کرنا چاہوں تو کئی ہفتے درکار ہوں گے۔

۳۴۰۔ جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا کہ زکوٰۃ کا ذکر ہم کو مکی سورتوں میں بھی ملتا ہے۔ قبل اسلام کے قدیم مذہبی صحیفوں میں بھی ذکر موجود ہے۔ قرآن میں ابتداء زکوٰۃ کے بارے میں صرف اشارے ملتے ہیں مثلاً ایک آیت ہے: "وآتوا حقه يوم حصاده..." (۱۴۱:۶) (جب تم زراعت کی فصل کاٹ لو تو اللہ کا حق اس میں سے ادا کرو)۔ یہاں "اللہ کا حق" سے مراد زکوٰۃ ہی ہے۔ اس طرح اور بھی آیتیں ہمیں ملتی ہیں جن میں صرف ایک لفظ "زکوٰۃ" نہیں بلکہ کئی اور لفظ بھی اس کے مترادف کے طور پر قرآن میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک معروف ترین لفظ "صدقات" ہے۔ "انما الصدقات للفقراء والمساكين..." (۶۰:۹) یہاں صدقہ و خیرات دینا بالکل مراد نہیں بلکہ زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اسی طرح: "خذ من اموالهم صدقة (۱۰۳:۹) یہاں بھی "صدقہ" کا لفظ گویا زکوٰۃ کے معنی میں ہے۔ اسی طرح لفظ "انفاق" نیز لفظ "نصیب" بھی ہمیں اسی معنی میں کئی جگہ ملتا ہے۔ غرض یہ کہ مکی دور میں اور مدنی دور میں کبھی ایک لفظ استعمال ہوتا ہے کبھی دوسرا لفظ' اور اس کو سمجھے بغیر ہمیں دشواریاں پیش آ سکتی ہیں۔ دوسری چیز جو اتنی ہی اہم ہے وہ یہ ہے کہ اگر مکہ ہی میں زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی' جس معنی میں ہم فرض سمجھتے ہیں' تو اس کا ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یعنی مکہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی وصولی اور خرچ کا انتظام کیا گیا ہو یا اس کی مقدار معین ہو' اس کی میعاد مقرر ہو' اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ان حالات میں مجبوراً اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے (اور یہ میری ذاتی رائے ہو گی' آپ پابند نہیں کہ اسے قبول بھی کریں) کہ زکوٰۃ کی ابتداء اور اس کا آغاز اخلاقی اور رضا کارانہ اساس پر ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے کہتے تھے کہ اپنی تجارت' زراعت اور دیگر کمائیوں سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرو' اور کوئی تعجب نہیں کہ وقتاً فوقتاً" مسلمان خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مال پیش کرتے ہوں تاکہ اپنی صوابدید سے اس مال کو خرچ کریں اور کبھی مسلمان براہ راست خود ہی اپنی صوابدید سے خرچ

کرتے ہوں۔ کن لوگوں میں زکوٰۃ تقسیم کرنی مناسب ہے' اس بارے میں کوئی صراحت نہیں ہوئی تھی۔ زمانہ جاہلیت میں نیک دل' شریف اور مخیر لوگ جس طرح اپنا مال خرچ کیا کرتے تھے' اسی طرح خرچ کرتے رہے تو وہی اسلامی طریقہ بھی رہا۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت کی ہر اچھی چیز کو اسلام برقرار رکھتا بلکہ اس کی تاکید بھی کرتا ہے۔ لفظ زکوٰۃ شروع میں ٹیکس کی بجائے ایسی چیز کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس سے ہمارا تزکیہ نفس ہو سکے۔ اس میں اخلاقی عنصر زیادہ ہے' سرکاری و قانونی دباؤ اور جبر کا عنصر نہیں۔ جب یہ چیز ذہنوں میں راسخ ہو جاتی ہے کہ دوسرے انسان کی مدد کرنا' غریبوں محتاجوں کا حتی الامکان ہاتھ بٹانا' یہ واجب امر ہے' تو پھر رفتہ رفتہ اس میں اور عناصر بڑھتے جائیں گے۔ مثلاً یہ کہ اس کو کس زمانے میں دیا جائے؟ کس شرح سے دیا جائے؟ اس کے مستحق لوگ کون ہیں؟ یہ مسائل رفتہ رفتہ حل ہوتے جائیں گے۔ چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ مکہ معظمہ میں زکوٰۃ ایک طرح سے رضاکارانہ چیز تھی اور کسی پر کوئی جبر نہیں تھا۔ اس سلسلے میں آپ کو یہ یاد دلاؤں گا کہ زمانہ جاہلیت میں' مشرکوں کے ہاں بھی ایک طرح کی زکوٰۃ پائی جاتی تھی۔ چنانچہ لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنی پیداوار کا ایک حصہ اپنے بتوں کو دیتے تھے: کچھ اللہ کے لیے رکھتے تھے' کچھ حصہ بتوں کے لیے' اور پھر قرآن نے سورہ انعام (۶:۱۳۶) میں طنز کیا ہے کہ اگر اتفاقاً" کسی وجہ سے بتوں کا کچھ حصہ اللہ کے حصہ میں پڑ جاتا ہے تو اسے لے کر دوبارہ بت کو دے دیتے ہیں۔ لیکن اگر مثلاً ہوا کے چلنے سے یا کسی اور وجہ سے اللہ کا کچھ حصہ بتوں کے پاس چلا گیا تو اللہ کو نہیں دلاتے' بتوں ہی کے لیے رہنے دیتے ہیں۔ یہ صورت حال مکہ میں رہی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہیں تو حالات بدلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہاں ایک تو مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہے دوسرے مسلمانوں کی ضروریات بڑھتی ہیں' تیسرے مسلمانوں کے دفاع وغیرہ کے لیے مال کی طلب پیدا ہوتی ہے' چوتھے یہ کہ مسلمانوں کے مالی وسائل بھی بڑھ جاتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں بھی بہت سے مالدار مسلمان تھے جو زراعت پیشہ تھے' باغات اور زراعت سے انھیں کافی آمدنی ہوتی تھی اور وہ معین طور پر اس کا کچھ حصہ دے سکتے تھے۔ پانچویں یہ کہ وہاں مسلمانوں کی ایک حکومت بھی قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن مدینہ منورہ میں بھی ابتداء" زکوٰۃ گویا ایک خیرات' ایک رضا کارانہ چیز اور ایک غیر معین فریضہ تھا۔ کتنی مقدار میں دیں' کب دیں' کس کو دیں' رفتہ رفتہ ان باتوں کی اہمیت بڑھتی جائے گی' ان سوالوں کا جواب دیا جائے گا اور اس میں وہ عناصر آ جائیں گے جن کی بناء پر ہم آخر میں زکوٰۃ کو آج کل کے ٹیکس

سے الگ چیز نہیں سمجھ سکیں گے۔ جس طرح آج کل اگر کوئی شخص ٹیکس دینے سے انکار کرے تو حکومت جبر کر کے اس سے وصول کرتی ہے' جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں ہوا کہ انھوں نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا اور بالجبر زکوٰۃ وصول کی۔

۳۲۱۔ ایک اور پہلو پر مجھے کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے' وہ یہ کہ جب مسلمان مکے سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو عام مہاجرین کی' بے روزگاری اور ان کی مصیبت زدگی کا ازالہ کیا گیا اور مواخات کے ذریعے سے مدنی مسلمانوں کے خاندانوں میں ان مکی مہاجرین کے خاندانوں کو ضم کر کے ان دو خاندانوں کو ایک خاندان بنایا گیا۔ یہ خاندان مشترکہ طور پر کمائی کرتے تھے اور رہتے تھے۔ اب یہ سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہو گا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بسر برد کس طرح کیا کرتے تھے اور آپ کے وسائل آمدنی کیا تھے؟ شاید آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک مستشرق جو سویڈن کا ہے لکھتا ہے کہ "ابتداء" مسلمان نہایت ہی غریب تھے' لہٰذا لوٹ مار کیا کرتے تھے وہ لکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوجیں بھیجتے تاکہ قافلوں کو لوٹ لیں کیونکہ وہ مجبور تھے اور ان کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی"۔ ظاہر ہے کہ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ بیان اسلام کے بارے میں بہت سخت اعتراض ہے کہ دوسروں سے تو وہ کہتا ہے کہ انصاف کرو اور اپنے آپ کو ہر چیز کا مجاز سمجھتا ہے لیکن اس اعتراض میں صداقت نہیں' مسلمانان مدینہ کے سلسلے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کے پاس گزر اوقات کے وسائل تھے۔ ان کی زمینیں تھیں اور وہ زراعت اور باغبانی کرتے تھے۔ مکی مہاجرین جو آئے تھے وہ بھی اس کام میں مشغول ہو گئے۔ کچھ لوگ تجارت کرنے لگے' کچھ لوگ جو مثلاً حرفت پیشہ تھے' جوتے وغیرہ بنانے لگے اور کچھ نجاری و صنائی وغیرہ کرنے لگے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عام طور پر ہماری تاریخی کتابوں میں کم ذکر ملتا ہے' اس لیے ابتداء میں اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ رسولؐ اللہ جب مکہ سے مدینہ پہنچے تو ابتداء میں شہر کے جنوبی حصہ "قبا" میں قیام فرمایا۔ بعض روایات کے مطابق وہ تین ہفتے وہاں مقیم رہے مگر میں ایک مؤرخ کی بیان کردہ روایت کو شعوراً ترجیح دیتا ہوں۔ وہ صرف چار دن کے قیام کا ذکر کرتا ہے۔ دوشنبہ کے دن وہاں پہنچے اور جمعہ کے دن وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اکثر یہ ذکر آتا ہے کہ جب آپ مدینہ کی طرف یعنی موجودہ مسجد نبوی کی طرف روانہ ہوئے تو جمعہ کا دن تھا۔ ظہر کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا

اور وہیں راستے میں لوگوں کو باجماعت نماز جمعہ پڑھائی۔ اس کے بعد آپ آگے بڑھ کر بنو نجار کی بستی میں پہنچتے ہیں اور وہاں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں قیام فرماتے ہیں۔ وہ اونٹنی کا قصہ وغیرہ جو ذیلی تفصیلیں ہیں مجھے ان سے بحث نہیں ہے۔ اس بارے میں یہ امر واضح ہے کہ جب آپ پہلے پہل "قبا" میں پہنچے اور چار دن یا دو تین ہفتے وہاں مقیم رہے تو مقامی لوگوں نے جو مسلمان تھے' نہایت ہی احترام کے ساتھ مہمان نوازی کے طور پر' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے پینے کی چیزیں پیش کیں۔ اس طرح اس مہمان نوازی کی وجہ سے وقت گزر گیا۔ اس وقت یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح زندگی گزارتے تھے۔ جب آگے بڑھ کر بنو نجار کی بستی میں بستے ہیں تو صحیح بخاری کے مطابق یہ آپ کے ننھیال کا گھرانا تھا۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ عبدالمطلب کی ماں ایک مدنی خاتون تھیں' اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ مدینے کے ایک خاندان سے قائم تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عبدالمطلب کے بعد سے ہر زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان ان رشتہ داروں کے ساتھ اپنے تعلقات کو برقرار رکھتا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کبھی شمالی سفر مثلاً مکہ سے شام کو جاتے' تو جاتے وقت بھی اور آتے وقت بھی' مدینہ میں اپنے خاندان کے پاس ٹھہرتے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کے تعلقات دوستانہ اور قریبی تھے۔ ان حالات میں صحیح بخاری کے اس بیان پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجار کی بستی میں ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں اس لیے قیام فرمایا کہ وہ آپ کے ننھیال کا خاندان تھا۔ (میں اس اونٹنی کے قصے کا ذکر فی الوقت ترک کرتا ہوں)۔ بہر حال عرض کرنا یہ ہے کہ جب ایک قریبی رشتہ دار کے مکان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیام فرماتے ہیں تو وہاں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسائل زندگی کیا ہیں؟ یقیناً قریبی رشتہ داروں نے آپ کی ضیافت کی ہو گی' بغیر اس کا مطالبہ کیے کہ ہمیں اس کے مصارف دیئے جائیں۔ اسے وہ اپنے لیے باعث فخر ہی سمجھتے ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں مہمان ہیں۔ یہ سلسلہ چند مہینے تک جاری رہا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر ایک بڑی مسجد بنانے کا حکم دیا۔ سارے شہر مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کے باعث جو لوگ پہلے محلے والی مسجد میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی اب اس مرکزی

مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے آنے لگے تھے۔ چھوٹی مسجد کافی نہیں ہو سکتی تھی' لہذا ایک بڑی مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس مسجد میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رہنے کے لیے چند کمرے بنوائے گئے یہ ابتداء میں تو اتنے زیادہ نہیں تھے جو بعد میں نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں' اس کے کچھ ہی دنوں بعد' دوسری بیوی جن سے شادی ہو چکی تھی لیکن ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی' تشریف لائیں' یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا' ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ کمرے کی ضرورت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو دو صاحب زادیاں تھیں' حضرت فاطمہ اور حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما' ان کے لیے بھی ایک کمرہ بنایا گیا۔ دونوں بہنیں ایک ہی کمرے میں رہیں۔ بعد میں کبھی ان حجروں میں رہنے والوں کی تعداد گھٹے گی۔ مثلاً لڑکیوں کی شادیاں ہو جائیں گی۔ کبھی ان کمروں کی تعداد نئی بیویوں سے زواج عمل میں آنے کے باعث بڑھ جائے گی۔ بالاخر جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں نو بیویاں تھیں اور ایک کنیز حضرت ماریہ قبطیہ بھی۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ توضیحوں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک حضرت ماریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق ہے بہ صراحت بیان کیا گیا ہے کہ مسجد نبوی کے حجروں میں نہیں رہتی تھیں بلکہ کسی قدر فاصلے پر' ان کا علیحدہ مکان تھا۔ اسی طرح جہاں تک مجھے اس وقت یاد آ رہا ہے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان علیحدہ تھا' وہ بھی ان حجروں میں نہیں رہتی تھیں۔ مسجد نبوی کے ان کمروں میں ایک کمرہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے تھا اور ایک کمرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحب زادیوں کے لیے تھا۔ ایک اور کمرہ بنایا گیا تھا' جس میں جلد ہی اس کا مقیم آ گیا یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ تو ابتداء" تین حجرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان سے اٹھ کر یہاں آ گئے۔

۳۲۲ - اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی بسر برد کا کیا انتظام تھا۔ لکھا ہے کہ مدینہ کے انصار جو کسان تھے اور زراعت پیشہ تھے' ان میں سے اکثر نے جو کافی مالدار تھے' اپنے باغوں میں ایک ایک درخت کو نشان زدہ کر دیا تھا کہ اس کا پھل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے انھوں نے ایسا کیا تھا' اور ہر سال کھجور کی فصل کٹنے

پر' اس درخت سے جتنی کھجوریں حاصل ہوتیں' وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پہنچا دی جاتیں۔ اگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت سے زائد ہوتیں تو غرباء اور مہمانوں میں تقسیم ہوتیں۔ یہ پیش کش برابر جاری رہی۔ ہمارے مؤرخ اور محدث اکثر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک حدیث کا ذکر کرتے ہیں کہ بعض اوقات مہینے گزر جاتے اور ہم صرف دو چیزیں پر اکتفا کرتے تھے یعنی کھجور اور پانی پر ہمارے گھر میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ غالباً اس زمانے کا ذکر ہے' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسائل آمدنی میں صرف کھجوریں ہوا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں چند اور تفصیلیں نظر آتی ہیں مثلاً اس کا پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند بکریاں خریدی تھیں اور ان کا دودھ خاندان میں خرچ ہوتا تھا۔ اس طرح اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی اونٹنی' کوئی بکری جو دودھ دینے والی ہوتی' پیش کرتے اور التجاء کرتے کہ اس کو قبول فرمایئے' اس طرح ہماری عزت افزائی ہو گی۔ تو کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قبول فرما لیتے تھے۔ اس طرح ان کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ شروع میں مثلاً ایک بکری تھی' بعد میں دس بکریاں ہو گئیں۔ شروع میں ایک اونٹنی تھی بعد میں چار اونٹنیاں ہو گئیں۔ اب ان کے لیے ہمیں تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ شہر مدینہ کے مضافات میں ایک چراگاہ معین کی گئی جہاں ایک صحابی رضاکارانہ طور پر ان جانوروں کی نگہداشت کرتے' انھیں چرانے کا فریضہ انجام دیتے اور روزانہ دودھ اس مقام سے مدینہ لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں پہنچایا کرتے تھے۔ اہل خاندان اس دودھ کو استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بنی نجار ہی کے ایک فرد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی ننھیالی رشتہ دار تھے' ان کی عادت تھی کہ روزانہ اپنے گھر میں پکی ہوئی چیزوں میں سے کوئی نہ کوئی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر بھیجتے۔ کبھی کوئی میٹھی چیز' کبھی ترکاری' کبھی گوشت' بہر حال جو بھی اچھی چیز ان کے گھر پکتی تھی' ضرور بھیجتے۔ وہ بہت مالدار شخص تھے۔ بعض وقت جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ یہی ایک صحابی اسی اصحاب صفہ کو بیک وقت اپنے گھر لے جا کر ان کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے اوقات میں تنہا کھانا کھانا کبھی پسند نہ فرماتے۔ ہر وقت دس پانچ لوگوں کو جو اس وقت موجود ہوتے' بلا لیتے۔ کبھی کچھ

گھر کی چیزیں کھجور وغیرہ' کچھ وہ تحفے جو روز بروز آتے تھے' وہ بھی کھانے کے طور پر استعمال ہوتے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا۔ جلد ہی ایک چھوٹے سے ذریعہ آمدنی کا اضافہ ہوتا ہے۔ ۲ ہجری رمضان کے مہینے سے دشمنوں کے ساتھ جنگوں کا آغاز ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جنگ کے مال غنیمت کا (۱/۵) حصہ حکومت کے لیے وقف تھا اور (۴/۵) حصہ مجاہدوں میں برابر تقسیم کیا جاتا ہے۔ بیش تر جنگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شخصا" شریک ہوئے۔ مثلاً بدر میں اور اس کے بعد مختلف غزوات میں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دو طریقے سے آمدنی ہونے لگی' ایک تو مجاہد کی حیثیت سے کہ آپ جنگ میں شریک تھے اور جنگ میں شریک ہونے والوں کی طرح برابر حصہ ملتا جس کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی۔ اس وقت ایسا نہیں تھا کہ مستقل ہر مہینے جنگ ہو اور ہمیشہ مال غنیمت سے کافی آمدنی ہوتی رہتی ہو۔ دوسرا وسیلہ اس مال غنیمت میں سرکاری مال تھا جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑا گیا تھا کہ جس طرح چاہیں آپ تقسیم فرمائیں۔ لیکن وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا' بلکہ عوام الناس کی ضروریات کے لیے اور ملکی عام بہبود' دفاعی انتظام' ہتھیاروں کی خریداری کے لیے خرچ ہوتا تھا۔ بہر حال اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے اور کسی وقت آپ کے مکان میں کوئی چیز نہ ہوتی تو اس سرکاری مال یعنی خزانے کی چیزوں میں سے مہیا کر دی جاتی۔ لیکن یہ صرف مال غنیمت کے متعلق ہے۔ جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے' اس کے بارے میں شریعت کا یہ حکم تھا کہ زکوٰۃ کا مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال اور قبیلہ بنی ہاشم اور قبیلہ بنی المطلب کے لیے حرام ہے۔ اگر سرکاری آمدنی حکمران کی آمدنی سمجھ لی جائے تو حکمران کے قریبی لوگ' ماتحت لوگ' ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اگر معلوم ہو کہ حکمران کے لیے یہ حرام ہے تو ماتحت افسروں کو ذرا احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کہ حکمران ان کا محاسبہ کرے گا۔ اس لحاظ سے یہ نہایت اہم بات ہے کہ اسلام کے سوا دنیا کی کسی اور قوم نے سرکاری آمدنی حکمران کی ذات کے لیے ممنوع قرار نہیں دی۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔ اس عام حکم میں کہ جو مال دشمن کافروں سے' غیر مسلموں سے' مال غنیمت کے طور پر حاصل ہو' اس کا ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ "...قل الا نفال اللّٰہ والرسول" (۸:۱) کے جو الفاظ آئے ہیں وہ صرف مال غنیمت کے متعلق ہیں "واعلموا انما غنمتم من شئی" (۸:۴۱) اور مال غنیمت کا کچھ حصہ

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات پر خرچ کر سکتے تھے۔ لیکن زکوٰۃ کا کوئی حصہ بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے لیے صرف نہیں جا سکتا تھا۔ بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ بالکل ابتداء میں' مدینہ میں' یہی صورت حال تھی۔ مکہ کا سوال نہیں کیونکہ یہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثتی جائیداد تھی' اپنی بیوی سے حاصل کردہ جائیداد تھی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی تاجر تھے۔ مدینہ میں ہمیں یہ صورت نظر آتی نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں مہمان رہے اس کے بعد آپ کو ایسی چیزیں "تحفتاً" پیش کی گئیں جو مستقل تھیں' مثلاً کھجوروں کی فصل کے وقت اس کا کچھ حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا۔ اس کے بعد مال غنیمت ایک ذریعہ پیدا ہوا' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گزر بسر کے انتظام میں کام آنے لگا۔ جنگ بدر کے بعد جلد ہی جنگ احد پیش آئی (کم و بیش ایک سال بعد)۔ اس موقع پر ہمارے مؤرخ ذکر کرتے ہیں کہ وہاں "مخیریق" نامی ایک یہودی تھا۔ کہتے ہیں کہ مسلمان ہو چکا تھا۔ اپنی انتہائی عقیدت کے پیش نظر اس نے وصیت کی تھی کہ اگر جنگ میں مر جاؤں تو میرے سارے باغ جو مدینہ میں ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں گے۔ چنانچہ مخیریق کے سات باغ تھے جن کی پوری آمدنی اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہو گئی۔ اس طرح ابتدائی زمانے کی دشواریاں ختم ہو گئیں۔ ہمیں اور چند چیزوں کا ذکر بھی ملتا ہے مگر میں ان تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔

۳۲۳۔ میں نے ابھی آپ سے بیان کیا کہ حکومت کی طرف سے ایک قانون بنا کہ سارے مالدار مسلمان' اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کریں۔ اس سلسلے میں ابتداءً خیرات کا حکم دیا گیا اور یہی خیرات بعد میں ٹیکس بن گئی۔ اس سلسلے میں مجھے مکرر ذکر کرنا پڑتا ہے کہ مال غنیمت کی آمدنی کا ایک حصہ حکومت کے لیے ہوتا تھا اور مال غنیمت کا ۱/۵ حصہ اور "مال فئے" پورے کا پورا حکومت کے تصرف میں آ جاتا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر دشمن سے لڑائی ہو اور جیسا کہ قرآن (۵۹ : ۶) کے الفاظ ہیں کہ گھوڑوں کے دوڑانے کے ذریعے دشمن کے علاقے پر دشمن کے مال پر قبضہ کیا گیا ہو' تو اسے مال غنیمت قرار دیا جاتا۔ اگر جنگ کے بغیر دشمن قبول کرتا کہ ہم آزاد تو رہیں گے لیکن تمھیں اس قدر سالانہ خراج دیا کریں گے۔ وغیرہ' یہ ساری آمدنیاں "فئے" کہلاتی تھیں۔ ان کو تقسیم کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ سارے کا سارا سرکاری خزانے میں آ

جاتا۔ حکومت کی ان دو آمدنیوں کے ساتھ ساتھ اب ہم زکوٰۃ کو لیں گے جس کے اصول یہ ہیں کہ اگر کسی شخص کے پاس اس کی ضرورتوں سے فالتو کچھ رقم ہو اور وہ رقم سال بھر اس کے قبضہ میں ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ یہ نہیں کہ مثلاً آج تو ہمارے پاس اپنی ضرورتوں سے فاضل ایک لاکھ روپے ہیں۔ لیکن چند دنوں' چند مہینوں یا چند ہفتوں کے بعد وہ رقم ہماری ضرورتوں کے لیے خرچ ہو گئی۔ اسے فالتو رقم نہیں کہا جا سکتا۔ اسلامی قانون یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس معینہ نصاب کی رقم یعنی Minimum سے اونچی رقم کم از کم ایک سال تک موجود رہے تو اسے اس کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ کے نام سے حکومت کو دینا ہو گا۔ اس میں کچھ تفصیلات کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ ساری زکوٰۃ ڈھائی فیصد نہیں ہے۔ مختلف چیزوں کی زکوٰۃ مختلف ہے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس روپیہ ہے' یا سونا اور چاندی ہے۔ ان پر ڈھائی فیصد ہے' سالانہ دینا پڑتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص زراعت کرتا ہے تو فصل کٹنے کے بعد جو مقدار حکومت کے سپرد کی جاتی ہے اسے زکوٰۃ الارض کہتے ہیں۔ زکات ہی کے نام سے ہم اس چیز کو موسوم کرتے ہیں جو آج کل مال گزاری کہلاتی ہے۔ یہ کٹی ہوئی فصل کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی شخص کے پاس سونے کی کان ہو' یا چاندی کی کان تو اس سے بھی اس کو ایک حصہ حکومت کی خدمت میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام کی شرحیں مختلف ہیں۔ اسی طرح کسی کے پاس جانور ہوں مثلاً بکریاں' گائے' بیل' بھینس یا اونٹ وغیرہ تو ان کی بھی ایک تعداد معین تھی کہ اس سے زیادہ کسی کے پاس ہوں تو ہر سال اس کا اتنا حصہ حکومت کو دیا کرے گا۔ بکریوں کے متعلق ہم عام طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ایک فیصد لیا جاتا تھا۔ مثلاً کسی کے پاس پانچ سو بکریاں ہوں تو وہ پانچ بکریاں دیتا' کسی کے پاس چار سو بکریاں ہوں تو وہ چار بکریاں دیتا تھا۔ عام طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اونٹوں کی شرح اور گائے کی شرح اس سے کسی قدر زیادہ پیچیدہ ہے۔ مثلاً پانچ اونٹوں پر ایک بکری دیں یا دس اونٹوں پر فلاں دیں یا بیس اونٹوں پر ایک اونٹ دیں وغیرہ۔ بعض وقت ہمیں ایک اور ذریعہ آمدنی بھی نظر آتا ہے۔ زکوٰۃ التجارۃ ہے' یعنی تجارت کی زکوٰۃ' اسی طرح زکوٰۃ المعدن یعنی مدنیات کی زکوٰۃ غرض مختلف چیزوں پر جو ٹیکس مسلمان اپنی حکومت کو دیتے وہ سب زکوٰۃ کے نام سے موسوم ہوتے اور ان کی شرح مختلف ہوتی۔ اس کے متعلق زیادہ تفاصیل میں گئے بغیر مجھے ایک چیز کی طرف اشارہ کرنا ہے' وہ بھی اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ اسلام سے پہلے کے مذہبوں میں سرکاری آمدنی کے ذرائع یعنی کن کن چیزوں پر ٹیکس لیا جائے' اس کی تفصیل تو ہمیں ملتی ہے مثلاً توریت وغیرہ میں۔ لیکن کن

کن مدات میں انھیں خرچ کیا جائے اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ وہ بالکل حکمران کی صوابدید پر ہوتا ہے کہ اس ٹیکس کو وہ جیسا چاہے خرچ کرے اور عام طور پر حکمران اپنی ذات پر اور اپنی فضول خرچی و عیاشی پر خرچ کیا کرتے تھے۔ میرے علم میں قرآن کریم وہ پہلی دینی کتاب ہے جس میں آمدنی کے وسائل کے متعلق بہت کم تفصیلیں ملتی ہیں، لیکن خرچ کے متعلق انتہائی تفصیل سے بتایا جاتا ہے کہ کس کو کتنی رقم دی جائے۔ مثلاً و آتوا حقه یوم حصاده (۶:۱۴۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زراعت پر زکوٰۃ دینی چاہیے۔ لیکن صرف لفظ 'حق' ہے' یہ نہیں بتایا کہ کس مقدار میں عشر ۱/۱۰ یا ڈھائی فیصد یا پچاس فیصد۔ ایسی تفصیلات قرآن میں نہیں ملتیں۔ یہ تفصیلیں ہمیں حدیث میں ملیں گی۔ لیکن قرآن کا یہ اصول نظر آتا ہے کہ آمدنی کے ذرائع کے متعلق زیادہ تفصیل نہ دے بلکہ اگر میری توجیہ (Interpretation) صحیح ہے تو قرآن اسے حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے کہ حسب ضرورت اس میں اضافہ و تخفیف کر سکے۔ جن چیزوں کا قرآن میں ذکر ہے (مثلاً زراعت پر ٹیکس' تجارت پر ٹیکس وغیرہ) ان کے علاوہ بھی کسی اور چیز پر ہم ٹیکس لے سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مقام پر مچھلیاں بہت ہوں یا کسی مقام پر شہد کی مکھیوں سے تجارتی پیمانے پر آمدنی ہونے لگے تو اس کا ایک حصہ حکومت کو دیں۔ یہ ساری چیزیں زکوٰۃ بن جاتی ہیں۔

۳۲۴۔ زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں صاف اور واضح قرآنی احکام ہیں۔ وہ مشہور و معروف آیت جو کہ سورہ توبہ میں ہے انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین و فی سبیل الله و ابن السبیل فریضة من الله........ (۹ : ۶۰) صدقات (یعنی حکومت کی آمدنیاں یا زکوٰۃ) کو تقسیم کیا جائے فقراء پر' مساکین پر' اس کے بعد ذکر ہے "والعاملین علیها" یعنی حکومت کے ان کارندوں پر جو زکوٰۃ کے کام میں مشغول ہیں۔ عاملین کے بعد ذکر آیا ہے والمؤلفة قلوبهم یعنی ان لوگوں پر جن کے دل موہ لینے کی تمھیں ضرورت ہے (تبلیغ اسلام کے لیے) مثلاً جیسے آج کل ہم کہتے ہیں Secret Service حکومت مخفی طور پر ملت اور مملکت کے مفاد میں لوگوں پر کچھ رقم خرچ کرتی ہے۔ اس کے بعد ایک لفظ ہے "وفی الرقاب" گردنوں کے چھڑانے کے لیے۔ اس کے معنی متفقہ طور پر دو لیے جاتے ہیں۔ ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے اور اسلامی مملکت کی مسلم اور غیر مسلم رعایا اگر دشمن کے ہاتھ میں قید ہو گئی ہو تو فدیہ دے کر انھیں رہائی دلانے کے لیے۔ زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں اس کے بعد ایک لفظ ہے۔ "غارمین" اس کے معنی ہیں وہ

کھاتے پیتے مالدار لوگوں جن پر یکایک کسی حادثے یا خسارے سے سخت مالی بوجھ پڑ جاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے میں نے سہواً" کسی آدمی کو قتل کر دیا۔ مجھے خون بہا دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں محتاج اور تہی دست ہوں۔ تو حکومت کا فریضہ ہے کہ میری مدد کرے تاکہ میں متضرر کے متعلق اس فریضہ کی انجام دہی سے سبکدوش ہو سکوں۔ یہ ہے۔ غارمین۔ اس کی ابھی میں مزید تشریح کروں گا۔ اس کے بعد ایک لفظ ہے "فی سبیل اللّٰہ" یعنی اللہ کی راہ میں حیرت ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کے اولین معنی لیے گئے ہیں۔ دفاعی خدمات، ملک کی حفاظت کا انتظام اور فوج کے اخراجات، مسجدیں وغیرہ بنانے کو ثانوی حیثیت دی گئی۔ اس کے بعد ایک اور لفظ ہے جس کی توقع عام حالات میں نہیں تھی مگر اس کا ذکر یہاں ملتا ہے۔ "ابن السبیل" اس کے لفظی معنی ہیں راستے کا بچہ اور مراد اس سے ہے مسافر۔ مسافر کسی مقام کا بھی ہو اگر ہمارے علاقے سے گزرتا ہے تو آج کل حکومتیں تو مسافر سے ٹیکس لیتی ہیں کہ ہمارے ملک میں کیوں آتے ہو۔ اسلامی قانون کا حکم یہ ہے کہ مسافروں کی مہمان نوازی کرو، انھیں کھلاؤ پلاؤ اور اقامت کی سہولتیں مہیا کرو۔ ان آٹھ مداتِ کے ذکر کے بعد قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ اللہ کا مقرر کردہ حکم ہے "فریضۃ من اللّٰہ" دوسرے الفاظ میں حکومت کے موازانہ (میزانیہ) (Budgeting) کی پالیسی متعین کر دی گئی کہ ان آٹھ مدات میں زکوٰۃ کی آمدنی سے رقم صرف کی جائے: فقراء، مساکین، عاملین علیہا، مؤلفۃ القلوب، الرقاب، غارمین، فی سبیل اللّٰہ، ابن السبیل۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سے دلچسپ چیز کا میں ذکر کرتا ہوں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ چونکہ آٹھ مدات میں رقم خرچ کرنے کا حکم ہے لہٰذا آمدنی کا ۱/۸ حصہ ہر ایک مد کو دلایا جائے۔ (دوسرے ائمہ کی رائے یہ نہیں ہے) ابتدائی دو نام فقراء و مساکین سے کیا مراد ہے؟ بظاہر دونوں مترادف لفظ ہیں مگر اس میں اختلاف رائے رہا ہے۔ اور اس اختلاف رائے کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوا تھا تو امام شافعی نے کہا، چونکہ اللہ نے آٹھ مدوں میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ نے اپنے وفور رحمت سے غریبوں کو دگنا حصہ دلانا چاہا، اس لیے دو نام استعمال کیے گئے ہیں۔ (۸ / ۱) فقراء کے لیے اور (۱/۸) مسکینوں کے لیے یعنی دونوں غریبوں کے لیے کہ بجائے (۱/۸) کے (۲/۸) یا ایک چوتھائی آمدنی ان لوگوں کے لیے خرچ کی جائے۔ یہ محض علمی بحث کے سلسلے میں، میں نے آپ سے بیان کیا ہے۔ ایک چیز بہت زیادہ اہم ہے۔ آج کل اگر ہم اپنی فقہ کی کتابوں کو کھولیں تو ان میں نظر آئے گا کہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں کو دی جا سکتی ہے غیر

مسلموں کو نہیں دی جا سکتی۔ ہمیں نظر آتا ہے انتہائی ابتدائی زمانہ اسلام میں' انتہائی مقدس اور قابل احترام ہستیوں کی یہ رائے نہیں تھی۔ چنانچہ امام ابو یوسف کی تالیف "کتاب الخراج" میں اگر ہم دیکھیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں زکوٰۃ کی آمدنی سے یہودیوں کی بھی مدد فرماتے تھے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک روز وہ مدینہ کی گلیوں سے گزر رہے تھے' دیکھا کہ ایک شخص بھیک مانگ رہا ہے۔ انھیں حیرت ہوئی کہ میرے زمانے میں لوگ بھیک مانگیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حکومت کا فریضہ ہے کہ غریبوں کی مدد کرے۔ انھیں کھلائے پلائے۔ اس سے پوچھتے ہیں تو کون ہے؟ وہ کہتا ہے میں ایک یہودی ہوں۔ اب تک کاروبار کیا کرتا تھا اور جزیہ دیا کرتا تھا۔ اب بوڑھا ہو گیا ہوں کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا مجبور ہوں کہ بھیک مانگوں' تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے حد متاثر ہوئے اور فوراً" اپنے افسر خزانہ کو حکم دیا کہ اس یہودی سے آئندہ جزیہ نہ لیا جائے۔ بلکہ مزید برآں اس کے لیے روزینہ مقرر کر دیا جائے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ ھذا مساکین اھل الکتاب یہ مساکین کی مد میں آتا ہے اس لیے زکوٰۃ سے اس کو رقم دی جائے۔ دوسرے معنی میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے اور بعض دیگر صحابہ مثلاً زید بن ثابت' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ کی رائے مماثل ہونے کا ذکر طبری نے کیا ہے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں کی دی جا سکتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ "فقراء" سے مراد مسلمانوں کے فقیر اور مساکین سے غیر مسلم رعیت کے فقیر ہوں گے۔ جو بھی ہو یہ پہلی مد ہے۔ والعاملین علیہا تیسری مد ہے۔ اگر میں یہ توجیہ کروں کہ اس سے مراد پوری سول ایڈمنسٹریشن ہے تو حیرت کی بات نہ ہو گی۔ کیونکہ زکوٰۃ کو جمع کرنے والے' زکوٰۃ کا حساب رکھنے والے' زکوٰۃ کے حساب کی جانچ پڑتال یا آڈٹنگ (Auditing) کرنے والے' زکوٰۃ کو تقسیم کرنے والے' تقسیم کی نگرانی کرنے والے' یہ سب لوگ عاملین میں آ جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری سول ایڈمنسٹریشن یعنی سرکاری ملازمین کی تنخواہ زکوٰۃ کی آمدنی سے دی جائے گی۔

۳۲۵۔ اس کے بعد کا لفظ ہے۔ "مولفہ قلوبھم" اس سلسلے میں ایک بہت ہی مشہور کتاب ہے۔ ابو یعلی الفرا الحنبلی' جیسے کٹر قسم کے عالم کی۔ کٹر کا لفظ میں اچھے معنی میں استعمال کر رہا ہوں کہ وہ کسی ذاتی غرض یا کسی سیاسی ضرورت کے تحت دبنے والے انسان نہیں تھے۔ کھری کھری بات سناتے تھے۔ ان کی ایک کتاب ہے۔ "الاحکام السلطانیہ" یہ ماوردی کے معاصر ہیں اور ماوردی کی کتاب ہی کے نام سے یہ کتاب انھوں نے لکھی ہے اس میں زکوٰۃ کی

مدات پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "مؤلفۃ قلوبھم" یعنی جن لوگوں کا دل موہ لینا ہے ان کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی مدد کریں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جائے کے وہ مسلمانوں کو مضرت پہنچانے سے باز رہیں۔ عام حالات میں وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن اگر ان کو رقم دے دیں تو مثلاً جنگ کے زمانے میں وہ غیر جانب دار رہیں گے' مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تیسری قسم' ابویعلی الفراء لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جائے کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔ چوتھی قسم' وہ کہتے ہیں' ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے قریبی رشتہ دار' ان کے قبیلے کے لوگ' ان کے خاندان کے لوگ اسلام قبول کرلیں۔ اس فہرست کے بعد وہ ایک جملے کا اضافہ کرتے ہیں کہ یہ رقم مسلمان اور غیر مسلم کسی کو بھی دی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کی تالیف قلب کرنی ہو یا کسی کو' مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچانے کے لیے رقم دی جانی ہو۔ تو وہ غیر مسلم ہی ہو گا۔ لیکن امام ابو یعلی صراحت سے کہتے ہیں کہ "وہ چاہے غیر مسلم ہو یا مسلم' اس کو مولفہ قلوبھم کے تحت زکوۃ کی آمدنی سے رقم دی جا سکتی ہے۔

۳۲۶۔ اس سے آگے چلیے "فی الرقاب" یعنی ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے بھی حکومت امداد کرے اور ملک کی رعایا کو' دشمن کی قید سے چھڑانے کے لیے بھی حکومت زکوۃ صرف کرے۔ اس سلسلے میں مجھے یاد آ رہا ہے۔ "طبقات ابن سعد" میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کچھ تفصیلی حالات دے کر ان کا خط نقل کیا گیا ہے۔ وہ خط انھوں نے گورنر یمن کے نام لکھا ہے۔ اس خط میں لکھتے ہیں کہ جتنی رعایا دشمن کے ہاتھ قید ہو' اس کو چھڑانے کے لیے سرکاری خزانے سے رقم خرچ کی جائے' اس صراحت کے ساتھ کہ چاہے وہ مسلمان ہو یا ذمی۔ تو گویا رقاب کے سلسلے میں اسلامی رعیت کو دشمن کی قید سے رہائی دلانے کے لیے جو فدیہ دیا جاتا ہے' اس میں بھی مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز نہیں ہے۔ جس طرح فقراء اور مساکین کے سلسلے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے میں زکوۃ کی رقم سے غیر مسلم کی مدد کی جا سکتی ہے۔ مولفۃ قلوبھم کے سلسلے میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں' اسی طرح رقاب کے سلسلے میں بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ زکوۃ غیر مسلموں پر خرچ کی جا سکتی ہے۔

۳۲۷۔ "غارمین" کا لفظ جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا تھا' کسی شخص پر رقم کی

ادائیگی کے سلسلے میں غیر معمولی بوجھ پڑ جائے اور وہ اس سے عہدہ بر آنہ ہو سکے۔ ہمارے مؤلف مثالیں دیتے ہیں کہ مثلاً اس کا مال راستے میں چوری ہو گیا یا اس کا مال کسی طغیانی میں' کسی زلزلے میں یکایک ضائع ہو گیا وغیرہ وغیرہ ایسی حالتوں میں اس بظاہر مال دار شخص کی بھی ہم مدد کر سکتے ہیں کیونکہ وہ اچانک' عارضی طور پر محتاج ہو گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں' بظاہر اس لفظ غارمین سے استنباط کر کے ایک نئی چیز کا ہمیں اضافہ نظر آتا ہے اور وہ سرکاری خزانے سے لوگوں کو امداد نہیں بلکہ قرض دینا ہے۔ کوئی شخص کھاتا پیتا ہے' اس کو امداد کی ضرورت نہیں لیکن اس کو مال کی ضرورت ہے' مثلاً تجارت کے لیے یا کسی اور کام کے لیے تو حکومت اس کو قرض دیتی ہے اور قرض ظاہر ہے کہ بلا سود ہی ہو گا کیونکہ حکومت ہی وہ ادارہ ہے جو سود کی آمدنی کا خیال کیے بغیر' رعایا ہی کی آمدنی' رعایا ہی کو قرض دے سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرز عمل یہی نظر آتا ہے کہ وقتاً" فوقتاً" وہ لوگوں کو سرکاری خزانے سے بلا سود قرضے دیتے۔ اس سے خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ ان کی آمدنی کم تھی' ان کی تنخواہ کم تھی' کبھی کبھی انھیں ضرورت پیش آتی تھی تو وہ سرکاری خزانے سے قرض لیتے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ماہ تنخواہیں نہیں بٹتی تھیں۔ بلکہ چھ ماہ میں ایک بار۔ تو اپنی تنخواہ کے ملنے پر وہ ادائیگی کر دیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح اور لوگوں کو بھی اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ لفظ "غارمین" سے یہ بھی استنباط کیا گیا تھا۔

۳۲۸۔ "فی سبیل اللّٰہ" کے متعلق ابھی میں نے ایک حد تک اشارہ کر دیا ہے کہ اس سے مراد فوجی انتظام اور دفاع کا اہتمام ہے۔ سول ایڈمنسٹریشن کا ذکر ہم "عاملین علیہا" کے تحت دیکھ چکے ہیں۔ "فی سبیل اللّٰہ" کے تحت پوری ملٹری ایڈمنسٹریشن آ جاتی ہے۔ سپاہیوں کی تنخواہ کی ادائیگی' اسلحہ کی فراہمی اور دیگر فوجی ضروریات سب اس مد کے تحت آ جاتی ہیں۔ نیز اور چیزیں بھی مثلاً مسجدوں کا بنانا' کارواں سرائے تعمیر کرنا' مدرسوں کی تعمیر وغیرہ یہ ساری چیزیں فی سبیل اللّٰہ کے تحت' اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے تحت آ جاتی ہیں۔

۳۲۹۔ آخری چیز "ابن السبیل" راستے کا بچہ یعنی مسافر جو گزر رہے ہیں' اس کی طرف بھی میں نے اشارہ کیا اور میں گمان کرتا ہوں کہ اس میں بھی مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہوتی تھی۔ کوئی غیر مسلم کسی مقام سے گزرے' مثلاً وہاں سب مسلمان ہوں تو اس کی مہمان نوازی اور اس کی ضرورتوں کا انتظام کرنا یہ حکومت کے فرائض میں داخل تھا اور میں اس کو اور

بھی زیادہ توسیع دے کر کہہ سکتا ہوں کہ ابن السبیل کے معنی پورے Tourist Traffic کا انتظام ہے۔ اس میں سڑکوں کا بنانا' پلوں کی تعمیر' اس میں پولیس کا انتظام کرنا کہ گزرنے والوں کی جان و مال محفوظ رہے۔ اسی طرح بازاروں کی نگرانی کہ وہاں پر دغا اور فریب نہ ہو' غذا صحت کے لیے مضر نہ ہو' وغیرہ وغیرہ' یہ سب ابن السبیل کے لفظ کے تحت آ جائیں گے۔ یہ ایک تاثر ہے جو اس آیت کے پڑھنے سے اور اس آیت کے متعلق ہمارے پرانے مفسرین کی آراء کو معلوم کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں اور اس کا اعتراف بھی کرتا ہوں کہ آج کل ہمارے فقہاء یہ رائے نہیں رکھیں گے اور وہ کہیں گے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں کو نہیں دی جا سکتی۔ انھیں اختیار ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ' یہودیوں اور عیسائیوں کی زکوٰۃ کی مد سے امداد کیا کرتے تھے۔ ایک یہودی کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے کہ امام ابو یوسف کی "کتاب الخراج" کے مطابق مدینہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ بلا ذری نے لکھا ہے کہ شام کے سفر کے دوران حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زکوٰۃ کی مد سے غریب اور محتاج عیسائیوں کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ ابو عبید کی کتاب الاموال فقرہ ۱۹۹۶ء ۱۹۹۷ کے مطابق تو رمضان کی عید کا صدقہ فطر بھی عیسائی راہبوں کو بھی دیا جاتا رہا ہے۔

۳۳۰۔ سوال اس وقت یہ پیدا ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا جو تصور آج کل ہمارے ذہنوں میں ہے کہ ہر شخص اپنی بچت سے سال کے اختتام پر ڈھائی فی صد رقم غریبوں کو بطور زکوٰۃ دیا کرے' یہ تصور کب سے پیدا ہوا ہے' جب کہ عہدِ نبوی میں زکوٰۃ حکومت وصول کرتی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مرتدین سے جو جنگ ہوئی وہ اسی زکوٰۃ کی وصولی کے سلسلے میں تھی۔ لوگ زکوٰۃ حکومت کو دینا نہیں چاہتے تھے۔ حضرت ابوبکر نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مجبور کیا کہ انھیں زکوٰۃ حکومت ہی کو ادا کرنی ہوگی۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرق کیسے پیدا ہوا؟ تاریخ کی کتابوں میں اس کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اس کا تعلق حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد سے ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں۔ (ستائیس ہجری کا میں معین طور پر ذکر کرتا ہوں کہ) اسلامی فوجیں ایک طرف یورپ' اندلس اور افرنجہ میں پہنچ گئی تھیں (افرنجہ سے مراد غالباً فرانس ہو گا۔ "اندلس اور افرنجہ" کے الفاظ طبری نے بیان کیے ہیں) دوسری طرف ستائیس ہجری میں مسلمانوں کی فوجیں جیحوں کو عبور کر کے ماوراء النہر تک پہنچ جاتی ہیں یعنی چین کی سرحد تک۔ گویا اسلامی حکومت رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف پندرہ سال بعد تین براعظموں' یورپ' افریقہ اور ایشیا میں پھیل جاتی ہے۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی' آبادی کی اکثریت غیر مسلم تھی۔ فتوحات نئی نئی ہوئی تھیں۔ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ سب لوگ راتوں رات مسلمان ہو جائیں گے۔ میرا اپنا گمان ہے کہ اس وقت ایک سو مربع میل میں ایک سے زاید مسلمان نہیں ہوتا ہو گا۔ ان حالات میں یہ میرا اندازہ (میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں) کہ اگر اس زمانے میں زکوٰۃ کی وصولی کے لیے' ہر ایک مسلمان کے مکان پر کارندے جاتے' اس سے حساب مانگتے کہ تمھیں کتنی آمدنی ہوئی' کتنا خرچ ہوا' کتنی رقم سال بھر باقی رہی' تو تین براعظموں میں اس کام کے لیے کثیر عملے کی ضرورت ہوتی۔ میرا اندازہ ہے کہ مصارف زیادہ ہوتے اور آمدنی اس سے کم ہوتی۔ ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وزیر مالیہ (فینانس) نے مشورہ دیا ہو گا کہ اس رقم کو مسلمانوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔ انھیں معلوم ہے کہ زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ اللہ کا فرض کیا ہوا امر ہے اس لیے ان لوگوں کے ضمیر پر چھوڑ دیجیے۔ ان سے کہہ دیا جائے کہ وہ ہر سال زکوٰۃ کی رقم خود ہی قرآنی احکام کے مطابق تقسیم کر لیا کریں اگر حکومت اس کے انتظام کو بدستور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تو سرکاری عملے کے اخراجات اتنے بڑھ جاتے کہ اس بار گراں کو کوئی عقل مند وزیر مالیہ قبول نہ کر سکتا بہرحال ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں طے کیا گیا کہ زراعت کی زکوٰۃ' معدنیات کی زکوٰۃ اور فلاں فلاں چیزوں کی زکوٰۃ تو بدستور حکومت ہی لے گی لیکن نقد رقم کی زکوٰۃ سونا اور چاندی' درہم اور دینار' اس کو مسلمان اپنی ہی ذاتی صوابدید پر اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق ہر سال تقسیم کر دیا کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہم بھول گئے کہ زکوٰۃ کے معنی عہد نبوی میں اور خلافت راشدہ کے ابتدائی دو خلفاء کے دور میں کیا تھے۔ اب ہم اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک طرح کی خیرات ہے جو ہر سال اپنی آمدنی کی بچت سے غریبوں کے لیے کرتے ہیں۔ حالانکہ صرف غریبوں کا ہی اس میں حق نہیں ہے بلکہ اور مدات بھی اس کے اندر شامل ہیں' جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔

۳۳۱۔ اب میں اس سوال کا جواب دیتا ہوں کہ مسلمانوں سے تو یہ سلوک ہو رہا ہے' پھر غیر مسلم رعایا سے کیا کیا جاتا ہے؟ اس سلسلے میں دو چیزیں نظر آتی ہیں۔ اولاً" مثلاً زراعت ہے' زراعت کے سلسلے میں ابتدائی دور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں کسی علاقے کو فتح کیا جاتا تو ایک معاہدے

کے ذریعے یہ صراحت کی جاتی کہ اس علاقے کے لوگ کتنی رقم حکومت کو سالانہ پیش کریں گے۔ اور پھر اس کے لیے ایک خصوصی انتظام کیا جاتا اور اس علاقے میں حکومت کا ایک نمائندہ یا نائب ہوتا جو مقامی رعایا سے رقم وصول کر کے' حکومت کو سالانہ مجموعی رقم ادا کر دیا کرتا۔ اس کو خراج کا نام دیا جاتا تھا۔ یہ خراج زراعتی اراضی کے لیے بھی ہوتا' دیگر چیزوں کے لیے بھی ہوتا۔ اس طرح غیر مسلم رعایا سے جزیہ بھی لیا جاتا' جس کا قرآن حکیم (۹ : ۲۹) نے حکم دیا ہے جو اولاً" قرآنی احکام کے تحت صرف اہل کتاب' یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کے متعلق خیال کیا گیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں لولا" اس میں مجوسیوں یعنی پارسیوں کو شامل کیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بربر جو شمالی افریقہ میں رہنے والی ایک بت پرست قوم تھی' ان کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔ پھر جلد ہی جب سندھ فتح ہوا تو ہندو اور بدھ مت لوگوں کو جو وہاں پائے جاتے تھے' اسی زمرے میں شامل کر لیا گیا اور وہ بھی جزیہ دینے لگے۔ اسی طرح غیر مسلم رعایا سے اور بھی ٹیکس لیے جاتے تھے۔ بعض صورتوں میں مسلمانوں کے ٹیکس سے کسی قدر گراں تر شرح سے۔ مثلاً اگر مسلمان تاجر کسی' مقام پر سامان لاتے تو ان سے ڈھائی فی صد شرح کے حساب سے چنگی وصول کی جاتی تھی۔ اگر وہ ذمی ہوتے تو ان سے پانچ فی صد شرح سے' اگر غیر ملکی اور غیر مسلم ہوتے تو ان سے دس فی صد۔ غرض شرح مختلف ہوتی تھی۔ ذکر آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مدینہ میں گرانی بڑھنے لگی تو انھوں نے غیر ملکی غیر مسلم تاجروں سے محصول درآمد یا امپورٹ ڈیوٹی بجائے دس فی صد کے پانچ فی صد کر دی تاکہ سامان کے نرخ میں تخفیف ہو اور لوگوں کو گرانی کی جگہ ارزانی میسر ہو۔ اس طرح چند اصول تھے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں فرق کی صورت میں ہمیں نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ دنیا کے بعض غیر مسلم علاقوں میں بھی پائے جاتے تھے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو زکوٰۃ سونے اور چاندی کے متعلق ہے' اس کا کیا قاعدہ ہے؟ اس بارے میں صراحت ملتی ہے کہ یہ مسلمانوں پر واجب ہے لیکن غیر مسلموں پر نہیں۔ غیر مسلموں سے ٹیکس اور خراج کے نام سے زراعت وغیرہ کی زکوٰۃ تو لی جاتی ہے لیکن سونے' چاندی' درہم اور دینار کے اندوختے پر ان سے زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔ اس کی وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ غیر مسلموں کو اس حکومت کے اندر داخلی خود مختاری دے دی گئی تھی۔ مسلمانوں کے علاوہ جتنی رعایا تھی مثلاً یہودی' نصرانی اور پارسی وغیرہ وغیرہ' ہر ایک کمیونٹی کو اپنے قومی و مذہبی معاملات میں آزادی حاصل تھی۔ ان

انتظامات کے لیے بھی کچھ رقم کی ضرورت ہونی چاہئے۔ لہٰذا غیر مسلم رعایا پر جو سونے اور چاندی کی رقم پر زکوٰۃ ہونی چاہیے تھی' اس کو ان اقلیتوں کی مذہبی انتظامیہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا جو ان سے اپنا ٹیکس وصول کرتی اور اس کے ذریعے اپنی مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی۔ مسلمانوں سے نقد رقم پر زکوٰۃ لینے میں یہ امر بھی مضمر ہے کہ وہ رقم کو اندوختہ کر کے بیکار نہ رکھیں بلکہ اس کو ہروقت گردش میں رکھیں کہ وہ پھلے پھولے اور نفع آور بنتی رہے۔ دوسرے الفاظ میں رقم کو بیکار معطل ڈالے رکھنے کی گویا ایک "جرمانے" کے ذریعے سے حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔

۳۳۲۔ اولاً" جیسا کہ ابھی کچھ دیر پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اپنی تقریر کے ایک جزء کے متعلق کچھ بیان کروں گا اور وہ تقویم کا مسئلہ ہے جو دلچسپ ہے اور اس پر ہمارے مؤلفین آج کل کم غور کرتے ہیں۔ عرب میں اسلام سے پہلے شمسی سال پایا جاتا تھا جیسا کہ آج کل پایا جاتا ہے۔ جس طرح انگریزی سنہ کی وجہ سے سال کے موسم معین مہینوں میں آتے ہیں۔ لیکن عربوں کا نظام فرنگی اصول سے الگ تھا۔ مہینوں کا آغاز رویت ہلال سے ہوتا تھا اور مہینوں کا اختتام نئی رویت ہلال سے ہوتا تھا۔ یعنی خالص قمری مہینے پائے جاتے تھے لیکن چونکہ قمری سال کے بارہ مہینوں میں عموماً" چھ مہینے انتیس اور چھ مہینے تیس ہوتے تھے۔ اگر ہم شمار کریں تو ایک سال میں دنوں کی مجموعی تعداد تقریباً" ۳۵۴ دن بنتی ہے۔ موسموں کا جو فرق پیدا ہوتا ہے' کبھی گرمی' کبھی سردی وغیرہ یہ آفتاب کی گردش کے باعث ہے۔ آفتاب کی گردش ۳۶۵ یا ۳۶۶ دنوں میں مکمل ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے قدیم زمانے میں بابل والوں نے جب یہ معلوم کر لیا کہ قمری سال بہ نسبت شمسی سال کے (جس میں موسموں کا لحاظ ہوتا ہے) کوئی گیارہ' بارہ دن چھوٹا ہوتا ہے تو انھوں نے شمسی تقویم اختیار کرلی..... بابل والوں نے دیکھا کہ اگر قمری سال پر عمل کریں تو فصل کاٹنے کا زمانہ' حکومت کو ٹیکس دینے کا زمانہ اور بیجوں کو بونے کا زمانہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا اور لوگوں کو اس کی وجہ سے نقصان ہوتا ہے۔ انھوں نے اس کا ایک حل معلوم کر لیا اور وہ یہ تھا کہ تقریباً" ہر تین سال کے بعد ایک مرتبہ بجائے بارہ کے تیرہ مہینوں کا سال کر دیا جائے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے تو اس طرح تین سال میں تینتیس دن کم ہوں گے۔ جو تقریباً" ایک مہینے کے برابر تو ہیں لیکن بہت ٹھیک نہیں بلکہ محض کم و بیش۔ غرض بابل میں ہر تین سال کے بعد سال میں ایک مہینے کا اضافہ کر دیا جاتا تھا اور

کیلنڈر میں اس سال تیرہ مہینے ہوتے اور پھر اس کے بعد دو سال بارہ' بارہ ماہ ہوتے۔ پھر تیسرا سال تیرہ مہینوں کا ہوتا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد تجربے نے ثابت کر دیا کہ یہ حساب ٹھیک نہیں۔ کیونکہ قمری سال اگر شمسی سال سے تقریباً" بارہ دن چھوٹا ہے تو تین سال میں ۳۲ دن بڑھانے کی ضرورت ہو گی' اور تیرھیوں مہینے سے صرف انتیس یا تیس دن حاصل ہو سکیں گے۔ حقیقی فرق بارہ دن کا نہیں بلکہ اس میں گھنٹے' منٹ سیکنڈ اور سیکنڈ کا جزء بھی ہوتے ہیں جو ہر سال جمع ہو کر رفتہ رفتہ مزید فرق پیدا کر دیتے ہیں۔ بہرحال اپنے علم کی ترقی سے انھوں نے تحقیقات کے ذریعے اس نظام کو اور زیادہ ترقی دی اور کہا کہ اتنے سال تک تو تین برس کے بعد ایک مہینے کا اضافہ ہو گا۔ جس کے بعد پھر ایک مرتبہ دو ہی سال کے بعد تیرھواں مہینہ تقویم میں بڑھایا جائے گا۔ وغیرہ اس طرح وہ اس بات میں کامیاب ہوئے کہ زراعتی اغراض کے لیے قمری مہینوں کے ذریعے سے بھی شمسی سال کی طرح کام لیا جا سکے۔ شہر مکہ میں بھی یہ نظام پایا جاتا تھا۔ اس کو زمانۂ جاہلیت میں "نسی" کا نام دیا گیا۔ میں یہاں اس کی تفصیلات بیان کرنے سے گریز کروں گا میں اس پر ایک مستقل اور مفصل مقالہ شائع کر چکا ہوں۔ مجھے صرف' یہ کہنا ہے کہ "نسی" کا جس میں سال میں کبھی کبھی ایک تیرھواں مہینہ بڑھایا جاتا تھا مکہ میں رواج رہا' مکہ کے حج کے باعث پورے جزیرہ نمائے عرب میں اس پر عمل تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی' آخری تین مہینوں کے سوا' اسی نظام کے تحت بسر ہوئی۔ آخری تین مہینوں کے الفاظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے خطبے میں "نسی" کی منسوخی کا قرآنی حکم کے تحت اعلان فرمایا: انما النسی زیادة فی الکفر یضل به الذین کفروا یحلونه عاما" و یحرمونه عاما" لیوا طؤا عدة ما حرم اللہ فیحلوا ما حرم اللہ...... (۹ : ۳۷) غرض اس کی منسوخی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے صرف تین مہینے پہلے اور ذی الحجہ کے مہینے میں عمل میں آئی۔ اس "اصلاح" یا مخالفین اسلام کے الفاظ میں اس "نافہمی کی ترمیم" کی وجہ سے کیا نتائج نکلے' اسے دیکھنا پڑے گا۔ نافہمی کا لفظ وہ اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ دوبارہ خالص قمری نظام رائج ہو جانے کی وجہ سے حکومت کو ٹیکسیشن میں دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ مثلاً انھوں نے طے کیا ہو کہ رمضان کے مہینے میں ہر سال لوگ مال گزاری ادا کریں گے۔ پہلے ایک دو سال تو رمضان کے مہینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی ہو گی' لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ فرق بڑھتا گیا ہو گا اور پھر یہ ہوا ہو گا کہ رمضان آ جاتا تھا اور فصلیں کٹتی نہیں تھیں بلکہ کھیتیاں کھڑی

رہتی تھیں وغیرہ۔ اس تصور کی بنا پر یہ فرض کر لیا گیا کہ یہ اصلاح نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے تخریب تھی، لیکن عہد نبوی کا رواج ہمیں اس کا جواب دے دیتا ہے کہ یہ ایسا نہیں تھا۔ اگرچہ نسی کی منسوخی کا اعلان ذی الحجہ ۱۰ھ میں کیا گیا لیکن غالباً" اس کی پیش بندی میں کچھ عرصہ پہلے سے ہی ایک اور انتظام قائم کر دیا گیا تھا' جس کے اشارات ہمیں پوری وضاحت کے ساتھ مختلف مکتوبات نبوی میں ملتے ہیں۔ مختلف قبیلوں کے سرداروں کو پروانے دیئے جاتے ہیں' ان سے معاہدے ہوتے ہیں یا ان کو کوئی جاگیر وغیرہ دی جاتی ہے تو اس میں صراحت ہے کہ یہ لوگ اپنی زراعتی زکوٰۃ معین مہینے میں یعنی رمضان شوال وغیرہ میں نہیں دیں گے۔ بلکہ فصل کٹنے پر ادا کریں گے۔ سب سے بڑی دشواری قمری سال میں یہی ہے کہ وہ زاعتی اغراض کے لیے کار آمد نہیں ہے۔ اس کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زراعتی اغراض کے لیے لوگ اپنا ٹیکس یا مال گزاری قمری مہینے کے لحاظ سے ادا نہیں کریں گے بلکہ فصل کے کٹنے پر۔ لہٰذا ساری دشواریوں کا اس طرح خاتمہ ہو جاتا ہے۔ باقی جو دوسرے ٹیکس ادا کرنے ہوتے ہیں' مثلاً تجارت پر معدنیات پر اس میں اسی ترمیم اور اس نظام کی تبدیلی یعنی شمسی سال کی جگہ قمری سال کو نافذ کرنے کی وجہ سے' حکومت کو ایک غیر معمولی فائدہ حاصل ہوا۔ ایک مرتبہ جرمنی میں ایک لیکچر دیتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اگر اس مصلحت کو آج روسی اور امریکی وزرائے مالیات معلوم کریں تو دونوں ہی قمری سنہ کے اختیار کر لیں گے اور شمسی سنہ کو رد کر دیں گے اس کی وجہ میں نے یہ بتائی کہ چونکہ کہ شمسی سال سے قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے لہٰذا ہر تیس سال میں شمسی لحاظ سے تو حکومت تیس مرتبہ ٹیکس وصول کرے گی لیکن قمری سال کے حساب سے اکتیس مرتبہ ٹیکس لے گی۔ حکومت کو ہر تیس سال میں ایک زائد سال کے ٹیکس وصول ہوں گے۔ کون سا وزیر مالیات ہو گا جو اس زائد آمدنی کو قبول نہ کرے گا؟ تقویم کی اس تبدیلی کی وجہ سے' اس میں شک نہیں کہ قانون میں ایک طرح کی لا مرکزیت (Decentralization) پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض چیزوں پر ایک زمانے میں ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور بعض چیزوں پر کسی دوسرے زمانے میں۔ یہ کوئی مصیبت کی چیز نہیں تھی بلکہ ایک اور نقطہ نظر سے جانچیں تو حکومت کے لیے بھلائی کی چیز تھی۔ معلوم نہیں آپ لوگوں کو واقفیت ہے کہ نہیں کہ آج کل حکومت کا خزانہ ٹیکس کے ادا ہونے کے زمانے سے عین پہلے خالی ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی فوری ضرورتوں' ملازمین کی تنخواہوں وغیرہ کے لیے رقم نہیں ملتی' تو وہ Debenture کے ذریعے سے مختصر مدت کے لیے سود پر قرض،

لیتی ہے۔ پھر جب ٹیکس کی وصولی کے باعث خزانہ بھر جاتا ہے تو وہ قرضے ادا کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ شمسی سال کے تحت سارے بڑے ٹیکس ایک معین مہینے میں آتے ہیں مثلاً زکوٰۃ یا زراعت کا ٹیکس ہے' فرض کیجئے وہ اگست کے مہینے میں ہمیشہ آئے گا دیگر ٹیکسوں میں کچھ تو مثلاً چنگی' ریل کے ٹکٹ روزانہ کے ہیں اور کچھ دیگر قسم کے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کا خزانہ ایک خاص زمانے میں خالی ہو جاتا ہے تو حکومت کے پاس روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مطلوبہ رقم نہیں ہوتی۔ اسلامی حکومت میں اس نظام کے تحت یعنی اس اصلاح کے تحت حکومت کے ٹیکس مختلف موقعوں پر وصول ہوتے ہیں۔ جو زراعتی ٹیکس ہے اس کا مہینہ الگ ہوتا ہے' دیگر ٹیکسوں کا زمانہ علیحدہ ہوتا ہے۔ اس طرح حکومت کا خزانہ ہر زمانے میں بھرا رہتا ہے اور رہ سکتا ہے۔ یہ بات شمسی سال میں نہیں پائی جاتی۔ یہ ایک خاص پہلو تھا جس کی طرف مجھے اشارہ کرنا تھا اور شاید آخری جملے کے طور پر یہ عرض کروں کہ سارے اسلامی ممالک میں موجودہ شمسی تقویم یعنی فرنگی نظام چل رہا ہے۔ اس نظام میں باوجود علم کی ترقی کے اور انتہائی دقیق آلات کی ایجاد کے اب بھی رفتہ رفتہ فرق پیدا ہو رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہزار سال کے بعد پورے ایک دن کا فرق پیدا ہو جائے گا۔ عمر خیام نے بھی اپنے زمانے میں ایک نظام پیش کیا تھا۔ میں نے اس کا جو مقالہ پڑھا تھا' اگرچہ میں اس کی تفاصیل سمجھنے سے قاصر رہا' البتہ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ عمر خیام کے نظام سے ایک دن کا فرق ایک لاکھ سال کے بعد پیدا ہو گا۔ اس کا نظام زیادہ پیچیدہ ہے لیکن اتنا صحیح ہے کہ پورے ایک لاکھ سال میں بھی مشکل سے ایک دن کا فرق پیدا ہوتا ہے۔ یہ تھیں چند گزارشات جو مجھے آپ کے سامنے پیش کرنا تھیں۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

۳۲۳۔ متعدد سوالات آپ کی طرف سے آئے ہیں' میں جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال ۱ "والخمس مردود علیکم" کی رو سے ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گزر اوقات مال غنیمت پر تھی؟

جواب : "خمس مردود علیکم" یہ مال غنیمت کے اس جزء (۴/۵) کا ذکر ہے جو حکومت

کو آتا ہے۔ مال غنیمت کا (۴/۵) حصہ سپاہیوں میں تقسیم ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر فوج کی لڑائی میں شریک رہے ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ بھی فوج کے دیگر سپاہیوں کی طرح اس (۴/۵) سے ملے گا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت ہو گی' اور اس پر گزر اوقات میں کوئی امر مانع نہیں۔ اور خمس جو حکومت کو ملتا ہے اس کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت صدر مملکت کچھ اختیارات دیے گئے ہیں اور عام زکوٰۃ کے برخلاف مال غنیمت سے حاصل ہونے والی آمدنی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اور اپنے خاندان کے لیے استعمال فرما سکتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن مال غنیمت کوئی ایسی چیز نہیں جو ہر وقت آئے یا بہت کافی مقدار میں ہو اس لیے روز مرہ کی غذا وغیرہ کے لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

۳۳۴ سوال ۲۔ علماء کو ہدیہ دینا جائز ہے اگر امداد کے طور پر دینا چاہیں؟ براہ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب : میرے خیال میں اس سوال کے جواب کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگوں کی طبعیتیں مختلف ہوتی ہیں' اگر مجھے ہدیہ دیا جائے تو میں رد کر دیتا ہوں' چاہے کتنی ہی محبت سے کوئی پیش کرے۔ کوئی عالم اسے قبول کرنا چاہے تو میں اسے روکتا نہیں۔ عام اصول' بطور سفارش کے کہئے یا بطور تاکید کے' ایک حدیث شریف میں مذکور ہے کہ استاد کو اپنے شاگردوں سے کوئی چیز نہیں لینی چاہئے۔ اور اس سلسلے میں ایک سخت لفظ استعمال ہوتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ عبادہ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ! مجھے ایک شاگرد نے' جسے میں نے قرآن کی تعلیم دی تھی' ایک کمان یہ کہہ کر ہدیہ کی ہے کہ میں اس سے جہاد فی سبیل اللہ کروں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً" فرمایا یہ کمان جہنم کی آگ ہے۔ تو وہ دوڑے ہوئے گئے اور کمان اپنے شاگرد کو واپس کر دی۔ علماء کو ہدیہ دینا نیت پر مبنی ہے۔ اگر آپ کا منشاء زکوٰۃ کی رقم میں سے بطور خیرات کے اپنے استاد کو دینا ہو اور اگر وہ استاد خاندان بنی ہاشم سے تعلق رکھتا ہو گا تو ہماری فقہ کے مطابق یہ اس کے لیے حرام ہے۔ لیکن اگر وہ غریب ہے تو وہ لے سکتا ہے۔ اس کے متعلق کوئی خاص چیز بیان کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

۳۳۵ سوال ۳۔ آپ کے بیان کردہ اصول کے مطابق آج کل مسافروں کو مفت ہوٹل اور کھانا

مہیا کرنا شروع کر دیا جائے تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہو گی کہ لوگ مستقل مسافر نہ بن جائیں؟
جواب : ایسا نہ سمجھئے۔ پیرس میں ہر محلے میں بے روزگار غریبوں کو روزانہ مفت کھانا کھلایا جاتا ہے لیکن کوئی شریف آدمی کبھی وہاں نہیں جاتا۔ یوں بھی ایک شہر میں تین دن رہیں گے۔ اس کے بعد انھیں جبراً وہاں سے رخصت کر دیا جائے گا۔

۳۳۶ سوال ۴۔ اگر کسی کو کثیر رقم قرض دی گئی ہو تو کیا اس پر زکوٰۃ ہو گی' جب کہ وہ قرض تین سال کے لیے دیا گیا ہو؟
جواب : زکوٰۃ کی ضرورتوں کے لیے' قرض دی گئی رقم کو جائیداد سے حذف کر دیا جاتا ہے۔ فرض کیجئے میرے پاس ایک لاکھ روپے تھے اور میں نے مثلاً نوے ہزار روپے قرض دے دیے ہیں تو خیال کیا جائے گا کہ زکوٰۃ کی ضرورتوں کے لیے میرے پاس صرف دس ہزار روپے ہیں۔ اس لیے اس میں کوئی دشواری نہیں۔

۳۳۷ سوال ۵۔ یتیم کے مال کا "ولی" زکوٰۃ دے سکتا ہے یا نہیں؟
جواب : اس بارے میں ہمارے فقہاء کی رائے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دینی ادائیگیاں کرنی چاہئیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے امام کے فتاویٰ کے مطابق عمل کرے گا۔

۳۳۸ سوال ۶۔ "فی سبیل اللہ" کے مال اور رقم سے کیا ملک کے دفاع کی خاطر ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم خریدے جا سکتے ہیں' حالانکہ ان سے بہت سے بے گناہ افراد مارے جاتے ہیں اور ان کے اثرات آنے والی نسلوں کو بھی متاثر کرتے رہتے ہیں۔ بحوالہ ہیروشیما' ناگا ساکی وغیرہ؟
جواب : جہاں تک دفاع کا تعلق ہے اس میں کوئی امتیاز نہیں کہ کس غرض کے لیے ہم رقم صرف کرتے ہیں۔ یہ امر تجربے سے معلوم ہو چکا ہے کہ ایٹم بم کا استعمال اب تک صرف ایک دفعہ ہوا ہے اور اس کے بعد جن سلطنتوں کے ہاتھ میں ایٹم بم ہے' اگر وہ جنگ میں شریک بھی ہوئیں تو انھوں نے آج تک اس کا استعمال نہیں کیا وہ ایک Dissuasive چیز بن جاتی ہے اور اگر کسی سلطنت کے پاس ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم ہو تو اوروں کو اس پر اس آسانی کے ساتھ حملہ کرنے کی جسارت نہیں ہوتی جیسا ہم اپنے ہمسائے ملک افغانستان میں دیکھ رہے ہیں۔ اگر پاکستان کے پاس مذکورہ بم آ جائیں اور انشاء اللہ تعالیٰ آ جائیں گے تو بہت سے ہمارے ہمسایوں کی ہوس ملک گیری بڑی حد تک کم ہو جائے گی۔

۳۳۹ سوال ۷۔ حکومت زکوٰۃ اور عشر وصول کرنے کے بعد پراپرٹی ٹیکس وصول کر سکتی ہے یا نہیں؟

جواب : آج سے نہیں بلکہ ہزار سال سے زیادہ عرصے سے اسلامی حکومتیں یہ تجربہ کر چکی ہیں کہ ان کی آمدنیاں جو کہ زکوٰۃ و عشر سے حاصل ہوتی ہیں ان کی ضرورتوں کے لیے ناکافی ہیں۔ تو اپنے زمانے کے فقہاء کے فتوے اور اجازت سے اور اتفاق رائے سے رعایا اور حکومت دونوں کی ضرورت کے پیش نظر نئے ٹیکس لگائے گئے اور ان کو "نوائب" کا نام دیا گیا۔ جس کے معنی فوری ضرورتوں کے لیے عارضی ٹیکس کے ہیں۔ یہ عارضی ٹیکس عملاً" مستقل بن جاتے ہیں لیکن منشاء یہ ہوتا ہے کہ یہ مستقل ٹیکس شتا" زکوٰۃ کی طرح کے نہیں ہوں گے بلکہ ان کی حیثیت عارضی ہو گی۔ جب تک وہ ضرورت باقی ہے اس پر عمل کیا جاتا رہے گا۔ یعنی جن حالات میں ہماری ضرورتوں کے لیے زکوٰۃ اور عشر ناکافی ثابت ہوں (اور میں سمجھتا ہوں کہ ناکافی ثابت ہوں گے) تو ان حالات میں "نوائب" کے نام سے مزید ٹیکس لگائے جا سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ملک کی معمولی اور بنیادی ضرورتوں کو ہم پورا نہیں کر سکتے' چاہے وہ دفاع کی ضرورت ہو یا ضروریات' مگر اس کا فیصلہ میں نہیں کروں گا۔ حکومت کی وزارت مالیہ اور پارلیمنٹ کر سکے گی کیونکہ نوائب واجبی نہیں مباح چیز ہیں۔

۳۴۰ سوال ۸۔ کیا ہم مسلمان ٹیلیویژن دیکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ شرعاً" اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب : یہ مسئلہ شاید اختلافی بن جائے گا' اس بنا پر کہ فوٹوگراف کو ہمارے بعض علماء جیسے مصر کے محمد عبدہ' کہتے ہیں کہ جائز ہے' بعض مجھ جیسے جاہل کہتے ہیں کہ ناجائز ہے' ٹیلی ویژن میں بھی فوٹو آتا ہے تو میری رائے میں وہ ناجائز ہو گا۔ اگر محمد عبدہ کی آپ تقلید کرنا چاہیں تو وہ جائز ہو جائے گا۔ لیکن میں بھی اور وہ بھی اس بات پر متفق ہوں گے کہ ٹی وی کا استعمال فحش اغراض کے لیے اور ایسی چیزوں کے لیے جن کا مقصد تعمیری نہیں تخریبی ہے' نہیں ہونا چاہیے۔

۳۴۱ سوال ۹۔ خلیفہ پر مقدمہ چلانے Impeachment کا طریقہ کار اسلام میں کیا ہے؟

جواب : جہاں تک مجھے معلوم ہے Impeachment کے معنی ہیں مقدمہ چلا کر سزا دینا۔ اس کی کوئی مثال تاریخ اسلام میں نہیں ہے۔ خلفاء کو معزول کیا گیا' خلفاء کو قتل کیا گیا۔ لیکن یہ فوجی افسروں کی اپنی صوابدید پر ہوا' عدالت کے حکم سے نہیں کیا گیا۔ اس کا کوئی طریقہ ہے یا نہیں' میرے لیے یہ کہنا دشوار ہے' لیکن ہمارے فقہاء قدیم سے یہ کہتے آئے ہیں کہ جو لوگ کسی کو

خلیفہ یا حکمران بنا سکتے ہیں وہی اس کو معزول بھی کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حاکم کی حیثیت وکیل یعنی نائب کی طرح ہے' یعنی میں ایک شخص کو اپنے ذاتی انتظامات کے لیے اپنا نائب مقرر کرتا ہوں تو موکل کو حق ہوتا ہے کہ وکیل کو جب چاہے اس کی خدمات سے الگ کر دے' اس لیے اس اساس پر ہمارے فقہاء کہتے چلے آئے ہیں کہ اگر حکمران نااہل ثابت ہوں تو انھیں معزل بھی کیا جا سکتا ہے۔ غالباً" یہی ایک صورت ہے جس کا فقہاء نے ذکر کیا ہے۔ حکمران پر مقدمہ چلانے Impeachment کا جو مغربی تصور ہے' وہ میری دانست اور میرے علم میں کبھی پیش نہیں آیا۔☆ ہو سکتا ہے یا نہیں' اس کے متعلق میں صرف اپنی ذات کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ وہ ممنوع نہیں ہے' اس کا فیصلہ ہماری پارلیمنٹ کر سکتی ہے۔

۳۴۲ سوال ۱۰۔ سنگ تراشی' مصوری' فلم وغیرہ تفریح کے دائرے میں آتے ہیں یا نہیں؟ یا انھیں معصیت گردانا گیا ہے؟

جواب: میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ تصویر کے متعلق میرا اپنا تصور حرمت کا ہے اور بعض دوسرے بڑے علماء جیسے محمد عبدہ اس کو جائز قرار دیتے ہیں جہاں تک فلم اور فوٹو گرافی کا تعلق ہے اس میں کچھ حد تک اختلاف رائے ہے۔ باقی سنگ تراشی (بت تراشی) اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے' سبھی اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

☆ ہمارے زمانے میں ترکی سلطان و خلیفہ عبدالمجید ثانی کو انقرہ کی بیوک وطن مجلسی یعنی پارلیمنٹ نے یہ قرار دے کر معزول کیا کہ ملک میں جمہوریت قائم کی جاتی ہے' سلطان کی ضرورت نہیں' عبدالمجید صرف خلیفہ رہیں' کچھ عرصہ بعد دوسری قرارداد میں یہ کہا گیا کہ خلیفہ کے فرائض پارلیمنٹ انجام دیتی ہے' اس لیے کسی ایک شخص کے خلیفہ ہونے کی ضرورت نہیں' پھر راتوں رات کمال آتا ترک کے سپاہیوں نے خلیفے کو گرفتار کر کے سرحد پر پہنچایا اور ملک بدر کرنے پر اکتفا کیا سلطانی ہو یا خلافت' متعلقہ شخص کو جواب دہی کا موقع نہیں دیا گیا۔

سعودی عرب میں ملک سعود بن عبدالعزیز کے خلاف ان کے بھائی اور ولی عہد فیصل بن عبدالعزیز نے ایک مقامی عالم سے ایک فتوی بادشاہ کے معزول کیے جانے کے متعلق حاصل کیا یہ عالم نابینا تھے' اور ظاہر ہے کہ انھوں نے صرف سنی سنائی باتوں پر اعتماد کیا یعنی اگر ایسا ہے تو بادشاہ معزولی کے قابل ہے۔ اس فتوے کی تعمیل کرانے کے لیے ولی عہد کے اپنے خصوصی ملازم سپاہیوں ہی کی ضرورت رہی' یہ بھی ایک قسم کا فوجی انقلاب ہی تھا' معمولی عدالتی طریقہ نہیں کہ ملزم یعنی حکمران کو جواب دہی کا موقع فراہم کیا جائے۔

مصر میں ملک فاروق' الجزائر میں صدر جمہوریت احمد بن بلہ' انڈونیشیا میں سوکارنو' وغیرہ' بہ کثرت اسلامی ممالک میں حکمرانوں کو معزول کر کے کبھی جلا وطن' کبھی قید اور کبھی قتل کیا گیا اور یہ سب فوجی افسروں کی صوابدید پر عدالتی طریقے جس میں ملزم کو جوابدہی کی آزادی ہونی چاہیے' کہیں نظر نہیں آئی' کم از کم میرے پاس معلومات نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ معزول شدہ لوگ معزولی کے مستحق ہی رہے ہوں۔

۳۴۳ سوال ۱۱۔ اگر ایک آدمی کو اس کے حق سے محروم کیا جا رہا ہو اور بجز اس کے کہ وہ رشوت دے' اس کو اپنا جائز حق ملنے کی امید نہیں' تو کیا اس صورت میں رشوت جائز ہو گی؟

جواب : یہ بڑا مشکل سوال ہے کیونکہ حدیث مبارکہ کے الفاظ میں الراشی والمرتشی کلاھما فی النار یعنی رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ رشوت نہ دے اور تھوڑی مصیبت بھگت لے۔ اگر ہم رشوت دینے سے اجتناب کریں تو ملک سے اگر رشوت ستانی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا' تو کم از کم اس میں کچھ کمی تو واقع ہو گی لیکن ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ آدمی مجبور ہو جائے تو اپنی جان بچانے کے لیے اپنا مال خرچ کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مثال میرے ذہن میں ہے۔ لکھا ہے کہ جب ہجرت سے پہلے بہت سے مکہ کے مسلمان حبشہ گئے تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ہے کہ انھیں کسی وجہ سے حبشہ کی پولیس سے کچھ دشواری پیش آئی اور انھوں نے اس کو نصف دینار یا پانچ درہم بطور بخشش کے دے دیے اور اس طرح ان کی گلو خلاصی ہوئی۔

۳۴۴ سوال ۱۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کی ذرا وضاحت کیجئے۔ کیا آل رسول یعنی سید زادوں کو اہل بیت قرار دے سکتے ہیں؟

جواب : میری رائے میں قرار دینا پڑے گا۔ اس میں یہ ذکر نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کی جو اولاد ہے بلکہ پورے بنو ہاشم اور بنو المطلب بھی۔ اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو اس وقت بڑے تھے اور وہ لوگ جو بچے تھے' سب اس میں داخل تھے۔ ان کے بعد آنے والے بچے بھی اس میں داخل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ہمارے علماء کا اتفاق ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر کسی زمانے میں اہل بیت (سید زادوں) میں سے کسی کے لیے کوئی ذریعہ معاش بالکل موجود نہ ہو اور حکومت بھی ان کی ضروریات کو پورا کرنے سے عمداً" یا سہواً" یا عدم امکان کی وجہ سے' غافل ہو تو ان کو خیرات دے سکتے ہیں۔

۳۴۵ سوال ۱۳۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہے بلکہ اس کی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کیا اسلامی نقطہ نظر سے آنکھوں' خون اور دیگر اعضائے جسمانی کا عطیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اس طرح کسی دوسرے شخص کی آنکھ یا دل وغیرہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب : اس بارے میں آپ کو نہ قرآن میں کوئی ذکر ملے گا' نہ حدیث میں اور نہ ہی ہمارے پرانے ائمہ اور فقہا کی کتابوں میں۔ یہ چیز علم طب کی جدید ترین ترقی ہے جو ہماری آنکھوں کے

سامنے ہوئی ہے۔ اس بارے میں ابھی تک کوئی اجماع نہیں ہو سکا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اور فقہاء کی کیا رائے ہے۔ میں اپنی ذاتی رائے عرض کر سکتا ہوں' ممکن ہے اس سے اوروں کو اتفاق ہو' ممکن ہے وہ اسے رد کر دیں ایک زندہ کی جان بچانے کے لیے ایک مردہ کی ذات سے استفادہ کیا جائے تو اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اس طرح ایک انسان کی فالتو چیز سے دوسرے انسانوں کا فائدہ ہوتا ہو' تو اس کی اجازت سے ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں فرض کیجئے کہ ایک آدمی مرجاتا ہے اور فوراً ہی اس کی آنکھوں کو لے کر آج کل طبی طریقے سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ اور ان کو کسی اندھے کے لیے استعمال کرکے اسے بینائی بخشتے ہیں۔ میرے خیال میں ایک زندہ کی جان بچانے کے لیے ایک مردہ کے جسم سے استفادہ کیا جائے تو اس میں کوئی امر مانع نہ ہو گا۔ اس طرح میں اگر اپنا خون کسی کو دوں تو ایک طرح کی خیرات ہے اور میں خوشی سے دیتا ہوں تو کوئی امر مانع نہیں۔ اگر مجھ سے جبراً لیا جائے تو ممکن ہے حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے تحت آ جائے۔ حدیث شریف میں مثلہ کرنے (Mutilation) کی بے شک ممانعت آئی ہے لیکن اس کا مقصد مرے ہوئے شخص کی توہین ہوتی تھی۔ اعضاء کی علاج کے لیے منتقلی میں یہ بات بالکل نہیں پائی جاتی۔

۳۴۶ سوال ۱۴۔ مسلمانوں سے چنگی کی شرح اور غیر مسلموں سے چنگی کی شرح میں تفاوت بظاہر ظلم لگتا ہے براہ کرم اس نکتے کی وضاحت فرمائیں؟

جواب : یہ سوال خود مجھے بھی کھٹکا تھا۔ عرصہ تک میں اس پر غور کرتا رہا اور اس کا جواب جو میرے ذہن میں آیا' وہی میں آپ سے عرض کرتا ہوں۔ یہی جواب میں نے ایک اطالوی پروفیسر "لیوی دیل لاویدا" کو دیا تھا جو یہودی النسل تھے۔ وہ اعتراض پر تلے ہوئے تھے اور جب میں نے تشریح کی تو وہ ایک دم چپ ہو گئے اور کہا کہ اس منطق کے سامنے کسی رابی Rabbi کی زبان بھی نہ کھل سکے گی۔ میرا جواب یہ تھا کہ مسلمانوں پر بعض بندشیں ہیں جو غیر مسلموں پر نہیں۔ انھیں سب سے اہم سہولت سود کی ہے جب کہ ایک مسلمان نہ سود لے سکتا ہے' نہ دے سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی قانون غیر مسلموں کو داخلی خود مختاری عطا کرتا ہے جس میں ان کا حق ہے کہ وہ سود لیں یا دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک سود لینے والا غیر مسلم تاجر بہت جلد متمول ہو جاتا ہے۔ بہ نسبت ایک مسلمان تاجر کے۔ اس طرح اس کی سالانہ آمدنی بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے لہٰذا ٹیکس بھی زائد شرح سے عاید ہوتا ہے۔ اسے ظلم

نہیں کہا جا سکتا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اس ٹیکس کی شرح کی زیادتی کے باوجود غیر مسلم زیادہ فائدے میں رہتا ہے' اس لحاظ سے بھی کہ اسلامی حکومت مسلمان پر زیادہ مالی ذمہ داریاں اور پابندیاں عاید کرتی ہے بہ نسبت غیر مسلموں کے۔ ملکیوں اور غیر ملکیوں میں فرق بہت سے ملکوں میں رہا ہے اور اب بھی ہے آپ نے اخباروں میں بارہا "نہایت منظور نظر قوم کا سا برتاؤ" Most Favoured Nation Clause کا بھی ذکر پڑھا ہو گا اور امریکہ وغیرہ کی Protectionism (یعنی اپنے اقتصادی مفاد کے تحفظ کے لیے اجنبی مال تجارت کی درآمد پر بندشوں) کا بھی ملکیوں میں مسلم اور غیر مسلم کے فرق کی وجہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ وہ فرق حقیقی نہیں بلکہ ٹیکنیکل ہے۔

۳۴۷ سوال ۱۵۔ آپ نے اپنی گزشتہ تقاریر میں جس فرقہ بندی کی حمایت کی ہے وہ مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔ یہی فرقہ پرستی مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کر رہی ہے۔ واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا (۳ : ۱۰۳)(اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ بازی نہ کرو) ایک اور جگہ پر آیا ہے کہ اشدلء علی الکفار رحماء بینھم (۴۸:۲۹) (کافروں کے لیے سخت اور آپس میں نرم) یہ حکم ایمان لانے کے بعد ہر مسلمان پر نافذ ہوتا ہے تو ان آیات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا نقطہ نظر واضح کریں؟

جواب : میں سمجھتا ہوں ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے انجام دیا ہے اور ایک گروہ کے نزدیک مثلاً" حنفی یا شافعی' ایک عمل کی روایت کے مطابق ایک بات پر عمل ہوتا ہے اور دوسرے گروہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت پر (ایک دوسری روایت کے مطابق) عمل ہوتا ہے' تو ہمیں رواداری سے کام لینا چاہئے اور اس کو فرقہ واریت قرار نہ دیں۔ کیونکہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہیں۔ خیال فرمایئے کہ اگر آج ایک حنفی کسی شافعی کے پیچھے نماز سے یا شافعی حنفی کے پیچھے نماز پڑھنے سے اس بناء پر انکار کرے کہ اس کے امام کے بیان کردہ طریقے کی خلاف ورزی ہو گی' تو اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے فرقے کے امام کے طریق کے مطابق نہیں بلکہ کسی دوسرے فرقے کے امام کے طریقے کے مطابق کسی دن عمل فرما رہے ہوں' تو میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتا ہوں' کون مسلمان اس بات کا تصور بھی کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرے۔ اس نقطہ نظر سے

غور فرمائیں تو آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ باہم رواداری زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ ہم میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اگر ایک سے زیادہ طریقوں پر مشتمل رہی ہے تو بھی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا طرز عمل ہے۔ ہمیں اس کا ادب و احترام کرنا چاہیے۔

۳۴۸ سوال ۱۶۔ کیا زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا سربراہ مملکت اس کی شرح میں تبدیلی کا مجاز ہے؟

جواب: میں ٹیکس کا لفظ اپنی تقریر میں خود استعمال کر چکا ہوں اور کہہ چکا ہوں کہ اگر ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ ایک معینہ زمانے میں، ایک معینہ شرح سے ایک معینہ چیز پر ہم رقم وصول کریں اور دینے سے انکار کرنے والے سے بالجبر وصول کریں، تو اس لفظ کا پورا پورا اطلاق زکوٰۃ پر بھی ہوتا ہے اور یہ بھی میں نے بیان کیا کہ زکوٰۃ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ شروع میں زکوٰۃ ایک اختیاری چیز تھی یعنی خیرات کی طرح تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ قرآن مجید نے اس کو ایک فریضہ قرار دیا۔ رسول اللہؐ نے اس کا زمانہ مقرر کیا، اس کی شرح مقرر کی اور اس کی ادائیگی پر مجبور کر دیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرز روش بتاتی ہے کہ زکوٰۃ دینے سے انکار کیا جائے تو تلوار کے ذریعے اس سے وصول کیا جائے گا۔ یہی ٹیکس کے عناصر ہیں ان حالات میں اگر زکوٰۃ کو ٹیکس کا نام دیا جائے تو وہ غلط نہ ہو گا۔ اگرچہ ٹیکس ایک برا لفظ ہے۔ اس کے معنی تکلیف دینے کے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ایک بہتر لفظ "زکوٰۃ" اختیار کیا ہے جس کے معنی ہیں "پاک کرنا" میرے مال میں خدا کے حکم کے مطابق لوگوں کا جو حصہ ہے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض ہے۔ صرف لفظ کا فرق ہے، جب کہ معنی کی حد تک دونوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس کی شرح میں تبدیلی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں ہمارے فقہاء کی یہ رائے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی شرح کو نہ بدلا جائے اور عصری ضرورتوں کے لیے "نوائب" کے نام سے نئے ٹیکس لگائے جائیں، تو اس طرح مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ ہمارا قانون جو کہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا نام ہے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا کسی کو کوئی اختیار نہیں اور نہ ہی آج تک ایسی صورت پیش آئی ہے اور غالباً آئے گی بھی نہیں کہ ہماری حکومت یہ قرار دے کہ زکوٰۃ ایک گراں ٹیکس ہے اس کی ضرورت اب نہیں رہی، اسے اب کم کیا جائے۔ بلکہ اس کے برخلاف زکوٰۃ کی آمدنی سے زیادہ ہماری حاجات ہوتی ہیں، لہٰذا "نوائب" کے نام سے

مزید ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ ہاں ایک چیز کہی جاتی ہے کہ قیامت کے قریب مسلمانوں میں دولت کی اس قدر فراوانی ہو جائے گی کہ لوگ مستحقین زکوٰۃ کی تلاش کریں گے لیکن انھیں کوئی بھی ملے گا نہیں۔ یہ ایک پیشین گوئی ہے جو ممکن ہے پوری ہو جائے۔ اس صورت میں زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ کوئی لینے والا نہیں ہو گا۔

۳۴۹ سوال ۱۷۔ کیا زکوٰۃ کی رقم سے مسجد بن سکتی ہے؟

جواب: میری رائے میں "فی سبیل اللہ" کی رقم سے مسجد بن سکتی ہے اور زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کی مد بھی ہے۔ ایک چیز کے متعلق ہمارے بعض فقہاء کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کو اس پر خرچ نہیں کیا جا سکتا' وہ متوفی کی تجہیز و تکفین کا مسئلہ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ میں کسی شخص کو مالک بنایا جاتا ہے اور چونکہ متوفی مالک نہیں بنتا' لہٰذا متوفی کو زکوٰۃ کے ذریعے' کفن دینا ممکن نہیں۔ اس کا حل میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعے سے کفن خود مرنے والے کو نہ دیجئے بلکہ متوفی کے کسی قریبی رشتہ دار کو مدد کے طور پر زکوٰۃ دیجئے کہ وہ اس رقم سے اپنے متوفی عزیز کے کفن دفن کا انتظام کر سکے۔ یا کفن کا کپڑا ہی خرید کر غسال کو دیجئے۔ اس طرح سے وہ دشواری باقی نہیں رہتی جو عارضی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شخص کی وفات ہو جائے اور اس کی قریبی رشتہ دار بالکل نہ ہوں تو ناگزیر ہو گا کہ دیگر مسلمان اس کی تکفین و تدفین کریں چاہے وہ زکوٰۃ کی رقم سے ہی کیوں نہ ہو۔

۳۵۰ سوال ۱۸۔ کیا یہ امر درست ہو گا کہ کوئی شخص کسی فقہی مسلک کی اتباع "ایسر الامور" کے تحت کرے اور مسائل میں اپنی ضرورت اور سہولت کو بھی مدنظر رکھے؟

جواب: میں شخصاً" اس کا قائل نہیں ہوں۔ زندگی کا اصول یہ ہے کہ ہر انسان کو کسی قانون پر عمل کرنا چاہیے۔ آسان ترین راستہ تو یہ ہو گا کہ کسی قانون پر عمل ہی نہ کیا جائے' مگر سب لوگ تسلیم کریں گے کہ یہ غلط خیال ہے۔ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے تحت ہر کام کرنا چاہیے۔ چاہے بار گزر رہا ہو کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے۔ اس کی خلاف ورزی محض آسانی کی خاطر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی ہو گا۔ معقول چیز پر عمل کرنا چاہیے' صرف آسان چیز ہمیشہ معقول نہیں ہو سکتی۔

۳۵۱ سوال ۱۹۔ کیا استعمال میں آنے والے سونے چاندی کے زیوروں پر زکوٰۃ ہو گی؟

جواب: ہمارے فقہاء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ عورت کے

استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ نہیں' اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہو گی۔ سوائے اس کے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ ہر شخص اپنے امام کے احکام پر عمل کرے۔

۳۵۲ سوال ۲۰۔ کتنی نقد رقم پر زکوٰۃ واجب ہو گی یعنی کم سے کم مقدار پر؟

جواب: یہ مسئلہ اس طرح سے پیچیدہ ہو گیا ہے کہ ہمارے فقہاء کے نزدیک عہد نبوی میں دو سو درہم پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا اطلاق شروع ہوتا تھا۔ دو سو درہم سے کم پر نہیں اور وہ اس معیار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ پرانے درہم آج کے کتنے روپے کے برابر ہوں گے۔ بدقسمتی سے اس کا تعین اس بناء پر ناممکن ہے کہ آئے دن گرانی Inflation اور Devaluation وغیرہ کی وجہ سے روپے کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس کا جواب میں صرف یہ دے سکتا ہوں کہ اپنے مقامی علماء سے آپ یہ سوال دریافت فرماتے رہیں۔ انشاء اللہ وہ آپ کو دھوکا نہیں دیں گے۔ آپ کی صحیح رہنمائی کریں گے۔ بہرحال میں آپ سے اپنا خیال ظاہر کرتا ہوں کہ رقم کی کم از کم مقدار جس پر زکوٰۃ واجب ہے اس کے متعلق اولاً" یہ سوچنا چاہیے کہ عہد نبوی میں درہم کی قوت خرید کیا تھی؟ یعنی ایک درہم سے کتنا کام پورا ہو سکتا تھا اور اسی کی اساس پر ہم آج یہ دیکھیں کہ آج وہ غرض کتنے روپوں میں پوری ہوتی ہے۔ سیرت کی کتابوں میں ذکر آتا ہے کہ ۸ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کی فتح کے بعد وہاں حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گورنر مقرر فرمایا اور ان کی تیس درہم ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ اسی تنخواہ میں گورنر' اس کی بیوی' اس کے بچے اس کے گھر کے ملازم اور غلام وغیرہ سب گزارا کرتے تھے۔ میری رائے میں اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دو سو درہم کی جگہ آسانی کے ساتھ ایسی شرح مقرر کی جاسکے جو سامان کی گرانی کے باعث ہمیں مناسب نظر آئے۔ فرض کیجئے کہ میں ایک درہم کو ایک روپے کے برابر تصور کر لوں تو آج کل کی گرانی میں دو سو روپے اتنی حقیر رقم ہے کہ وہ ہمارے ہاں کے چپڑاسی کو بھی ماہانہ دی جائے تو وہ قبول نہیں کرتا۔

۳۵۳ سوال ۲۱۔ آج کے جدید دور میں منصوبہ بندی کئی سال پہلے کر لی جاتی ہے' جب کہ اسلامی یا قمری نظام میں تاریخوں اور مہینوں کا تعین چاند کے نکلنے پر ہوتا ہے۔ اس طرح قمری نظام میں قطعیت (Exactness) پیدا نہیں ہوتی' دوسرے یہ کہ ایک ہی دن میں' مختلف ملکوں میں' مختلف اسلامی تاریخیں پائی جاتی ہیں۔ کئی ملکوں میں مختلف دنوں میں عید منائی جاتی ہے۔ اس بحران پر کیسے قابو پایا جائے اور آیا قمری نظام میں قطعیت پیدا کی جاسکتی ہے تاکہ وہ آج کے زمانے کا

ساتھ دے سکے؟

جواب : اس میں کئی سوالوں کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ الگ الگ جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر آپ منصوبہ بندی کئی سال پہلے کرتے ہیں تو قمری تقویم ہو یا شمسی کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ قمری سال کے اگر ۳۵۴ دن ہوتے ہیں' تو اس سال محرم کا مہینہ خواہ انتیس دن کا ہوا ہے یا تیس کا صرف ایک دن کا فرق ہو گا اور پانچ سال میں جو فرق ہو گا وہ مشکل سے ایک یا دو دن کا ہو سکتا ہے۔ اس سے ہماری منصوبہ بندی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ ہم یہی کہیں گے کہ پانچ سال کی آمدنی سے ہم پانچ سال تک آئندہ فلاں فلاں طریقے سے کام کریں گے۔ مجھے اس میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی۔ دوسرے میں یہ بھی بیان کر چکا ہوں کہ خود عہد نبوی کے رواج کے مطابق ہم شمسی سال کو بھی استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قبائل کو حکم دیا کہ تم سے زراعت کی زکوۃ معین مہینے میں نہیں لی جائے گی۔ بلکہ فصل کے کٹنے پر وصول کی جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں شمسی سال پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی بیان کردہ منصوبہ بندی کے لیے بھی اگر ہم شمسی سال پر عمل کریں مثلاً" عمر خیام کے سال پر تو کوئی امر مانع نہیں' آپ کر سکتے ہیں' اسلام اس سے نہیں روکتا۔ جہاں تک عیدین کا تعلق ہے' میں اپنی حد تک اسے قطعاً" کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ کہ پاکستان میں جمعرات کو عید منائی جائے اور بنگال میں جمعہ کے دن چہار شنبہ کے دن۔ کیونکہ اصل سوال یہ ہے کہ آیا میں اپنے خدا اور اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو پورے خلوص' پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتا ہوں یا نہیں۔ اہمیت اس کو نہیں ہے کہ میں کس دن اس فریضہ کو انجام دیتا ہوں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ بنگال میں اور پاکستان کے اوقات میں شاید ایک گھنٹے کا فرق ہے۔ مغرب کی نماز آپ یہاں جس وقت پڑھتے ہیں' وہاں تقریباً" عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں اب بھی ہم اس شمسی یا قمری سال کے بغیر اختلاف رکھتے ہیں اور یہ مسئلہ نیا نہیں ہے۔ عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں بھی یہ چیز پیش آ چکی ہے کہ اسلامی مملکت کے ایک علاقے میں' چاند ایک دن دیکھا گیا اور دوسرے علاقے میں دوسرے دن۔ چنانچہ جہاں تک مجھے یاد ہے' سنن ابوداؤد میں ذکر آتا ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک شخص امیر معاویہ سے ملاقات کے لیے' یا کسی اور غرض سے' دمشق بھیجا گیا۔ وہ وہاں رمضان کا پورا مہینہ مقیم رہا' پھر اس نے بیان کیا کہ ہم دمشق میں ایک دن پہلے چاند دیکھ چکے ہیں اور آج اتیسویں نہیں تیسویں

ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے گفتگو کے دوران یہ بات کہی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی حکم دیا ہے کہ مقامی رویت کے مطابق عمل کریں۔ چاہے دوسرے مقام کی رویت خود خلیفہ وقت کے حکم سے ہی کیوں نہ عمل میں آئی ہو۔ ان حالات میں اگر ہم آج قانون فطرت کے مطابق رویت ہلال دو مختلف اوقات میں کرتے ہیں' تو میرے نزدیک اس میں قطعاً" کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ ایک دن عید منائیں۔ لیکن عید منائیں اور نماز بھی پڑھیں۔ دوسرا شخص دوسرے دن عید منائے لیکن وہ بھی نماز کو اہمیت دے "دن" کو نہیں۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے اس لیے میرے نزدیک یکسانیت پیدا کرنے پر اصرار کرنا محض بے کار ہے۔

عہد نبویؐ میں تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ

محترم صدر ! محترم وائس چانسلر صاحب ! محترم اساتذہ و مہمانان گرامی !
السلام علیکم و رحمتہ اللہ وبرکاتہ !

۳۵۴۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین و آلہ و اصحاب اجمعین!

۳۵۵۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دو پہلو ہیں جو حقیقت میں ایک ہی پہلو کے دو جز ہیں یعنی اسلام کی تبلیغ اور اس تبلیغ کو قبول نہ کرنے والوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ۔ آج ہم ان کے بارے میں بات کریں گے۔ یہ برتاؤ کچھ تو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یا آپ کے ذاتی طرز عمل پر مبنی ہوگا اور کچھ ان احکام پر مبنی ہوگا جو قرآن مجید اور حدیث شریف میں پائے جاتے ہیں۔ میرے علم میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں ہے جو صرف اس موضوع پر لکھی گئی ہو۔ اس لیے میں کوشش کروں گا کہ تاریخی حیثیت سے دیکھوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل کیا رہا اور کس طرح آپؐ اللہ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچاتے رہے؟ پھر اس کا جو ردعمل ہوا' اس سلسلے میں آپؐ کا برتاؤ کیا رہا؟ کس طرح آپؐ اس کا مقابلہ کرتے رہے اور تاریخی نقطہ نظر سے اس کے کیا نتائج نکلے؟ ہمیں ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ پہلے دن کی وحی میں تبلیغ کا کوئی حکم نہیں ہے۔ پہلی وحی سے آپ سب لوگ واقف ہیں کہ وہ سورۂ اقراء (۹۶: ۱۔۵) کے پہلی پانچ آیتیں ہیں' جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کا حکم دیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے آپ کی امت کو یہ حکم دیا گیا۔ اس کے بعد ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ تین سال تک ایک وقفہ رہا جس کے لیے فترۃ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس دوران کوئی نئی وحی نہیں آئی

لیکن دوسری وحی کے نہ آنے کے باوجود' یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ تبلیغ کا کام شروع ہوگیا۔ ان پہلی آیتوں میں صاف طور پر تبلیغ کا حکم نہ ہونے کے باوجود عملاً" اس کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جب پہلی وحی نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تھے۔ میرے علم میں یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ مکے میں سخت سردی پڑ رہی تھی۔ وحی کے فوراً" بعد آپ شہرواپس آجاتے ہیں اور اپنے مکان میں پہنچ کر اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرماتے ہیں: زملونی زملونی: (مجھے کمبلوں سے ڈھانپو' مجھے کمبلوں سے ڈھانپو) ظاہر ہے بیوی نے ایسا ہی کیا ہوگا۔ کچھ تو اس سردی کی شدت کے اثر سے اور کچھ اس وحشت کی وجہ سے جو جبرئیل کی آمد اور متعلقہ واقعات کے مشاہدے کے باعث پیدا ہوئی' آپ کی حالت غیر تھی۔ جب ذرا سکون ہوا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیوی کو سارا واقعہ سنانے کے بعد آخری بات یہ کہی کہ کیا یہ شیطان کی کارستانی تو نہیں ہے؟ میں کوئی کاہن تو نہیں ہوگیا ہوں حالانکہ میں ساری زندگی ان لوگوں کو' جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں' برا کہتا رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیوی تسلی دینے کے لیے کہتی ہیں کہ یقیناً ایسا نہیں ہوگا کیونکہ تم زندگی بھر لوگوں کی مدد کرتے رہے ہو۔ غریبوں' محتاجوں' بیواؤں اور یتیموں کی پرورش کرتے رہے ہو' اس لیے خدا ایسے شخص کا ساتھ نہیں چھوڑے گا' یقیناً خدا تمھیں شیطان کے حوالے نہیں کرے گا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی نے ایک اور جملہ کہا کہ میرا ایک چچا زاد بھائی جس کا نام ورقہ بن نوفل ہے' وہ ان چیزوں سے بہت واقفیت رکھتا ہے' کل صبح ہم اس کے پاس جائیں گے۔ تم اس کو اپنا قصہ بیان کرنا وہ تمھیں اچھی طرح بتا سکے گا کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس کے بعد دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس جاتی ہیں' جو عیسائی تھا۔ دوسری روایت کے مطابق' اگلی صبح (غالباً" حسب عادت) حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کے پاس تشریف لائے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کو یہ واقعہ سنایا' یا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کی کہ وہ ابوبکر کو یہ واقعہ سنائیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس بھیجا۔ ورقہ بن نوفل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ضعیف العمری کے باعث نابینا ہوچکے تھے۔ یہ واقعہ سن کر اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ "جو کچھ تم نے بیان کیا ہے اگر یہ سچ ہے تو یہ ناموس موسیٰ علیہ السلام کے مماثل ہیں۔ اگر میں اس وقت تک

زندہ رہا جب تمہاری قوم تمہارے ساتھ بدسلوکی کرے گی او، تمہیں اپنے شہر سے نکال دے گی تو اس وقت میں تمہارا ساتھ دوں گا اور تمہاری مصیبتوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ کیا اس بات پر، کہ میں خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاؤں، لوگ مجھ پر ظلم و ستم کریں گے، اذیتیں دیں گے، اور مجھے اس ملک سے نکال دیں گے؟ اس پر ورقہ بن نوفل نے کہا، ہاں، کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس کو اس کی امت نے تکلیف نہ دی ہو۔ میں اب لفظ ناموس پر کچھ بحث کروں گا۔ عام طور پر اردو میں یہ لفظ عزت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ زیر بحث سیاق و سباق میں یہ معنی نہیں لیے جاسکتے۔ ہمارے بعض مفسر یہ کہتے ہیں کہ ناموس کے معنی قابل اعتماد چیز کے ہوتے ہیں۔ یہ معنی بھی یہاں مناسب نظر نہیں آتے۔ میں شاید یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ جس سیاق و سباق میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں ایک اور معنی مراد لینے کی ضرورت ہے۔ ورقہ بن نوفل نے عیسائیت اختیار کرلی تھی اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے، جیسا کہ بخاری کی حدیثوں میں بھی ہے، کہ انھیں سریانی زبان آتی تھی اور سریانی سے عربی زبان میں انھوں نے انجیل کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان حالات میں کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ سریانی زبان میں موجود ایک یونانی لفظ ہو۔ اگر اس مفروضے کی بنا پر ہم غور کریں تو فوراً اس کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔ یونانی زبان میں توریت کو "نوموس" Nomos ہی کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ پر جو پیغام نازل ہوا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے مشابہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ اس مفہوم میں زیادہ پھبتا ہے اور زیادہ مناسب و معقول لگتا ہے۔ ان ابتدائی واقعات کے بعد، بجز مفروضات کے یہ کہنا مشکل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا تھا۔ غالباً وہ بار بار مختلف لوگوں اور پوچھنے والوں کو اپنا واقعہ سناتے رہے ہوں گے کہ جبرئیل نے مجھے یوں کہا اور مجھے یہ بتایا۔ میں ایک چھوٹی سی بات کا تکملہ کرتا چلوں۔ پہلی وحی کے سلسلے میں بلاذری کی "انساب الاشراف" میں کچھ تفصیلیں اور بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سورۂ اقراء کی پہلی پانچ آیتوں کے ابلاغ کے بعد حضرت جرائیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاً استنجے کا طریقہ بتایا کہ اپنے جسم کو نجاست سے کس طرح پاک کریں۔ اس کے بعد وضو کا طریقہ بتایا کہ نماز کے لیے کس طرح اپنے آپ کو جسمانی اور روحانی طور سے تیار کرنا چاہیے۔ پھر جبرئیل علیہ السلام نے امام بن کر نماز پڑھائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی بن کر اسی طرح نماز پڑھی۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام چلے گئے۔ ان حالات میں سیرت کی کتابوں میں یہ روایت پڑھ کر ہمیں حیرت نہیں ہونی

جاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا' دونوں وقتاً" فوقتاً" کعبے کے سامنے علانیہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ نماز مکہ والوں کی عبادت سے' ظاہر ہے' مختلف تھی' جس کے باعث لوگ حیرت سے انھیں دیکھتے تھے۔ ابھی تک قرآن کی وہ آیتیں نازل نہیں ہوئی تھیں جن میں بت پرستی کو برا بھلا کہا گیا تھا اور بتوں کی پرستش کرنے والوں کو جہنم میں جانے کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ لوگوں کو اس نئے دین کے متعلق استعجاب ضرور ہوتا ہوگا لیکن ابھی ان میں کوئی عناد یا غصہ پیدا نہیں ہوا ہوگا۔ بہرحال ان دنوں دو تین مسلمان نظر آتے ہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' ان کے بعد آپ کے چچا زاد بھائی جو آپ کے متبنیٰ بیٹے بھی تھے یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ' ان کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ گویا اولین مسلمانوں کی جماعت ان پانچ سات آدمیوں پر مشتمل تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اسلام لانے کے بارے میں دو مختلف روایتیں ملتی ہیں۔ پہلی روایت کے مطابق چونکہ وہ بہت کم سن تھے' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر خود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کرنے لگے۔ دوسری روایت جو غالباً" کچھ عرصے بعد کی ہوگی' یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کعبے کے سامنے جاکر نہیں بلکہ شہر کے باہر صحرا میں یا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کئی مرتبہ دیکھا کہ دونوں چھپ کر گھر سے چلے جاتے ہیں تو وہ ان کی ٹوہ میں پیچھا کرتے ہیں۔ جب دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ بھی وہاں کھڑے رہتے ہیں۔ نماز کے اختتام پر پوچھتے ہیں کہ یہ کیا چیز تھی؟ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور میں اللہ کا نبی ہوں تو وہ اسلام قبول کرتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اسلام لانے کے بارے میں ایک تیسری روایت بھی ہے۔ ان اختلافی روایات کی وجہ سے یہ کہنا دشوار ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کس زمانے میں اسلام قبول کیا۔ تیسری روایت' پہلی وحی نازل ہونے کے کم از کم تین سال بعد کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ملا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی تبلیغ کریں: وانذر عشیرتک الاقربین (۲۶ : ۲۱۴) (اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ سے ڈراؤ) چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدائی حکم کی تعمیل میں تبلیغ کا ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ بازار سے فلاں فلاں

چیز خرید کر لاؤ اور بیوی سے کہا کہ ان سے ایک ضیافت کا اہتمام کرو۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھیجا کہ خاندان کے سارے گھروں میں (چچاؤں اور چچاؤں کے بیٹوں کے پاس) جاؤ اور انھیں دعوت دو کہ فلاں دن اور فلاں وقت کھانے کے لیے میرے پاس آئیں۔ عام کتب سیرت میں ہے کہ پہلی مرتبہ لوگ آئے تو تھوڑی مقدار میں کھانا بہت سے (تیس چالیس) آدمیوں کو کافی ہوگیا۔ اس معجزے کو دیکھ کر ابولہب نے استہزاء کیا کہ یہ جادوگر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت متاثر اور ملول ہوئے اور کچھ بول نہ سکے۔ چند دن کے بعد رسول اکرم نے مکرر دعوت دی' اور اس دن ان کی تبلیغ کی۔ یہ عام روایت ہے لیکن میرا گمان ہے کہ پہلی مرتبہ چونکہ ان لوگوں کو یہ علم نہیں تھا کہ کس غرض کے لیے بلایا گیا ہے وہ آئے لیکن سب ایک وقت میں نہیں آئے اور کھانا کھاکر جاتے رہے ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آخری شخص کے کھانا کھا چکنے کے وقت سوائے اس آخری شخص کے کوئی اور آدمی موجود نہ تھا۔ اس لیے اصل مقصد کہ خاندان کے لوگوں میں تبلیغ کریں پورا نہ ہوا۔ کچھ دنوں بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ وہی تدبیر اختیار کی حضرت علی کرم اللہ وجہہ خاندان والوں کو اطلاع دیتے ہیں۔ اس مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احتیاطا" کہتے بھی جاتے ہیں کہ کھانے کے بعد میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں' ٹھہرنا' انتظار کرنا۔ چنانچہ اب کی بار سب لوگ اس تجسس میں بیٹھے رہے کہ دیکھیں وہ کیا بات ہے جس کے لیے ہمیں بلایا گیا ہے۔ کھانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مخاطب ہوکر بتاتے ہیں کہ بت پرستی کیوں بری ہے۔ اللہ کو ایک ماننا کیوں ضروری ہے؟ پھر اس کے نتائج یعنی آخرت کی زندگی اور خدا کے سامنے حساب و کتاب کا ذکر کیا۔ اس طرح کی چند بنیادی باتیں لوگوں کو بتائیں۔ اس سلسلے میں طبری کی روایت بہت دلچسپ ہے۔ طبری کا بیان ہے کہ اس تبلیغ کا غالبا" آخری جملہ یہ تھا کہ تم میں سے جو شخص میری دعوت کو قبول کرے گا وہ میرا جانشین اور خلیفہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ' جو ابھی بچے تھے' اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ابولہب قہقہہ مار کر ہنسا اور تالی بجا کر کہنے لگا۔ ابو طالب مبارک ہو۔ آج سے تم اپنے بیٹے کے ماتحت بن چکے ہو۔ اس سے ابوطالب کو خفت سی ہوئی۔ اس لیے وہ ساری عمر اس کے لیے آمادہ نہیں ہوسکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قبول کرلیں۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ "خلیفہ" سے کیا مراد ہے' خاص کر اس لیے کہ امکان تھا کہ کئی لوگ اس دن مسلمان ہو جاتے اور ہر ایک خلافت

کا مستحق بنتا۔ شاید حدیث "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" بھی اس کی تائید کرتی ہے۔
اس بیان کا منشا تبلیغ کا طریقہ بتانا تھا۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کیسے ایمان لائے یا وہ کب ایمان لائے؟ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ اس وقت ہم صرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی وحی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے۔
اس کے کچھ عرصے بعد دوسری وحی نازل ہوتی ہے جس میں یہ حکم آتا ہے کہ فاصدع بما تومر و اعرض عن المشرکین (۱۵: ۹۴) (جس چیز کا تجھے حکم دیا جاتا ہے وہ کھول کر بیان کر اور مشرکوں کی پروا نہ کر) اس حکم کے آنے پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرح کی دہشت محسوس کرتے ہیں کہ سارا شہر بت پرست ہے' اگر میں یہاں کے لوگوں کو برملا یہ کہوں کہ تمہارا دین غلط ہے' اور تمہارے بت تمہارے لیے حفاظت اور نجات کا باعث نہیں بن سکتے' تو لوگ خفا ہوں گے اور استہزاء بھی کریں گے۔ حضرت جبرئیل نے پھر آکر تشفی دی کہ اللہ آپ کو نہیں چھوڑے گا' اللہ آپ کی حفاظت کرے گا۔ اس پر ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے باہر ایک پہاڑی کے کسی بلند حصے پر' کھڑے ہوکر لوگوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ جیسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔ لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں فلاں قبیلے کے لوگوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں۔ جو لوگ اس قبیلے کے نہیں تھے' وہ چلے گئے۔ پھر اس کی ایک شاخ کا ذکر کیا کہ میں صرف ان سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ غرض بجائے سارے شہر کے لوگوں کو خطاب کرنے کے اس کے ایک محدود حصے کو اس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطب کیا۔ خطاب کا انداز کچھ اس طرح تھا کہ اے بھائیو! اگر میں تم سے بیان کروں کہ اس پہاڑ کے پیچھے' دوسری طرف' ایک دشمن کی فوج آئی ہوئی ہے اور وہ تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم میری بات پر اعتماد کرو گے؟ ان کا جواب تھا کہ ہم نے تمھیں آج تک جھوٹ بولتے نہیں پایا۔ اگر تم سنجیدگی سے کہتے ہو کہ واقعی کوئی دشمن اس طرف آیا ہوا ہے اور پڑاؤ ڈالے پڑا ہے تو ہم تمہاری بات پر یقین کریں گے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ میں تم کو اس انسانی لشکر سے بھی بڑے ایک دوسرے لشکر سے ڈراتا ہوں' یہ اللہ کا قہر اور عذاب ہے۔ اگر تم اللہ کو ایک نہ مانو گے اور بتوں کی پرستش نہیں چھوڑو گے تو مرنے کے بعد اللہ تمھیں دوزخ میں ڈال دے گا۔ اس دن اور لوگوں کے علاوہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چچا ابولہب بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے جل کر کہا' کیا اس فضول بات کے لیے تم نے ہمارا وقت ضائع کیا؟ اور وہ چلا گیا' دوسرے

لوگ بھی آہستہ آہستہ وہاں سے چلے گئے۔

۳۵۶۔ اس وقت بے محل نہ ہوگا اگر میں یہ بیان کروں کہ ابولہب کو اپنے بھتیجے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت کیوں پیدا ہوگئی تھی؟ بلاذری نے انساب الاشراف میں اس کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن گھر میں دو بھائی یعنی ابولہب اور ابو طالب کسی بات پر لڑ پڑے۔ اولاً ابولہب نے اپنے بھائی کو زمین پر پٹخ دیا اور سینے پر چڑھ کر طمانچے لگائے۔ اس کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ان دنوں دادا کی وفات کے بعد ابو طالب کی کفالت میں تھے' دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور ابولہب کو ابوطالب کے سینے سے دھکیل کر ہٹاتے ہیں۔ اس طرح ابو طالب کو اٹھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اب وہ ابولہب کو زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور اس کے سینے پر چڑھ کر اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چپ چاپ دیکھتے رہتے ہیں۔ ابولہب جل کر کہنے لگا۔ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ابو طالب بھی تیرا چچا ہے اور میں بھی تیرا چچا ہوں۔ پہلے تو نے ابو طالب کی مدد کی لیکن اب میری مدد کے لیے کیوں نہیں آیا؟ خدا کی قسم میرا دل تجھ سے کبھی محبت نہیں کرے گا۔" بلاذری کی انساب الاشراف میں یہ ایک چھوٹا سا واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہ نفسیاتی اصول ہے کہ جو لوگ جتنے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اتنا ہی وہ چھوٹی سی چیز کا زیادہ اثر لیتے ہیں اور ان کے دلوں پر اس کا دیرپا اثر رہتا بلکہ روز افزوں ہوتا جاتا ہے' ممکن ہے یہی وجہ ہو جس کی بنا پر ابولہب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت پیدا ہوگئی اور کبھی اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ اسے اسلام کے انتہائی شدید دشمنوں میں سے ایک قرار دے دیا گیا۔ ان ابتدائی کوششوں کے بعد یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کا دعویٰ کر رہے ہیں' اور یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد کا دین غلط اور لغو ہے۔ جن چیزوں کی ہم پرستش کرتے ہیں وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نفرت شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی اور جلد ہی وہ نوبت آگئی کہ شہر کی حکومت اور سربر آوردہ لوگوں نے بھی انھیں اس بات سے منع کر دیا کہ خانہ کعبہ کے سامنے آکر اپنے طرز کی عبادت کریں۔ اس کے بعد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تو اپنے مکان میں نماز پڑھتے یا گھر سے باہر کسی جنگل یا صحرا میں عبادت کرتے۔ لیکن کافروں کی چھیڑ خانی میں کمی نہیں آئی۔ لوگ آپ کے پاس آتے' آپ سے بحث کرتے' آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے۔ ان میں آپ کا چچا ابو لہب پیش پیش رہتا۔ اسے پتہ چلا کہ جب سب لوگ سو جاتے ہیں تو اس وقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپتے چھپاتے خانہ کعبہ کے سامنے آتے ہیں اور وہاں اپنے طرز کی عبادت یعنی نماز پڑھتے ہیں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گزرگاہ میں خار دار درختوں کی شاخیں لاکر ڈال دیتا اور مکان کی دہلیز پر گندگی اور غلاظت لاکر ڈالا کرتا تھا۔ یہ وہ رکاوٹیں تھیں جن کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام پہنچانے میں دشواری ہوتی رہی لیکن آپ نے ہمت نہ ہاری اور تبلیغ کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ پھر ایک نئی مشکل سے آپ کو سامنا کرنا پڑا' وہ یہ کہ مکے کے باشندے وقتاً" فوقتاً" گلی کے لونڈوں کو ترغیب دلاتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے جائیں' ان پر پتھر پھینکیں اور انھیں یہاں سے نکالیں۔ جب کبھی ایسا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدتمیز لڑکے پیچھا کرتے تو مقریزی نے بیان کیا ہے کہ ایسے وقت اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اتفاق سے ابو سفیان کے مکان کے قریب ہوتے تو ابوسفیان کے گھر میں چلے جاتے اور ابوسفیان مسلمان نہ ہونے کے باوجود اس قدر شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کرتا کہ فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتا اور گلی کے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتا۔ ان کے جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطمینان سے اپنے گھر جاتے۔ اس واقعے کا ذکر کرنے کے بعد مقریزی نے ایک بہت بعد کے واقعے کی طرف چھوٹا سا اشارہ کیا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو فتح کرتے ہیں تو ہمارے مؤلف لکھتے ہیں کہ فوج کے ہراول دستے یا مقدمتہ الجیش میں ایک منادی کرنے والا تھا جو گلیوں سے گزرتے وقت با آواز بلند' چلا چلا کر کہتا جاتا تھا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے وہ امن میں رہے گا۔ جو شخص اپنے گھر کے اندر بند رہے' باہر نہ نکلے امن میں رہے گا۔ جو حرم کعبہ میں چلا جائے گا وہ امن میں رہے گا اور آخری چیز جس کی طرف اس وقت توجہ دلانا مقصود ہے' وہ یہ کہ جو شخص ابوسفیان کے مکان میں جائے گا وہ بھی امن میں رہے گا۔ مقریزی کہتے ہیں کہ یہ امتیاز اور خصوصیت اس واقعے کی بناء پر تھی کہ زمانہ قبل ہجرت جب کبھی مکے کے شریر بچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دیتے اور آپ ابوسفیان کے گھر جاتے تو ابوسفیان آپ کو پناہ دیتا تھا۔ لہٰذا اس کے بدلے میں ابوسفیان کے مکان کو بھی پناہ گاہ قرار دے دیا گیا۔

۳۵۷۔ اس تبلیغ کا سلسلہ کوئی چار پانچ سال جاری رہا۔ اس عرصے میں کفار کے ظلم و ستم اور اذیتوں کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ انھیں اپنے ملک میں رہنا دشوار ہوگیا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بتایا کہ وہاں ایک عیسائی بادشاہ نجاشی

حکومت کرتا ہے جس کے ملک میں کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ وہ لوگ حبشہ پہنچ گئے۔ اب چونکہ تبلیغ کی آزادی تھی، اس لیے یہ مسلمان (مکے کے نو مسلم مہاجر) حبشہ میں تبلیغ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند سالوں میں وہاں کافی تعداد میں یعنی کم از کم چالیس پچاس حبشی مسلمان ہوگئے۔ لیکن اس سلسلے میں انھیں دشواریاں بھی پیش آئیں۔ جب مکے کے نو مسلم ہجرت کرکے حبشہ چلے گئے تو مکے کے مشرکوں نے نجاشی کے پاس ایک وفد بھیجا۔ اس وفد نے جاکر یہ مطالبہ کیا کہ ان مسلمانوں کو ہمارے سپرد کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں واپس لے جاکر پھر تکلیفیں دیں اور ستائیں۔ نجاشی نے صرف مطالبے کی بنا پر فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ تم لوگوں کے متعلق الزام ہے کہ تم اپنے شہر میں فتنہ و فساد کرتے رہے ہو اور وہاں کی سزا سے بچنے کے لیے یہاں آکر پناہ گزین ہوگئے ہو۔ تم لوگوں کا کیا جواب ہے؟ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی جعفر طیار رضی اللہ عنہ جواب دیتے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں اس جواب کا ذکر کروں، ایک ذاتی استنباط آپ سے بیان کرتا ہوں جس کا ذکر ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات میں نجاشی کے نام ایک مکتوب ہمیں ایسا بھی ملتا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ "میں اپنے چچا زاد بھائی جعفرؓ کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں۔ جب وہ پہنچے تو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی مہمانداری کر، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کر اور اس بارے میں کوئی ہٹ دھرمی اختیار نہ کر۔" طبری میں یہ خط موجود ہے جسے وہ ۷ ہجری کے حالات میں درج کرتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ ممکن نظر آتا ہے کہ یہ خط جعفر طیارؓ کو بطور تعارف دیا گیا ہو، خط لے کر گئے ہوں اور نجاشی کو ۵ نبوی میں دیا ہو کیونکہ ۷ ہجری میں مسلمان مہاجرین حبشہ میں پندرہ سال گزار کر مدینہ واپس جا رہے تھے۔ واپسی کے وقت پناہ طلبی کے لیے تعارفی خط بھیجنا فضول سی بات نظر آئے گی۔ اس لیے مورخوں کے سکوت کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ مہاجرین مکہ کی اولین جماعت جس وقت حبشہ گئی ہوگی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ تعارفی خط دیا ہوگا۔ قطع کلام کرکے شاید یہ عرض کرتا چلوں کہ سہیلی کے مطابق یہ نجاشی ایک زمانے میں اپنے ظالم چچا کی وجہ سے عرب میں سکونت پذیر ہونے پر مجبور ہوا، اور مقام بدر میں رہتا تھا۔ بدر وہ مقام ہے جہاں قریشی کاروان شام کو جانے اور وہاں سے واپس آنے کے وقت منزل کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کاروانی سفر کے وقت، بعثت سے قبل، اس سے شخصی تعارف حاصل ہوا ہو۔ بہرحال مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور مسلمان ہو جانے والے لوگ بھی جہاں جہاں جاتے' اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مطابق اپنے نئے دین کی تبلیغ شروع کر دیتے' جس سے متاثر ہو کر لوگ ایمان لے آتے۔ چنانچہ جعفر طیارؓ کو جب نجاشی کے سامنے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع ملا تو انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ یہ لوگ ہم پر کیوں الزام لگاتے ہیں کہ ہم فتنہ و فساد کرتے ہیں۔ آخر میں انھوں نے قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھ کر سنائیں بالخصوص سورۂ مریم کی' جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے حکم سے بغیر باپ کے حضرت مریم علیہ السلام کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے مؤرخوں کا بیان ہے کہ یہ تفصیل سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ ان آیتوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے اتنے (اس تنکے کے برابر) بھی زیادہ نہیں تھے۔ ہمیں مزید تفصیلیں نہیں ملتیں کہ آیا نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن کچھ اشارے ایسے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ اگر اس وقت نہیں تو بعد میں نجاشی ضرور مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ بخاری کی ایک روایت کے مطابق' جس دن نجاشی کی وفات کی مدینے میں خبر آئی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دن اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی غیر مسلم کے لیے نماز جنازہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس لیے یہ گمان کرنا چاہیے کہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا' اور اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھجوائی تھی۔

۳۵۸۔ تبلیغ کے سلسلے میں یہ چند ابتدائی باتیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بھی مشکل تر حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ جب حبشہ بھیجی ہوئی مشرکین مکہ کی جماعت اپنے مقصد یعنی مسلمان مہاجرین حبشہ کو واپس مکہ لانے میں ناکام ہوئی تو وہ لوگ مقیم مکہ بقیہ مسلمانوں کو زیادہ سختی سے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے لگے' اور باتوں کے علاوہ انھوں نے ایک قرارداد منظور کی کہ رسولؐ اور آپؐ کے خاندان کے دوسرے لوگوں سے نہ کوئی شخص شادی بیاہ کے تعلقات رکھے' نہ ان کو بیٹی دے اور نہ ان سے رشتہ لے۔ نیز یہ بھی کہ نہ کوئی تجارتی چیز انھیں فروخت کرے' اور نہ ان کی دکان سے کوئی چیز خریدے' حتیٰ کہ ان سے بات چیت بھی نہ کرے۔ یہ قرارداد انھوں نے لکھ کر خانہ کعبہ کے اندر لٹکا دی اور یہ عہد کیا کہ ہم اس کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ یہ بائیکاٹ کئی سال تک جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں متعدد مسلمان فاقہ کشی سے شہید بھی ہوئے۔ بہت سے مسلمانوں نے ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائیں کہ انھیں

یاد کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بالآخر وہ بائیکاٹ ختم ہوجاتا ہے۔ اس کی تفصیل میں میں نہیں جانا چاہتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہر واپس آتے ہیں اور یہ دیکھ کر کہ اب شہر کے باشندوں سے بات چیت بھی ناممکن سی ہوگئی ہے اور لوگ اسلام کا نام سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں تو سوچنے لگتے ہیں کہ کیا کریں؟ اسی زمانے میں چچا ابو طالب کی وفات ہوگئی' اور نہ معلوم کس طرح دوسرا چچا ابولہب قبیلے کا سردار بنا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ حضور اکرمؐ کو "خلع" (یعنی جات باہر) کر دے کہ جو چاہے آپ کو جان سے بھی مار ڈالے' قبیلہ انتقام کی کوشش نہ کرے گا۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجبور ہوتے ہیں کہ شہر کو چھوڑ دیں اور کسی اور جگہ جاکر تبلیغ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر طائف انتخاب کرتے ہیں۔ ہمارے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھیالی رشتہ دار تھے' گویا ماموؤں کا علاقہ تھا۔ آپ بہت پرامید ہوکر گئے لیکن وہاں مکے سے زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ماموؤں نے آپؐ کی حوصلہ شکنی کی اور دھمکی دی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا شہر چھوڑ کر چلے جائیں ورنہ آپ کی جان کی خیر نہیں۔ مجبوراً" آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے نکلے تو ان لوگوں نے گلی کے شریر لڑکوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا: ان پر پتھر پھینکو اور انھیں ستاؤ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوجاتے ہیں شہر سے باہر آکر ایک باغ دیکھتے ہیں جس کے دروازے پر ایک دربان کھڑا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت سے باغ کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ دربان ایک نیک دل عیسائی تھا۔ اس نے ان شریر لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور اپنے مالک کی اجازت سے' جو مکے کا رہنے والا تھا اور اس وقت باغ میں موجود تھا' اس بے بس مہمان کی میزبانی کرنے لگا۔ انگور کا ایک خوشہ توڑ کر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا۔ اس وقت ایک واقعہ پیش آیا جسے شاید تبلیغ کا بالواسطہ طریقہ کہا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "بسم اللہ" کہہ کر انگور کے ان دانوں کو کھانا شروع کیا۔ باغ کا مالی یا دربان حیرت سے پوچھنے لگا کہ تمھارے ملک میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ یہ کیا طریقہ ہے؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتایا کہ میں نبی ہوں۔ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں جو کام کروں' اللہ کا نام لے کر شروع کروں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دربان سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا میں عیسائی ہوں۔ میرا وطن نینوئی کا شہر ہے (اسے آج کل موصل کہتے ہیں) ایسی مصیبت آئی کہ اب غلام کی صورت میں یہاں کام کر رہا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس شہر کے باشندے ہو جہاں میرا بھائی

یونس علیہ السلام رہا کرتا تھا۔ اس پر وہ عیسائی بے اختیار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کو بوسہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہاں یونس علیہ السلام نبی رہا کرتے تھے۔ کچھ اس طرح کی گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے رخصت ہو کر مکے کی طرف لوٹے۔ تھوڑی دور جا کر آپ تھک کر ٹھہر جاتے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ آپ نماز میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نماز کے بعد دکھے ہوئے دل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے ہیں جو آج بھی ہم پڑھیں تو دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے الفاظ کم و بیش اس طرح ہیں: "اے اللہ میں اپنی کمزوری اور بے بسی کی تجھ سے فریاد کرتا ہوں۔ لوگ مجھے حقیر پاتے ہیں۔ مصیبت زدوں کا رب تو ہی ہے۔ اے میرے رب، کیا کروں؟ دور کے رشتہ دار درشتی سے پیش آ رہے ہیں۔ قریبی رشتہ دار دشمن بن گئے ہیں۔ اس سب کے باوجود، اگر تو مجھ سے خفا نہیں ہے تو مجھے ان تکلیفوں کی پروا نہیں لیکن تیری طرف سے عافیت مل سکے تو وہ زیادہ خوشگوار ہو۔ میں پناہ صرف اس بات سے چاہتا ہوں کہ تو مجھ سے ناراض ہو جائے۔ میں تیری اور صرف تیری خوشنودی کا طالب ہوں۔ کسی بھی کام کی کوئی قوت، کوئی طاقت مل سکتی ہے تو وہ بس تجھی سے ہے۔" مختصر یہ کہ فرماتے ہیں: میں ان ساری مشکلوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں اور عازم ہوں کہ اپنے فریضے کی انجام دہی کو جاری رکھوں۔

۳۵۹۔ یہ امتحان الٰہی تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اس میں حضور کس شان سے کامیاب ہوتے ہیں۔ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ ابھی نماز اور دعا سے فارغ ہی ہوتے ہیں کہ قبولیت کے آثار نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں چنانچہ ایک اہم واقعہ پیش آیا جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دینے کے لیے خدا نے ایک سورت نازل کی جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں کہ قل اوحی الی انہ استمع نفر من الجن (۷۲ : ۱) (آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے کہ جنوں کا ایک گروہ مجھے سن رہا ہے) اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا اور نہ ان کے وجود کو محسوس کیا۔ جب تک خدا نے اطلاع نہیں دی آپ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف انسانوں کے لیے نبی نہ رہے، جنات کے لیے بھی نبی بن گئے۔ اگر انسان آپ کی نبوت سے انکار کرتے ہیں تو کم از کم جنات کا ایک گروہ تو اسلام قبول کر رہا ہے۔ یہ روشنی کی پہلی کرن تھی جو اس تاریکی اور مایوسی کے عالم میں آپ کو دکھائی دیتی ہے۔

۳۶۰۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ آہستہ پیدل مکہ واپس جاتے ہیں۔ یہاں ایک نئی مشکل آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ یہ کہ چچا کے طرد اور شہر مکہ کو چھوڑنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی قومیت ختم ہوگئی تھی۔ آپ اس وقت تک شہر مکہ میں داخل نہیں ہوسکتے تھے جب تک شہر مکہ کا کوئی باشندہ آپ کو پناہ نہ دے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بدوی شخص کو کچھ رقم دے کر بھیجتے ہیں کہ میری ماں کے فلاں رشتہ دار سے جا کر کہو کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ وہ جاتا ہے مگر واپس آکر کہتا ہے کہ اس شخص نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ہے کہ میں مکہ والا نہیں، طائف والا ہوں، اس لیے مکہ والوں کو اپنی پناہ دہی کا پابند نہیں کرسکتا۔ پھر اسی بدوی کو کچھ اور انعام دے کر ایک شخص کے پاس بھیجتے ہیں جو آپ کی بیوی حضرت سودہ کا رشتہ دار ہے، وہ بھی انکار کرتا ہے کہ میں چھوٹے خاندان کا آدمی ہوں۔ پھر اسی کو ایک تیسرے شخص کے پاس بھیجتے ہیں جو آپ کی بیوی حضرت خدیجہ کا رشتہ دار ہے وہ قبول کرلیتا ہے اور اپنے بچوں اور اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ ہتھیار بند ہوکر آتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حفاظت میں لے کر مکے میں داخل ہوتا ہے۔ حسب رسم اولاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ضروری تھا کہ کعبے کا طواف کریں اور پھر گھر جائیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الاعلان کعبے کا طواف کرتے ہیں اور پھر اپنے گھر جاتے ہیں۔ یہاں میں یہ بیان کرتا چلوں کہ طائف کے اس سفر سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بڑے حامی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے : آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔اسی افسردگی کے عالم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر چھوڑ کر طائف گئے تھے۔ اس شہر مکہ میں چچا ابولہب کی دشمنی کے باعث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اجنبیوں کی سی تھی جو مقامی باشندوں میں سے ایک کی پناہ میں رہتے تھے۔ جس سے میں یہ معنی اخذ کرتا ہوں کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہر میں آزادی نہیں تھی کہ سیاست میں حصہ لیں، یعنی تبلیغ دین کریں۔ اللہ نے اس کا حل بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا۔ وہ یہ کہ شہر مکہ کے رواج کے تحت لوگوں کو ہر سال حج کے زمانے میں ایک طرح کا امن عام مل جاتا تھا چنانچہ جو لوگ مجرم اور قاتل ہوتے تھے اور سارا سال چھپتے رہتے تھے وہ بھی حرام مہینے میں، یعنی حج کے زمانے میں، کھلم کھلا باہر نکل سکتے تھے اور آجا سکتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا کہ شہر مکہ کے لوگ تو اسلام کے دشمن ہیں، ممکن ہے بیرونی قبائل یعنی غیر علاقوں سے آنے والے حاجی اسلام قبول

کرلیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوشش کی کہ حج کے زمانے میں باہر سے آنے والے قبائل میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ کافی جدوجہد کے بعد اس میں کچھ کامیابی ہوئی۔ ابن ہشام کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کم سے کم پندرہ قبائل میں گئے۔ ہر ایک کو مخاطب کر کے یہ کہتے رہے کہ تم اسلام قبول کرو (جس کی یہ خصوصیات ہیں) تو جلدی ہی قیصر و قصریٰ کے خزانے تمہارے قدموں پر نثار ہوجائیں گے۔ مگر کسی نے قبول نہیں کیا' سوائے آخری سولھویں گروہ کے' جس میں صرف انصار کے چھ آدمی تھے۔ وہ یہ سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ گویا آنکھوں آنکھوں میں مشورہ کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم سب اسلام قبول کرتے ہیں۔ یہ پہلی بیعت عقبہ ہے۔

۳۶۱۔ بات یہ تھی کہ شہر مدینہ میں بہت سے یہودی بستے تھے اور ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ جب کبھی عربوں اور یہودیوں کا مدینے میں جھگڑا ہوتا تھا تو یہودی ان سے کہتے تھے ذرا ٹھہر جاؤ' آج تو تم ہمیں مار رہے ہو لیکن جلد ہی آخری نبی آنے والا ہے' جب وہ آئے گا تو ہم اس کی اتباع کرکے تم کو دنیا سے نیست و نابود کر دیں گے۔' تمہارے بچے' بوڑھے' عورتیں' مرد' سب کو قتل کر دیں گے۔ ان مدینے والوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعی آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو کیوں نہ یہودیوں سے بھی پہلے اسلام قبول کرلیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں کے اشارے سے گفتگو کرتے ہیں۔ پھر سب لوگ اسلام قبول کرلیتے ہیں۔ ان کا اسلام مخلصانہ تھا چنانچہ مدینے پہنچ کر وہ سب لوگ اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں اور اس میں انھیں کامیابی بھی ہوتی ہے۔ ایک سال بعد امن کے زمانے میں' یعنی حج کے مہینے میں' مدینے سے بارہ نئے آدمی مکے آتے ہیں اور بمقام عقبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اس بیعت کے بعد ہمیں چند واقعات ایسے نظر آتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔

۳۶۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بارہ آدمیوں کو' جو بارہ مختلف قبیلوں کے نمائندے تھے' اپنی طرف سے ان قبیلوں میں نقیب یا سردار مامور کیا۔ اور انہی میں سے ایک کو نقیب النقباء۔ اس میں ایک طرف تو ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں تنظیم پسندی تھی اور مسلمانوں میں ایک مرکزی نظام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نامزد کرتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ کے ماتحت تھے جو کسی کو نامزد کرتا ہے وہ اس کو معزول بھی کرسکتا ہے۔ اس نامزدگی کے بعد وہی لوگ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کرتے ہیں کہ ہمیں ایسا معلم دیجئے جو اسلام سے ہمارے مقابلے میں زیادہ واقف ہو اور مدینے میں ہمیں دین بھی سکھائے اور تبلیغ بھی کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ کیا جو بہت ہی مخلص مسلمان تھے اور نفسیات کے بڑے ماہر تھے۔ ان میں لوگوں کو اسلام پر آمادہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ انھیں بہت ہی شاندار کامیابیاں ہوئیں۔ بیسیوں لوگ مسلمان ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ انتہائی اجڈ لوگ بھی اسلام قبول کرتے گئے۔

۳۶۳۔ اس بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک دن حضرت مصعب نے ایک باغ میں جا کر وہاں کے لونڈی غلاموں اور بچوں کے سامنے تبلیغ شروع کی۔ مالک کو یہ تماشا برا لگا۔ اس نے ایک آدمی کو بھیجا کہ اس کو ڈانٹ کر نکال دو کہ ہمارے باغ میں اس طرح بلا اجازت آکر کیوں فساد کر رہا ہے؟ وہ شخص پہلے سے مسلمان ہو چکا تھا۔ اس نے بہانہ کیا اور واپس جا کر مالک کو بتایا کہ میں نے اسے بہت ڈانٹا مگر وہ نہیں مانتا' تم خود جا کر اسے نکالو۔ اصل میں اس کا منشا یہ تھا کہ یہ مالک بھی اسلام کی باتیں سنے اور اس شخص کی زبان سے سنے' جو اپنی جادو بیانی اور طلاقت لسانی سے ہر شخص کو اسلام کا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ چنانچہ وہ سردار بڑے طنطنے سے نیزہ ہلاتا ہوا آیا اور دھمکی دی کہ نکل جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمھیں قتل کر دوں گا۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھبرانے کے بجائے مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ایک بات پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں وہ یہ کہ یہ معلوم کیے بغیر کہ میں کیا کہہ رہا تھا' تم مجھے یہاں سے کیوں نکالنا چاہتے ہو؟ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ تم پہلے سن لو کہ میں کیا کہہ رہا ہو۔ اس کے بعد تمھیں اختیار ہے' تم کہو گے تو میں چلا جاؤں گا" وہ اجڈ شخص اپنے نیزے کو زمین میں گاڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ انھوں نے حسب عادت قرآن مجید کی ایک سورۃ کی تلاوت کی۔ تلاوت شروع ہوتے ہی اس کو سکون آگیا۔ چہرے پر خشونت کی جگہ سکون اور ایک نئے شعور کی روشنی پھیل گئی۔ پھر قبل اس کے کہ سورہ کی تلاوت ختم ہوتی' وہ شخص اٹھا اور پوچھنے لگا کہ مجھے مسلمان ہونے کا طریقہ بتاؤ۔ چنانچہ وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا ہے۔ پھر اپنی عادت کے مطابق سابقہ اجڈ پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے زور سے نیزہ ہلاتے ہوئے اپنے گھر کے اندر جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آؤ' سب میرے پاس آؤ۔ چنانچہ عورتیں' بچے اور غلام سب بھاگ کر اس کے پاس آتے ہیں۔ اس نے سب سے پوچھا کہ بتاؤ میں کون ہوں؟ سب نے کہا آپ ہمارے

سردار ہیں۔ ہم سب سے زیادہ عقل مند ہیں۔ تب اس نے کہا میرا حکم ہے کہ تم سب مسلمان ہو جاؤ ورنہ تم مجھ سے زیادہ کسی کو اپنا دشمن نہ پاؤ گے۔ اس طرح پورا خاندان مسلمان ہو جاتا ہے۔ جب سردار مسلمان ہو تو ظاہر ہے کہ سردار کے ماتحت لوگوں کا مسلمان ہو جانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ہمیں اسلام پھیلنے کے یہ مختلف طریقے نظر آتے ہیں۔ یہ ان میں سے ایک تھا۔

۳۶۴ - یہ چیزیں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری زمانے تک ملتی ہیں۔ دو ایک مثالیں اور دے کر میں اس بیان کو ختم کروں گا۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں ایک اجنبی مہمان آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کھانے کو بھی دیتے ہیں اور رات گزارنے کے لیے کمرہ بھی دیتے ہیں وہ شخص بدنیتی اور دشمنی کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ علی الصباح کمرے میں بستر پر غلاظت کر کے، قبل اس کے کہ لوگ بیدار ہوں، اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ صبح کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں آئے اور غلاظت دیکھی تو اس کو اپنے دست مبارک سے دھویا، بستر کو پاک صاف کیا۔ پھر دیکھا کہ وہ شخص جاتے ہوئے اپنی تلوار وہیں بھول گیا ہے۔ کچھ دور جا کر اس اجنبی کو بھی تلوار یاد آئی اور آہستہ آہستہ واپس آیا کہ ابھی لوگ سو رہے ہوں گے۔ میں تلوار لے کر پھر واپس چلا جاؤں گا۔ مگر اس نے دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو چکے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے بستر کو صاف کر رہے ہیں بجائے اس کے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ڈانٹیں یا دھمکائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم اپنی تلوار بھول گئے تھے، یہ تلوار رکھی ہے، لے لو۔ اس سلوک کے نتیجے میں وہ بے ساختہ پکار اٹھا "اشھدان لا الہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمدا رسول اللّٰہ" ۔ ایک اور واقعہ ملتا ہے کہ ایک جنگ کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے ہیں۔ فوج کی آمد کی خبر سن کر دشمن بھاگ جاتا ہے۔ دور تو نہیں بھاگتا، کیونکہ پہاڑی علاقہ تھا۔ پہاڑ پر چڑھ کر کسی درے یا وادی میں چلا جاتا ہے۔ اس دشمن قبیلے کا سردار پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کے دور تاکتا رہتا ہے کہ یہ فوج کیا کرتی ہے۔ اس دن بارش ہوئی۔ چنانچہ بارش کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی تربتر ہو گئے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تنہا ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ اور اپنا کرتہ درخت کی شاخ سے لٹکا دیا تاکہ وہ خشک ہو جائے۔ دشمن جو اوپر سے تاک رہا تھا، دیکھتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تنہا سوئے ہوئے ہیں آتا ہے اور تلورار کھینچ کر چلا کر کہتا ہے۔ اے محمد۔ تجھے اب میرے ہاتھ سے کون بچائے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی

سکون کے ساتھ کہتے ہیں۔ اللہ ' اس جواب سے اس پر اتنا رعب ہوا کہ ہاتھ میں تھرتھری پیدا ہوگئی اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ تلوار کو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اٹھا کر کہتے ہیں۔ "اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا"؟ وہ کہتا ہے "کوئی نہیں" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اس کی تلوار واپس کرتے ہیں کہ جاؤ میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔ وہ اس مرحمت پر اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اب میں اپنے قبیلے میں اسلام کی تبلیغ کروں گا۔ اسی طرح فتح مکہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب عام معافی کا اعلان کرتے ہیں تو اس کے رد عمل کے طور پر لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے ہیں اور راتوں رات سارا مکہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ یہ تھے وہ طریقے جو تبلیغ اسلام کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائے اور نتیجہ ہمیں واضح نظر آتا ہے۔

٣٦٥ ۔ اس سے پہلے کے انبیاء کی زندگی میں ان کے ہاتھوں پر ایماں قبول کرنے والوں کی تعداد کا ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی سے مقابلہ کریں تو یہاں بھی آپ کو غیر معمولی فوقیت نظر آتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق انجیل میں جو تفصیلات ملتی ہیں' ان سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس آدمی ایمان لائے ہوں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی قوم بنی اسرائیل کے لوگ جن کی تعداد بائبل کے مطابق پانچ لاکھ تھی' ان کا ساتھ دے رہی تھی' لیکن ایک خود غرضی کے تحت تاکہ فرعون کے ظلم سے نجات پائیں۔ سچے دل سے ایمان لانے والوں کی تعداد تقریباً صفر تھی۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے نکلنے کے بعد ایک دن ان سے مخاطب ہو کر کہا خدا نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ تمھیں فلسطین کا ملک دے گا' آگے بڑھو اور اس ملک پر قبضہ کر لو۔ تو انھوں نے کہا کہ ان جباروں سے ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمھارے خدا نے وعدہ کیا ہے تو "تم اور تمھارا خدا دونوں (فلسطین پر قبضہ کرنے) جاؤ ہم تو یہیں بیٹھے رہتے ہیں" ۔ (قرآن ٥ : ٢٤) دوسرے الفاظ میں ساری قوم کافر اور نافرمان ہو جاتی ہے آپ کی بات قبول کرنے اور ایمان لانے سے انکار کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ صرف دو آدمی تھے۔ جنھوں نے ایسا نہیں کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی : ایک آپ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام اور دوسرے آپ کے خادم حضرت یوشع جو بعد میں نبی بنے۔ ان دو کے سوا سارے بنی اسرائیل میں سے کسی نے آپ کی بات نہیں مانی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ (١٢) بہت ہی مخلص حواری تھے۔ ان میں

سے سینٹ پیٹر کا آپ نے نام سنا ہوگا جن کی قبر (ویٹی کان) اٹلی میں ہے۔ ان کے متعلق انجیل ہی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے "جا او شیطان" یہ ان کی کسی حرکت یا طرز عمل کی بنا پر کہا ہوگا۔ تفصیلات مجھے معلوم نہیں۔ ایک اور حواری یہودا تھا جس کے متعلق تو صراحت ملتی ہے کہ اس نے ارتداد اختیار کیا۔ پولیس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ضرورت تھی اور وہ انھیں تلاش کر رہی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غائب ہو گئے تھے۔ تو اس ساتھی نے جو مرتد ہو گیا تھا' پولیس کی مخبری کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرا دیا۔ اس کے برخلاف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ صحیح اعداد و شمار تو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ لیکن ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے ان کی تعداد کا ایک حد تک تخمینہ لگایا جاسکتا ہے۔ حجتہ الوداع کے متعلق جو وفات سے تین مہینے پہلے کا واقعہ ہے' ہمارے مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس وقت میدان عرفات میں ایک لاکھ چالیس ہزار (۱٬۴۰٬۰۰۰) آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اسلام میں حج کوئی ایسا فریضہ نہیں کہ ہر شخص کو ہر سال ادا کرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ جتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے' سب کے سب وہاں اس سال حج کے لیے نہیں آئے ہوں گے۔ کچھ لوگ گھروں میں رہے' کچھ لوگ آئے۔ اگر بالفرض ہر پانچ میں سے ایک شخص آیا ہو تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ سب مسلمانوں کی تعداد کم و بیش پانچ چھ لاکھ ہوگی۔ کہاں تیس چالیس آدمی' کہاں لاکھوں کی تعداد۔ ہمیں اسلام کی تاریخ میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد شاذو نادر ہی کسی نے ارتداد کیا ہو' عہد نبوی میں ارتداد کی ایک آدھ مثال ہمیں نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ مسلمان ہونے کے بعد مرتد نہیں ہوئے بلکہ وہ منافق تھے۔ منافقانہ طور پر اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اسلام کو اندر سے نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ لیکن جب ان کی چلی نہیں تو بھاگ نکلے اور پھر اپنے کفر کا کھلم کھلا اعلان کیا۔ غرض یہ چند خاص باتیں ہیں جو تبلیغ کے سلسلے میں ہمیں نظر آتی ہیں۔

۳۶۶ ۔ اب ایک سوال یہ ہے غیر مسلموں کے متعلق اسلام کا برتاؤ کیا ہے مختصراً بیان کرتا ہوں۔ اس آیت سے آپ میں سے ہر شخص واقف ہوگا "لا اکراہ فی الدین" (۲ : ۲۵۶) "ان علیک الا البلاغ" (۴۲ : ۴۸) یعنی اسلام قبول کرنے کے لیے جبر کرنے کی کوئی اجازت نہیں۔ پیغمبر کا فریضہ صرف ابلاغ و تبلیغ ہے' اس کے بعد نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے بارے میں حتمی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی کو جبر کے ساتھ کبھی مسلمان

نہیں بنایا گیا۔ غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے؟ قرآن میں یہ عجیب و غریب اصول ملتا ہے کہ ہر مذہبی کمیونٹی کو کامل داخلی خود مختاری دی جائے حتی کہ نہ صرف عقائد کی آزادی ہو اور اپنی عبادات وہ اپنی طرز پر کر سکیں بلکہ اپنے ہی قانون' اپنے ہی ججوں کے ذریعے سے اپنے مقدمات کا فیصلہ بھی کرائیں۔ کامل داخلی خود مختاری کا قرآن کی کئی آیتوں میں ذکر ہے۔ جن میں سے ایک آیت بہت ہی واضح ہے۔ "ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ" (۵ : ۴۷) یعنی انجیل والوں کو چاہیے کہ اس چیز کے مطابق احکام دیا کریں جو اللہ نے انجیل میں نازل کی ہے۔ ان احکام کے تحت عہد نبوی ہی میں قومی خود مختاری ساری آبادی کے ہر ہر گروہ کو مل گئی تھی۔ جس طرح مسلمان اپنے دین' عبادات' قانونی معاملات اور دیگر امور میں مکمل طور پر آزاد تھے' اسی طرح دوسری ملت کے لوگوں کو بھی کامل آزادی تھی۔

۳۶۷۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایک نیا واقعہ پیش آتا ہے۔ مسلمانوں پر جنگ فرض کی جاتی ہے اور غیر مسلم رعایا کو اس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر مسلمان دین کی خاطر جنگ کریں تو غیر مسلموں کو اسلام کی خاطر جنگ کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ مسلمان جنگ کر کے اسلامی مملکت' ریاست اور اس کی حدود کی حفاظت کرتا ہے' جس کے باعث وہاں رہنے والی غیر مسلم رعایا امن و امان سے متمتع ہوتی ہے جب کہ مسلمان اپنے ملک کی حفاظت کے لیے سر کٹاتے ہیں۔ لہٰذا فوجی ضروریات کے تحت غیر مسلم رعایا پر ایک ٹیکس عاید کیا جاتا ہے' جو جزیہ کہلاتا ہے۔ یہ جزیہ اسلام کی ایجاد نہیں ہے۔ اسلام سے پہلے ایران وغیرہ میں بھی جو لوگ فوجی خدمت انجام نہیں دیتے تھے' ان کو ایک ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ یہ چیز اسلام میں بھی آئی۔ غیر مسلم رعایا بہت ہی خفیف ٹیکس دے کر' جو سال میں دس دن کی غذا کے مترادف تھا' اسلامی سلطنت کی پوری حفاظتی قوتوں اور پولیس وغیرہ کی خدمات سے مستفید ہوتے رہتے اور جس وقت مسلمان اپنا سر کٹاتے یہ اپنی تجارت اور کاروبار میں لگے ہوئے دولت کماتے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز غیر مسلموں کے متعلق ہمیں نظر آتی ہے کہ محض دین کی بنا پر ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۲ ہجری میں جب غزوہ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو مکے والوں نے ایک وفد دوبارہ حبشہ بھیجا اور چاہا کہ وہاں جو مسلمان مہاجرین مقیم ہیں ان کو نئے نجاشی سے کسی طرح واپس حاصل کر لیں اور ان کو تکالیف دیں جب اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو مؤرخوں نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ

الضمری کو اپنا سفیر بنا کر نجاشی کے پاس بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کی سفارش کرے اور ان کی حفاظت کے لیے حکمران کو آمادہ کرے۔ حالانکہ عمرو بن امیہ الضمری اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ہمیں اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسائے میں یہودی رہتے تھے' اگر ان کے یہاں کوئی بچہ بھی بیمار ہوتا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بچے کی عیادت کے لیے اس کے گھر جایا کرتے۔ بنی عریض نامی ایک یہودی قبیلہ مدینے میں رہتا تھا۔ اس کی کسی بات سے خوش ہو کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے کچھ سالانہ معاش مقرر فرمائی۔ یہ مختلف چیزیں ہیں جو غیر مسلموں سے برتاؤ کے سلسلے میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ ایک اور چیز کہ مسلمان کا ہی نہیں یہودیوں کا جنازہ بھی شہر کی گلیوں سے گزرتا اور اتفاق سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کسی جگہ بیٹھے ہوتے تو جنازے کو دیکھ کر آپ کھڑے ہو جاتے تاکہ ان کے ساتھ ایک طرح سے اپنی ہمدردی کا مظاہرہ کریں۔ غرض مسلمانوں کا طرز عمل غیر مسلم رعایا کے ساتھ اس قدر رواداری کا تھا کہ اس کی نظیر ہمیں تاریخ عالم میں کم ملتی ہے۔ اس کا جو نتیجہ نکلا' اس کی طرف اشارہ کرکے میں اسے ختم کرتا ہوں: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں خانہ جنگی ہوئی۔ پھر اس کے بعد بارہا خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ کسی بھی مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کے زمانے میں غیر مسلم رعایا نے کبھی بغاوت نہیں کی۔ وہ نہ اس فریق کا ساتھ دیتے' نہ اس فریق کا ساتھ دیتے' موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمان حکومت سے غداری یا بغاوت کا خیال انھیں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب قیصر روم نے پیام بھیجے اور اسلامی ممالک کی عیسائی رعایا سے کہا کہ موقع ہے کہ تم بغاوت کرو۔ میں بھی اس وقت مسلمانوں پر حملہ کروں گا' اور ان مشترکہ دشمنوں سے ہم نجات پائیں گے' اس ابتدائی زمانے سے لے کر کروسیڈز (صلیبی جنگوں) تک جب کبھی ایسے مطالبے کسی پوپ نے یا کسی عیسائی حکمران نے کیے' تو مسلمانوں کی عیسائی رعایا کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہم ان کافر حکمرانوں (مسلمانوں) کو تم جیسے ہم مذہب حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کبھی غیر مسلموں پر اسلام لانے کے لیے جبر نہیں کرتے تھے اور ان کو مذہبی و قومی معاملات میں پوری آزادی و خود مختاری دیتے تھے' حتیٰ کہ ان کے مذہبی اداروں کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کی ایک معتبر شہادت موجود ہے جس کی اصل

دستاویز بھی آج تک محفوظ ہے۔ ایک عیسائی اپنے بعض ہم مذہبوں کو جو دوسرے شہر کے تھے یہ خوش خبری پہنچاتا ہے کہ آج کل ایک نئی قوم ہماری حاکم بن گئی ہے۔ لیکن وہ ہم پر ظلم نہیں کرتی' اس کے برخلاف وہ ہمارے گرجاؤں اور ہمارے راہب خانوں Convents کی مالی مدد کرتی ہے۔ السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔

سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم و رحمتہ و برکاتہ!

۳۶۸ ۔ سوالات جو آج کے اجتماع کے دوران کیے گئے ہیں' ان کے متعلق میں کچھ مختصراً عرض کروں گا۔ امید ہے آپ میری تقریروں اور کوتاہیوں کو جو جوابات کے متعلق اور اپنی ساری گزشتہ تقریروں کے متعلق مجھ سے ہوئی ہیں' معاف فرمائیں گے۔ کیونکہ انسان معصومیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اگر مجھ میں کوئی قابلیت کوئی خصوصیت ہے تو وہ یہی ہے کہ میں اپنی تقصیر کو ماننے کے لیے ہمیشہ آمادہ ہوں۔

۳۶۹ سوال ۱ : آپ کے بیان کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کا تناسب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں سے کافی زیادہ تھا۔ کیا وجہ ہے کہ موجودہ دور میں وہ تناسب نہیں ہے؟

جواب : اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک جواب قدرت کے متعلق ہے۔ اور دوسرا جواب خود آپ کے ہمارے متعلق ہے۔ قدرت کے متعلق میں اس لیے کہتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا میں تشریف آوری تک چھ سو سال کا وقفہ ہے لہٰذا عیسائیوں کو ہم پر چھ سو سال کی سبقت حاصل ہے۔ انشاء اللہ آئندہ چھ سو سال کے بعد ہماری حالت وہ نہیں رہے گی جو آج ہے۔ یہ قدرتی صورت حال ہے۔ جو اس کی توجیہ کے لیے پیش کی جاتی ہیں یوں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت دنیا میں عیسائیوں کا جو تناسب تھا وہ بہرحال اب باقی نہیں ہے ان عیسائیوں میں سے کروڑوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ لیکن گستاخی معاف ہو' اگر میں یہ کہوں کہ ان سے زیادہ یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ کیا ہم اپنے اطراف نہیں دیکھتے کہ عیسائی مشنری کس تندھی' کس

جوش و خروش اور کس خلوص کے ساتھ اپنا دین پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ دنیا کے ہر خطے میں جاتے ہیں۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی کی سردیوں میں بھی اکڑتے' اور خط استوا کی گرمیوں میں بھی جھلستے ہیں اور اپنا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے سبق آموز چیز ہے۔ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں' ہم اس کا عشر عشیر بھی نہیں کرتے۔ پھر ہم اس بات کی کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ ہماری تعداد عیسائیوں کی تعداد سے زیادہ ہو۔ اس کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیان درست نہیں ہے کہ موجودہ دور میں عیسائیوں کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ خود یورپ اور امریکہ میں اب اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔

۳۷۰ سوال ۲ : اگر خلیفہ وقت یا اقتدار اعلی قتل یا طبعی موت سے فارغ عہدہ نہ ہوں تو کیا کوئی ایسا اسلامی طریقہ ہے جس سے انھیں علیحدہ کیا جانا ممکن ہو۔ براہ کرم کسی مثال یا نظیر Precedence سے مطلع فرمائیں۔

جواب : میرا پہلا جواب یہ ہے کہ آپ کو ایسی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد' یکجہتی اور تعاون ہو' یہ نہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ خانہ جنگی میں مبتلا ہو کر اپنے دشمنوں کو موقع دیں کہ ہم پر حاوی ہو جائیں۔ دوسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ مسلمان فقہاء کے بیان کے مطابق حکمران یا خلیفہ کی حیثیت ایک وکیل کی ہے اور مؤکل جو کسی شخص کو اپنا وکیل بناتا ہے اس بات کا ہمیشہ حق رکھتا ہے کہ اپنے وکیل کو معزول کرے۔ جو لوگ کسی کو حکمران بنائیں گے انہی کو یہ حق بھی ہوگا کہ اس کو اس کی خدمت سے الگ کریں۔

۳۷۱ سوال ۳ : آپ نے کل' ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ استاد کے لیے شاگرد کا دیا ہوا ہدیہ لینا مناسب نہیں۔ ہمارے علماء تقریریں کرنے کا معاوضہ لیتے ہیں۔ اس کے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب : مجھے معلوم نہیں کہ ایسا ہوتا ہے لیکن میں عرض کروں گا کہ ہر شخص کی ضرورتیں ہوتی ہیں' اس لیے کوئی عام حکم نہیں دیا جاسکتا۔ ایک مثال دیتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خدمت پر مامور کیا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے وہ زکوٰۃ وغیرہ کی تحصیل کا کام تھا۔ یہ کام انجام دینے کے بعد جب وہ واپس آئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تنخواہ کے طور پر کچھ رقم عطا کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ادب کے ساتھ اس کو لینے سے انکار کیا اور کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اس مال کی

ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ کام اللہ کے لیے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ یہ رقم دوسری ضرورت کے لیے صرف فرما سکتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں تمھیں لے لینا چاہیے۔ لینے کے بعد چاہے کسی کار خیر میں لگا دو' لیکن لینا چاہیے۔ یہ بخاری کی بیان کردہ حدیث ہے۔ منشاء اس سے یہ ہے کہ کچھ تو حکومت کے فرائض ہیں جن کے لیے کسی شخص کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف جس شخص سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے اپنے مسائل اور اپنی ضرورتیں ہوں گی۔ ان تمام چیزوں کا ہمیں لحاظ رکھنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں' اس قدر جواب آپ کے لیے کافی ہوگا۔ پھر آپ اس کے لیے خود فیصلہ فرما سکتے ہیں۔

۳۷۲ سوال ۴ : یہ بتایا گیا ہے کہ مسند احمد ابن حنبل میں ایک حدیث ہے۔ جس میں کم و بیش یہ الفاظ ہیں کہ خدا نے مجھ کو معارف اور مزامیر کے نابود کرنے کے لیے بھیجا ہے۔

جواب : اگر یہ حدیث صحیح ہے تو ظاہر ہے میرے لیے یا کسی مسلمان کے لیے سوائے سر تسلیم خم کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اس کے باوجود دو چیزیں قابل ذکر ہیں۔ ایک چیز علمی ہے جس کے بیان کرنے کے لیے وقت چاہیے اور دوسری چیز وہ فوری رد عمل ہے جو اس حدیث کے پڑھنے سے ذہنوں میں آتا ہے لیکن میں سب سے پہلے ایک اصولی بات کی طرف اشارہ کروں گا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ ستار کے تاروں کو توڑنے کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے لیکن اب تک صحیح حوالے کے ساتھ کوئی حدیث بیان نہیں کی گئی۔ حدیث کی کتابوں میں روایت کے ساتھ ساتھ اس کے مصادر بیان کیے جاتے ہیں کہ فلاں نے فلاں سے' فلاں نے فلاں سے' اس کی روایت کی ہے۔ جس طرح ہم حدیث پر عمل کرنے کے پابند ہیں' چونکہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے' اسی طرح اس بارے میں اولاً یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا یہ روایت صحیح بھی ہے یا نہیں چنانچہ ان راویوں کی سوانح دیکھنی ہوں گی اور یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ان راویوں کے متعلق ہمارے علمائے سلف نے کیا رائے قائم کی ہے۔ اس تحقیق کے ختم ہونے تک' جس کا مجھے یہاں وقت نہیں مل سکتا۔ کوئی رائے اس مسئلے کے متعلق قائم نہیں کی جاسکتی۔ بہرحال حدیث کے تمام الفاظ پر دوبارہ غور کیجیے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ بتوں کی پوجا اور پرستش کے لیے جو گانا بجانا ہوتا ہے' میں اس کو محو کرنے کے لیے آیا ہوں۔ یہاں گانے بجانے کا ذکر بتوں کی پرستش کے سلسلے میں آیا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے۔ بتوں کے حوالے کو نظرانداز کر کے کوئی نتیجہ اخذ کرنا

مناسب نہ ہوگا۔

۳۷۳ سوال ۵ : حضرت ام ورقہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر کی عورتوں کا امام بنایا تھا۔ کیا عورت صرف عورتوں کی امامت کر سکتی ہے۔ مردوں کی نہیں؟

جواب : میں اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ صرف عورتوں کے لیے امام بنایا گیا تھا۔ حدیث میں یہ الفاظ ہیں "اہل خاندان کے لیے" "اہل" کے معنی صرف عورتوں کے نہیں ہوتے پھر اس حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے کہ ان کا ایک موذن تھا جو ایک مرد تھا اور مزید تفصیلات بھی ملتی ہیں کہ ان کے غلام بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ غلام ان کی امامت میں ہی نماز پڑھتے ہوں گے۔ غرض یہ کہ امامت صرف عورتوں کے لیے نہیں تھی بلکہ مردوں کے لیے بھی تھی۔

۳۷۴ سوال ۶ : رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طائف میں تقریباً ڈیڑھ ماہ رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کس کے ہاں قیام کیا؟

جواب : مجھے اس کا علم نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مشکل سے ایک دن وہاں رہے۔ ڈیڑھ مہینے کی روایت میں نے نہیں پڑھی۔ ممکن ہے صحیح ہو مگر قرین قیاس نہیں۔

۳۷۵ سوال ۷ : غائبانہ نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ روایت میں آیا ہے کہ نجاشی کی وفات کے وقت تمام پردے ہٹا دیے گئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ذرا وضاحت فرمائیں؟

جواب : جہاں تک بخاری کی روایت کا تعلق ہے جو حدیث کی مستند کتاب ہے اس میں اس جزو کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ "تمام پردے ہٹا دیے گئے۔" اگر کسی روایت میں ہو تو میں نے کبھی نہیں پڑھی۔ بہرحال ایک واقعہ بہ صراحت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی وفات کے بعد جو کسی اور ملک میں ہوئی تھی مدینہ منورہ میں نماز جنازہ پڑھائی اور اب چودہ سو سال سے مسلمان ایسا ہی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ ہم اپنے کسی مسلمان بھائی یا بہن کی مغفرت کے لیے ایک سے زیادہ وقت میں یا ایک سے زیادہ مقام پر نماز جنازہ ادا کریں۔

۳۷۶ سوال ۸ : حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی غیر مسلم کو مسلمان کرتے وقت کیا پڑھاتے تھے؟

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ ایک ہی کلمہ ہوتا تھا "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ممکن ہے کچھ اور تفصیلات ہوتی ہوں مثلاً اس سے پوچھا جاتا ہو کہ تم نماز پڑھو گے؟ کیا تم روزہ رکھو گے؟ کیا تم اسلام کے احکام پر عمل کرو گے؟ تاکہ آدمی سوچ سمجھ کر اسلام لائے' یہ نہیں کہ بعد میں واقفیت پر رائے بدل دے اس طرح کی جو چیزیں ہوسکتی ہیں وہ مختلف افراد کے لحاظ سے مختلف بھی ہوسکتی ہیں لیکن کئی بار اس کا ذکر آیا ہے کہ صرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا گیا اور قصہ ختم ہوگیا۔

۳۷۷ سوال ۹ : کیا مسلمان عالم کو ایک مرکز پر مجتمع کرنے کے لیے اسلامی مملکت کا دوبارہ قائم کرنا ضروری نہیں ہے۔ اگر ہے تو اس کے کیا امکانات ہیں اور ایسا کرنے کے لیے کیا اقدامات ضروری ہیں؟

جواب : اس کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ سوائے اس کے کہ میری بھی تمنا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ اگر میں کسی ملک کا حکمران ہوتا تو اس کے لیے آمادہ رہتا کہ کسی اور بہتر شخص کے لیے اپنی جگہ خالی کر دوں کہ تم ان دونوں ملکوں کے بادشاہ ہو جاؤ لیکن ایسا نہیں ہے' اس لیے کہہ نہیں سکتا کہ کیا کرنا چاہیے۔ یہ کام حکمرانوں کے کرنے کا ہے۔

۳۷۸ سوال ۱۰ : آج کل کے حالات میں تبلیغ کی ضرورت غیر مسلموں سے زیادہ مسلمانوں میں کرنے کی ہے۔ اپنے تجربات کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب : مجھے اس سے اتفاق ہے بھی اور نہیں بھی۔ اتفاق اس معنی میں ہے کہ اگر مسلمانوں کا کردار اچھا ہو اس کردار کا اثر دیکھنے والے غیر مسلموں پر پڑتا ہے لیکن اختلاف بھی ہے اور وہ اس معنی میں کہ اگر ہم انتظار کریں کہ سارے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں' اس کے بعد ہم تبلیغ کریں تو یہ قیامت تک نہیں ہوسکتا۔ ضرورت ہے کہ دونوں کام بیک وقت جاری رہیں۔ ہم مسلمانوں کو مسلمان بنانے کے لیے بھی کام کریں اور غیر مسلموں تک اسلام پہنچانے کی بھی کوشش کریں۔

۳۷۹ سوال ۱۱ : غیر مسلموں کے ساتھ مثالی رواداری کے باوجود مرتد کو واجب القتل کیوں قرار دیا گیا ہے؟ "لا اکراہ فی الدین" (۲ : ۲۵۶) کے باوجود ایسا حکم دینے کا کیا جواز ہے؟

جواب : اس بارے میں میرا شخصی ردعمل یہ ہے کہ مرتد کو سزائے موت دینے کے سلسلے میں نہیں دی جاتی بلکہ اسے ایک سیاسی غداری کی سزا دی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت غداری کرنے

والے کو معاف نہیں کرتی۔ اسلام میں چونکہ سیاست اور دین میں کوئی دوئی نہیں۔ اس لیے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض دین سے انحراف کی سزا ہے۔ ہم کسی کو اسلام میں داخل ہونے اور اسلامی امت کا رکن بننے کے لیے جبر نہیں کرتے لیکن جب وہ مسلمان ہونے کے بعد اس اجتماعی نظام سے بغاوت کرتا ہے تو اس کو دنیا کے عام سیاسی قواعد اور سیاسی ضرورتوں کے تحت غداری کی سزا بھی دی جائے گی۔

۳۸۰ سوال ۱۲ : غیر ممالک خاص طور پر یورپ اور امریکہ میں تبلیغی جماعت کی تبلیغ کے کیا نتائج مرتب ہوئے ہیں؟ کیا اس جماعت کی کارکردگی کافی موثر ثابت ہو رہی ہے۔ اگر نہیں ہے تو کیوں؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب : مجھے اور ممالک کا علم نہیں لیکن شہر پیرس کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ گزشتہ بیس سال سے یہ جماعتیں وہاں آنے لگی ہیں اور میں نے اس کے اچھے نتائج دیکھے ہیں۔ اب سے بیس سال پہلے پیرس شہر کے مسلمانوں میں اگر نماز پڑھنے والوں کی تعداد ہزار میں سے ایک تھی تو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ کچھ نہیں تو سو میں سے پچاس ہوگئی ہے۔ یعنی پچاس فیصد لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں۔ یہ تبلیغی جماعت کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ۱۹۲۴ء سے پیرس میں ایک بہت عظیم الشان مسجد ہے لیکن اب گزشتہ بارہ سال سے یہ مسجد ناکافی ثابت ہو رہی ہے چنانچہ شہر میں روز بروز نئی مسجدیں بننے لگی ہیں یا کوئی عمارت کرائے پر لے کر اس سے مسجد کا کام لیا جاتا ہے یا خود عیسائیوں کی طرف سے فروخت کئے جانے والے گرجاؤں کو خرید کر مسجدوں میں بدلا جا رہا ہے' نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت میرے علم میں شہر پیرس اور اس کے مضافات میں اسی (۸۰) سے زائد مسجدیں ہیں۔

۳۸۱ سوال ۱۳ : سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی صاجزادی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام کیوں نہیں لیا جاتا۔ جب کہ ان کے ہم عمر یا ان سے بھی کم عمر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام لیا جاتا ہے؟

جواب : میرا منشاء یہ نہیں تھا کہ سارے ابتدائی مسلمانوں کا نام بیان کروں۔ اس لیے میں نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ صرف چند نام گنائے جن سے لوگ واقف ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ بعثت کے وقت بی بی ابھی والدین کے گھر ہی میں تھیں کہ فوراً مسلمان بنیں' یا شادی ہوکر شوہر کے پاس جاچکی تھیں۔ صرف یہ ذکر آتا ہے کہ وہ شوہر کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ مدینہ ہجرت کر گئیں اور بعد میں شوہر مسلمان ہوئے تو نکاح سابق ہی پر وہ شوہر کے گھر چلی گئیں۔ نکاح کب ہوا تھا معلوم نہیں۔

۳۸۲ سوال ۱۴ : جب کہ قرآن پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی برات بیان فرمائی اور مسلمانوں کو ان کے حواریوں کی اتباع کا حکم دیا ہے تو پھر بھی حوار یین یعنی صحابہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیوں مطعون کیا جاتا ہے؟

جواب : آیت یہ ہے کہ "یا ایھا الذین آمنوا کونوا انصار اللّٰہ کما قال عیسی بن مریم للحواریین من انصاری الی اللّٰہ قال الحواریون نحن انصار اللّٰہ" (۶۱ : ۱۴) میں نے اپنی طرف سے مطعون نہیں کیا بلکہ میں نے انجیل کے حوالے سے بیان کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک حواری سینٹ پیٹر کو ان الفاظ میں جھڑکا تھا۔ "جا او شیطان۔" اس سے زیادہ میرا کوئی مقصد نہیں تھا۔ یہ روایت صحیح ہے یا نہیں' اس کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ یہی حال یہودا اسخریوطا حواری کا ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروایا تھا۔

۳۸۳ سوال ۱۵ : آپ نے تقریر کی ابتداء میں ورقہ بن نوفل کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ اس واقعے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے رسول ہونے کا علم نہیں تھا۔ جب کہ ورقہ بن نوفل یہ جانتا تھا۔ کیا اس بیان سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سبکی نہیں ہوتی۔ کیا نبی' وقت کا سب سے بڑا عالم' وقت کی سب سے بڑی کامل و جامع شخصیت تسلیم نہیں ہوتا۔ کیا وہ کسی فرد سے کم تر ہو کر نبی ہو سکتا ہے؟

جواب : جو مفہوم میں آپ کا سمجھ سکا ہوں اس کا جواب عرض کرتا ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب پہلی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر یہ کہتی ہے کہ میں جبرئیل ہوں اور خدا نے مجھے بھیجا ہے اور آپ کو اللہ نے اس امت کا نبی بنایا ہے۔ اس واقعے کی تفصیل آپ ابن ہشام میں پڑھیں۔ اس میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ خواب میں پیش آیا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ تذبذب تھا اور وہ تذبذب کچھ عرصے بعد ختم ہو جاتا ہے' جب یہ بات مکرر ہوتی ہے اور جبرئیل دوبارہ آپ کی بیداری میں آتے ہیں تو اس طرح توثیق Confirmation ہو جاتی ہے لیکن پہلی وحی اور دوسری وحی میں تین سال کا طویل وقفہ ہے۔ اس عرصے میں فطرت انسانی کے تقاضے سے شروع شروع میں کچھ خوف کا احساس ہوا۔ پھر جب خوف دور ہوتا ہے تو یہ آرزو پیدا ہوئی

کہ کاش ! اس تجربے کا دوبارہ اعادہ ہو۔ پھر اس کے بعد شوق انتظار ایک خلش کا روپ اختیار کرتا ہے اور بالآخر یہ کیفیت پیش آتی ہے کہ آدمی مایوس ہو کر سمجھے کہ شاید گزشتہ واقعہ محض ایک وہم تھا چنانچہ ہماری کتابوں میں یہی روداد ملتی ہے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت ہے کہ شدید مایوسی کے عالم میں ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خودکشی کی کوشش فرمائی۔ قصہ یہ ہے کہ ایک دن آپ کی چچی' ابولہب کی بیوی نے طعنہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے تیرا وہ شیطان تجھ سے خفا ہو کر تجھے چھوڑ چکا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر و انتظار کے پیمانے میں یہ آخری قطرہ گرا تو وہ چھلک پڑا۔ اس وقت آپ انتہائی جوش کی حالت میں شہر سے نکلتے ہیں' ایک پہاڑی کی چوٹی پر چڑھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چھلانگ لگا کر خودکشی کرلیں۔ اس وقت جبرئیل علیہ السلام آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (قرآن ۹۳ : ۳) نہیں' اللہ نے آپ کو چھوڑا نہیں ہے۔ آپ برحق نبی ہیں۔ پھر اس کے بعد آپ کو سکون ہو جاتا ہے اور وحی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ فرشتہ نہ سمجھئے۔ وہ ایک بشر تھے۔ قرآن مجید بار بار کہتا ہے "انما انا بشر مثلکم (۱۸ : ۱۰) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ردعمل بشری تقاضوں کے مطابق ہے۔ اگر ابتداء میں شبہ پیدا ہوا' تو وہ انکار کے باعث نہیں تھا بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تقاضائے بشری کے باعث تھا' پھر جو کاہن اور جادوگر تھے۔ ان کے حالات سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم واقف تھے۔ یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ ہمیں کسی غیبی شخصیت نے آکر فلاں فلاں چیزیں بتائیں تو اس بنا پر شبہ پیدا ہونا ایک لازمی اور طبعی بات تھی اور اس کا منشاء صرف اس قدر تھا کہ مجھے شیطان نہ بہکائے۔ اس سے زیادہ کوئی اور بات نہیں تھی۔

۳۸۴ سوال ۱۶ : حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل خانہ نے شعب ابی طالب میں پناہ لی۔ کیا شعب ابی طالب میں پناہ لینے والے سارے مسلمان تھے۔ یا ان میں غیر مسلم بھی شامل تھے؟ اگر ابوطالب نے کچھ عرصہ شعب میں پناہ لیے رکھی' بھوک وغیرہ برداشت کی تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تفصیلات آپ کو آسانی کے ساتھ سیرت کی ہر کتاب میں مل سکتی ہیں۔ مکہ والوں نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ خاندان بنی ہاشم کا بائیکاٹ کیا جائے لہٰذا مسلم و غیر مسلم جتنے افراد تھے سب پر اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ ہماری کتابوں میں مثلاً بلاذری کی کتاب میں صراحت ہے کہ اور غیر مسلموں نے خاندان کا ساتھ دینے Solidarity کی خاطر ساتھ دیا لیکن ابولہب نے

خاندان کو اور شعب ابی طالب کو چھوڑ کر شہر میں آکر مشرکوں سے کہا کہ میں خود کو مستثنیٰ کرتا ہوں اور تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔ میں بتوں کی حمایت کروں گا۔ ان حالات میں دونوں مسلم اور غیر مسلم وہاں تھے۔ غیر مسلموں نے خاندانی حمیت کی خاطر ساتھ دیا اور مسلمانوں نے مجبوری کے تحت ایسا کیا تھا۔ رہا بھوک پیاس کا برداشت کرنا' اگر ہم قبول کرتے ہیں کہ خاندان کے ساتھ ہم اپنا تعلق برقرار رکھیں گے تو اس کے نتائج کو برداشت کرنا ہوگا چنانچہ انھوں نے برداشت کیا۔ کچھ لوگ اس بھوک اور پیاس کی تکلیف اٹھا کر بیمار بھی ہوتے رہے۔ کچھ لوگ جاں بحق بھی ہوئے لیکن بہرحال انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ چھوڑا۔

۳۸۵ سوال ۱۷ : مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تو پیغمبر تھے اور مدینے میں بادشاہ بن گئے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب : میری اس بارے میں رائے یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے میں نبی تھے۔ اس سے دشمن کو بھی انکار نہیں۔ مدینے میں صرف بادشاہ تھے۔ اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ مدینے میں آپ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی پرانے فرائض میں اب اضافہ ہوگیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اگر نبی کے فرائض یہ ہیں کہ دین کی تبلیغ کرے۔ عبادات کے طریقے بتائے۔ عقائد کی اصلاح کرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے لے کر وفات تک مکے اور مدینے دونوں جگہ یہی فرائض انجام دیتے رہے۔ شکریہ۔ السلام علیکم و رحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

مختصر کتابیات

زبانی لکچروں میں بیانات کے ماخذ نہیں دیے جاسکتے۔ میری اپنی ذیل کی نشریات میں اکثر چیزوں کا مکمل حوالہ مل جائے گا:

اردو:

-- عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی طبع ثالث کراچی ۱۹۸۱ء
-- رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، طبع جدید کراچی، ۱۹۸۰ء
-- رسول اکرمؐ کے میدان جنگ، طبع حیدر آباد دکن (نیز انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی ایڈیشن) انگریزی ایڈیشن تازہ تر ہے۔
-- صحیفہ ہمام بن منبہ (حدیث کا قدیم ترین مجموعہ اور تاریخ تدوین حدیث) طبع حیدر آباد دکن (نیز عربی، انگریزی، فرانسیسی، اور ترکی ایڈیشن، انگریزی تازہ تر ہے)۔
-- امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی، طبع سادس، کراچی ۱۹۸۳ء۔
-- عہد نبویؐ کے واقعات کے لیے تقویمی پیچیدگیاں، اورنٹیل کالج میگزین، لاہور، اگست ۱۹۶۴ء
-- قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں، طبع حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء
-- قانون بین الممالک کی تازہ ترقیاں، (مجلہ طیلسانین حیدر آباد دکن ۱۹۴۱ء
-- اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ ہائے بدر، بعثت، ثقیف، حدیبیہ، حلف الفضول، حنین، خط، خندق، خیبر۔
-- روزہ کیوں؟ طبع حیدر آباد دکن ۱۹۶۹ء (نیز انگریزی، فرانسیسی اور ترکی ایڈیشن، فرانسیسی تازہ تر ہے)۔
-- محمد رسول اللہ (نذیر حق کا انگریزی سے ترجمہ جس کی صحت کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ اصل انگریزی، مطبوعہ حیدر آباد دکن، یا ترکی ایڈیشن بہتر ہے۔)

عربی:

-- الوثائق السیاسیة للعهد النبویؐ والخلافة الراشدة، نظرثانی شدہ طبع خامس ۱۹۸۵ء میں بیروت میں مطبع میں تھا۔ (ناقص اردو ایڈیشن بھی ہے، فرانسیسی ایڈیشن ۱۹۳۵ء کا ہونے سے بہت نامکمل ہے)۔

-- هل للقانون الرومی تاثیر علی الفقہ الاسلامی؟ بیروت ۱۹۷۳ء (حمید اللہ' تالینر' بوسکے' فٹنز جیرالڈ اور معروف الدوالیبی کے انگریزی' اطالوی' فرانسیسی اور انگریزی مقالوں کے ترجمے عربی میں اور معروف الدوالیبی کا اصل عربی میں سوائے آخر الذکر کے باقی سب کے اردو ترجمے رسالہ معارف: اعظم گڑھ میں چھپے ہیں)۔

-- التاریخ المقارن للقرآن الکریم والصحف السماویۃ الاخری' مجلۃ الامۃ' قطر ۱۹۸۲ء

-- الحجر الاسود یمین اللہ فی الارض' مجلۃ الفکر الاسلامی' بیروت' اکتوبر ۱۹۷۲ء صفحہ ۹۹ -۱۰۱-

-- فتح الاندلسی فی خلافۃ سیدنا عثمان' اسلام تدقیقلری انیس تی تو سو درگیسی' جامع ے استانبول' ج ۷' ۱۹۷۸ء

-- المصادر الاسلامیۃ لداروین فی نظریۃ عن اصل الانواع' مجلۃ الدراسات الاسلامیۃ' اسلام آباد ج ۱۶' ۱۹۸۱ء

-- الاجتہاد فی عصر الصحابۃ ایضاً" ۱۹۸۴ء

-- تدوین القرآن و تراجمہ (ایضاً ۱۹۸۵)۔

-- اقدم آثار تدوین الحدیث کتابتہ (ایضاً" ۱۹۸۵ء

French

- *Le Prophète de l'Islam, sa vie et son oeuvre*, Paris, 2 vols., 4th ed. 1979 Also Turkish and Yougoslave ed.

- *La Diplomatie musulamne a l'époque du Prophète et des Khalifes Orthodoxes*, 2 vols., Paris 1935.

- *Six originaux des letters diplomatiques du Prophète de l'Islam*, Paris, 1986

Le Saint Coran, (see particularly the introduciton), 13th ed. 1985.

- 'La psychologie des grands ennemis du Prophète", *Revue des Études Islamiques*, Paris, 1965.

- 'La philosophie juridique chez les Musulmans", in *Annales de la Faculté de droit*, Istanbul, N. 29-32, 1968.

- 'Le chef de l'etat musulman a l'époque du Prophete et ses califes", in *Monocratie*, Societe Jean Bodin, Bruxelles 1970.
- 'Le premier empire musulman du temps du Prophete et des ses trois successeurs", in *Grands Empires*, Société Jean Bodin, Bruxelles, 1973.
- 'Sur la trace du Saint Prophéte dans sès voyages en Arabie de l'Est", in *France-Islam*, Paris, N. 93-95, 1975, (illustrations).
- 'Les voyages du Prophète avant l'Islam", in *Bullètin d'Etudes Orientales*, Damas, vol. 29, 1977 (Mélange Henri Laoust).
- 'Le monde musulman devant l'economie moderne", in *Cahiers de l'Institut de science économique appliquée*, section Humanité, Suppl. 120, Paris 1961.
- 'Les liens entre la religion et le de roit en Islam", in *Recherches et Debats du Centre Catholique des Intellecutuels Francais*, Paris, cahier 51, 1965
- 'Le régne conjoint, la théorie et la pratique islamiques", *Rivista degli Studi- Orientali*, Rome, 1953.
- 'Les Ahabish de la Mecque", in *Presentation volume to Levi della Vida*, Rome 1956.
- "al-llaf ou les rapports économico-diplomatiques de la Mecque pré-Islamique", in *Presentation Volume to Louis Massignon*, Damas-Paris 1957.
- 'l 'Histoire de l'usul al-fiqh chez les Musulmans", in *Annales de la Faculté de droit*, Istanbul, N 9-11, 1959.
- 'La date de naissance du Prophète Muhammad", in *France-Islam,* 28-29, 1969, Paris.
- 'Les Villages arabes (surtout Médine) au temps du Prophete", in *Communautés rurales*, Société Jean Bodin, Bruxelles 1982.
- 'Document inédit sur les dêbuts de l'Islam en Iran," in *Connaissance de l'Islam*, Paris, N 12, 1982.

- *Pourquoi jeuner?* Paris 1984.
- *Le pelerinage*, Paris 1984.
- *La symbolique en Islam*, Paris, 1987. ed. rev. (sous press), 1988, St. Denis (Reunion)

English

- *Muslim Conduct of State*, 7th ed. Lahore. 1977, (also in Turkish)
- *The First written-Consititution in the world*, 3rd ed. Lahroe. 1975.
- *Muhammad Rasulullah*, Hyderabad-Deccan 1974, also in Turkish.
- *Introduction to Islam*, (in a dozen languages but, alas, not in Urdu).
- *The Battlefields of the Prophet*, 3rd ed. Hyderabad-Deccan 1983. (also Turkish, Persian and French).
- *The Prophet's Establishing a State and his Succession*, Hyderabad-Deccan 1986; rev. ed. in Press, Islamabad, 1988.
- *Sahifah Hammam ibn Munabbih*, Hyderabad-Deccan rev. ed. 1979, also French.
- "The Nasi', the Hijrah Calendar and the Need of Preparing a New Concordance of the Hijrah and Gregorian Eras", revis. ed. in *Islamic Review*, Woking, February, 1969.
- "Administration of Justice under the Early Caliphate", *Journal of Pakistan Historical Society*, January 1971, Karachi.
- "Constitutional Problems in Early Islam", *Islam Tetkikleri Enstitusu Dergisi*, Istanbul University 1973.
- "The City-State of Mecca", in *Islamic Culture*, Hyderabad-Deccan 1938.
- "Some Arabic Inscriptions of Medinah of the Early Years of Hijrah", in *Islamic Culture*, Hyderabad-Deccan 1939.
- "The Friendly Relations of Islam with Christianity and How they

Deteriorted" *Journal of Pakistan Historical Society*, Karachi 1953.

- 'New Light on the Character of Abu Sufyan the Companion of the Prophet", in *Islamic Literature*, Lahore 1953.
- 'Budgeting and Taxation in the time of the Holy Prophet", in *Journal of Pakistan Historical Society*, Karachi, 1955, and *Islamic Review*, Woking, 1956.
- "Two Christians of Pre-Islamic Mecca, 'Uthman ibn al-Huwairith and Waraqa ibn Naufal", in *Journal of Pakistan Historical Society*, Karachi, 1958.
- "The Christian Monk Abu Amir of Madina of the Time of the Holy Prophet", in *Journal of Pakistan Historical Society*, Karachi 1959.
- "The Service of Worship Why in Arabic Alone?" in *Islamic Review*, Working, 1964.

German

- 'Die Neutralitaet im Islamischen Voelkerrecht", in *ZDMG*, Berlin 1935.
- 'Theorie und Praxis des Voelkerrechts im fruehen Islam", in *Kairos*, Salzburg/Austria, 1963.
- 'Die Bibel als eine Kononische Quelle des 'islamischen Rechts", in *Festschrift fuer Otto Spies*, Bonn, 1967.
- "Aesthetik und Kunst in der Lehre des Propheten", in *Proceedings of International Congress of Orientalists*, Munich 1959.

اشاریہ

حوالے پیراگرافوں کے ہیں، صفحوں کے نہیں

ح: حاشیہ

م: مقام کا نام

✿ ✿ ✿